ادبستانِ لاہور کی تازہ ترین کتابیں

خطباتِ ابوالکلام آزاد علم و ادب کی دنیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپکا ہر خطبہ طوفان انگیز اور انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے خطبات میں اردو ادب سیاست اور مذہب گھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کے تمام خطبے آجتک متفرق پڑے تھے اور علمی دنیا ان خطبات کے حصول کیلئے پریشان تھی۔ چنانچہ اس کتاب میں مولانا کے تمام خطبے جمع کر دیئے گئے ہیں مشرق بھر میں ایسا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ قیمت مجلد معہ گرد پوش تین روپے آٹھ آنے۔

مقالاتِ الہلال سال ۱۹۱۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا تھا۔ الہلال جاری ہوتے ہی ہندوستان بھر کی نظریں اسکی انقلاب انگیز دعوت کی جانب اٹھ کھڑی ہوئیں۔ الہلال کی دعوت نے ہر ہندوستانی کو انقلابی بنا دیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی الہلال کا کوئی ثانی نہ تھا۔ الہلال نے سیاسیات میں بھی نئی راہیں پیدا کیں۔ اردو ادب کو الہلال کی بدولت چار چاند لگے۔ یہ کتاب اسی الہلال کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے قیمت مجلد دو روپے۔ اعلیٰ جلد والی تین روپے بارہ آنے

مضامینِ الہلال یہ کتاب بھی سلسلۂ الہلال کی دوسری جلد ہے۔ قیمت دو روپے۔ اعلیٰ ایڈیشن تین روپے بارہ آنے۔

مضامینِ ابوالکلام آزاد اس کتاب میں مولانا کے متفرق مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں قیمت دو روپے چار آنے۔

مولانا کی دیگر کتابیں ۔ قول فیصل ۔ تصریحات آزاد ۔ انسانیت موت کے دروازے پر ۔ مسلمان عورت ۔ مضامین البلاغ ۔

ایک ادبی ڈائری اس کا مصنف اختر انصاری ہے۔ اردو کی دنیائے ادب اختر انصاری کو ایک شاعر۔ افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے خوب جانتی ہے۔ اختر انصاری کی اس ادبی تصویر خانے میں ہماری نئی نسل کے افراد مصنفوں کے بیشمار فنی کارناموں اور ان گنت ادبی مسائل و تحریکات سے دو چار ہوتی ہے اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

روحِ عصر اختر انصاری کی تازہ ترین غیر مطبوعہ نظموں غزلوں گیتوں اور قطعات کا نایاب مجموعہ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ

دیگر قابلِ مطالعہ کتابیں مضامین جمال الدین افغانی ۔ تقاریر علامہ اقبال بزبانِ انگریزی ۔ مضامین مولانا محمد علی مرحوم بزبانِ انگریزی ۔

منگوانے کا پتہ :- ادبستان ۔ بیرون موچی دروازہ ۔ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی اور معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۴۳ — نمبر ۲

عالمگیر سالنامہ نمبر ۱۹۴۵ء

فہرست مندرجات ماہ جولائی ۱۹۴۵ء

(حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار، لاہور سے شائع کیا)

ادارہ

مُلاحظات

چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اہلِ ذوق کی خدمت میں "عالمگیر" اپنا بائیسواں سالانہ نمبر پیش کرتا ہے — !

اگر گزشتہ بائیس سال کے سالانہ نمبروں کو اٹھا کر دیکھا جائے تو ادب و صحافت کی بوقلموں اور رنگا رنگ دنیا آباد نظر آئے گی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ "عالمگیر" کے سالانہ نمبروں میں اُردو ادب کی تاریخ بند کر دی گئی ہے۔ "عالمگیر" نے ہمیشہ رفتارِ وقت کا ساتھ دیا ہے۔ اور وہ زندگی اور ماحول کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پوری قوت اور تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک تھکن اور آزردگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ زمانے کی ہر کروٹ اس کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کرتی ہے اور وہ اپنے فرائض پہلے سے بھی زیادہ انہماک اور تیز گامی کے ساتھ انجام دے رہا ہے —

سالانہ نمبر ۱۹۴۸ء علم و ادب کے موجودہ رجحانات کا کس حد تک آئینہ دار ہے؟ اس کا جواب زیرِ نظر صفحات ہی دے سکیں گے۔ لیکن جہاں تک ادارہ کی مساعی کا تعلق ہے اُن کو حالات کی حد بندیوں کے ماتحت بار آور بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ اُردو صحافت جس نازک دَور سے گزر رہی ہے وہ قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ کاغذ کی بہم رسانی ابھی تک عام نہیں ہوئی۔ ہر اخبار اور رسالے کا حصۂ رسدی سرکارِ عالی مدار کی طرف سے مقرر ہے لیکن اس کی مقدار اتنی محدود ہے کہ ضروریات کا تیسرا حصہ بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نگاہیں بار بار شملہ کی برفانی چوٹیوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ کہ شاید خداوندانِ "ہالی لاج" کے سینہ میں اک ذرا فراخی پیدا ہو سکے۔ لیکن اُن کو مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں "استحقاق" کا سوال نہیں۔ مجبوریوں کی قید ہے۔ اس کے علاوہ آرٹ پیپر کا استعمال ممنوع ہے جس کی وجہ سے نہ تو سہ رنگی اور یکرنگی تصاویر شامل کی جا سکتی ہیں، نہ سرورق ہی دیدہ زیب بنایا جا سکتا ہے اس کے باوجود سالانہ نمبر کے ظاہری محاسن کو بھی چمکانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اُمید ہے۔ قارئین کو "افسانہ نمبر" کی طرح اس مرتبہ بھی "عالمگیر" کا سرورق پسند آئے گا — !

جہاں تک مضامینِ نظم و نثر کا تعلق ہے۔ اُن کے کامیاب ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر صاحبِ ذوق تسلیم کرے گا کہ "عالمگیر" اُردو ادب کی جدید کروٹوں سے ناواقف نہیں ہے اس لئے وہ جن پہلوؤں کو قوم اور معاشرے کے لئے مفید خیال کرتا ہے اُن کو ابھارنے میں اُسے ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ "سالانہ نمبر" میں بھی حتی الوسع ایسا لٹریچر شامل کیا گیا ہے جو عہدِ حاضر کے شائستہ اور پاکیزہ مذاق کا آئینہ دار ہے۔

تنقیدی ادب کے حصہ میں اگرچہ صرف تین مقالے شامل ہیں لیکن اُن میں سے ہر مقالہ کسی نہ کسی جہت سے اُردو ادب کے جدید مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ میرزا ادیب نہ صرف ایک کہنہ مشق اور مقبول ترین افسانہ نویس ہیں بلکہ اُن کی ناقدانہ نگاہ بھی بہت زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ اس مرتبہ آپ نے گزشتہ سال کی رفتارِ ادب کا جائزہ جس بالغ نظری اور بے تعصبی سے لیا ہے وہ ہر حلقے سے یقیناً خراجِ تحسین حاصل کرے گا۔ سید احتشام حسین رضوی کا شمار نقادوں کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ آپ کے ادبی مقالات با ذوق حلقوں میں پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ آپ نے مولانا اختر علی تلہری کے بعض منطقی نکات کا جواب علم و فہم کی روشنی میں دیا ہے۔ اُن کے اس مراسلہ نے بہت سی ادبی اُلجھنوں کو دُور کر دیا ہے

محمد ابراہیم مدہوش محفلِ عالمگیر میں نو وارد ہیں لیکن اُن کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ تنقیدی ادب میں اپنے لئے مستقل گنجائش پیدا کئے بغیر نہ رہیں گے۔ اُن کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور استدلال قوی۔ اگر وہ اظہار بیان کی سادگی کی طرف توجہ کریں تو اُن کے مضامین کی مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ "روایات اور جدید تخیلِ شعری" اگرچہ تر نوالہ نہیں ہے اور اسے پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لئے فرصت اور تنہائی کی ضرورت ہے تاہم مسئلے کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس قابل ہے کہ تمام اہلِ ذوق اسے آنکھوں سے لگائیں اور دل میں جگہ دیں۔

افسانوی ادب کا حصّہ خاص طور پر کشش انگیز اور جاذبِ توجہ ہے۔ احسان بی۔ اے نے اپنے زیرِ تصنیف ناول "دُرِّ یتیم" کی چوتھی قسط پیش کی ہے جو گزشتہ ابواب کی طرح حد درجہ دلگداز اور موثر ہے۔ عبدالحلیم شرر کی طرح تاریخی واقعات کو افسانوی پیرایہ میں بیان کرتے جانا تو بہت آسان ہے لیکن نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ سے بات کی تہ تک پہنچنا ہر کسی کا کام نہیں۔ احسان ایک وسیع المطالعہ اور دقیق بیں افسانہ نویس ہے اس نے "دُرِّ یتیم" کی تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر دیا ہے! طفیل ملک اُن بے زبان انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی زندگی میں آج تک انقلاب نہیں آیا۔ "زرد پتے" میں وہ آرٹ کی بلندیوں پر پرواز کر رہے ہیں اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جو کام کرشن چندر نے ادھورا چھوڑ دیا تھا اُس کی تکمیل طفیل ملک ہی کے آزمودہ کار ہاتھوں سے ہو سکے گی۔ ظہور الحسن ڈار ایک نیا ستارہ ہے جس کا آرٹ آہستہ آہستہ آفتاب بن کر ضیاباریاں کر رہا ہے۔ اُس کا ہر نقش پہلے نقوش کے مقابلہ میں نمایاں اور گہرا ہوتا ہے "بھائی" ایک زبردست طنز ہے جس کی بازگشت کے تذکرے ایوانِ ادب میں مدتوں ہوتے رہیں گے۔ "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" میکسم گورکی کے ایک شہرۂ آفاق افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس میں عورت کی فطرت پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ میکسم گورکی جو کچھ لکھتا ہے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر لکھتا ہے اس لئے جزئیات نگاری میں جو کمال اُسے حاصل ہے اُس کی نقل آج تک نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر محمد نصیر الدین کا شمار صفِ اوّل کے افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی تجزیہ میں اُن کو خاص مہارت حاصل ہے۔ "گھسیٹے" کردار نگاری اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے امتیازی شان کا مستحق ہے۔ احمد شجاع پاشا کا نقطۂ نظر روز بروز واضح اور روشن ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کا افسانہ طبقاتی کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ "چائے اور چنے" میں مزدور طبقہ کے دل کی دھڑکنیں بند کر دی گئی ہیں۔ "انہیں ملیح آبادی کی نامکمل ڈائری" فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ایک ذہنی ردِّ عمل ہے۔ بچّوں کے جذبات کی عکاسی وہ نہایت خوبی سے کرتے ہیں۔ "کبھی" کے مسئلہ پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اُمید ہے اے۔ آر۔ رشدی کا افسانہ بھی دل و دماغ میں ہلچل پیدا کئے بغیر نہ رہے گا۔ عزیز اثری نے بظاہر ایک بعید از قیاس نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ لیکن جہاں تک فنکاروں سے اُن کی ہمدردی کا تعلق ہے وہ بہر صورت لائقِ داد ہے۔

شعری ادب کے حصّہ میں اساتذۂ سخن کے دوش بدوش نوجوان شعرا کا تازہ کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے اہلِ ذوق مستفید ہو سکیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ قلّتِ گنجائش کے باعث بعض علمی و ادبی مضامین شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔ خصوصاً ممتاز مفتی کے "شوقِ تحقیق" اور کسریٰ منہاس کے "فنِ تعمیہ" کی کتابت ہو چکی تھی لیکن تنگ دامانی نے آگے بڑھ کر کہا

ع - کہ اب تو کچھ نہیں باقی جناب شیشے میں

اس لئے مجبوراً اُن کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ ہم اپنے محترم اہلِ قلم معاونین سے معذرت خواہ ہیں ——!

عالمگیر بک ڈپو کی زیرِ تکمیل مطبوعات کا اشتہار جا بجا درج کر دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں طباعت و کتابت کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ دو تین ماہ تک مارکیٹ میں آ جائیں گی۔ ضخامت اور قیمت کا اعلان آئندہ اشاعتوں میں کیا جائے گا۔ قارئین اِن علمی و ادبی جواہر ریزوں سے مستفید ہونے کے لئے تیار رہیں۔

مینیجر سے خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ادارہ

اخبار و افکار

"اینٹی ریڈیو ڈے"

ہندی ساہتیہ سمیلن کے ارکان بھی عجیب ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ اُردو دان طبقہ کو آل انڈیا ریڈیو سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس محکمہ میں اُردو سے وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو سوتیلی ماں اپنے بیٹے سے روا رکھتی ہے۔ اور خصوصاً لاہور میں جب کہ زمام اختیار مسٹر سومناتھ چھبر کے مہا سبھائی ہاتھ میں آئی ہے اُردو کے الفاظ کو چُن چُن کر نشر گاہ سے نکال باہر کیا جا رہا ہے۔ اور ریڈیو کے تمام ملازموں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے نشریوں میں آسان سے آسان زبان استعمال کریں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی اس میں رہنے نہ پائے اور صرف ایسے الفاظ کو ثقہ قرار دیا جائے جو کاشی کے بوڑھے پنڈتوں اور کیمبرج کے سن رسیدہ محققوں کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آ سکیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے دل کا کانٹا ابھی پوری طرح دُور نہیں ہوا۔ وہ اصطلاحی طور پر بھی نشر گاہوں میں اُردو کا نام سُننا گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ چاہتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرح لاہور کی نشر گاہ بھی گورو کل کانگڑی بن کر رہ جائے۔ اور اس اسٹیشن سے جو آواز بھی اُٹھے وہ ہندی اور سنسکرت کی بھول بھلیوں میں پھنسی ہوئی ہو۔ چنانچہ ۲۴ جون کو "ریڈیو سدھار سمتی" کی ہدایت کے ماتحت پنجاب میں "اینٹی ریڈیو ڈے" منایا گیا۔ جس میں بقول "ملاپ" آل انڈیا ریڈیو کی ہندی کش پالیسی کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔ اور حکومت کو دھمکی دی گئی۔ کہ اگر ہندی سے ترجیحی سلوک نہ کیا گیا تو ہندوستان کے ۳ لاکھ لائسنس ہولڈروں میں سے اڑھائی لاکھ ہندو اپنے ریڈیو بند کر دیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہندی ساہتیہ سمیلن زبان کے مسئلہ پر فرقہ پرستی کا رنگ چڑھانا چاہتی ہے۔ حالانکہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہے اور اسلام کو اُردو سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہندی ساہتیہ سمیلن اپنی مہا سبھائی ذہنیت کا ثبوت دیئے بغیر نہیں رہ سکی۔ تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مہا سبھا کے خرخراتے ہوئے گلے سے نکلی ہوئی یہ کھوکھلی آواز بے اثر ثابت ہوگی کیونکہ احمد شاہ بخاری سے لیکر سومناتھ چھبر تک ریڈیائی ادلمپیا کے تمام دیوتا غالباً اُردو کو کچلنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور ارباب اُردو کے پیہم احتجاج کے باوجود اُن کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگی۔ اس لئے ہم پنجاب کے اُردو دانوں سے پُوچھتے ہیں۔ کہ اس کڑی آزمائش کے موقع پر وہ کس گوشۂ خمول میں بیٹھے ہیں؟ اُن کی رگِ حمیت پھڑک کیوں نہیں اُٹھتی؟ وہ ہندی ساہتیہ سمیلن کی فتنہ انگیزی کا دنداں شکن جواب کیوں نہیں دیتے؟ کیا اُن کا فرض نہیں ہے کہ وہ بھی آل انڈیا ریڈیو کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے حکومتِ ہند کو بتا دیں کہ زبان کے باب میں سرکار نے جو روش اختیار کی ہے اُس سے اہلِ اُردو مطمئن نہیں ہیں۔ اور اگر ہندی معشوق کی نازبرداری کے شوق میں اُردو کا وقار قائم نہ رکھا گیا تو پنجاب کی اُردو داں اکثریت اپنے تعاون سے دست کش ہونے پر مجبور ہو جائے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ پنجاب کے وہ تمام اہلِ ذوق جن کے دل میں اُردو زبان کی ذرا بھی قدر موجود ہے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے فرض سے غافل نہ رہیں گے اور آل انڈیا ریڈیو کی ہندی نوازی کے خلاف فوراً کوئی مؤثر قدم اُٹھائیں گے۔

یاد رکھنے کی باتیں

۱۔ دفترِ "عالمگیر" میں غزلیں بہت زیادہ تعداد میں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے اُن کی اشاعت میں تعویق ناگزیر ہے۔

۲۔ مشاہیر شعرا کے علاوہ تمام شاعروں کو چاہیئے کہ وہ اپنا کلام بھیجنے سے پہلے کسی اُستادِ سخن سے مشورہ کر لیا کریں ورنہ اشاعت پر غور نہ ہو سکے گا۔ ادارۂ "عالمگیر" کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اصلاح و ترمیم سے کام لیتا پھرے۔

۳۔ ادارۂ عالمگیر ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ اس لئے جن حضرات کو اپنے مضامین پر شبہ ہو اُنکی نقل اپنے پاس رکھا کریں۔

(ادارہ)

علم ادب

لکھنے والے :-

میرزا ادیب بی اے
احتشام حسین ایم اے
محمد ابراہیم مدہوش

میرزا ادیب

جون ۱۹۴۴ء سے جون ۱۹۴۵ء تک

گرد و پیش

زندگی کا کارواں کہیں بھی نہیں رکتا۔ ادب کا قافلہ کہیں بھی نہیں ٹھہرتا۔ زندگی اور ادب، یا ادب اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جن کے قیام کی کوئی صورت نہیں ہے۔ جن کی حقیقتاً کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ زندگی ادب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ادب زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ اگر زندگی تنگ و تاریک، تیرہ و تار راہوں سے گزرے تو لازماً ادب کا رُخِ روشن بھی سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اور اگر ادب وسیع و شاداب، روشن و صحت مند فضاؤں میں سانس لے تو زندگی کی رگوں میں بھی خونِ صالح کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ گزشتہ کئی سال سے ہندوستانی زندگی پر سیاسی نقطۂ نظر سے جود و جمود کی ایک ایسی تیرگی چھائی ہوئی ہے جو روز بروز گہری سے گہری ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگِ یورپ میں روس کی شاندار کامیابی نے شہنشاہی کے دل و دماغ پر ایک شدید ضرب لگائی ہے۔ اور آزادی کا حیات آفریں تصوّر ان حدود کو بھی چھو رہا ہے جہاں شہنشاہی نے صدیوں سے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اس انقلاب کے اثرات اپنے اثر و نفوذ کے لئے انسانی آبادی میں نئے نئے امکانات ڈھونڈ رہے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی زندگی کے سامنے ابھی تک آزادی کا کوئی واضح، غیر مبہم، روشن و صاف تصوّر نہیں ہے۔ "کچھ نہ کچھ تو ہوگا گھبرائیں کیا" — غلامانہ ذہنیت کا ایک نظریہ ہے جو زندگی کو بلندی اور روشنی کی طرف لے جانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، شہنشاہی کا مداری اپنے تھیلے میں شعبدے کی نئی نئی چیزیں لے کر ہندوستان میں پہنچ رہا ہے۔ چند رہنماؤں کو توقع ہے "شاید کچھ مل جائے"۔ اور لیڈروں کی بیشتر تعداد یہی سمجھ رہی ہے کہ حسبِ معمول اس مرتبہ بھی برطانوی شہنشاہی اپنے رجعت پسندانہ تصوّرات سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گی۔ بہرحال

ہماری سیاسی زندگی کے پس منظر میں اُمید و بیم کی جو کیفیت کارفرما ہے اس نے ہمارے ادب پر کافی گہرا اثر ڈالا ہے۔ سیاسی زندگی کا دھارا صرف ایک ہی راہ پر نہیں بہتا، اس سے ملک کی سماجی، معاشی اور اقتصادی زندگی یکساں طور پر متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اور ادب چونکہ کسی ملک کی زندگی کے ہر شعبے کی "نمائندگی" کرتا ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ادب پر ایک اضمحلال سا، ایک تھکن سی طاری ہے۔ ادب ایک کھلی، شاداب اور وسیع فضا میں پرواز کرنے کی بجائے ایک تنگ و تاریک مگر سرد راہ میں ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں کی نیت نیک ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہماری زندگی ہی منجمد ہے۔ انجماد کی یہ کیفیت جب دور ہو جائے گی۔ ادب کے سینے میں بھی حیات آفریں شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ گزشتہ جون سے لیکر اب تک ہمارے ادب نے جو کروٹیں لیں۔ ان کے پس منظر میں وہی بیدلی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے جس سے ہماری زندگی کو ابھی تک نجات نہیں مل سکی! آیئے سب سے پہلے تنقید نگاری کا جائزہ لیجئے۔ پچھلے بارہ مہینوں میں تنقید سے متعلق بہت کم مضامین لکھے گئے۔ اور ان مضامین کے موضوعات میں بھی کوئی شادابی نہیں ہے۔ میری نظروں سے زیادہ تر وہی مضمون گزرے ہیں جو ترقی پسند ادب سے متعلق ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے ترقی پسند ادب کی وضاحت کی۔ اور بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے لیکن ان الجھنوں کو نہیں مٹا سکے جنہوں نے ترقی پسند ادب کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ احتشام کا ذہن عام ترقی پسند نقادوں کے مقابلے میں زیادہ واضح تصوّرات پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ان کے یہاں بھی ایسی باتیں نکل ہی آتی ہیں جنہیں متضاد کہا جا سکتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے نقاد اپنے دماغوں کو صرف اپنے مخصوص نظریوں تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ اختر تلہری صاحب نے پروفیسر احتشام کے مقالات کے جواب دینے میں جو طرز

اختیار کیا ہے وہ ہر چند ایک سلجھے ہوئے ذہن کی پیداوار ہے تاہم پرانی لکیر ہی سے چمٹا ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اب اس قسم کے تنقیدی مضامین کی ضرورت نہیں رہی۔ ان سے خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک سچا ادیب جس کا ہاتھ وقت اور زندگی کی نبض پر ہے کبھی تنزل پسند نہیں ہو سکتا۔ ایسے یہ کہنا کہ تم اس قسم کا ادب پیش کرو ایک بے معنی سی بات ہے۔ اگر یہ دنبیر احتشام صاحب اور اختر تلہری صاحب اس بحث سے علیحدہ ہو کر اردو ادب کو ٹھوس انتقادی مقالات سے نوازنے کی کوشش کریں تو یقیناً ان کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہوگی۔ عبادت بریلوی کے چند مضامین بھی پڑھے مگر ان میں نہ تو گہرائی ہے اور نہ معقول دلائل۔ عبادت صاحب کے یہاں کوئی واضح نظریہ نہیں ہے۔ رک رک کر لکھتے ہیں۔ ٹھیر ٹھیر کر سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کا ذہن ابھی دھندلکوں میں گھرا ہے۔ احتشام کی طرح ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کسی موضوع پر غور نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھتے وقت ان کا قلم بار بار الجھ جاتا ہے۔ یہاں شبلی بی کام کے ایک مقالے کا ذکر نہ کرنا یقیناً ان پر ظلم ہے۔ "لاشعور" اگرچہ ادبی تنقید نہیں ہے لیکن یہ مقالہ اپنے ٹھوس دلائل اور اظہارِ بیان کی شگفتگی کے لحاظ سے ادبی مقالات میں ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ شبلی نے فرائڈ کے مشہور و معروف نظریے کا بڑی کامیابی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ظہور الحسن ڈار نے بھی اس سال مضامین کا ایک خاص سلسلہ شروع کیا ہے "میں خاموش نہیں رہ سکتا" اس سلسلے کی دو قسطیں عالمگیر میں شائع ہو چکی ہیں اور دونوں بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ ڈار کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ ان ادبی منزلوں میں سے گزر رہا ہے جو ایک سچے فنکار کی راہ میں اکثر آتی ہیں۔ مگر جن میں سے گزرتے وقت فنکار کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے — تنقیدی اور معلوماتی مقالات کے علاوہ ادبی کتابوں پر ریویو بھی ہوئے۔ مگر ادب کا یہ شعبہ بھی ابھی اپنے ابتدائی مرحلے پر ہے۔ گزشتہ سال ہماری شاعری نے کوئی ترقی نہیں کی۔ میں آزاد شاعری کو اردو کے شعری ادب میں ایک مستقل اضافہ سمجھنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر جو اعتراض "پرانی شاعری" پر کیا جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے وہی اعتراض نئی شاعری پر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر پرانی شاعری "رسوم و قیود" کے دائرے میں مقید ہے تو نئی شاعری نے کونسی نئی راہیں تجویز کی ہیں؟ نئی شاعری میں خیالات کا افلاس جا بجا نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔

ہیئت میں تبدیلی کے ساتھ اگر مواد میں "ہمہ گیری" اور "تر و تازگی" نہیں ہے تو محض ہیئت بدلنے سے شاعری کو زندہ رہنے والی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ فیض، راشد، جذبی، یوسف ظفر، قیوم نظر، جذبی نے ہیئت اور مواد دونوں میں کچھ نہ کچھ انفرادی تبدیلی کی ہے اور ان شاعروں کی بعض نظمیں یقیناً اچھی ہیں۔ مگر ابھی نئے شاعروں کی اکثریت ان تجربات میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ چند الفاظ کا گورکھ دھندا تو شاعری نہیں ہے۔ پرانی ہیئت اختیار کرنے کے باوجود ترقی یافتہ شاعری کے امکانات لامحدود ہیں۔ فراق گورکھپوری کہتے تو غزل ہیں۔ مگر ان کی شاعری زندگی کی طرح کس درجہ ہمہ گیر اور کتنی گہری ہے۔ بہرحال گزشتہ سال شاعری نے کوئی نیا قدم نہیں اٹھایا۔ بہت ہی کم ایسی نظمیں کہی گئی ہیں جو ادبی لحاظ سے کچھ بلند ہوں۔ اس سال میں نے میراجی کی بہت کم نظمیں دیکھی ہیں۔ جو نظمیں دیکھی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر کے جنسی الجھنوں میں دبے ہوئے افکار ایک نئی فضا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔ یہ اردو شاعری کی بدقسمتی ہے کہ میراجی جیسا ذہین اور طباع ادیب اپنی شاعری کو اس قدر محدود کر دے۔ نئی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ بھی ہے کہ یہاں ذہنی توازن نہیں ہے۔ نئی شاعری کرنے والے عام طور پر اپنے آپ کو پریشان دماغی کی نذر کر دیتے ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ ایک تو ذہنی توازن کی عدم موجودگی اور دوسرے الفاظ کا افلاس۔ اگزشتہ دس بیس برس میں ہماری جس صنفِ ادب نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ افسانہ نویسی کی صنف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ عوام کی مقبول ترین صنف ہے۔ اور دوسرے اس کی طرف عام طور پر ان دماغوں نے توجہ کی جو مغربی فنِ افسانہ نگاری کی تمام نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے۔ گزشتہ سال اگرچہ ہماری افسانہ نویسی نے اپنے لئے نئے موضوعات تلاش کرنے کی کوئی اہم کوشش نہیں کی۔ تاہم بعض ایسے افسانے بھی لکھے گئے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کرشن چندر تیزی کے ساتھ لکھتے رہے۔ اور اردو ادب ان کا ممنون ہے کہ انہوں نے اسے "ان داتا" جیسا ہمیشہ زندہ رہنے والا افسانہ دیا۔ پچھلے سال میں نے کرشن چندر کے بہت سے افسانے پڑھے ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ان کی بہت بڑی خصوصیت — یعنی طنز اپنے لئے اشتہاری انداز بیان کا سہارا ڈھونڈنے پر

محصور ہو رہی ہے۔ جہاں وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یا جہاں ان کے پاس کچھ کہنے کے لئے نہیں ہوتا وہاں وہ طنز کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ گزشتہ سال افسانہ نویسوں میں سب سے اہم نام شمس آغا ہے جو اب [illegible] —— دو ایسے افسانے ہیں جنہیں اردو ادب کے بہترین افسانوں میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ شمس کے یہاں ایک گہری یاسیت کی فضا چھائی رہتی ہے۔ ایک چھپا ہوا شکستہ زخم کی سی کیفیت۔ مگر ادبی دنیا کے تازہ شمارہ میں ان کے قلم سے جو افسانہ نکلا ہے وہ بہت پسند ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا رنگ پہلے کی بہ نسبت بہت گہرا ہو گیا ہے۔ زندگی کے سنجیدہ تجربات نے ان کے افسانوں میں ایک خاص گہرائی پیدا کر دی ہے۔ پہلے وہ زندگی کے سامنے جیسے ہنستے تھے لیکن اب وہ انسانی زندگی کو بعینہٖ [illegible] رہے ہیں۔ اپنے موضوع براہ راست زندگی سے لیتے ہیں اور ایک خاص سنجیدگی، تفکر کے ساتھ قارئین کو متوازن اور [illegible] مسرور [illegible] وہ [illegible] کا آغاز نہایت شائستہ [illegible] کی زبان [illegible] اور دلکشی اور جزئیات نگاری ان کے افسانوں کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ مگر کچھ عرصے سے ہما کا مشاہدہ زندگی کے تمام موضوعات کو نظر انداز کر کے جنسی پیچیدگیوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ گزشتہ سال ان کے قلم سے جتنے افسانے نکلے ہیں وہ قریب قریب اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ اگر وہ کوشش کریں تو اپنے افسانوں کو کافی وسیع کر سکتی ہیں۔ قرۃ العین، آفاق ادب پر ایک [illegible] ستارہ [illegible] درخشندہ۔ اردو کے جمیل [illegible] ادیب [illegible] صاحبزادی۔ [illegible] کی [illegible] زندگی [illegible] محترمہ خاتون افسانہ نویسوں کی نئی اور ترقی یافتہ صلاحیتیں لے کر دنیائے ادب میں آئی ہیں۔ محمد حسن عسکری [illegible] زندگی [illegible] رہے ہیں۔ اور دونوں نے کافی ترقی کی ہے۔ [illegible] افسانہ نویسی کے آغاز میں [illegible] "سرخ ستارے" سے بہت متاثر تھے۔ مقام مسرت ہے کہ اب ان کی ادبی زندگی کا افق روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان کا تخیل "سرخ ستارے" سے بہت آگے نکل کر کائنات کی لامحدود فضاؤں میں جذب ہو رہا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں غلام [illegible] کا مستقبل سب سے زیادہ روشن ہے۔ عزیز اثری اور [illegible] نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ ان [illegible] افسانہ نگاروں کا موضوع خاص کلرک کی زندگی ہے۔ کلرک کی محدود، تاریک اور بے رنگ دنیا۔ ان کے افسانوں میں ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں موجود ہیں جو کلرک کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں —— خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے ادیب خاص طور پر ناول کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ عصمت، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی، سید احسان علی شاہ اور کرشن چندر سب کے سب ناول لکھ رہے ہیں۔ پچھلے سال کوئی قابل قدر ناول مارکیٹ میں نہیں آیا۔ سید احسان علی شاہ کے تاریخی ناول "در یتیم" کے چند ابواب رسالہ عالمگیر میں شائع ہو چکے ہیں۔ احسان ایک مفکر ادیب ہیں۔ ان ابواب میں سطحی قسم کے جذبات نہیں ہیں۔ بلکہ جذباتیت اور فنی لطافت کو پختہ کار فنکار نے ایک دوسرے کے اندر فنکارانہ انداز کے ساتھ سمو دیا ہے۔ —— ادیبوں کی موجودہ سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ یقین ہوتا ہے کہ ہمارے ناول کی ترقی کے امکانات کافی وسیع ہیں اور وسیع ہوتے جا رہے ہیں —!

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اردو کے مشہور افسانہ نویس محمد حسن عسکری نے "ساقی" میں تنقیدی اشارات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ کافی مفید ہے۔ چنانچہ اردو رسائل کے مدیر اس قسم کے اشارات کے لئے اپنے رسالوں میں گنجائش نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کے باوجود اردو رسائل نے بہت اچھے اچھے خاص نمبر بھی نکلے۔ رسالہ عالمگیر کا خاص نمبر، ادب لطیف کا افسانہ نمبر، [illegible] کا [illegible] نمبر اور آجکل کا سالنامہ۔

احتشام حسین رضوی ایم۔اے
(لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی)

ترقی پسند ادب اور نیا ادب

محترمی جناب ایڈیٹر صاحب عالمگیر تسلیم!

جب آپ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مولانا اختر علی صاحب کا مضمون میرے مضمون کے جواب میں شائع ہو رہا ہے تو میں نے لکھا تھا کہ میں جواب نہ لکھوں گا۔ کیونکہ آج تک میں نے ایسے مباحثوں کا خاتمہ اس وقت تک نہیں دیکھا ہے جب تک کہ ایڈیٹر خود اپنے اخبار یا رسالہ میں اس بحث کے بند ہونے کا اعلان نہ کر دے۔ ہم میں بدقسمتی سے نہ جانے کیوں یہ فراخدلی بھی نہیں ہے کہ اپنی شکست کا اعتراف کر لیں۔ ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے، شاید دلچسپ ہو اس لئے آپ سے بھی اس کا اظہار کرتا ہوں۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسی بحثیں تھوڑی دیر کے بعد وہ شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ ان کی حیثیت لفظی نزاع سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ چاہے اصل موضوع سے اتفاق بھی ہو جائے لیکن لفظوں کے استعمال، ان کے معنی متعین کرنے، ان کے لب و لہجہ سے نئے مطالب نکالنے کی گنجائش ہر وقت باقی رہتی ہے۔ اس لئے جب تک کوئی چاہے ایسی بحثیں "چلائی" جا سکتی ہیں۔ ہر دفعہ کچھ نیا مواد ہاتھ آ جاتا ہے اور جس کے قلم میں زور، دماغ میں سکت، دل میں حوصلہ اور فرصت بجا رہا ہے وہ دلچسپی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس لئے میں نے لکھا تھا کہ میں جواب اور جواب الجواب کو مفید نہیں سمجھتا۔ اور اگر کبھی اس کی جرأت کرتا بھی ہوں تو اپنے خیالات کا جائزہ لینے کے لئے یا کسی ایسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے جس کی وجہ سے شدید ذہنی الجھنیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ان باتوں کے علاوہ کوئی تین چار مہینے سے میری صحت اچھی نہیں اور لکھنے پڑھنے کا شغل تقریباً متروک ہے۔ پڑھنے کا کام تو برا بھلا ہو بھی جاتا ہے لیکن لکھنا بند ہے۔ تاہم جب مولانا اختر علی صاحب کا مضمون میں نے پڑھا تو چند مسائل پر اظہار خیال کو جی چاہا۔ مگر میں نے اسے مضمون کی شکل میں لکھنے کی بجائے آپ کے نام خط کی شکل میں لکھا ہے تاکہ جواب الجواب کی نوعیت باقی نہ رہے۔ مولانا کا جی چاہے تو اسے میری شکست سمجھ

تعبیر کر لیں لیکن میں اس طنز اور تلخی سے مولانا کے قلم کو بچانا چاہتا ہوں جو اس دفعہ جواب لکھتے ہوئے ان کے وہاں ذرا زیادہ راہ پا گئے ہیں۔

میں نے ابھی جو یہ کہا کہ لفظی نزاع کا خاتمہ ہونا آسان نہیں اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر مولانا اختر علی صاحب ہندوستان کی آزادی، دنیا میں امن و سکون، ترقی اور جمہوریت کو پسند کرتے ہیں، شاعروں اور ادیبوں کے منکر نہیں ہیں اور ساری دنیا کو گھسیٹ کر اس مرکز پر نہیں لانا چاہتے جہاں موصوف خود ہیں، کلچر اور ثقافت کو عام انسانوں کی ملک بنانا چاہتے ہیں تو پھر بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ بنیادی طور پر میں نے انہیں چیزوں کو ترقی پسندی قرار دیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں سوشلزم کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن مولانا اختر علی صاحب نے اسلام اور سوشلزم کا مقابلہ شروع کر دیا۔ میرے پیش نظر وہ وقت بھی ہے [illegible] وہ مضامین بھی جن میں مولانا موصوف اسلام اور سوشلزم میں مشترک مقامات تلاش کر رہے تھے۔ اگر ادب کے معاملہ میں مندرجہ بالا مقاصد ہی شاعر یا ادیب کے پیش نظر ہیں تو اسلام یا سوشلزم کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بحثیں اصل مقصد سے دور لے جاتی ہیں اور لفظی نزاع کی نئی صورتیں پیدا کرتی ہیں۔ اگر میں نے کسی جگہ یہ کہا ہو کہ اشتراکی ادب اور ترقی پسند ادب دونوں ایک ہی چیز ہیں تو یہ سوال پیدا کیا جا سکتا تھا کہ کیا اشتراکی ادب کے علاوہ کوئی اور ادب ترقی پسند نہیں ہو سکتا؟ میرے مضامین کا مطالعہ کرنے والے اور میرے جاننے والے اسے اچھی طرح جانتے ہیں (اور اس میں محترمی اختر علی صاحب بھی شامل ہیں) کہ میں دونوں کو ایک نہیں سمجھتا۔ میں بہت سے (بلکہ زیادہ تر) غیر اشتراکی ادیبوں کو پڑھتا اور پسند کرتا ہوں، ان سے تعلق رکھتا ہوں، قدیم ادب کو بے معنی اور لغو نہیں سمجھتا۔ پھر اس سلسلہ میں اشتراکی

ادب اور اسلامی ادب کی بحث صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ حربہ بحث میں کام تو آتا ہے مگر اس سے ایک ایسا دھندلکا پھیلا دیتے ہیں کہ اصل مقصد کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ اگر مولانا آزادی کی حمایت میں، رجعت پسندی کی مخالفت اور ... کی مخالفت میں، عوام کو علم اور کلچر سے آشنا بنانے کے لئے، انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے، دنیا کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے، حقیقتوں سے روشناس کرانے اور حالات کے بدلنے پر آمادہ کرنے کے لئے لکھیں تو میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ترقی پسند انہیں غیر ترقی پسند نہ کہے گا۔ ترقی پسندی کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ شاعر اشتراکی بن جائے لیکن اگر کوئی ترقی پسند اشتراکیت کو ایک معقول نظام حیات سمجھتا ہے اور اس کے متعلق لکھتا ہے تو صرف اس خطا پر کہ اسے اشتراکیت سے دلچسپی ہے اور اس کے خیالات میں اس کی جھلک پائی جاتی ہے اسے ترقی پسندی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا میں نے یا کسی ترقی پسند نقاد نے کبھی کسی کو اس بنا پر غیر ترقی پسند کہا ہے کہ وہ مسلمان یا ہندو ہے؟ محترمی اختر علی صاحب کے یہاں یہ خیال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ موصوف مذہبی مضامین لکھتے ہیں اور عقیدۃً ترقی پسند نہیں ہیں اس لئے جب انہیں غیر ترقی پسند کہا جاتا ہے تو ترقی پسندوں پر یہ الزام لگانا چاہتے ہیں وہ سوائے اشتراکی ادب کے اور کسی ادب کو ترقی پسند نہیں سمجھتے۔ کیا قیامت ہے کہ ہم میر، غالب، انیس، میر حسن، آزاد، حالی، شیکسپیر، ملٹن، فردوسی، اقبال، حافظ، سعدی، کالیداس، تلسی داس اور ہزاروں دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تعریف کریں تو کچھ نہیں اگر دو لفظ کسی ایسے ادیب کی تعریف میں لکھ دیں جو اشتراکی ہے تو بس ہم نے صرف اشتراکیت کو ادب قرار دے دیا اور جو کچھ اس کے علاوہ کہا ہے وہ غیر مخلصانہ یا جھوٹ ہے! مولانا نے ان تمام ضروری باتوں کو جن سے ترقی پسندی کی وضاحت ہوتی تھی پس پشت ڈال دیا اور چند الفاظ لے کر ان میں اخلاقی اسقام تلاش کرنا شروع کیا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کی تحریر اور کوئی پڑھنے والا موصوف کو آزادی پسند، مجموعی حیثیت سے انسانی مسرت کا حامی، جمہوریت کا علمبردار قرار نہیں دے سکتا اس لئے موصوف کا یہ کہنا کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں، الفاظ کے ساتھ معانی کی بھی عظمت کے قائل ہیں مجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یقیناً موصوف کے یہاں زندگی اور معنویت کے دوسرے نام ہیں جن سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ احتشام صاحب نے "میرے ادبی عقائد" کی غلط ترجمانی کی۔ میں بہت ادب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ موصوف کے ادبی عقائد کیا ہیں؟۔ اگر واضح خیالات کی عدم موجودگی میں میں نے موصوف کے ادبی عقائد ان کی تحریروں سے تلاش کئے تو کیا غلطی کی۔ موصوف نے ابھی تک اپنے ادبی یا کسی عقیدے کا واضح اظہار نہیں کیا ہے، ہمیشہ تخریبی اور منفیانہ رخ پیش کیا ہے اور جب ایک شخص اس شدت کے ساتھ ترقی پسندی کی مخالفت کرے گا تو پڑھنے والا اس کے متعلق یہی نتیجہ نکالے گا کہ وہ ترقی پسندی کے عام بنیادی عقائد یعنی آزادی، مساوات، جمہوریت، عوام دوستی کا مخالف ہے۔ مولانا کا یہی رویہ ہے جس نے یہ نتائج نکالنے پر مجبور کیا۔ اور میں کیا جو شخص بھی موصوف کے مضامین پڑھے گا یہی نتیجہ نکالے گا۔ بحث مباحثہ کے لئے تخریبی یا منفی رُخ اختیار کرنا ضرور مفید ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی تعمیری مقصد پورا نہیں ہوتا۔

میں نے ترقی پسندی کی تعریف کے سلسلہ میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا بلکہ اس کی جگہ ترقی پسندی کی توضیح اور تشریح اچھی طرح کر دی تھی لیکن مولانا تعریف پر مُصر ہیں۔ میں نے کہا تھا کسی نے آج تک شعر و ادب کی کوئی مکمل تعریف نہیں پیش کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایسا ہوا کرے ترقی پسندی کی تعریف تو کرنا ہی پڑے گی، میں نے کہا تھا کہ ہر شخص کا شعور اس کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور جمالیاتی تصورات کی وجہ سے نیز اقتصادی اور معاشی معاشرتی روابط کی وجہ سے قدرے مختلف ہوگا اس لئے ترقی پسند ادب کی تعریف آسان نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں، ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی آپ تعریف کیجئے ——— اگر میری تشریح اور توضیح کے بعد بھی ایک منطقی تعریف کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے تو میں جواب میں خاموشی اختیار کرتا ہوں بلکہ شکست مانتا ہوں کیونکہ ایسی حالت میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ موصوف میری بات کو سمجھنا نہیں چاہتے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بصیرت کے لئے موصوف سے استدعا کروں گا کہ وہ شعر، ادب، غزل اور اسی قسم کے اور اصناف کی منطقی تعریف فرما دیں تو نہ صرف مجھ پر بلکہ ساری ادبی دنیا پر احسان ہو۔ موصوف مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اشتراکیت کی کئی قسمیں ہیں اور ایک نقطۂ نظر دوسرے سے کتنا مختلف ہے۔ اس لئے جب موصوف ترقی پسندی کو اشتراکی کہتے ہیں تو کونسی اشتراکیت مراد ہوتی ہے!

رہا۔ بانی اسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام مختلف شکلوں میں پیش کیا گیا، آج بھی نئی نئی شکلوں میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ کیا چیز ہے جسے موٹے اسلام کہکر مراد لیتے ہیں۔ اگر اسلام کے تحت میں معمولی اختلافات بنیادی نہیں، رکھنے والے رکھے جا سکتے ہیں تو ترقی پسندی کے تحت میں معمولی اختلافات رکھنے والوں کا پایا جانا کیونکر تعجب کی بات قرار پا سکتا ہے۔ اس میں اشتراکی بھی ہوں گے مسلمان بھی لیکن سب کے سب بنیادی طور پر آزادی، مساوات، جمہوریت، حقیقت اور ترقی کے حامی ہوں گے۔ اس لئے مقصد کو سمجھنے کے لئے تعریف سے زیادہ تشریح کی ضرورت ہے اور عام طور پر کام اسی طرح چل رہا ہے۔

محترمی مولانا اختر علی صاحب تلہری اب بھی اس بات پر مصر ہیں کہ میرے یہاں بعض تبدیلیاں مدآوا کے مضامین پڑھ کر پیدا ہوئی ہیں۔ فرماتے ہیں "اگر مدآوا جنوری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تو اس کے چند مضامین اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مدآوا میں کوئی مضمون ۱۹۴۲ء سے پہلے کا لکھا ہوا نہیں ہے، ن نے اگر میں نے اپنے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے مضامین کا حوالہ دیکر یہ لکھا تھا کہ میں بہت پہلے سے سارے نئے ادب کو ترقی پسند ادب نہیں سمجھتا تو معلوم نہیں موصوف اسے کیوں یاد نہیں کرتے۔ میرے پیش نظر وہ مضامین نہیں ہیں جو موصوف نے یا میں نے سرفراز لکھنؤ میں اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۳ء میں لکھے اس لئے میں یقین کے ساتھ ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اُن میں میں نے کیا لکھا البتہ مولانا نے جو بات لکھی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ موصوف لکھتے ہیں "ان مضامین کی اشاعت کے بعد سے ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جناب موصوف ہمارے ان اعتراضات سے جو نئی شاعری (الہامی پہلو؟) سے متعلق تھے بہت کچھ متفق ہو گئے ہیں، اور انہوں نے اس سلسلے میں اپنے خیالات کا رُخ کسی قدر بدل دیا ہے اس کے ثبوت میں سرفراز لکھنؤ کے وہ پرچے پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے نئی شاعری سے بحث کرتے ہوئے اس کے الہامی عنصر(؟) کی "استحسانی توجیہہ" فرمائی تھی" ———— میں ان جملوں کا مطلب نہ سمجھ سکا اس لئے کچھ عرض نہیں کر سکتا لیکن اگر ان سے ابہام مراد ہے اور میں نے ابہام اور طرزِ اظہار کی پیچیدگی کو غلط کہا ہے تو وہ کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ میں بہت دنوں سے سمجھتا ہوں کہ جس کی بات سمجھ میں نہ آئے وہ اچھا فن کار نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ کہیں نہ سمجھنے کی وجہ ہماری اپنی کم علمی اور بے بضاعتی تو نہیں ہے؟ ابہام اور طرزِ اظہار کی پیچیدگی کا مطلب ایسی حالت میں کچھ اور ہی ہو جائیگا۔

اسی سلسلہ میں موصوف نے میری ایک غلطی اور پکڑی ہے میں نے کہیں ن۔م۔ راشد کی شاعری کا ذکر عقیدت مندانہ لہجہ میں کیا تھا۔ پھر تعریفی حدود سے نکل کر تنقیدی حدود میں آگیا۔ اس کے متعلق میں دو جملے خاص طور سے لکھنا چاہتا ہوں۔ موصوف اسے نقطۂ نظر کی تبدیلی سمجھتے ہیں۔ تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ہم جب کسی شخص یا چیز کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تو ہر جگہ اُس کے متعلق ہر بات نہیں کہہ دیتے بلکہ سلسلۂ کلام میں جس بات کی ضرورت ہوتی ہے اُسی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ایک طرف تو طوالتِ جانسوز ہو جائے دوسری جانب بلاغتِ کلام کا خون ہو، اس لئے اگر میں نے ن۔م۔ راشد کے کسی مخالف سے راشد کی شاعری کی چند خصوصیتیں بیان کر دیں تو اس کا مطلب یہ کسی طرح نہیں ہوا کہ راشد کے متعلق میرے خیالات کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ جب میرا مخاطب راشد کے کور مقلدین سے ہوگا اُس وقت میں راشد کی شاعری کے عیوب بیان کروں گا۔ اس لئے مولانا کا یہ فرمانا کہ میں نے اپنا نقطۂ نظر موصوف کا مضمون پڑھنے کے بعد بدل دیا ہے صحیح نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ راشد کے اکثر خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ میں اُن کے خیالات کو صحت بخش نہیں سمجھتا لیکن یہ بھی کہتا ہوں کہ انہیں اپنے خیالات کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اور کبھی کبھی جب اُن کے خیالات مجھے اپنے خیالات سے ملتے ہوئے معلوم ہوئے ہیں تو اُن کا اثر مجھ پر کافی ہوا ہے۔ جون ۱۹۴۳ء میں بھی میں نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے راشد کے خیالات کو غیر صحت مند کہا تھا۔ ایک بات اور واضح کر دینا چاہتا ہوں اگر کبھی کوئی بات میری سمجھ میں آگئی جسے میں پہلے دوسری نظر سے دیکھتا تھا تو میں اپنی رائے نئے علم کی روشنی میں ضرور بدل دوں گا اور خوش ہوں گا۔ اور اگر یہ تبدیلی مولوی اختر علی صاحب کے کسی مضمون کو پڑھکر ہوئی تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ موصوف کافی غور و فکر کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور وہ دوسروں کے لئے بھی قابلِ غور ہوتے ہیں۔

ایک اور جگہ جہاں مولانا نے غیر معمولی منطقی احتیاط سے کام لیکر میری غلطی پکڑی ہے وہی نئے ادب اور ترقی پسند ادب کا فرق ہے معلوم نہیں موصوف میری بحث کی روح سے متفق ہیں یا نہیں کیونکہ یہ

تو ایک مضمون سی لفظی قباحت ہے جو شاید میری بد احتیاطی اور زود نویسی کی وجہ سے واقع ہو گئی ہے لیکن جس کا اثر نفس مضمون پر نہیں پڑتا میں نے اُن الفاظ کو دوبارہ پڑھا میرے لئے تو بات صاف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کو دقت پیش آئی ہو۔ میں اُسے پھر واضح کرنا چاہتا ہوں اور اگر اب مولانا میرے الفاظ کو پڑھیں گے تو موصوف کو دشواری نہ ہوگی اور وہ منطقی سقم بھی نظر نہ آئے گا جس کا تذکرہ موصوف نے کیا ہے میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "ہر ترقی پسند ادب تو نیا ادب ضرور ہے لیکن ہر نئے ادب کا ترقی پسند ہونا ضروری نہیں۔" اس کے بعد میں نے لکھا کہ "ترقی پسند ادب چند ایسی خصوصیتیں رکھتا ہے کہ اگر وہ ادب کے کسی حصہ میں پائی جائیں تو وہ ترقی پسند ادب کہا جائے گا" مولانا نے اس سے یہ بالکل صحیح نتیجہ نکالا کہ اس طرح (دوسرے جملہ کی وجہ سے) قدیم ادب میں بھی ترقی پسند ادب پایا جا سکتا ہے اور چونکہ پہلے جملہ میں ترقی پسند ادب کو نئے ادب کی خصوصیات میں شامل بتایا گیا ہے اس لئے یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر مولانا کو بحث مقصود نہ ہوتی اور میرا مطلب سمجھنا چاہتے تو موصوف میرے ایک جملہ سے یہ معلوم فرما سکتے تھے کہ میں قدیم ادب میں بھی ترقی پسندی کا قائل ہوں۔ جس مضمون کا جواب مولانا نے لکھا ہے اُس میں یہ جملہ بھی ہے کہ "کسی عہد کا سارا ادب رجعت پسند نہیں جس طرح آج کا سارا ادب ترقی پسند نہیں۔" میں اس کا بارہا اعتراف بھی کر چکا ہوں اور متذکرہ بالا جملے میں بھی یہ بات موجود ہے کہ قدیم ادب میں بھی زندگی کے مخصوص ادوار کے لحاظ سے ترقی پسندی پائی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ مولانا کی منطق بھی ان کے مقصدِ ادب کی طرح جامد ہے اس لئے وہ حقیقتوں کو وقت کے رشتے میں نہیں دیکھتی اس کے نتیجہ میں موصوف نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ترقی پسندی جدید ادب کا جزو ہے تو قدیم ادب میں بھی نہیں پائی جا سکتی۔ میرے بیان میں کسی قسم کی پیچیدگی اسی وقت نظر آ سکتی ہے جب اُس پر غور کرنے والا ادب کے تسلسل کا قائل نہ ہو، ادب اور زندگی کے معاشی معاشرتی تعلق کا قائل نہ ہو۔ اپنے پچھلے مضمون میں چونکہ میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے فرق پر گفتگو کر رہا تھا اس لئے میں نے اُس فضا کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں دونوں کے فرق کو واضح کیا اور ترقی پسندی کا لفظ نئے ادب کے رشتہ میں استعمال کیا۔ ورنہ صحیح تو یہ ہے کہ جو کل جدید تھا وہ آج قدیم ہے یہی نہیں، بلکہ جو کل کے نقطۂ نظر سے ترقی پسند تھا وہ آج کے لحاظ سے ترقی پسند نہیں ہے۔ ایک زمانے میں جو رواج کا تقاضا ترقی پسندی کا تقاضا تھا، آج مکمل آزادی کے مطالبہ کے مقابلہ میں یہ مطالبہ ترقی پسندانہ نہیں ہے گو خالص منطقی لحاظ سے اگر ایک تقاضا ترقی پسندانہ ہے تو وہ رجعت پسندانہ ہو ہی نہیں سکتا لیکن تاریخی طاقتوں کے بڑھتے اور گھٹتے اثرات، زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ترقی پسندی کی شکلیں مختلف ہوں گی۔ قدیم ادب میں بھی ترقی پسندی تھی اور وہ اس سے مختلف تھی جو جدید ادب میں ہے۔ اُس وقت بھی لوگ جیتے تھے، زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں مسرتوں کا اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ جو لوگ اپنی مصلحتوں کی وجہ سے حقیقتوں کو نہ دیکھتے تھے یا اُن سے آشنا بنتے تھے۔ ایسے لوگ اپنے خیالات میں ترقی پسند تھے کیونکہ وہ جہدِ حیات میں اُن قدروں کو عزیز رکھتے تھے جن سے انسانیت سربلند ہوتی ہے۔ جن سے تنزل کی طاقتوں پر چوٹ پڑتی ہے۔ اصولی حیثیت سے ایسے لوگ ترقی پسند کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے جو معرکہ گرم تھا اُس میں انہوں نے زندگی کے اہم ترین مسائل پر غور کیا ——— خیر اس وقت تو اِس امر کی بحث بھی نہیں ہے کہ قدیم ادب کے سلسلہ میں ترقی پسندی کا کیا مطلب ہے، میں تو اتنا ہی کہنا چاہتا تھا کہ نئے ادب کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اُس قسم کی ترقی پسندی کا ذکر کیا جو آج معرضِ بحث میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اپنی حدوں میں ترقی کے مفہوم سے ناواقف تھے۔

میرے مضمون کے جن خاص مطالب میں مولانا نے لفظی یا منطقی گرفت کی تھی اُن کا تذکرہ ہو چکا لیکن خلاصہ کے طور پر چند سطریں اور ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جو ادب کو تاریخی طاقتوں کا اور زندگی کی کشمکش کا مظہر سمجھتا ہے، جو آزادی (مابعد الطبیعیاتی مفہوم میں نہیں، سیاسی معاشی اور معاشرتی مفہوم میں) چاہتا ہے، جو عام انسانوں کو انسان سمجھ کر اُن میں تمدن کی تمام برکتوں کی اشاعت کرنا چاہتا ہے، جو جمہوریت پسند ہے، جو حقیقت پسند ہے اور جو ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا وہ آج ترقی پسند ہے۔ کل کیا ہوگا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ آج ترقی پسند کیلئے مسلمان، ہندو، اشتراکی یا لامذہب ہونے کا سوال نہیں ہے، ممکن ہے کبھی ہو۔ آزادی، مساوات اور جمہوریت کے بڑے محاذ پر جو لوگ ایک ساتھ صف آرا ہیں وہ ترقی پسند ہیں۔ اُن میں کندھے سے کندھا جوڑے ہوئے مختلف مذہب و ملت کے لوگ ہو سکتے ہیں۔

طفیل ملک

زرد پتّے

ایک تنگ راستے پر جس کے دونوں طرف اونچے اونچے دیوقامت درخت اُگے تھے اور جو جھکی ہوئی چٹانوں کی دُور سے نظر آتی محرابوں اور آسمان کے درمیان ایک تاریک چھت بنائے کھڑے تھے۔ وہ گھوڑے پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ تازہ شفاف اور درختوں اور گھاس کی خوشبو میں بسی ہوئی ہوا سے اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا تھا۔

دائیں بائیں دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے جو ایک تنگ بیضوی دائرہ بنا۔تے ہوئے پھر آپس میں مل گئے تھے۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اور اس تنگ بیضوی آسمان میں سورج کی حرکت کی ایک چھوٹی سی آڑی لکیر اُبھر رہی تھی۔ اس کا دل انتہائی اطمینان کی حالت میں تھا۔ کسل اور تھکن بالکل نہ تھی۔ گھوڑا ابھی اسی طرح چل رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی سفر شروع کیا ہو۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سورج کی سنہری کرنوں میں پیتل کے منجھے ہوئے برتنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ حدِ نظر تک آنکھوں کے سامنے نیلے نیلے جنگل۔ ناشپاتیوں کے کنج۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پل۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار۔ جھرنے اور مختلف چھوٹے چھوٹے ندی نالے۔ جڑی بوٹیوں میں سے ہو۔تے ہوئے بڑے بڑے پتھروں سے سر پٹکتے۔ دودھیا جھاگ اٹھاتے شبنمی موتیوں کی پھوار بکھیرتے بھاگتے ہوئے نیچے وادی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دُور کوئی گنگناتا ہوا نیلا چشمہ۔ ترل ترل ترل ملل کی مدھم میٹھی اور مسلسل آواز کسی پجارن کے پائیل کی دلکش جھنکار کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ پہاڑوں کے سینوں میں اڑتی ہوئی پگڈنڈی ایک سفید تاگے کی طرح جس کا سرا کھو گیا ہو دُور تک چڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی بار اس پتلی سی شبنم آلود پگڈنڈی پر اس کا گھوڑا اچلتے چلتے بدکا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اور وہ گرتے گرتے بال بال بچا۔ کہیں جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں۔ کہیں جگہ اونچی گھاٹیاں تھیں۔ جن کے دامن میں کھڑے ہونے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بلندی پر ہے۔ اور یہ پگڈنڈی بڑھتی ہوئی اوپر ہی اوپر چلی جائے گی۔ جنگل کے گھنے سایوں اور کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے ہالوں میں چیڑھ کے نکیلے جھومر کسی نامعلوم مسرت کے زیرِ اثر تھرتھرا رہے تھے۔ معاً برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم سے مس ہوتا اور اس کا سارا جسم کانپنے لگتا۔ اس کا گائیڈ بھُربھُری چٹانوں اور اونچی نیچی بے ڈھب سی ڈھلوانوں اور پھیلاؤں کو نہایت بے پروائی سے پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں نہ کوئی ہچکچاہٹ تھی اور نہ اس کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی نظر آتی۔ وہ اسی طرح مست مست قدم اٹھاتا بڑھتا جاتا۔ گویا مدتوں سے انہی راہوں پر چل پھر رہا ہے۔ دفعتاً چند لمحوں کے توقف کے بعد کسی بڑے پتھر کے گرنے سے ایک ہولناک گڑگڑاہٹ بلند ہوتی جیسے ہزاروں توپیں ایک ساتھ چھوٹی ہوں۔ وہ گھبرا جاتا۔ اس کی رگیں اُبھر آتیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ جاتا۔ اس پر ایک خوف سا طاری ہو جاتا اور افسوس کرنے لگتا کہ وہ اکیلا کیوں آیا۔ ساتھ کے ملازموں کو پہلے کیوں روانہ کیا۔ وہ گھوڑے کی گردن سے چمٹ جاتا۔ اس کے بالوں میں مُنہ چھپا لیتا۔ اور آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر چلتا۔ وہ کوہستانی جو اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا گھوڑے کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دیتا "صاحب، آپ بالکل فکر نہ کریں، موٹر سڑک کے لئے پہاڑوں کو گرایا جا رہا ہے۔ پکی سڑک بن جانے پر خوب رونق ہوگی آمد و رفت بھی بڑھ جائے گی۔ صاحب پھر مزدوری کا بھی کال نہ رہے گا" اور وہ باتیں کرتے کرتے آگے بڑھتے جاتے۔ برائے نام محض اس بیچارے کا جی خوش کرنے کے لئے۔ اس نے اس سے کہا "میں تھک گیا ہوں، لو اب تم گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ میں پیدل چلوں گا۔"

"جی صاحب، کیا کہہ رہے ہیں آپ، میں تو آپ کا ادنیٰ خادم۔ حضور میرے حال پر رحم کر کے مجھے اپنا نوکر ہی بنا لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یہی سات آٹھ روپے تنخواہ ...

غریب ہوں۔ ایک بہن ہے۔ اس کی ابھی شادی کرنی ہے۔ اسوقت وہ بیچاری دعائیں مانگ رہی ہوگی کہ میں خیروعافیت سے گھر پہنچ جاؤں۔ مجھے جو مزدوری ملتی ہے وہ میں بہن کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ اب اتنے ہو گئے ہیں۔ پر سال تک اتنے ہو جائیں گے۔ جب دو سو پچاس ہو جائیں گے تو تمہاری شادی کر دوں گا۔ کیا کروں صاب، ہم دونوں بہن بھائیوں کو کبھی پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملی۔ اناج کتنا مہنگا ہے۔ سواری نہیں تو بکتا ہے۔ حضور یہاں پگڈنڈیوں پر کوئی مسافر مل جاتا ہے... کچھ زیادہ اُجرت دے دیتا ہے۔"

اور اس نے اس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کا بہت ممنون ہے۔ "میری یہ انتہائی خواہش ہے کہ کہیں نوکر ہو جاؤں۔ جناب میں نوکری کا کام اس عمدگی سے سرانجام دوں گا کہ حضور دن بھر مجھ سے خوش رہا کریں گے۔ میں یہاں کی تمام سڑکوں سے واقف ہوں۔ مجھے ریاست کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ میری مدت سے تمنا ہے کہ کسی آپ جیسے نیک صاحب کی نوکری کروں۔ بس حضور ہی میرے مائی باپ ہوں گے۔ اور میں حضور کا غلام۔ میری بہن جوان ہے۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ مجھے اس کا بھی غم ہے۔ صاب، مجھے تو آپ کی باتیں سن کر ہنسی آتی ہے، میں گھوڑے پر سوار ہو جاؤں اور آپ پیدل۔ آپ مجھ غریب سے مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں" وہ اپنے چہرے پر ایک زبردستی مسکراہٹ لاکر بولا۔

"جناب ذرا سنبھل کر بیٹھئے۔ راستہ بڑا پُرپیچ اور خطرناک ہے۔"

ان دنوں کوہستانی علاقہ میں ایک سب ڈویژن کا وہ انچارج تھا۔ پہاڑ کے دامن میں ہی اس کا بنگلہ تھا۔ اس کے بنگلے کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ جس پر ہر وقت دھوئے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لئے پھیلائے ہوتے۔ دائیں طرف نائب تحصیلدار صاحب کا چھوٹا بنگلہ اور نوکروں کے کوارٹر تھے۔ اور پرے پکے ہوئے کھیت، درختوں کا ایک جھنڈ۔ گنجان سبزہ۔ سوندھی سوندھی گرم خوشبو اور عنبر بیز ہوا۔ نیلوفر کی خاردار جھاڑیاں۔ کھلے ہوئے گلاب۔ نیل دھاری کی بیلیں اور سرسبز پتوں کے بازوؤں میں چہکتی ہوئی چڑیاں۔ اور پھڑپھڑاتی ہوئی بلبلیں۔ اور ان کی کوکو۔ اس کی عادت تھی کہ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر اس جھنڈ میں کسی یوکلپٹس کے درخت کے نیچے ایک آرام کرسی بچھوا کر بیٹھ جاتا اور وقت اونگھتے اونگھتے سو جانے میں گزر جاتا۔

تحصیل کے چھوٹے بڑے اور اونچ نیچ ذات کے لوگ صبح و شام اس کے بنگلے پر حاضری دینا اپنا معمول سمجھتے اور وہ بھی دل کھول کر ان سے باتیں کیا کرتا۔ کبھی اسے ان سے ملنے کی فرصت ہوتی اور کبھی زکام، سردرد یا پیٹ درد کا بہانہ ہو جانے کی وجہ سے ان سے مل نہ سکتا۔ اس کے ذہن پر یہ چیز اچھی طرح نقش ہو چکی تھی کہ جب لوگ اس کے سامنے جوتیوں کی جگہ پر نہایت ادب سے دونوں ہاتھ باندھے کھڑے ہو کر یا بیٹھے ہوتے اور بیٹھ کر ان کے گھٹنے جب کھینچے ہوئے لگے ہوتے اس کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی مبہم خوف سے کانپ رہے ہیں۔ اگر وہ ان سے یونہی سرسری طور پر وقت کاٹنے کے لئے کچھ پوچھ گچھ کرتا تو بمشکل ہی وہ اس کی بات کا جواب دے سکتے۔ اکثر بات کرتے کرتے ہکلا جاتے۔ وہ اس کے چہرے اور طرز تخاطب کو بڑے غور سے دیکھتے۔ سر ہلاتے جاتے۔ اور درمیان میں جی حضور کہتے رہتے۔ اور وہ جبراً اپنے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لے آتا۔ تاکہ وہ سمجھ لیں کہ ملک صاحب سب آدمیوں کیساتھ خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ سب انسان بنیادی طور پر ایک سے ہوتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی ہوا نہیں ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب وہ کسی تحصیل، قصبہ یا گاؤں میں تحقیقات کے لئے پہنچتا لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے وہ پھول جاتے۔ وہ اسے چاروں طرف سے سلام کر رہے ہوتے۔ اس کی دستار کا سفید طرہ ہوا میں لہراتا کسی جگہ پر پہنچتا تو بینڈ بجنے لگتا۔ لوگوں کو فرطِ مسرت سے آپس میں باتیں کرتے دیکھتا جیسے وہ اس کے غائبانہ مداح ہوں۔ یہ۔ نئے افسر بڑے نیک اور غریب دوست آدمی ہیں۔ حضور اتی باپ ہیں۔ بیسیوں اشخاص اپنی اپنی داستانیں لیکر اس کے پاس آتے۔ کوئی اپنے لڑکے کے لئے قانونگوئی اور نائب تحصیلداری کی فکر میں ہوتا۔ کسی کیساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی ہوتی۔ کوئی لگان اور انکم ٹیکس کی سختیوں سے نالاں ہوتا۔ کسی کو یہ شکایت ہوتی کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اس کے بعد کے کئی آدمیوں کو ترقیاں مل چکی ہیں۔ اس کی جب باری آتی ہے تو کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس قسم کی کوئی نہ کوئی داستان

اور زہری اس تک پہنچتی۔ مگر اس کے پاس ان سب کے لئے صرف ایک ہی جواب تھا۔ "ہوں! اس معاملہ میں پوری تحقیقات کی جائے گی۔" اور اس معاملے میں مزید تحقیقات کیا ہوتی؟ وہ اس واقعہ کو بالکل بھول جاتا۔ جب کبھی وہ تفتیش میں مصروف ہوتا۔ کوئی نہ کوئی اس کے کیمپ میں اچانک وارد ہو کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیتا۔

"جناب نائب تحصیلدار صاحب نے نمبردار کو خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو لگان کی خاطر خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ جناب عالی! عرض یہ کہ نمبردار صاحب کو تنبیہ ہو گئی ہے کہ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ حضور انور، اگر میری عرض نہ سنتے۔ تو خیر فساد ہو گیا ہوتا۔ بس آپ کی عنایت سے سارے کنبہ کی جان بچ گئی۔ آپ بڑے نیک دل ہیں۔ حضور مائی باپ ہیں۔ خدا حضور کی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔" اور وہ پہاڑی راستوں کو پھلانگتا ہوا دور دور تک نکل جاتا۔ بہت بہت رات گئے تک سفر کرتا رہتا۔ کبھی دائیں طرف غیر متوقع گشت کے لئے نکل جاتا۔ اور کبھی جنوب کی طرف۔ دوسرے افسروں کی طرح کبھی بیماری کا بہانہ نہ کیا۔ کبھی ٹال مٹول نہ کی۔ خواہ راستہ خراب خطرناک اور نہایت ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو۔ اندھیری رات ہوتی۔ پرشور ندی نالے بپھرے ہوتے وہ بدحواس نہ ہوتا۔

وہ شسپلو جا رہا تھا۔ راستہ نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ کبھی تو خوفزدہ ہو کر گھوڑے سے اتر بیٹھتا اور کبھی اس پھرتی سے ایک ہی جست میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا کہ گھوڑا مست ہو کر اچھلنے لگتا۔ وہ گھوڑے پر اوپر نیچے اچھل رہا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی گھوڑے کی ایال پر گر پڑے گا۔

"شسپلو یہاں سے کتنی دور ہے؟" اس نے کانگڑی گفتگو کی سادگی اور حالات سے دلچسپی سی محسوس کرتے ہوئے پوچھا

"صاحب، اب تو نزدیک ہے۔ اس کے قریب ہی ہمارا گاؤں ہے۔"

"تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟"

"شسپلو کے مندر سے تو شاید کوئی بیس پچیس منٹ کا پیدل راستہ ہے۔ مگر یہاں سے دو کوس سے کم نہ ہوگا۔"

"اور شسپلو کا مندر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"وہ دیکھو نا، اس گھاٹی کے قریب (انگلی اٹھا کر) وہ رہا شسپلو کا مندر پہاڑی کے دامن میں اس کا کلس نظر آ رہا ہے۔"

مندر کی عمارت معمولی سی تھی، پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ جس کی رنگت کائی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ دروازے کے گوشے میں ایک بوڑھا جھکا ہوا درخت جس کی کتنی لمبی لمبی ٹہنیاں بل کھاتی ہوئی لٹک رہی تھیں اپنی شکستہ شاخوں سے لیپ ٹاپ کی ہوئی دیواروں پر سایہ فگن تھا۔ سب سے اوپر کی شاخ پر ایک بانس پر جو کثرت بارش کی وجہ سے گدلا ہو گیا تھا۔ سیندوری رنگ کی بدوضع سی جھنڈی لہرا رہی تھی۔ کہتے ہیں آج سے دو برس پہلے یہاں کے لوگ بہت صاف دل اور دیانتدار تھے۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی کا نام بھی نہ تھا۔ لوگ اس طرح خوش وخرم رہتے تھے جیسے بہشت میں۔ گویا سید بولاتے وہ سماں بہت جلد بیت گیا۔ جب لوگ سونا چاندی اچھالتے ہوئے اس رہگذر سے بے دھڑک گذر جاتے تھے۔ اب آپ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کوئی بات آپ سے چھپی ہوئی نہیں۔ شسپلو کے مندر کے پجاری ہی کی بات ہے۔ ہر روز صبح سویرے اگر کوئی راہگیر اس پگڈنڈی پر گذرے تو اسے پوجا کی آواز سنائی دے گی لیکن آج کل سب لوگ اس سے خفا ہیں۔ کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بری نیت سے کیوں دیکھا۔ لاجو ایک دن مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لئے آئی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ملا جو ایک بیوہ ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ خدا جانے یہ بات کہاں تک سچ تھی۔ مگر اس رات گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے لاجو بھی تھی۔ پنڈت سروپ [illegible] نے پوچھا "کیوں لاجو۔ کیا یہ بات درست ہے کہ پجاری نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟" اور لاجو نے جو شرم سے ڈوبتی جا رہی تھی کچھ ہوں ہاں سا جواب دیا۔ کہ پجاری نے کیونکر اس کا ہاتھ پکڑا اور گلے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک نے کہا "آج اس نے لاجو کا ہاتھ پکڑا کل کسی اور کا آنچل کھینچے گا۔ اب پجاری کے خلاف مندر سے نکل جانے کا نوٹس ضلع کی تحصیل میں دیدیا گیا ہے۔"

وہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ کوہستانی نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام کو تھام لیا۔ اور وہ اس کے آگے آگے دھیمے دھیمے قدم اٹھانے لگا۔ اس کے ہاتھ کبوتروں کے نرم نرم سفید پروں جیسے ریشمی ریشوں کو چھو رہے تھے۔ اور انگلیوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی لڑکی کے شگفتہ خوشبو سے بسے ہوئے گھنیرے سیاہ اور ریشم کے تاروں کی طرح نرم و نازک زریں بالوں سے مس ہو رہی ہوں۔ جیسے رتن اس کے پاس ہی بیٹھی ہو مسکرا [illegible]

اور گہرے ہلکے سنہری رنگ کا نور جھلملا رہا ہو۔ گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا نام رتن تھا اس سعید، جس کا سر فرشتوں کا سا۔ اور جس کا جسم موسیقی کی سی لے پر ٹھیک رہا ہوتا۔ اور جب وہ اسکے سامنے ہوتی تو رعب حسن سے وہ ٹھٹھر جاتا۔ اسے اظہار رغبت کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ لیکن وہ ایک سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا جیسے وہ اس کا غلام ہو۔ اس کی ہر حرکت سے اس کی نرمی بردباری اور بہت ملائمت کا پتہ چلتا۔ اور اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اضطرابی اور محبت کا راز کھل جاتا۔ وہ کچھ جھجکتا اور اس کے بعد کانپتے ہوئے گھٹنے ٹیک دیتا اور رتن کے دل پر جیسے اس کا ذرہ بھی اثر نہ ہو۔ وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوریاں چڑھا کر منہ پھیر لیتی۔ یا ایسی زہر خند ہنسا کرتی۔ ایسی سرد مہری کی ہنسی جس سے اس کی امیدیں خون ہو جاتیں۔ وہ ایسی بے مہری کی باتیں کرتی اور اس کے عجز و انکسار کا ایسا مضحکہ اڑاتی، کہ اس کا دل ٹوٹ کر رہ جاتا۔ ایک دفعہ جب وہ بہت اداس اور مایوس سا تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ واقعی وہ رتن سے نہایت دلفریب باتیں کر رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبا بھی رہا ہے۔ وہ اس سے اتنا نزدیک ہے، کہ اسے اس کی سانس اور جسم کی حرارت بھی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اس کے ہاتھوں کو چوما اور اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ رتن نے خلاف توقع مزاحمت کی بالکل کوشش نہ کی۔ اس کے ماتھے پر بے ترتیب تیوریاں نہ پھیلیں۔ وہ زہر خند ہنسی مفقود ہو گئی۔ وہ بے انتہا مسرت کا ایک ایسا لمحہ جو دنیا میں بہت ہی کم انسانوں کو میسر ہوتا ہے۔ ایک جنت کا سا لمحہ، ایک دیوانہ بنا دینے والا لمحہ ایک ناقابل فراموش لمحہ۔ رتن یاسمین کے پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ تھا جو ابھی ابھی تیار کیا گیا ہو۔ نیلا آسمان، زمین کی سوندھی خوشبو، اور عورت کی چھلکتی ہوئی جوانی، جوان اور خوبصورت رتن، وہ اس کے بھیگے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر اکثر پاگل ہو جاتا تھا۔ اور اس چاندنی رات میں وہ اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے عمر خیام کی ایک رباعی۔ چاندنی رات، بہتا ہوا پانی، حسین سبزہ۔ رتن کے چہرے پر ایک نور تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک بات تھی۔ ایک سرور تھا۔ ایک مسکراہٹ سی تھی، شبنم کے قطروں کی طرح پر فریب اور دلکش۔ پھر ایک دم اس کے سرخ سرخ ہونٹوں پر جو ... اور

اس کے دو چھوٹے پتلے سے ہونٹ خفیف سی حرکت کرتے ہوئے شوخ شفق کی طرح گہرے اور سرخ ہو گئے۔ اس کی چال میں تیزیاں لہرا رہی تھیں۔ اس کی پرسحر آنکھیں جیسے ہزاروں جام ہزاروں خم انڈھائے جا رہی تھیں۔ اور وہ، نیم وا ہونٹوں سے پیتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جیسے تخیل میں پرواز کر رہا تھا۔ جس کی روحانی فضا اور ابدی موسیقی کی خواب آور لے میں اس کے احساسات منظم ہو رہے تھے۔ اور چاند آسمان میں نہیں زمین پہ اتر آیا تھا۔ اس کی روح کا ہر تار کسی خوش آئند نغمے سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ شاید یہ خواب کی دنیا تھی۔ مسرتوں کی انتہا تھی وہ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ کبھی گلو چھپانے لگتا! کبھی سبز ہد ہد بول اٹھتے کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی پرندہ اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں، چاندنی راتیں کئی دفعہ بسر کی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی، وہ بہاریں سبزہ و گل کی بہاریں تھیں، یہ بہار —— دل کی بہار تھی۔

اور پھر جس طرح کوئی بچہ کسی ڈراؤنے اور وحشتناک خواب میں بعض اوقات اچانک رونے لگتا ہے اسی طرح وہ گویا جاگ اٹھا، ایک بے بس کی طرح —— مجروح افکار —— حواس باختہ بے حس، ناکام محبت۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے [illegible] کی مورت وہ بہار تھی جو زندگی کے ہنگامے، نفسی نفسی اور پیہم کشاکش میں کہیں کھو گئی۔ بہار کا موسم گزر چکا تھا، خزاں کا موسم بڑھا چلا آ رہا تھا۔ یہ موسم بڑا نحس ہوتا ہے۔ اس کی چہیتی امی جان سے لاڈلے ابا جان، اور سب کچھ برداشت کرنے والا بوڑھا حسن جو اسے ابا جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا خزاں ہی کے موسم میں فوت ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ناگہاں ایک ٹنڈ منڈ درخت پھیل گیا جس کے زرد، پژمردہ، خشک، بے جان سے پتے آہستہ آہستہ جھڑ رہے تھے۔ اس نے جانا کہ جوں جوں یہ پتے کم ہو رہے ہیں، ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ نہ سمجھ سکا کہ اس ٹنڈ منڈ درخت کے چاروں طرف سرخ کنکری کیوں ہے۔ یہاں ویرانی کیوں بڑھ گئی ہے۔ فضا کا ہر ذرہ کیوں اداس و غمگین ہے۔ ایک خاموشی، ایک بے ہوشی، ایک نا امیدی، ہوا کا ایک جھونکا آتا خشک شاخوں سے لٹکتے ہوئے پتے اپنی پوری قوت سے مدافعت کرتے، شاخوں کے ساتھ ناچتے، اور آخر ایک ایک کر کے ٹوٹتے، اور فضا میں لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر تڑپنے لگتے۔ درخت اپنی برہنہ شاخیں اٹھائے آسمان

فنی حیثیت سے اُن میں خلوص، شعریت، ادبیت، لفظ و معنی کا توازن ہونا چاہیئے۔ بس اگر یہ ہے تو مذہب و ملت کا سوال نہیں۔ مولانا نے مذہب کی بحث پیدا کر کے بہت سے لوگوں کو ترقی پسندی سے بدظن کرنا چاہا ہے لیکن قومی اور بین الاقوامی حالات ایسے ہیں کہ لوگ زندگی کے اصل مطالبات کو سمجھیں گے۔ اگر کوئی اشتراکی ترقی پسند ہو اور اپنی ادبی کاوشوں میں اشتراکیت کی اشاعت کرتا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ترقی پسندی اور اشتراکیت مترادف ہیں۔ ترقی پسندی زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں پائی جا سکتی ہے۔ چونکہ آج کل نئے ادب کے سلسلہ میں اس کا تذکرہ آتا ہے اس لئے اسے نئے ادب ہی کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے لیکن مقصود یہ نہیں ہوتا کہ دوسرے ادوار حیات میں ترقی پسندی سے انکار کیا جائے۔

مَیں مولانا سے درخواست کروں گا کہ موصوف کبھی اپنے ادبی عقائد کا واضح اثباتی تذکرہ، دوسروں پر طنز و تعریض کے وار چلائے بغیر کریں تو ہم سب کو فائدہ پہنچے۔

خط بہت طویل ہو گیا، مَیں معافی چاہتا ہوں، لیکن اس سے کم جگہ میں بات صاف نہ ہوتی۔ مجھے مولانا اختر علی صاحب کے مضامین پڑھ کر بار بار یہی محسوس ہوتا ہے کہ موصوف عینیت پسند ہیں، موصوف کی فلسفیانہ اور منطقی توجیہیں اسی افتادِ نظر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ حقیقتوں کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں عینیت پسندی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ حقیقتوں کا صحیح ادراک کر سکے، اُن کی حرکت اور اُس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو واضح طور پر سمجھ سکے۔ مَیں جانتا ہوں کہ موصوف کو یہ باتیں نہ تو اچھی معلوم ہوں گی اور نہ صحیح لیکن مَیں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ساری دشواریاں اسی وجہ سے ہیں کہ موصوف تغیر کو عینیت کے فلسفہ سے سمجھنا چاہتے ہیں۔

ابھی چند دن ہوئے، مَیں نے ایک کتاب پڑھی What is Philosophy (فلسفہ کیا ہے؟) لکھنے والا ایک امریکن ہے Howard Selsam (ہوورڈ سیل سیم) اس کتاب میں اس مسئلہ پر بڑی دلکش بحث کی گئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ مولانا بھی اسے پڑھیں اور آپ بھی۔ کتاب ڈھائی روپیہ میں کلکتہ کے ماڈرن پبلشرس کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ختم کرتے کرتے ایک بات اور جو اس بحث سے تعلق نہیں رکھتی ——— آپ کے یہاں جو امیر مینائی کے شعر کی بحث چھڑی ہوئی ہے اُس میں جیسی موشگافیاں کی جا رہی ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔ لیکن میرے خیال میں امیر نے شیون لکھا ہے اور شعر کا مطلب یہ ہے ——— جب زخم لگانے والے ظالم نے زخم لگا کر یہ دیکھا کہ اس کی شکل دہن کی سی ہو گئی تو اُس کے مجرم ضمیر کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں یہ دہن نالہ و شیون کر کے میرے ظلم کا پردہ فاش نہ کر دے اس لئے اس نے انہیں سینے کا حکم دیا۔ زخم نے کہا میں واقعی دہن نہیں ہوں کہ شیون کر سکوں مجھے سلوا کر کیوں اور تکلیف پہنچائی جا رہی ہے، میں بالکل بے منہ رہوں۔ اب اس میں جو خرابی رہ جاتی ہے وہ یہی کہ جب زخم نے یہ کہہ دیا کہ ہم قابلِ شیون نہیں ہیں، یعنی بول دیئے تو پھر وہ شیون بھی کر سکتے ہوں گے لیکن اوّل تو اتنی دُور تک شاعر کا ذہن نہ گیا ہوگا دوسرے یہ کہ اسکی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے کہ اُس دہن زخم نے "زبانِ حال" سے یہ کہا۔ بہرحال شیون کے علاوہ دوسرے الفاظ سے معنویت کا خون ہوتا ہے۔ اور جو مطالب پیش کئے جا رہے ہیں وہ درست نہیں معلوم ہوتے۔

میری صحت اچھی نہیں، اگر آپ دُعا کے قائل ہوں تو صحت کی دُعا کیجیئے۔

نیازمند
سید احتشام حسین

محمد ابراہیم مدہوش

روایات اور جدید تخیلِ شعری

(۱)

ابھی کل تک جو خوبیاں ادبی روایات بہ حیثیاں خود کو ادبی تقریظ کی ماہر خیال کرتی تھیں آج جدید شاعری سے بوجہ تنفر منہ موڑے بیٹھی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ رجحان محض ایک طرح کی نمائش ہے ——— شاعری کا جوہر، اپنی حقیقت زندگی کی تشریح کا احساس مسرت۔ بعض جو اس سے زیادہ مخالف نہیں اور شاعری کی اس جدت کو "شنٹ" سے زیادہ حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہیں ان کے لئے بھی دلچسپی و "غیر مخلوط استحسان" کے ساتھ اس کا تصور ممکن نہیں۔ شاعری کی اس کامل جدت کے باوجود یا اس کے نومولود ہونے کی وجہ سے وہ اسے "eccentric" محض اور بدقطع ہی خیال کریں گے۔ دنیا کی تاریخ میں اگر کبھی قدیم روایات کے بندھنوں کو توڑنے اور عام و مشترک معیارِ فہم و مسرت کو بدل ڈالنے کی کوئی والہانہ اور ہیجانی کوشش کی گئی ہے تو وہ ان شاعروں کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔ مروجہ اقدار و معیار سے اس بے رحم گستاخی کا وہ ماتم کریں گے کیونکہ اس نے شاعری کی بنیادیں کھوکھلی اور اس کی کامیابی کے توقعات کو بہت کم کر دیا ہے۔

جدید شاعری بظاہر حد سے زیادہ غیر روایاتی قسم کی نظر آتی ہے مگر اس کی تائید اور اس کی تخلیق کے جواز میں جو تنقیدی نظریات پیش کئے جاتے ہیں ان کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہم اپنے فیصلہ کی آسودہ خاطری سے چونک جائیں گے کہ ارے ——— ؟ ان میں اور روایات میں اتنا زور ؟" ہم سے کہا جاتا ہے کہ شاعری کو زندگی سے وابستہ کرنے کے لئے ہی موضوع، اسلوب بیان اور تکنیک میں اس جدت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح اگر کوئی انحراف عمل میں آیا ہے تو وہ انحطاطی روایت سے ہے۔ اس کا مقصد حقیقی موجود اور زندہ روایات کے مرکزی چشمہ کی بازیافت ہے جس کے ذریعہ زندگی اور شاعری کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب لایا جا سکے موت اور زیست کا مقابلہ کیا جا سکے۔

جدید شاعری کو اب تک چند طبقات میں وہ وقعت اور اہمیت نصیب نہیں ہوئی ہے جس کا یہ مطالبہ کرتی ہے۔ وجہ اس کی شاید یہ ہے کہ تہذیب کے دعویدار اس کی اہمیت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن جدید تنقید کو احساسِ برتری کی مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کر دینا اتنا آسان نہیں۔ اس کا ہم سے اور اس دور کے تمام انسانوں سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ یہ تنقید شاعروں کے کسی خاص اسکول کا منشور ہے نہ کسی خاص تحریک کا عقیدہ۔ دنیا نے اب تک جتنے ادب کی تخلیق کی ہے۔ یہ اس کو اجتماعی حیثیت سے اس زندگی کے ساتھ دیکھنے کی کوشش ہے جسے کوئی صنفِ ادب پیش کرے۔ زندگی کی کسی مخصوص شکل، اور اس سے تخلیق شدہ ادب، کسی خاص نمونۂ زندگی جو عام سُبک رفتاری سے خلاصی حاصل کر چکا ہو اور کسی دوسرے نمونۂ زندگی، ایک ادبی کاوش اور دوسری ادبی کاوش کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی یہ ایک سعیٔ جمیل ہے۔

اس صدی کے آغاز بلکہ اس سے بہت عرصہ پیشتر سے یہ آواز یورپ میں برابر سنائی دے رہی ہے کہ زندگی غیر حقیقی بنتی جا رہی ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم تک مبہم شکوہ کے اس زخم کو برابر رستے دیا جاتا رہا۔ اس کے لئے کوئی مرہم تجویز نہ ہوا تھا کہ جنگ کے تلخ حقائق نے شاعروں کے جذبات کو ابھارا۔ ان کو زندگی کے خدوخال سے روشناس کیا اور انہوں نے ادبی مہم کے آغاز کا بیڑا اٹھا لیا۔ زندگی جیسی وہ بسر کر رہے تھے یقیناً غیر حقیقی تھی مگر اس کی وجہ دماغی روایات کے سمی بخارات نہ تھے جنہوں نے ان کے نزدیک دھڑکتی ہوئی حقیقت پر پردہ ڈال دیا تھا۔ پردہ کھینچ لیا گیا اور ——— اور اس جگہ تھے جنگ کے تلخ حقائق ——— روح آفاقی کی بیگور و کفن لاش ——— انسانیت کی بے گور و کفن لاش ———! مگر یہ تو وہ حقیقت نہ تھی جس کے وہ تلاشی تھے۔ اور جیسا کہ ہمیشہ سے دستور رہا ہے یہاں بھی مرضی، پسند اور انتخاب کا سوال تھا۔ اور کیا آج سے پہلے کا اشتیاقِ حقیقت مرضی و انتخاب کا معاملہ نہ رہ چکا تھا؟ اور کیا یہ،

جبلی و خام حقائق، حیوانی سطح پر جسمانی تجربہ اور سیاسی سطح پر ذہنی تجربے کے شغف کا نام نہ تھا؟ —— اب اس کا اندازہ کرلیا گیا کہ وسواسی انتخاب کی راہ تو محض جزوی حقیقت تک ہی پہنچا سکتی ہے۔ موجودہ زندگی کی نقش گری میں ایک ہوشمندانہ نقطۂ نظر اور ایک داخلی میزانِ پیمائش کی ضرورت ہے۔ اور اس میزانِ پیمائش کے معیار کی تصدیق وقت اور تجربہ کے ہاتھوں ہونی چاہیے یا بالفاظِ دیگر اسے اپنی سند روایت سے اخذ کرنی چاہیئے۔

گویا حقیقت نہ اس زندگی میں ہے جو بسر کی جاتی ہے نہ صرف موجودہ، مروجہ و فرسودہ جذبات، عقائد، مصلحت اندیشی اور طریق کار کی گستاخ پردہ دری میں۔ اس کے خاکہ کی دریافت کے لئے ایک کشادہ و تربیت یافتہ تخیل کی عرق ریزی یا صنعت کی ضرورت ہے۔ اور تخیل کی صرف اسی ایک طرح تربیت کی جا سکتی ہے کہ دنیا کی تمام عظیم روایات کے ساتھ اس کا ربط پیدا کیا جائے۔

روایت کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے ہوگا۔ جو ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مضمون "Tradition & Individual Talent" سے اخذ کی گئی ہیں:۔

"ہم شاعر اور اس کے پیش روؤں کے فرق پر بڑے اطمینان سے بحث کرتے ہیں۔ ہم کسی ایسی چیز کی تلاش میں جدوجہد کرتے ہیں جس سے لطف اٹھانے کے لئے اسے منفصل کر دیا جائے۔ درآنحالیکہ اگر ہم شاعر کے احساس تک اس یک طرفہ میلانِ خاطر کی بندشوں سے دور ہو کر پہنچنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نہ صرف بہترین بلکہ اس کی تخلیقات کے انفرادی حصص کی اکثریت وہ ہے جن میں گذرے ہوئے شعراء اس کے اسلاف، اپنی بقاء و حیاتِ جاوِدانی کا ادعا بڑی مضبوطی سے کرتے ہیں —— اور میرے پیشِ نظر عنفوانِ شباب کا زود تاثر پذیر زمانہ نہیں ہے بلکہ کامل بلوغ کا زمانہ۔"

—— (٢) ——

مگر آخر روایت سے مراد کیا لی جائے؟

مندرجہ بالا سطور میں جس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ صنفِ ادب سے متعلق ہے۔ اگر ہم ان تمام عظیم روایات کا محض شمار ہی کرلیں جو اکثر موضوعِ گفتگو بنی رہتی ہیں تو ہم پر یہ بات فوراً روشن ہو جائے گی کہ ان سب کی فطرت جداگانہ ہے اور یہ کہ ان کی (Classification) درجہ بندی کی جا سکتی ہے بعض مذہبی روایات ہیں، بعض ادبی، بعض سیاسی و سماجی اور بعض حکیمانہ و فلسفیانہ بھی۔

اس ضمن میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نقطۂ نظر کا معائنہ ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ ٹی۔ ایس ایلیٹ بیسویں صدی میں انگریزی ادب کا سب سے بڑا نقاد تسلیم کیا جاتا ہے اس کی ادبی زندگی کے مندرجہ ذیل حقائق ہماری اس تفتیش کو اور زیادہ اہم اور مفید بنا دیتے ہیں یہ ایلیٹ ہی تھا جس نے سب سے پہلے جدید شاعری کو اس کی صدی کی مبہم شکل سے نجات دلا کر اسے ایک متعین ہیئت عطا کی۔ یہ اس کی شاعری اور تنقیدی نظریات ہی تھے جنہوں نے شاعروں کی نئی پود کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیا۔ مگر روایات پر اس کے غیر معمولی زور کے خلاف اس کے مخالفین تو خیر الگ رہے اس کے پیروؤں کی طرف سے بھی بڑی شدت کے ساتھ احتجاج کیا جا رہا ہے۔

"اسٹیفن اسپنڈر" ایک جدید شاعر و نقاد اپنی کتاب —— "Destructive Element" میں ایلیٹ کی حیثیت کی بے ضابطگی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آئی۔ اے۔ رچرڈز جیسے قابل نقاد کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ حقیقی ایلیٹ "The Hollow Men" اور "Waste Land" کا ایلیٹ ہے۔ جہاں وہ ایسا شاعر نظر آتا ہے جس نے تخریبی عنصر (Destruction Element) کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ اسپنڈر کے نظریہ کے مطابق اس تخریبی عنصر کے سمندر میں استغراق ہی جدید ادب کی کسوٹی ہے اور اس مقالے میں اس نے اس رجحان کا نزول بر رنگ سلبیہ ادبی ہیئتوں سے کر اس زمانے تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ چیز آ سکتی ہے کہ وہ ایلیٹ کی روایت پرستی میں ذاتی ناپسندیدگی اور بدظنی کو شہ دینے کا دیدہ ریزانہ اندازہ اس کی بعد کی رجعتِ شعری کے نشانات جیسے انگلیکت کا لنگ پڑھنے کی کوشش کس طرح دریافت کرتا ہے۔

لیکن اس کا یہ کہنا بالکل مناسب ہے کہ ایلیٹ کی استعمال الفاظ مبہم اور غیر واضح، یہاں تک کہ کسی حد تک ... نے بھی خود کوئی واضح تشریح پیش نہیں کی ہے۔ وہ ایک ... "Classic poet" (جو روایت پر اپنا انحصار رکھتا ہے) اور "poet of genius" (جو روایت کو درخورِ اعتنا نہیں

سمجھتا ہے کہ اول الذکر کو عمداً غلط سمجھتا ہے اور مؤخر الذکر کو ایک ایسی رائے کا ذمہ دار قرار دیتا ہے جو یقیناً اس کی ذاتی رائے نہیں ہے۔ مثال یہ رائے کہ "روایت [illegible] شاعری کی ناگزیر شرط ہے"۔ اس کا یہ کہنا بھی بالکل [illegible] ہے کہ اگر شاعری کی خوبی کا انحصار تمام تر اسی روایت پر ہے جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ تو شاعروں کے متعلق سب جو سرو روایت پرستی کے کم و زائد درجہ پر مبنی ہوں گے۔ [illegible] یہ ایک ایسا [illegible] اور معیار ہے۔ جس کو [illegible] کسی کے درجہ روایت پرستی کی تحدید کبھی نہیں کی جا سکتی۔ اس نکتہ پر اختلافِ رائے ہو سکتا ہے لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جب تک لفظ "روایت" کی صاف اور معین الفاظ میں تشریح نہیں کی جاتی ایلیٹ کے مندرجہ ذیل فقروں کی قسم کے بیانات پر سوالات کی بوچھاڑ ہوتا یقینی ہے:-

"ایک پختہ کار شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نہ صرف "معرضِ التواء" میں پڑی ہوئی روایت کو برقرار رکھے بلکہ روایت کی انتہائی ڈوریوں کو از سرِ نو بٹے۔ جتنی ڈوریاں بھی اس سے بٹنا ممکن ہوں۔"

یہاں ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ کونسی قسم کی روایات ہیں؟ اس سے پیشتر روایات کی جن اقسام کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے کیا کوئی قسم پختہ کار شاعر کی غرض و غایت کو پورا کر سکتی ہے؟ دو شاعر جو یکساں [illegible] ہیں ان میں سے اگر ایک مقابلتاً کم درجہ کی روایات کا انتخاب کرے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا کسی "sense of time" یا کسی عام حساس آدمی کے لئے مروجہ روایات میں سے کم از کم چند سے کسی نہ کسی حد تک بے خبر رہنا ممکن ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ روایت رکھنے والے شاعر اور روایت نہ رکھنے والے شاعر کا فرق کیوں؟ اور آخر میں شاعر کی روایت پرستی اور مقبولیت کا ثبوت کیا ہوگا اور اس کی تحدید کیسے ہوگی؟

ایلیٹ نے اپنی پوزیشن کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے "After Strange Gods" میں اس کی یوں وضاحت کی ہے:-

"میرے نظریہ کے مطابق روایت، مذہب کی اہم ترین رسوم سے لے کر اجنبی کے ہمارے غیر طبعی خیر مقدم تک ان تمام مستقل و عادی افعال و عادات اور رواج پر مشتمل ہے۔ جو ایک ہی جگہ رہنے والے ایک ہی قسم کے افراد کے باہمی خون کے رشتے کو ظاہر کرتے ہیں ..... آبادی کو متجانس و ہم قسم ہونا چاہئے ..... جہاں دو یا زائد کلچروں کا وجود ہوتا ہے تو وہاں اس کا اندیشہ ہے کہ وہ بڑی تندہی کے ساتھ خود آگاہ ہو جائیں یا باہم آمیزش سے دونوں مصنوعی بن جائیں۔"

اس میں نہ صرف ایک آگاہی ——— کثرتِ روایات کی نظر آتی ہے جس کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے بلکہ روایات کا متناقض اور جامع تنوع بھی دکھائی دیتا ہے مگر اسے نہ تو وہ قرینے میں رکھ سکتا ہے نہ کسی نام سے موسوم کر سکتا ہے۔ لہذا اس بیان کے باوجود بھی وہ سوالات تشنۂ جواب ہی رہتے ہیں۔

بالآخر ایلیٹ "تاریخی احساس"، "وقت کا احساس" جیسے الفاظ کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اس ضمن میں ایک طویل اقتباس درج کرنے کے لائق ہے۔ روایت اب بھی ایک [illegible] شکل میں اپنا ظہور کرتی ہے جانے کے لئے تیار مگر ایک معزز راہِ خروج تلاش کرنے سے معذور۔

"اگر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہونے والی روایت کا یہی مفہوم ہے کہ چند سال پیشتر کی نسل کی پیروی اس کی کامیابیوں سے اندھی اور بودی وابستگی سے کی جائے تو ایسی روایت کی قطعی طور پہ تائید نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے ایسے کئی دھاروں کو ریت میں خشک ہوتے دیکھا ہے۔ جدت اعادہ سے بہتر ہے۔ روایت کی اس سے کہیں زیادہ وسیع اہمیت ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملا کرتی۔ اور اگر تمہیں اس کی خواہش ہے تو اسے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد حاصل کر سکتے ہو۔ اس میں سب سے پہلے "تاریخی احساس" شامل ہے جو ہر اس شخص کے لئے ناگزیر ہے جو اپنے پچیسویں سال کے بعد تک شاعر رہے۔ تاریخی احساس نہ صرف گذرے ہوئے زمانے کی "گذشتگی" کا شعور ہے، بلکہ حال کی "برقراریت" کا بھی۔ تاریخی احساس انسان کو محض اپنی اس نسل کے لئے لکھنے پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی ہڈیوں میں نشو و نما پا رہی ہے بلکہ اس احساس کے ساتھ لکھنے پر مجبور کرتا ہے کہ یورپ کا کل ادب "ہومر" کے زمانے سے، اور اس میں اس کے اپنے ملک کا تمام ادب ہم عصر وجود رکھتا ہے اور ہم عہد نظام کی ترتیب دیتا ہے۔ یہ تاریخی احساس جو "عارضی و دائمی" کا احساس ہے یہی مصنف

کو رومانی بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو اس حقیقت سے بھی بڑی شدت سے واقف کر دیتا ہے کہ "معاصرت" میں اس کی جگہ کیا ہے۔"

(۳)

گلبرٹ مورے (Gilbert Murray) روایت کے اس نمونے کا زیادہ واضح تصور پیش کرتا ہے جسے ایلیٹ منفصل کرنے میں ناکام رہا۔ "Religo Grammatici" میں وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ "مغربی دنیا کی تہذیب نسب اور برادری کا اتحاد ہے۔" مطلب اس کا یہ ہے یورپ کی تمام عظیم روایات وقت اور جگہ کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی الگ کیوں نہ ہوں باہم مربوط ہیں۔ پھر بھی اسے انگلینڈ میں ایک ایسی روایت کے وجود کا اقرار کرنا پڑتا ہے جو قدیم الایام سے چلی آ رہی ہے، ہر طرح سے آزاد ہے اور کسی چیز سے متاثر نہیں۔ وہ کہتا ہے:-

"ہمیں اس کا بے تکلفی سے اقرار کر لینا چاہیئے کہ تمام انگریزی ادب میں یوں کہیئے کہ "ورناکیولر انگریزی تخیل" کا رجحان پایا جانا ضروری ہے جس کی چند لہریں ــــ حسن و تازگی بخشنے والی لہریں مشکل ہی سے مختلف ہوتیں اگر تمام رومانی ادب ہماری روایت کے لئے سربمہر کتاب بن جاتا۔"

اور اگر ہم اپنے احاطۂ تصور کو کسی خاص ملک کے حدود سے باہر لے جائیں تو ہمیں پھر اسی طرح سے اس کا بے تکلفی سے اقرار کرنا پڑیگا کہ تخیل اور احساس کے چند نقوش تمام انسانی تہذیبوں، کلچروں اور ملکوں میں شناخت پذیر اور قابلِ تسلیم ہیں۔ نقوش ــــ جو مستقل اور کائناتی ہیں ــــ نقوش ــــ جو کچھ اس طرح آپس میں باہم رشتے ملیں کہ ان کے رابطے سے ہمارا ذہن دوام، تواتر اور پیہم روانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ روایت نسلِ انسانی بحیثیتِ اجتماعی ــــ!

اب پوری پوزیشن کو واضح کرنے کیلئے آیئے ہم ایک دوسرے زاویۂ نظر سے اپنی تحقیق کی ابتدا کریں۔ ہاں تو روایات کی کونسی لازمی خصوصیات ہیں؟ روایت کس طرح جنم پاتی ہے؟ کہاں تک اور کس طرح شاعری کو روایات سے استفادہ کرنا چاہیئے؟ روایت کی کونسی قسم یا کونسی اقسام کی شاعری کو دوسری اقسام سے زیادہ وقعت دینی چاہیئے؟

یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک مجلسِ قانون ساز، تعلیمی ادارہ، تجارتی انجمن بھی اپنی چند ذاتی روایات کا اعلان کرتی ہے ہمارے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ لفظ "روایت" کے استعمال کی حد بندی کر دیں تب ہی تنقید نگاری یا اس سے کچھ نہ کام لے سکیں گے۔ لفظ "روایاتی" کو اپنے نزدیکی پیش روؤں کے نقشِ قدم پر چلنے والے شاعر کیلئے بطور کلمۂ فصیحت استعمال کرنے کی ہمت افزائی نہ کرنی چاہیئے۔ اسکو محض کسی طریق یا ہیئت کے بارے اور ساری وجود پر دلالت کرنے کیلئے بھی استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ وقت اور جگہ کی حدبندیاں خواہ کچھ ہی ہوں روایت کو انسانوں کی پوری جماعت کی زندگی اور زندگی کے ایک پورے نظریہ کی ترجمانی کرنی چاہیئے اور بعض فیشن، عقاید و جذبات، سلسلۂ تخیل اور اصول کے اجتماع کو پیش کرنے سے اسوقت تک گریز کرنا چاہیئے جبتک وہ پرکھے جانے کے بعد ایک ہی زاویہ اختیار نہ کر چکے ہوں۔

گویا روایت کی لازمی خصوصیات میں سب سے پہلے اس کا تواتر ہے۔ پھر اس کا سلسلۂ مفہوم اور اہمیت، اس کی تحویل منفصل، ذیل کی طرف نہیں ــــ تعقلی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی، سیاسی وغیرہ ــــ بلکہ اشخاص متعلقہ کی زندگیوں کی ہر سطح میں ان نمونہائے ردِ عمل کی طرف جو ایسے عام و مشترک طریقِ عمل، وجدان اور اقدار پر دلالت کریں جنہیں جماعت اور اسکی وابستگی کی تشکیل کا ذمہ دار قرار دیا جا چکا ہے۔

روایت کی لازمی خصوصیات کے اس تصور کو قبول کرنے کے بعد ان کی درجہ بندی کرنے کا امکان اپنی جگہ اب بھی قائم رہتا ہے کیونکہ تہذیبی، اخلاقی یا مذہبی کسی بھی عظیم روایت کو کلچر، اخلاق، مسلک یا فلسفہ کے پرے جا کر اس پوری زندگی کو گلے لگا لینا چاہیئے جس سے یہ متعلق ہے مثلاً ہندوستان میں "Viashnavism" اپنے جنم کیلئے کسی مذہبی الہام کے زیر بار ہو اور ہم اسے زیادہ تر ایک مذہبی روایت کے نام سے موسوم کرنے پر متفق ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی تشویق کے مرکزی قلب کی جولانیاں ہر جانب پھیلتی ہیں جس سے Viashnavas کی "رسائی زندگی" تک میں ایک یکتائی حلول کر جاتی ہے۔ ایک ایسی یکتائی جس نے نہ صرف مذہبی رسم و رواج بلکہ ادب اور کلچر میں اپنی راہِ اظہار تلاش کی۔ ایک زندہ روایت کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ یہ اپنے اصلی چشمہ کے کناروں کے اوپر تک پر ہو کر بہہ نکلے اور اس زندگی کے پورے حدود کو سیراب کر دے جہاں اس کی تخلیق ہوئی تھی۔

مذہبی عقیدہ، اخلاقی اصول، ذہنی نظام ان میں سے کوئی ایک بھی روایت کی بنا ڈال سکتا ہے مگر ان میں سے خود کوئی روایت نہیں بن سکتا جب تک چلن اختیار نہ کر چکا ہو اور آدمیوں کی کسی جماعت کے دل و دماغ، تخیل و تصور اور جذبات و احساسات کے اندر اپنی

جڑیں نہ پھیلا چکا ہو۔ یہی کچھ روایت کو شاعروں کے لئے جو زندگی کا سودا کرتے ہیں بہت زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ روایت میں انہیں زندگی عریاں منکشف اور مجسم ہو کر سامنے نظر آتی ہے۔ روایت سے الگ انہیں "فعلی زندگی" [illegible] سکتہ کار شاعر اپنے ذاتی تجربے سے سیکھتا ہے کہ [illegible] زیادہ عقیدہ، قبا ترا اور ترنگ سے زیادہ بصیرت [illegible] کے عقیدہ سے زیادہ نبی کا عقیدہ، موت قلیل کے عقیدہ سے زیادہ [illegible] کے اعتقاد کی کس طرح "قدر" کی جائے اور چونکہ [illegible] قدامت پسندوں کی وکالت یا اصلی بصیرت شعری کی [illegible] ہے بلکہ شاعر [illegible] قوت کی تحلیل اور جوہر شعری کو راس آنے والے حالات کی توضیح ہے تو شاید اب ہم ایلیٹ کے اس نظریہ سے اتفاق کر لیں کہ Genius کے مکمل طور پر خود آگاہ ہونے کیلئے اس کی [illegible] قوت کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے — ہم رنگ و ہم مزاج روایت کا نزدیکی وقوع ——

(۴)

اب میرے خیال میں یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ تاریخی احساس احساس وقت اور روایت کس طرح باہم مربوط ہیں۔

"احساس وقت" گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کے تمام جدید شاعروں کی مشترک پکار رہی ہے۔ مگر بعض کے نزدیک تو یہ محض ایک وسواسی معاملہ ہی رہا ہے کہ دنیا منتشر ہو رہی ہے، زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ باقی رہ نہیں گیا، اور تخریبی عنصر کے سمندر میں چھلانگ لگانے کے سوا اور کچھ چارہ نہیں۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہلاکت خیز و ہولناک واقعات اور انسان کی موجودہ مظلومی، محکومی و مایوسی کا تیز احساس ہمارے وقت کی تشخیص کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن محض اس میں استغراق، یہ ارتکازی اور بے تسکین تلخی، نکبت میں یہ ارادی مستی کیا اس تاریخی احساس کی کمی کی غمازی نہیں کرتی جسے ایلیٹ وقت میں انسانی جگہ کی آگاہی [illegible] برخیال کرتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگی ہو تو اس کے [illegible] ہذیانی جنون کی طرح بدحواس ہو جانا فطرت کے عین مطابق ہے لیکن اس وقت کا اس کا ذہنی ردعمل کرداری ([illegible]) اور مشترک ردعمل کی سطح پر تیرتا ہوا ہی گردانا جا سکتا ہے، اور کسی معنوں میں بھی اس کی "پوزیشن کا احساس" نہیں مانا جا سکتا جو واقعتاً اسے بہت دیر کے بعد نصیب ہوگا۔ شاعروں کے اس طبقہ کی نظر میں ایک زخمی جانور کے جذبات اور ارسطاطالیسی معنوں میں المیہ کے احساس کا فرق برابر واضح نہیں۔

چند جدید شعراء جن میں اس تاریخی احساس کا فقدان نہیں ہے انہیں واقعی کامیابی اور عزت نصیب ہے۔ اگر ہم اس سے پہلے درج کئے ہوئے ایلیٹ کے طویل اقتباس کی طرف رجوع کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تاریخی احساس اس کے نزدیک وہی ہے جسے ہم نے نسل انسانی کی وسیع روایت کے نام سے موسوم کیا تھا۔

بعض "احساس وقت" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ یہ محض موجودہ زندگی کے مختلف مسائل مثلاً سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی وغیرہ کے گہرے علم، مختلف زاویہائے نظر، مجادلی مقاصد و مفاد اور مرئی ماجرا کے کٹھ پتلی کے تماشہ کے پس پردہ ڈوریوں اور چرخیوں کی آگہی کا نام ہے۔" اس میں وسوسوں اور آئین و قوانین کے تاریخی نشو و نما کا علم بھی مضمر ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ تاریخی احساس بھی شامل ہو جو علم سے زیادہ وجدانی ادراک پر مشتمل ہے۔

بعض کو اس کا یقین ہے کہ احساس وقت فنکار کو اس کی "فنی مشق" میں ممد و معاون ہوتا ہے یعنی اس "طریق" کا احساس جس پر اس کے معاصرین کا دماغ کام کرتا ہے گویا یہ احساس اداکار یا مقرر کے "احساس حاضرین" کے مرادف ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے احساس سے فنکار اپنے اظہار کی تکنیک کو کچھ اس طرح ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ عوام کی ایک بہت بڑی جماعت تک رسائی حاصل کر سکے۔ لیکن اس قسم کا احساس کچھ زیادہ دیر تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا اگر اس کی پشت پر تاریخی احساس کارفرما نہ ہو۔ کوئی مقرر کسی اجتماع کے سامنے تقریر کرنے کے لئے ذرا دیر سے پہنچے، اگر وہ بنی بنائی تقریر کرنے والا نہ ہو تو اس کا ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے۔ وہ "احساس حاضرین" بھی رکھتا ہو اس معنی میں کہ اسے انسانی دماغ کے رجحانات سے کماحقہٗ واقفیت حاصل ہے مگر میٹنگ کی گذشتہ کارروائیوں اور لوگوں کے ذہنی ردعمل کے تسلسل سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے بولنے کے لئے کھڑے ہونے پر وہ ان کی "واقعی ذہنی کیفیت" کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور اسے یقیناً بڑی دشوار گذار اور خاردار راہ سے گذرنا پڑے گا۔

"ورناکیولر" یا مقامی روایات اور تاریخی احساس جو انسانی زندگی کے وسیع پس منظر کے ادراک کا نام ہے دونوں میں بہت قریب کا رشتہ ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ایک ہی جگہ کے حدود میں محدود ہے۔ شاعرانہ فراست رکھنے والا انسان دنیا میں رہنے کے سلسلے

دونوں قسم کی روایات کم و بیش حد تک قبول کرنے سے چوک نہیں سکتا۔ تاریخی احساس کا انحصار ایک ذہنی قوت پر ہے۔ ایک ایسی ذہنی قوت جو عام ذہنی ادراک سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس خصوصی قوت کے ملنے کا بیشتر حصہ قدرت کی طرف سے شاعر ہی کے لئے وقف ہوتا ہے اور ایلیٹ کے نظریہ کے مطابق "بڑی کاوش سے اس کے حسن کو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن خواہ کتنی ہی محنت کی جائے اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا" اگر تاریخی احساس کی مندرجہ بالا تعریف سے اتفاق کر لیا جائے تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ کوئی بھی حقیقی شاعر اس کے بیشتر حصہ سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ہم ایلیٹ کے اس نظریہ کو مان لیں کہ تاریخی احساس ہی شاعروں کو روایاتی بناتا ہے" تو منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حقیقی شاعر روایاتی ہیں۔ تب بلیک اپنے پیمبرانہ سُر ال کے بعد اور شیلے، ڈینٹے کی طرح کا کلاسک شاعر، روایاتی ہونے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ اور "poet of genius" کے اعزاز کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں؟

واقعہ دراصل یہ ہے کہ ایلیٹ اس جگہ ایک دوسری قسم کی روایت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اور میرے خیال میں لفظ 'روایت' کا یہی سب سے معقول ترین استعمال ہے۔ اگر ہم اس لفظ کو ابہام کی پُرخطر وادی میں گرنے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں لازم ہے کہ اس کے معنی اسی حد تک محدود کر دیں۔ یہ اس قسم کی روایت ہے جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ جو کسی خاص تسلسلِ تخیل یا جذباتی رجحان سے جنم پاتی ہے۔ لیکن آخر میں اس تمام زندگی پر مشتمل ہو جاتی ہے جو اس کے زیر اثر ہے۔ اس میں ردِ عمل کے معین بیل بوٹے بناتی ہے۔ اور اس کو ابھار کر خود اظہار کی چوٹی میں منتقل کر دیتی ہے۔ جو شاعر روایت کے اوپری دباؤ کے بر وقت موقع پر پیدا ہوتا ہے، اس ابھار کو جو اس کی قوت سے بھی زیادہ زور آور ہے، محسوس کرتا ہے۔ جو دو موجوں کے درمیان پھنس جاتا ہے وہ محض خلا میں اپنے پر پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ اس کی اڑان بیکار ہے۔ اور جو ایسے زمانے میں پیدا ہوتا ہے جب ہوا معتدل چل رہی ہو، نہ تغیر عظیم اور نہ انحطاط، وہ قوت اور سہارے کیلئے گذری ہوئی روایات کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تجربہ سے مماثلت رکھنے والی کسی اور روایات کی طرف بھی دستِ طلب بڑھاتا ہے۔ اور اگر اسے اپنے لئے کوئی موزوں و ہم مزاج روایت نظر نہیں آتی تب بھی وہ اچھے اشعار کہہ سکتا ہے لیکن ان کی اپیل اور اہمیت بہت ہی محدود ہوگی۔

تخلیقِ شعر کے رمز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر حال میں اس جگہ تاریخی احساس اور احساسِ وقت کا ایک مؤثر حد تک کارفرما ہونا ضروری ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر منحصر ہیں، اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ کوئی شاعر یا شاعروں کی کوئی خاص نسل انہیں مختلف تناسب میں قبول کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی احساس بعض اوقات خود بین اور مبہم ہو جانے پر مائل ہو جاتا ہے۔ حقائق کے گہرے تعلق سے اپنی نوشتی کر لے اور اپنے سلوار نے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی طرح معاصرت بھی بعض اوقات محض ایک پست و بے تخیل "امروز پرستی" کی طرف جھک جاتی ہے —— آجکل کے واقعات و حقائق پر حد سے زیادہ زور جیسے اخباری قسم کی واقعیت ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر کوئی شاعر اپنی فطرت میں ان دونوں کی مناسب اور موزوں آمیزش میں کامیاب ہو جائے تو وہ اہم اور معنی خیز شاعری کرنے لگیگا لیکن اگر اس کی خواہش ہے کہ کائناتی اہمیت اور بزرگی کی معراج پر پہنچ جائے تو اسے (Impulse of Tradition) تحریک روایت (اپنے مقید معنی میں) سے استفادہ کرنا چاہئے اگر یہ اس کے اپنے زمانے کی روایت ہے تو وہ اسے کسی نقص کے تقابل یا امتیاز میں پیش کرے گا یا اپنے دور کی کسی امکانی قوت کے لئے بطور محرک استعمال کرے گا محض قدیم روایات کے تخیل ہی میں زندگی بسر کرنا بھی رجعت پسندی ہے نقصان دہ ہے اور ضعفِ استعداد کی پردہ دری کرتی ہے۔ روایت کے قلب سے قوت کی روح کو اپنے تصرف میں لاتے ہوئے رموز کے تمام مقفل دروازوں کو شق کرتے ہوئے، تمام متمرد متناقضات اور بے ضابطگیوں کو مغلوب کرتے ہوئے ایک حقیقی شاعر کو "زندہ حال" میں اپنی مہم جاری رکھ کر ایک نئے ذہنی نظام کی بنا ڈالنی چاہئے ——!

شعری ادب

لکھنے والے :-

قصائد: جنگ جلیل ——— سیماب اکبرآبادی
نوح ناروی ——— آرزو لکھنوی
علی اختر ——— الم مظفرنگری
ہادی مچھلی شہری ——— شاد عارفی
اعجاز صدیقی ——— ماہر القادری
علی احمد ——— عزیز احمد
مغیث الدین فریدی ——— غلام احمد فرقت
نظر حیدرآبادی ——— عبداللہ مضطر گجراتی

نواب فصاحت جنگ جلیل

موجِ فصاحت

ساری خوبی ہے ان آنکھوں میں مروّت کے سوا
ساری دنیا ہے نظر میں میری حالت کے سوا

کیا کہوں جلوہ گہہ ناز میں کیا کیا دیکھا
میں نے دیکھا ہی نہیں کچھ تری صورت کے سوا

کچھ کرم کی بھی جھلک انکا ستم دیتا ہے
شکر بھی میری زباں پر ہے شکایت کے سوا

پھول کہہ دینے سے افسردہ کوئی ہوتا ہے
سب ادائیں تری اچھی ہیں نزاکت کے سوا

کیا قیامت ہے گئے دید کا وعدہ کر کے
ہاتھ آتے ہیں کہاں اب وہ قیامت کے سوا

سابقہ پڑنے سے یہ راز سمجھ میں آیا
ہر زمانہ گزراں ہے شب فرقت کے سوا

جلوۂ حسن تو ہے دیر سے بے پردہ جلیل
کون اب مانع دیدار ہے حیرت کے سوا

سیماب اکبر آبادی

چند شعر

فلک پر چاند چھپتا جا رہا ہے — خیالِ صبحِ منزل آ رہا ہے
ہوا سنکی ہے بادل چھا رہا ہے — جنوں انگیز موسم آ رہا ہے
کبھی پنہاں کبھی پیدا رہا ہے — مگر جلوہ ترا جلوا رہا ہے
نہ پوچھ اُس دل سے حالِ عیشِ امروز — جو مجبورِ غمِ فردا رہا ہے
کہاں طُور اور کہاں سوزِ آشنا دل — یہاں برسوں دھواں اُٹھتا رہا ہے
تری خوئے تغافل کا گلہ کیا — محبت میں یہی ہوتا رہا ہے
یہاں جو ہے وہ ہے مجبور و محتاج — یہ تو دامن کہاں پھیلا رہا ہے؟
نہ کر رُسوا دلِ حُسن آشنا کو — کہ یہ تیرا اسرار پردار رہا ہے
یقیں رکھ حاصلِ لاحاصلی پر — یہاں جو کھو رہا ہے پا رہا ہے
نگہدارانِ شامِ غم میں باقی — فقط اِک صبح کا تارا رہا ہے
تصور میں وہ اُن کی غمگساری — کہ جیسے دل کو دل سمجھا رہا ہے

غم اُن کا آئے بسم اللہ سیماب
مگر اب مجھ میں باقی کیا رہا ہے؟!

نوح ناروی (بقیہ مطلع)

لہریں

کب چرخ کا شکوہ کرتے ہیں قسمت کو برا کب کہتے ہیں
غم ہو کہ خوشی ہو کچھ بھی ہو ہر حال میں ہم خوش رہتے ہیں

آئینے بھی اُن کی محفل میں منہ اُن کا دیکھتے رہتے ہیں
بس باعث ہے اس باعث سے کیا راز وہ کس سے کہتے ہیں

کروٹ کے بدلنے پر ایذا ہم اور زیادہ سہتے ہیں
ناسور ہیں اپنے دل میں کئی کچھ رستے ہیں کچھ بہتے ہیں

آپس غم کی تکلیفیں آپس میں چمک کر کہتے ہیں
انجم سے نہیں کم اشک اُن کی راتوں کو جو رستے رہتے ہیں

اقرارِ وفا پر وہ ہم بھی مشکل سے وہ قائم رہتے ہیں
کچھ دل میں ہے کچھ منہ میں ہے کچھ کرتے ہیں کچھ کہتے ہیں

دریائے غمِ الفت میں ہم لہروں کے تھپیڑے سہتے ہیں
ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے اب ڈوبتے ہیں اب بہتے ہیں

ہم جھیلیں گے ہم اٹھائیں گے کہنے کو تو یہ سب کہتے ہیں
لیکن نہ سہے گا کوئی انھیں جو ظلم و ستم ہم سہتے ہیں

اور اہلِ وفا کب میری طرح منزل میں نری غم سہتے ہیں
خوش آتے ہیں خوش جاتے ہیں خوش ہوتے ہیں خوش رہتے ہیں

ناکامیِ قسمت کا چرچا اُن کر بھی بہت چپ رہتے ہیں
ہیں لے تو کہا جو کہنا تھا اب دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں

وہ چرخِ ستم گر ذرہ ہٹ کر ڈر کر دب کر کب رہتے ہیں
جو ظلم تمہارے جھیلتے ہیں بیداد تمہاری سہتے ہیں

ہم اُٹھتے بیٹھتے محفل میں آزار تمہارے سہتے ہیں
رہنے کو تو رہتے ہیں لیکن رہنے کی طرح کب رہتے ہیں

کیا اہلِ جفا کیا اہلِ وفا بے فکر و تردد رہتے ہیں
جو سنتا ہے جو کہنا ہے وہ سنتے ہیں وہ کہتے ہیں

وہ میرے دل کے داغوں کو پژمردہ کیوں کر کہتے ہیں
ہو موسمِ گل یا عہدِ خزاں یہ پھول شگفتہ رہتے ہیں

سن کر مری الفت کا قصہ خاموش نہیں وہ رہتے ہیں
کچھ اور کہو کچھ اور کہو کچھ اور کہو یہ کہتے ہیں

تیروں کو تمہارے بے پروا ہم خاص سبب سے کہتے ہیں
آج اس دل میں کل اس دل میں کس دل میں یہ جم کر رہتے ہیں

مانا کہ تغافل نازِ بتاں اوروں سے وہ کرتے رہتے ہیں
کہتی ہے اگر دنیا تو کہے ہم کیوں انھیں ظالم کہتے ہیں

صحرائے غمِ الفت میں ہم دن رات اذیت سہتے ہیں
یا ذرے گنتے رہتے ہیں یا تارے گنتے رہتے ہیں

آزارِ ستم کے شکووں پر کیوں آپ بگڑتے رہتے ہیں
کہنے کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ کہنے والے کہتے ہیں

اے نوح یہ برگ غنچہ و گل سب کھل کھل کر کہتے ہیں
خوش بھگوتی اُن سے رہتی ہے جو بھگوت باغ میں رہتے ہیں

آرزو لکھنوی

نوائے فطرت

تمنّا حسرتوں کی فتنہ ساماں ہو کے رہتی ہے
خوشی کیا ایسی بستی کی جو ویراں ہو کے رہتی ہے

بنے چہرے کی زردی یا شکن ماتھے کی بن جائے
ہر اک پردے سے بے چینی نمایاں ہو کے رہتی ہے

مآل اندیش ہے تو دیکھ ربطِ شبنم و گل کو
جو ہنستی ہے بہت وہ آنکھ گریاں ہو کے رہتی ہے

زلیخا۔ الفت ناکام کے اندھیر کچھ کم ہیں
بڑی معصوم صورت شمعِ زنداں ہو کے رہتی ہے

شرارہ جانو پتھّر کا چٹیلے دل کے نالے کو
چھپی گرمی محبّت کی نمایاں ہو کے رہتی ہے

جو قائم رکھ سکے ٹکراؤ اپنا روحِ آزادی
کسی دن منہدم دیوارِ زنداں ہو کے رہتی ہے

نہ یہ پوچھو کہ کیونکر۔ دیکھ لو نوکِ سرِ ناخن
پھٹے دامن کی ہر دھجّی گریباں ہو کے رہتی ہے

ہوائے یاس پیدا تو کرے امّید کی گرمی
جو بجھتی ہے وہ مشعل پھر فروزاں ہو کے رہتی ہے

جب آنسو رک کے جاتے ہیں پسینہ بہنے لگتا ہے
حقیقت پھر حقیقت ہے نمایاں ہو کے رہتی ہے

سحر ہونا ہے لازم رات ہو کتنی ہی طولانی
گزرتی ہے جو حد سے وہ نہیں ہاں ہو کے رہتی ہے

بھروسا آرزو جھوٹی تسلّی پر نہیں اچھّا
یہی تسکینِ خاطر آفتِ جاں ہو کے رہتی ہے

علی اختر (حیدرآباد دکن)

قولِ فیصل کا ایک ورق

رفتہ رفتہ جب عناصر میں ہوا کچھ اعتدال
تھم چلا آگنی کے برہم دیوتاؤں کا جلال

میگھ راجہ نے سنبھالی اب نگر اسکی عناں
رقص کرتی تھیں فضا میں تند گہری بدلیاں

آندھیاں تھیں، زلزلے تھے، برف تھی، طوفان تھے
زندگی کے کم، تباہی کے بہت امکان تھے

آخر کار ان حوادث میں سکوں آنے لگا
عقل کی منزل میں ہستی کا جنوں آنے لگا

نرم موجوں کو ہوائیں لوریاں دینے لگیں
ندیاں میدان میں انگڑائیاں لینے لگیں

سر نکالا خاک سے پودوں نے لہرائی حیات
سطح پر آئے چمن، قلزم، ستارے، کائنات

یونہی برسوں زندگی کا کارواں چلتا رہا
یہ زمیں چلتی رہی یہ آسماں چلتا رہا

آگ کی منزل سے گزری قالبِ طوفاں میں رہی
زندگی اس رنگ سے تعمیرِ دوراں میں رہی

مچھلیاں کیڑے مکوڑے طائر و حیواں بنے
رفتہ رفتہ محفلِ امکاں بنی انساں بنے

اس طرح صدیوں کی تعمیر و تغیر کا مآل
تو ہے ہستی ہے تری اور تیری دنیا کا جمال

مختلف دوروں سے گزری ہے یہ خاکِ پرفشاں
زندگی کے ہر قدم دینے پڑے ہیں امتحاں

تب کہیں یہ کارواں آیا ہے منزل کی طرف
کشتیٔ دوراں نے رخ پھیرا ہے ساحل کی طرف

الم مظفر نگری

آخری سلام

نہ دیکھ لے کہیں پھر چشمِ روزگار مجھے
سکوں نصیب ہُوا ہے نہ مزار مجھے

وہ کر رہے ہیں کیئے جائیں بے قرار مجھے
کبھی تو دے گا خُدا دل پہ اختیار مجھے

مجاز کا نہ حقیقت کا اعتبار مجھے
ڈرا رہی ہے خزاں بن کے کیوں بہار مجھے

لرز رہا ہُوں تغافل سے تیرے اے ساقی
گرا نہ دے سرِ خُم شدّتِ خمار مجھے

سلامِ آخری کرنا ہے اہلِ ساحل کو
اُبھار موجۂ طوفاں ذرا اُبھار مجھے

زمیں پہ لالہ و گُل آسمان پر تارے
دیئے ہیں داغ محبّت نے بیشمار مجھے

الٰہی اس کو ہمیشہ سکوں میسّر ہو
رکھا ہے شام و سحر جس نے بیقرار مجھے

بس ایک آہ میں تفصیلِ غم بیاں ہو جائے
ملا ہے عشق سے یہ حکمِ اختصار مجھے

اُبھارتے ہیں فغاں کے لئے نہ جانے کیوں
قفس میں رہ کے چمن کے اُمیدوار مجھے

ہے موج موجِ صبا موجِ حلقۂ زنجیر
اسیر کر کے چلی تُو کہاں بہار مجھے

ہزار بار دیئے ہیں فریب اس نے الم
نہیں رہا ہے اب اس دل کا اعتبار مجھے

ہادی مچھلی شہری

ہم کیا کریں گے؟

سمجھ میں آتا نہیں کہ ہم اس کشاکشِ غم میں کیا کریں گے
یہ داغ ہائے دلِ حزیں تو بنا کریں گے مٹا کریں گے

بہت ہی مشکل ہے اس کے آگے بیان و شرحِ غمِ محبت
کوئی ہمیں کاش یہ بتا دے کہ کس طرح ابتدا کریں گے

نہ پہلی حالت یہی ہماری نہ کم ذرا ہو گی بے قراری
دلِ حزیں کا سکون تو سچ ہے تری تمنا کو کیا کریں گے

الٰہی بگڑے نہ بات دل کی کہیں یہ ہمت نہ ہار جائے
میں جانتا ہوں ستم وہ مجھ پر بہ اعتمادِ وفا کریں گے

کہاں ہیں وہ وعدہ ہائے رنگیں کہاں ہیں وہ دلنوازیاں [illegible]
دلِ حزیں کو ہم اپنے تسکیں کہاں تک آخر دیا کریں گے

یہ ذرّے ہیں میری خاکِ دل کا دبا ہوا جن میں سوزِ غم ہے
یہ منتشر ہو کے دیکھ لینا کبھی قیامت بپا کریں گے

کبھی ہر اک شے سے ہوں گے واقف کبھی خود اپنی خبر نہ ہو گی
نظر کے آگے یہ دونوں پردے گرا کریں گے اُٹھا کریں گے

کسی کی محفل میں بادۂ غم کی آرزو ہم کو لے چلی ہے
یہاں وہاں بھی رہی جو حالت تو اے دلِ زار کیا کریں گے

کشاکشِ غم سے چھوٹ جانا یہ ہم نے مانا کہ ہے بڑی شے
تجھے توقع ہے کیا یہ اے دل کہ دن خوشی کے وفا کریں گے

نہیں ہے کوئی جو سننے والا نہ ہو ہمیں کچھ غرض نہیں ہے
ہم آپ قصۂ دلِ حزیں کا کہا کریں گے سنا کریں گے

جو اپنی تقدیر ہی بری ہے تو سعی و تدبیر کیا کریں گے
جو ڈوبنا ہی ہے کشتیوں کو تو ناخدا ہو کے کیا کریں گے

ہزار پردے پڑے ہوئے ہوں رہا جو جذبِ نظر سلامت
چھپے ہوئے جلوہ ہائے خود بیں کو ہم کبھی برملا کریں گے

جو تجھ کو کہنا ہے اُن سے ہادیؔ بہ اعتمادِ وفا کہے جا
نہ کر تو پروا ذرا بھی اِس کی وہ کیا سُنیں گے وہ کیا کریں گے

شاد عارفی

پیرِ دہقاں

ٹھیکیدار؟ بھلے کو آئے! نکلے دھوپ تو جاڑا جائے"
صبح کو "پوری مرغی" کھائے شام سے پھر دوزخ بھڑکائے
ایسی جنت سے بھر پائے

آئے "پیٹ پجاری" بنکر "پھٹک چند" "گردھاری" بنکر
جم جائے بیماری بنکر "نارد" "ڈھیٹ" "کساری" بنکر
مذہب کا بیوپاری بنکر

دودھ، ملائی، ماوا، مسکا اس مہنگے میں کس کے بس کا
متوالا، گنوں کے رس کا چائے کی لت - انڈوں کا چسکا
نور بنا، جو حلق سے کھسکا

موٹا تازہ - ہٹا کٹا گاما سے تھوڑا سا بٹا
ممدو کی بیوی سے سٹا ہی ہی.... ہا ہا... چیل جھپٹا
کیا جانیں؟ "کب" کھائے کھٹا"

اے انگھڑ؟ صحرائے رو رُو ہل میں الٹا اونٹ نہ جوڑو
اس آلھا اودل کو چھوڑو "چھیلا خاں" بیلوں کو موڑو
"کوٹ وار" کی چندیا توڑو

سالے سے اک بھیلی لاؤ دونوں بیلوں کو کھلواؤ
خالص گھی کی ناریں... جاؤ جس جا - دانہ بھوسہ.. پاؤ
قیمت؟... یہ مونچھیں؟ شرماؤ!

پیر تمہارا ہے؟ تم جانو ایسوں کی عظمت پہچانو
تو میں اتنی کمی کیوں چھانو خود ہی نبٹو - بے ایمانو
مجھ کو جھگڑے میں کیوں سانو

ممدو کی بیوی پہ تہمت ہمسایوں کی گندی نیت
عورت ہے شہکارِ فطرت "شہکارِ فطرت" سے رغبت
پیروں کو زیبا ہے - تُم ... بت...

اعجاز صدیقی

طلسمِ خیال

ڈوبی ہوئی نظر ہے محیطِ جمال میں
چاہوں تو لاکھ چاند بنا لوں خیال میں

دو دن کٹے خوشی میں تو دو دن ملال میں
انساں رہ سکا نہ کبھی ایک حال میں

مرجائے گھٹ کے آدمی رنج و ملال میں
صبحِ اُمید ہو نہ اگر شامِ حال میں

لب سِل گئے تو دیدۂ خوں بار بول اُٹھا
کام اک نہ ایک آ ہی گیا عرضِ حال میں

جاتی نہیں نگاہ کبھی ماورائے فکر
انساں گھرا ہوا ہے طلسمِ خیال میں

اُس پر ہزار چاند ستارے نثار ہوں
وہ داغ دے گئی جو محبت مآل میں

اب تک ہے زیرِ بحث یہاں اپنی بندگی
پوجا تھا ایک دن انہیں وہ بھی خیال میں

اللہ یہ مقامِ محبت ہے کون سا
اب کیف ہجر میں ہے نہ لذت وصال میں

ہیں اب بھی یاد اُن کی جوانی کے نشان
بنتے ہیں پھول اب بھی نگاہ و خیال میں

محشر میں نام لے کے مرا تم پکارنا
شاید میں بھول جاؤں تمہیں دیکھ بھال میں

اللہ رے تصورِ رنگینِ روئے دوست
اس نے تو اور آگ لگا دی خیال میں

وہ ایک زندہ نعش ہے اور بارِ کائنات
جو انقلاب کر نہ سکے اپنے حال میں

اعجاز کشتگانِ محبت میں ہم بھی ہیں
کیوں لوگ نام لیں نہ ہمارا مثال میں

ماہر القادری

فکرِ نو

نظریں نئی نئی ہوں اشارے نئے نئے
دل ڈھونڈتا ہے روز سہارے نئے نئے

ہر شاخِ گلستاں پہ ہے اک آشیانِ نو
اب ان کے واسطے ہوں شرارے نئے نئے

کب تک سفینے ایک ہی انداز پہ رہیں
موجیں نئی نئی ہوں کنارے نئے نئے

کتنے ہیں اُن کی شانِ تغافل کے پائمال
کتنے ہیں التفات کے مارے نئے نئے

یک رنگیٔ جمال سے اُکتا گئی نگاہ
میرے لئے ہوں چاند ستارے نئے نئے

ماہرؔ یہ دار و گیر یہ رفتارِ انقلاب
آنکھوں کے سامنے ہیں نظارے نئے نئے

عزیز احمد بی اے (عثمانیہ)

بربط

یہ کس نے چاند کے بربط کو چھیڑا
فضا میں ایک سکوتِ سرمدی ہے
ہر اک ذرہ پہ چھائی بے خودی ہے
زمیں سے آسماں تک نور ہی نور
زمانہ بن رہا ہے طور ہی طور
چمن میں برگ و گل بھی سو گئے ہیں
یہ سب نغموں کی لے میں کھو گئے ہیں
پپیہے کی صدائیں رک گئی ہیں
گلوں کی نرم شاخیں جھک گئی ہیں
دبے پاؤں ہوائیں چل رہی ہیں
جوانی کی شرابیں ڈھل رہی ہیں
تھکے ماندے مسافر سو گئے ہیں
سکوں کی حد میں داخل ہو گئے ہیں
ہوئی خاموش تانیں بانسری کی
نہیں اب رُوح چرواہے کی پیاسی
خموشی ہی خموشی چار سُو ہے
یہ دنیا اک جہانِ رنگ و بو ہے
کسی کی یاد دل کو آ رہی ہے
گھٹا محرومیوں کی چھا رہی ہے
مجھے ناکامیٔ قسمت نے گھیرا

علی احمد بی اے (عثمانیہ)

ساقی

اُٹھ تکلّف کے حجابات اُٹھادے ساقی / آج میخانے تبسّم کے بہادے ساقی
تاکجا، شیشۂ و صہبا کے یہ فرسودہ قیود / مست آنکھوں کو اشاروں سے پلادے ساقی
دیکھ جلنے کو ہیں پھر ہوش و خرد کی شمعیں / دامنِ ساغر و صہبا کی ہوا دے ساقی
ہمرہِ بربط و نے سازِ جوانی بھی چھڑے / اور طوفان میں طوفان اُٹھادے ساقی
مَے تو پیتا ہُوں مگر ہوش نہیں اُڑتے ہیں / اپنی مستی بھی ذرا اس میں ملادے ساقی
زُلف کے ساتھ ہی آنچل بھی ترا لہرائے / نکہت و رنگ کا اک دام بچھادے ساقی
وہ ہُوا سنکی، وہ جھنکار سی اُٹھی دل میں / ابر کے ساز پہ اک گیت بھی گادے ساقی
غرق ساغر کی کھنک میں ہو صدائے ہر درد / رنج کو عیش کی سرحد سے ملادے ساقی
آج تشنہ نہ رہے زیست کا پہلو کوئی / آج صہبائے جوانی بھی لٹادے ساقی
درگزر بربط و مضراب کی پابندی سے / نغمے رفتار کی لغزش سے سُنادے ساقی
عمرِ رفتہ کو مری نغمۂ قلقل سے بُلا / بخت کو رقصِ مسلسل سے جگادے ساقی

دیکھ تعظیم کو اُٹھا ہے مری میخانہ
تو بھی سر اپنا مرے آگے جھکادے ساقی!

مغیث الدین فریدی (ادیب کامل)

مفارقت

تو رشتۂ امیدِ وفا توڑ چکا ہے — میں اپنی دعاؤں کا اثر بھول گیا ہوں
تو نے مرے سجدوں کی حقیقت کو نہ سمجھا — لے، میں بھی پرستاریٔ در بھول گیا ہوں
تو اپنے تغافل کی اداؤں پہ ہے نازاں — میں تیری محبت کی نظر بھول گیا ہوں
تھی لذتِ آزار بھی امیدِ کرم تک — اب دردِ دل و داغِ جگر بھول گیا ہوں
پیچ و خمِ ہستی سے گریزاں ہے مرا دل — جیسے کہ تری راہگذر بھول گیا ہوں
جب حاصلِ کونین تھا ہر لمحۂ مستی — اے دوست وہی شام و سحر بھول گیا ہوں

مدت سے ہے دل خانۂ ویران تمنا
اب کوئی تمنا ہے نہ سامانِ تمنا (فانی)

کچلے ہوئے جذبات میں شورش ہی نہیں ہے — اب کوئی پشیمانِ جفا ہے تو مجھے کیا
تھا پاسِ وفا بھی دلِ مرحوم کے دم تک — اب کوئی پرستارِ وفا ہے تو مجھے کیا
ویرانیٔ دل ہے اثرِ آہ سے محفوظ — اب مضطربِ غم شعلہ نوا ہے تو مجھے کیا
اب وہ ہوسِ دید نہ وہ شوقِ تماشا — بے پردہ کوئی جلوہ نما ہے تو مجھے کیا
باقی نہ رہا خون مرے دیدۂ تر میں — اب حسن طلبگارِ حنا ہے تو مجھے کیا
ساقی مرا پیمانۂ دل ٹوٹ چکا ہے — شیشہ میں ترے آبِ بقا ہے تو مجھے کیا

دلچسپ مرے عشق کی روداد نہیں ہے
اک خواب سا دیکھا تھا مگر یاد نہیں ہے

کافی ہے فریدی مجھے ویرانیٔ دل بھی — سامانِ جنوں اب میں فراہم نہ کروں گا
منظور نہیں دعوتِ تجدیدِ محبت — میں شکوۂ بے مہریٔ عالم نہ کروں گا
خود اپنی امنگوں کا گلا گھونٹ رہا ہوں — ناکامیٔ تقدیر کا ماتم نہ کروں گا
دل سوز سہی عشق کی فریاد کے شعلے — آہوں سے مگر حسن کو برہم نہ کروں گا
ہوں لاکھ نمکپاش تبسم کی ادائیں — اس پر بھی کبھی خواہشِ مرہم نہ کروں گا
چاہے دلِ مضطر پہ گزر جائے قیامت — میں عشق کی عظمت کو مگر کم نہ کروں گا

اب رنج کا شکوہ ہے نہ احساسِ خوشی ہے
تکمیلِ غمِ عشق حیاتِ ابدی ہے

پیروڈی

منیب الرحمن ایم اے

انکار

نگاہیں تمنا اٹھیں، دامنِ نیرِ زماں چھوا
میں بارہا کہہ چکا
نہیں نہیں نہیں نہیں۔
بتا تجھے اسی مستوری پہ ناز ہے؟
ترا یہ سحرِ رنگ و بو!
اسی کی قید میں تری حیات گھٹ کے رہ گئی
وہ شوخیِ قلم کہاں!
وہ حسین ہیئتِ نظم کہاں۔
ہزاروں نقش تو نے اس سے خوب تر بنائے ہیں
یہ تیرا شاہکار ہے؟!
فلک بھی سرنگوں ہوا
زمیں بھی تھرتھرا گئی
جبینِ خود نگر مگر نہ جھک سکی نہ جھک سکی
تجھے کسی کا پاس ہے؟ — نہیں!
یہ آسماں! — نہیں!
مکاں و لامکاں!

نہیں!
یہ زندگی؟
نہیں! نہیں!
ہزار بار کہہ چکا
نہیں نہیں نہیں نہیں!
فرازِ آسماں سے اک ستارہ ناگہاں گرا
یہ اذنِ بے بسی نہ تھا
یہ جد و جہدِ زیست تھی
زمیں نے اپنے اشک پونچھ کر کہا
نہیں! نہیں!
صدائیں آئیں کوہ و دشت سے
نہیں، نہیں، نہیں
فضا میں گونجنے لگیں
نہیں، نہیں، نہیں، نہیں —!

غلام احمد فرقت ایم اے

اقرار

یہ کون آیا سرنگوں جنوں کی کائنات میں
کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں
صبا تجھے ابھی تلک سبک روی پہ ناز ہے؟
وہ اُن کی زلفِ مشک رنگ
ترا خرام کو بکو!!
اسی فضا میں زندگی فریب بن کے رہ گئی
وہ بربطِ کہن کہاں!
وہ رونقِ چمن کہاں!
ہزاروں نغمہائے دل فضا میں لہلہا اٹھے
ہزاروں قہقہے مرے
فضا میں تھرتھرا اٹھے
مگر سحر کی دلکشی نہ سجدہ ریز ہو سکی
جہاں رسیدہ داستاں
نہ نغمہ بیز ہو سکی
ہزاروں نغمہائے غم بلا کئے مٹا گئے
محبتوں کے راز داں جیا کئے کڑھا کئے
حقیقتوں سے آشنا؟

نہیں!
یہ داستاں؟
نہیں! نہیں!
مگر نگاہِ دلنشیں
نہیں — مگر نہیں!
یہ تلخیِ شفق کی داستانِ نغمہ بیز
نہیں، مگر نہیں، مگر نہیں!
کشاکشِ حیات کیوں؟
یہ کاوشِ ممات کیوں؟
زمیں کی مسکراہٹیں
خمیدہ ہو کے رہ گئیں
دمیدہ ہو کے رہ گئیں
مگر صدائیں چار سو فضا میں گونجنے لگیں
مگر، مگر، مگر، مگر!
نہیں نہیں مگر، نہیں، نہیں، مگر
نہیں، نہیں، ابھی نہیں، نہیں نہیں ابھی نہیں۔
مگر ———؟

نظر حیدرآبادی

غنچۂ پژمردہ

ہوائیں ناز فرماتی ہوائیں
مچلتی جھومتی گاتی ہوائیں
برابر آرہی ہیں جا رہی ہیں
سحر کے دوش پر لہرا رہی ہیں

ستارے ڈوبتے بے بس ستارے
فرشتوں کی نگاہوں کے اشارے
چمن کو اوس سے نہلا رہے ہیں
فلک سے یوں زمیں پر آرہے ہیں

گلوں پر سے ہٹا شبنم کا بادل
ڈھلک جائے کسی کا جیسے آنچل
چمن کو اوس شاید دھو چکی ہے
شعاع مہر اونچی ہو چکی ہے
پرندوں نے بجائیں تالیاں سی
سر کہسار ہیں کچھ سرخیاں سی
ہوا ہے یا کوئی نغمہ ہے بے پر
ندی ہے یا کسی مینا کی چادر
فلک پر ہلکے بادل چھا رہے ہیں
یہ کتنے تاج اڑتے جا رہے ہیں

ہوائیں ناز فرماتی ہوائیں
مچلتی، جھومتی، گاتی ہوائیں
برابر آرہی ہیں جا رہی ہیں
حسیں کلیوں پہ جوبن لا رہی ہیں
وہیں اک پھول بھی سبزے سے ہٹ کر
پڑا ہے خاک پر جیسے گدا گر
پریشاں حال دل پر چوٹ کھائے
بہار صبح نو سے جی چرائے
ہوا کی بد فشانی دیکھتا ہے
کلی کی نوجوانی دیکھتا ہے
نہ جانے کون سا غم سہہ رہا ہے
بہت بیتاب ہو کر کہہ رہا ہے
"ہواؤ جھومنے والی ہواؤ
مرا انجام دیکھو، باز آؤ:
مچلتی، گنگناتی جا رہی ہو
کلی کو کیوں کھلاتی جا رہی ہو

خدارا رحم، ظالم ہے زمانہ
جوانی ہے مصائب کا نشانہ!!

عبداللہ مضطر گجراتی

مسجد عالمگیر بنارس

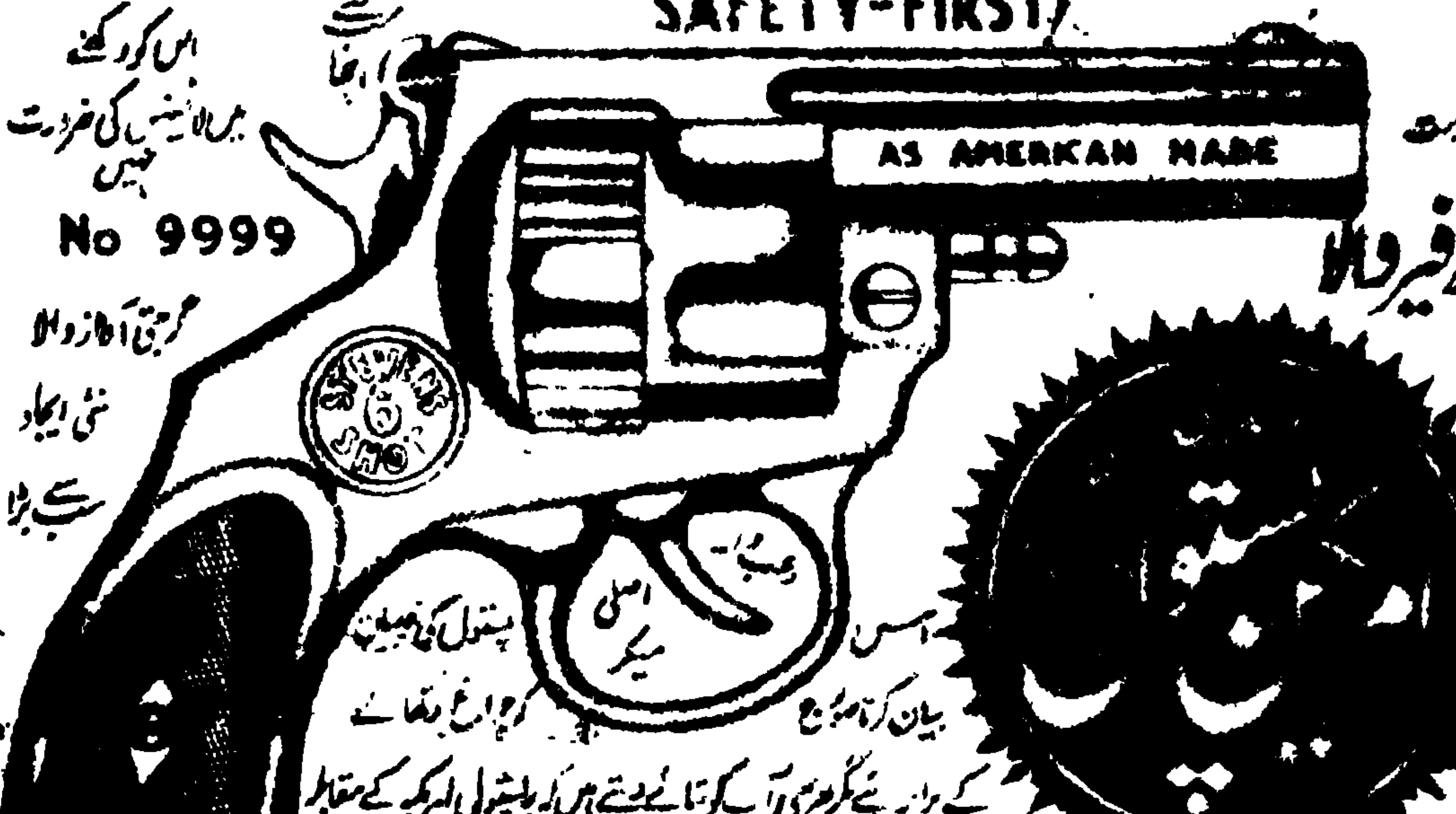
فطرتاً ہستی نگارِ رنگ و بو ہوتی رہی　　پردے ہی پردے میں جلووں کی نمو ہوتی رہی
آنی و فانی خذف پاروں پہ سر جھکتا رہا　　خاکدانوں میں خدا کی جستجو ہوتی رہی
شعبدے چھائے رہے عرفان پر الحاد کے　　نذرِ بت خانہ حرم کی آبرو ہوتی رہی
امتیازِ صانع و مصنوع کے موضوع پر　　مدتوں عقل و نظر میں گفتگو ہوتی رہی
عشق کو با این غلط اندیشی و نقصِ تلاش　　اک سکونِ مستقل کی آرزو ہوتی رہی
غیرتِ فطرت بالآخر جوش میں آ ہی گئی
روحِ انسانی لرز کر ہوش میں آ ہی گئی

خلقتاً انساں عبادت آشنا سمجھا گیا　　اور سجدہ صرف خالق کو روا سمجھا گیا
آدمیت کو ملا کونین میں اصلی مقام　　آدمی کو مظہرِ شانِ خدا سمجھا گیا
انجم و مہتاب کی تسخیر کی ٹھانی گئی　　جلوۂ امکاں کو حسبِ مدعا سمجھا گیا
موت و ہستی کی ہوئیں شرحیں باندازِ عجیب　　جو مٹا نقشہ وہ رومانِ قضا سمجھا گیا
کی گئی تعمیر وحدت کی بنا پر کائنات　　آذرستانوں کو شایانِ فنا سمجھا گیا
یادِ اس عہدِ مقدس کی حرم خانوں میں ہے
اب بھی اک مسجد بنارس کے صنم خانوں میں ہے

فرضِ تاسیسِ اخوت ہے کہ تعمیرِ جہاں　　وقت کا فاضل مورخ کھا گیا دھوکا یہاں
مادیت کے پرستاروں نے آنکھیں پھیر کر　　کہہ دیا فوراً کہ عالمگیر تھا غارت نشاں
اس غلط نظری و کج فہمی کا آخر کیا علاج　　ہے انھیں نورِ سحر پر ظلمتِ شب کا گماں
زندگی کا مقصدِ اول ہے الہامی نظام　　مقصدِ ثانی ہے تنظیم و مساواتِ جہاں
سلطنت دشوار ہے منشائے فطرت کے بغیر　　آج تک اس پر گواہی دے رہا ہے آسماں
موت کی زد میں رہینگے غلغلے تکفیر کے
نقش ممنونِ بقا ہیں فکرِ عالمگیر کے

مفت ہے! بالکل مفت! مفت!

SAFETY-FIRST!



کے برابر ہے مگر ہم بھی آپ کو بتا دیتے ہیں کہ ریوالور امریکہ کے مقابلہ پر حال ہی میں تیار ہو کر آئے ہیں جن میں خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول کی مانند کارتوس رکھنے کی چرخی بنی ہوئی ہے اور چرخی میں چھ کارتوس آجاتے ہیں۔ گھوڑا دبانے سے چرخی خود بخود گھومتی ہے۔ اور کارتوس شاٹ چلنے کی اس زور سے آواز آتی ہے کہ چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس پستول سے بہتر اس وقت کوئی ریوالور نہیں ہے ... کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا ... ۱۵ انچ ... چور، ڈاکو اور جنگلی جانور مثلاً شیر، چیتا، ہرن وغیرہ اس کی آواز سن کر اور شکل ہی دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ بوقت ضرورت حفاظت جان و مال کیلئے بہت ہی اعلیٰ چیز ہے مانند اصلی پستول ہندوستان بھر میں صرف ... ملیگا قیمت نمبر ۸۸۸ پستول بمعہ ۵۰ کارتوس صرف چار روپیہ آٹھ آنہ (Rs 4/8/-) نمبر ۸۸۸ ... کا بنا ہوا بمعہ ۵۰ کارتوس رعایتی قیمت صرف پانچ روپیہ تین آنے (Rs 5/3/-) نمبر ۹۹۹۹ سپیشل درجہ خاص جو ماڈل بمعہ ۸۰ کارتوس قیمت چھ روپیہ بارہ آنہ (Rs. 6/12/-) فالتو شاٹ (کارتوس) چار سو 400 کی رعایتی قیمت (Rs. 3/-/-) پستول لگانے کے لئے خوبصورت پیٹی غلاف ایک روپیہ بارہ آنہ (Rs. 1/12/-) پستول کے لئے تیل (-/12/-) محصولڈاک پیکنگ -/15/- ... اس پستول کو مشہور کرنے کیلئے ہر پستول کے ساتھ ایک سپورٹ رسٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے۔ اور ایک انگوٹھی (سونا) امریکن نیو گولڈ بالکل مفت دیجاتی ہے۔

ضروری نوٹ: مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس ہوگی۔ دو پستول اکٹھے منگوانے والے کو محصولڈاک بالکل معاف اور تین انگوٹھی سونا نیو گولڈ اور تین عدد گھڑیاں مفت انعام بھیجی جاتی ہیں۔

ملنے کا اصلی پتہ: امریکن این۔ جی کمپنی۔ پوسٹ بکس 61 لاہور شہر (پنجاب)

American N. G. Coy: P.B. 61 Lahore (Pb.)



اُدھر اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لیے امن کی فاختہ کو کو کو کو کا شور مچاتی ہوئی ایک مرتبہ پھر جنگ کے مارے ہوئے درماندہ وخستہ حال یورپ کے ویران خانے میں جنگجو قوموں کے لیے صلح و آشتی اور اطمینان وسکون کا پیغام لے کر اتر آئی ہے۔

اِدھر ہمدرد دواخانہ

ہمدرد مرہم

لے کر ہندستان اور ہندستان کے باہر کے لوگوں کے بیسیوں دکھ بیماریوں سے محفوظ اور مامون رکھنے کے لیے میدان میں اتر آیا ہے اور مژدۂ جانفزا سنا رہا ہے کہ

چوٹ، آگ سے جلنا، کھولتے پانی سے جلنا، چاقو کا زخم، موچ، داد، دودڑے، کھجلی، پھوڑا پھنسی، گنٹھیا، گوکھرو، گھائیاں پکنا، جلد پھٹنا، ناصور، مہاسے اور دوسری تمام جلدی بیماریوں کے لیے ہمدرد مرہم اکسیر ہے۔

دس سال کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد بالآخر "ہمدرد" نے "ہمدرد مرہم" ایجاد کر لیا ہے یہ مرہم بلاشبہ دنیا کے سب مرہموں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سائنٹفک طریقہ تیاری نے اسے بہت اعلےٰ درجے پر پہنچا دیا ہے۔

ہمدرد مرہم

جلد کی سب بیماریوں کے لیے اکسیر — ہمدرد کی سائنٹفک ایجاد — چربیوں سے بالکل پاک

قیمت فی ڈبیہ بارہ آنے (۱۲)

ہمدرد مرہم کے لیے تمام ہندستان میں اسٹاکسٹوں کی فوراً ضرورت ہے۔ شرائط طلب کیے جائیں

ہمدرد دواخانہ (ہمدرد مرہم ڈپارٹمنٹ) دہلی

افسانوی ادب

لکھنے والے:-

احسان علی شاہ
طفیل ملک
انور شجاع پاشا
ظہور الحسن ڈار
عبدالرحیم شبلی
محمد نصیر الدین
اختر ملیح آبادی
اے۔ آر۔ رشدی
عزیز اثری
محمودہ رضویہ

احسان بی۔ اے

"دُرِّ یتیم کا چوتھا باب"

لبادہ

حرث ابن عبدالعزیٰ یمینی ، بیشہ کے لحاظ سے نہ بے والا نہیں تھا بادیۂ بنو سعد کی کھلی آزاد ہوا ، اور مضبوط اونٹوں کے دودھ نے اس کی رگوں میں قوت و نجابت ۔ ۔ ۔ ۔ رکھے ۔ وہ بیٹے نہیں ۔ ۔ میں سب سے زیادہ طاقتور بہادر تھا ۔ اس کے علاوہ ۔ ۔ کھلانے کی عادت سی ہوگئی تھی ۔ اس کی بیوی حلیمہ بچے کے رونے سے بچے لے آتی اور انہی کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ۔ اس کے اپنے بچے حرث ہی کی گود میں پلتے تھے ۔ چنانچہ اس کی دونوں لڑکیاں انیسہ اور حذامہ جب کو قبیلہ والے نہ جانے کیوں شیما کہہ کر پکارا کرتے تھے حرث ہی کو ماں کی جگہ سمجھا کرتیں ۔ اور جب کبھی حلیمہ ناراض ہوتیں تو یہ دونوں سہم کر حرث کی گود میں سما جایا کرتیں ۔ اب تیسرے بچے عبداللہ کی پیدائش پر بھی حرث ہی کو ماں بننا پڑا ۔

لیکن اب حالات بہت کچھ بدل چکے تھے ۔ بادیۂ بنو سعد میں دس مہینوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ گرا تھا جس کی وجہ سے قبیلۂ بنو سعد کے تمام تالاب تقریباً خشک ہو گئے تھے ۔ اور دگر دکے نخلستانوں میں گھاس تو کیا درختوں پر کی سرسبزی بھی معدوم ہو اور ان کی نمو رک چکی تھی ۔ جانوروں کو کھلانے کے لئے گھاس اور پینے اور پینے کے لئے پانی کے چند گھونٹ نہیں ملتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹنیوں اور بکریوں کا دودھ خشک ہو گیا ۔

حرث بن عبدالعزیٰ کچھ تو پہلے ہی اپنے دوسرے قبیلہ والوں کی نسبت غریب تھا ۔ اس کی بکریوں کا گلہ بس نام ہی کو گلہ تھا ۔ ورنہ تیس چالیس سے زیادہ بکریاں اسے کبھی میسر نہیں ہوئی تھیں ۔ اس پہ خشک سالی نے کمر توڑ دی ۔ بکریاں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گئیں اونٹنیوں کی وہ کوہانیں جن پہ کبھی حرث کو ناز ہوا کرتا تھا سمٹ کر سپید کی طرح ہو گئیں ۔ انکا دودھ ختم ہو گیا تھا کہ ان کے اپنے بچے سیر نہیں ہوتے تھے ۔ حرث اور اس کے بچوں کو دودھ کہاں سے ملتا یہی وجہ تھی کہ حرث کی فولادی رگیں کمزور پڑ گئیں ۔ اور ننھا عبداللہ اس کے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گیا ۔

حلیمہ صبح سے کسی بچے کی تلاش میں شہر کے اندر گئی ہوئی تھی ۔ اب شام ہونے کو آئی تھی ۔ لیکن دور دور تک حلیمہ کا کچھ پتہ نہ تھا ۔ بھوک کے مارے بچوں کا برا حال ہو رہا تھا ۔ ننھی انیسہ اور شیما کے معصوم ہونٹ سوکھے پڑے تھے ۔ بھوک کی وجہ سے اُترے ہوئے تھے ان میں سے کسی میں بھی اتنی طاقت نہ تھی کہ عبداللہ کو چپ کرا دے یا باپ کی مدد کر سکیں ۔ دونوں کچھ دیر بھوک کی شکایت کرنے کے بعد باپ کے سمجھانے بجھانے پر ماں کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں ۔ انہیں یقین تھا کہ ماں ابھی آئیں گی ۔ اس کی جھولی میں کھجوریں ، انگور ، طرح طرح کے میوے ۔ گندم کی سفید روٹیاں ، ستو ، شکر اور دنیا بھر کی نعمتیں ہوں گی ۔ گوشت ——— ہاں تازہ ، اور سوکھا ہوا ——— دونوں طرح کا گوشت ہوگا ۔ ماں آتے ہی گوشت کے تکے بھون بھون کر انہیں دے گی ۔ ٹھنڈے پانی کے بڑے بڑے گھونٹ چلتے ہوئے سینے پر آبِ حیات کی طرح گریں گے اور ان کی ادھ کھلی ہوئی رگیں بیدار ہو جائیں گی ۔ ان کے باپ نے انہیں یہی بتایا تھا ۔ بادیۂ بنو سعد میں جب انہیں بھوک ستاتی اور ان کا باپ انتہائی کوشش کے باوجود بکریوں سے ۔ ۔ ۔ بھیڑوں کی طرح لٹکتے ہوئے پستانوں سے دودھ حاصل کرنے میں ناکام رہتا ، تو ان دونوں کو یہی کہا کرتا کہ عنقریب مکے کو جانے کا موسم آ جائے گا وہاں سے ان کی ماں کسی بڑے امیر کبیر رئیس کا بچہ پالنے کے لئے لائے گی اور بچے کے والدین ان کی ماں کو جھولیاں بھر بھر کے دنیا بھر کی نعمتیں دیں گے ۔ اب وہ وقت آ گیا تھا ۔ اب وہ مکہ میں تھیں اور ان کی ماں صبح سے کسی امیر کبیر رئیس کے گھر گئی ہوئی تھی ۔ وہ ابھی آئیں گی ———

انیسہ اور حذامہ اپنے اپنے دل میں تمام نعمتوں کو بیک وقت کھا جانے کی تجویزیں سوچ رہی تھیں ۔ وہ ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتیں ۔ اپنی اپنی پُر لطف تجویز ایک دوسرے کو کہنا چاہتیں ، لیکن پھر خاموش ہو جاتیں ۔ ان دونوں میں یہ مہربانی گھ

یہی خوف تھا کہ اگر دوسری بہن کو اس کی تجویز کا علم ہو گیا تو وہ اس سے زیادہ کھا جائے گی۔

لیکن حرث کو متخیلہ کی اس پُرلطف جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ عبداللہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہا تھا۔ مادہ خر کے پستان خشک تھے۔ وہ ایک بکریاں جن کو وہ راستہ کاٹنے کے لئے ساتھ لے آئے تھے خیمے کے دروازے پر بیٹھی بھوک سے منمناتے منمناتے تھک کر چپ ہو گئی تھیں۔ عبداللہ کا حلق تر کرنے کے لئے دودھ کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ حرث نے کئی دفعہ اپنی زبان عبداللہ کے ننھے سے منہ میں دی تھی۔ اور عبداللہ نے کئی دفعہ بھوک کے پیاسے لبوں نے ہونٹوں سے اسے چوسا بھی تھا۔ لیکن بھوک کے باپ کی زبان میں قوت و حیات کی وہ ندیاں نہ تھیں جو پھوٹتے اور سکڑتے ہوئے معدے کی لامعلوم تکالیف کو دور کر سکیں۔ عبداللہ لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے بیقراری سے زبان چوسنے کے بعد گھبرا کر علیحدہ ہو جاتا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگتا۔

اُسے اچھالتے، لوریاں دیتے، پیار کے الفاظ کہتے اور گالیاں دیتے دیتے حرث عاجز آ گیا۔ اور آخر تھک کر عبداللہ کو فرش پر چھوڑ کر بھنّاتا ہوا باہر نکل گیا۔ "صبح کی گئی ابھی تک نہیں لوٹی" حرث کو غصے کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ سورج کو غروب ہوئے مدت گذر چکی تھی، لیکن خطِ سرطان کی کپکپاتی ہوئی طویل شام ابھی تک رات کی تاریکیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر تیار نہیں ہوئی تھی اور مکہ کی وادی ابھی تک سیاہی مائل مٹیالے رنگوں میں کسمسا رہی تھی۔

حرث نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ اس کے قبیلے والوں کے خیمے پاس پاس کھڑے تھے۔ اور ان سب میں آگ روشن تھی، بنو سعد کی جتنی عورتیں بچے لینے کے لئے مکہ میں آئی تھیں سب کی بلند ہنستی اور ناچتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ سب آ چکی ہیں ——— اور سب خوش ہیں"، حرث کا ذہن خود بخود سوچنے لگا "حلیمہ کیوں نہیں آئی۔"

وہ ایک خیمے کی طرف بڑھا۔ وہ حلیمہ کا پتہ لینا چاہتا تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ حلیمہ پر کیا گذری، وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔

لیکن خیمے کے قریب پہنچتے ہی گوشت کے بھوننے کی مشام نواز خوشبو اس کے ذہن کی رگ رگ میں تیر گئی۔ اس کا بھوکا معدہ شدت کی تیزی سے سکڑا اور خشک منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کے ساتھ ہی قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ بھوک کے چیتے کی اُن ڈکاروں سے ملتے قہقہے جو شکار کی آخری تڑپ کو پنجے کے نیچے محسوس کر کے لاشعوری طور پر حلق میں غرغرانے لگتی ہیں۔

خوشبو سونگھ کر حرث کے اٹھتے ہوئے قدم رک سے پڑ گئے۔ وہ بھوکا تھا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کیا ایسے وقت میں وہ اپنے قبیلے والوں کے دسترخوان پر جا کر بیٹھ سکیگا؟ یہ خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں چبھ گیا۔ اگر وہ بھی شکم سیر ہوتا تو بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو اس کے پاؤں میں زنجیر نہ ڈال سکتی۔ لیکن وہ بھوکا تھا اور اس کی بدوی غیرت اس حالت میں ایسے ہمسائے کے پاس جانے سے روک رہی تھی جو گوشت بھون رہا ہو۔ اگر وہ خیمے میں چلا گیا تو کیا اس کا ہمسایہ اُسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت نہیں دے گا؟ کیا وہ اس دعوت کو رد کر سکے گا؟ اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ نوالے تیزی کے ساتھ نہ اٹھائیں گے؟ اس تیزی کو دیکھ کر اس کے ہمسائے پر اس کی بھوک کا راز فاش نہ ہو جائے گا اور وہ یہ نہ سمجھ لے گا کہ حلیمہ کے متعلق استفسار ایک بہانہ تھا اصل مقصد کھانے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا؟ اس کے علاوہ بھوک سے بلبلاتا ہوا ننھا عبداللہ، سہمی ہوئی نیم جان بچیاں ———!

حرث تیزی سے گھوما اور بھاگ کر اپنے خیمے کے قریب آ گیا۔ جیسے کسی جانی دشمن سے جان بچا کر آیا ہو۔

خیمے کے دروازے سے انیسہ اور خذامہ کی بھوک سے کمزور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں عبداللہ کو اپنی اپنی تجویزیں بتا رہی تھیں۔ وہ تجویزیں جن کا ایک دوسرے سے کہہ دینا خلافِ مصلحت تھا دو ماہ کے بھائی کے کانوں میں من و عن کہی جا رہی تھیں۔ گوشت کے تکے، تازہ کھجوریں، ستو، گندم کی روٹیاں، انگور اور نہ جانے کیا کیا۔ دونوں بہنیں اپنا اپنا قصہ چھوٹے بھائی کو سنا دینے پر تیار تھیں۔ انہیں پروا نہ تھی۔ وہ بھوکی بھی سو سکتی ہیں لیکن عبداللہ کو دے دیں گی اپنا حصہ ——— اور عبداللہ ان خوشگوار وعدوں کو سن کر خاموش ہو گیا تھا۔ دو ماہ کا ننھا سا بچہ بہنوں کی زبان نہ سمجھنے کے باوجود کسی غیبی قوت کی مدد سے ان کے خیالات سمجھ گیا تھا۔ اور شاید اس حسین جنت میں کھو گیا تھا جو بھوکی بہنوں کی امیدوں نے بنائی تھی، وہ اب سو رہا تھا۔ اس کی خرخراتی ہوئی آواز جس میں قہقہے، خو[illegible] ہزاروں تصویریں بنا کر وقت

محسوس ہو رہی تھی ۔ خیمے کے دروازوں سے گذر کر اس کے کانوں میں آ رہی تھی ۔ یہ خوشبو اس کو ... معتدی ہو ... پریشانی اور تشویش ... دمسکرا ... کے ... کئے ... اپنے آپ کو کیسی اور دنیا میں محسوس کیا ۔ ... جس کی لغت میں بھوک کا لفظ نہیں ہوتا ۔

بھوک کے بچوں کی کمزور آوازوں نے اس کی نگاہوں کے سامنے ایک جنت مجسم کر دی کھجوروں ، گندم کی روٹیوں ، گوشت کے ٹکڑوں اور انگور کے سبز خوشوں سے بنی ہوئی جنت ۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے خیمے کے اندر ہی وہ جنت ہے ۔ وہ صرف آوازیں سُن کر مطمئن نہ ہو سکا ۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ آہستہ آہستہ ... چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا ۔ آہستے چور کی طرح ... دروازے پر پڑا ہوا کمبل ہٹایا اور ایک آنکھ سے اندر جھانکنے لگا ۔ دونوں بہنیں گھٹنوں کے بل عبداللہ کے اوپر جھکی ہوئی تھیں اور عبداللہ اس طرح ہمک رہا تھا جیسے خوب شکم سیر ہو کر دودھ پی چکا ہو ۔

حرث کے دل پر طمانچہ سا لگا ۔ کاش وہ آوازوں پر ہی اکتفا کرتا اور سمٹتے ہوئے زرد رخساروں پر کھینچ کر زبردستی چسپ کی ہوئی عارضی مصنوعی خوشی نہ دیکھتا ۔ جس جنت کو دیکھنے کے لئے وہ اس طرح بڑھا تھا وہ جنت نہ تھی بلکہ تارِ عنکبوت کا ایک کمزور غلاف تھا جو بھڑکتے ہوئے جہنم پر چڑھا دیا گیا تھا ۔ انڈے کی جھلی کا ایک خول تھا جسے کانٹوں کے تاج پر منڈھنے کی کوشش کی جا رہی تھی ۔

دفعتہً حلیمہ کی آواز گونج اُٹھی ۔ حرث نے گھوم کر عقب کی طرف دیکھا ۔ حلیمہ کا گرد آلود تھکا ہوا چہرہ ، اندر کو دھنسی ہوئی سیاہ حلقوں میں گھری ہوئی بے نور سی آنکھیں ، ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیر ، تھکی ہوئی نحیف آواز ، بھوک ، تھکان ، غیر ضروری اور غیر مؤثر غصے میں کلبلاتے ہوئے ہاتھ پیر ——— ! تارِ عنکبوت کا کمزور غلاف شعلے کی ایک ہی لپک میں بھسم ہو گیا ۔ انڈے کی جھلی کا خول ایک ہی جھٹکے میں تار تار ہو کر رہ گیا ——— !

" یہاں کیوں کھڑے ہو ——— " حلیمہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی ۔

انیسہ اور خذامہ نے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھا اور پھر " اماں ——— اماں " کہکر حلیمہ کی طرف لپکیں ۔

لیکن حلیمہ نے جھٹک کر دونوں کو علیحدہ کر دیا اور ڈانٹ کر کہا " بیٹھ جاؤ آرام سے "

اور خود دھپ سے فرش پر بیٹھ گئی ۔

عبداللہ کی بھوکی ناک نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی تکلیف کا علاج ڈھونڈ لیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ماں کی طرف دیکھ کر رونے لگا ۔ حلیمہ نے دانت کچکچا کر ایک چپت اس کی ننگی پیٹھ پر لگائی اور اُسے دُور پھینک دیا ۔

انیسہ اور خذامہ کی نگاہوں میں امیدوں کے جتنے محل تھے آن کی آن میں گر کر کہیں غائب ہو گئے اور اس کی جگہ خوف اور دہشت سے پھیلی ہوئی پتلیاں ہلکے سے آبی پردوں میں تیرنے لگیں ۔ وہ آہستہ آہستہ اُلٹے پاؤں چلکر باپ کے پاس آگئیں ۔ حرث نے دونوں کو گود میں اُٹھا لیا ۔

عبداللہ چپت کھا کر بلبلا اُٹھا ——— اس کے آنسو اس کے حلق میں اٹک گئے اور یکایک حلیمہ کے چہرے پر بکھری اونٹوں کے بالوں کی نرمیاں پھیل گئیں ۔ اس نے جھک کر عبداللہ کو اٹھا لیا اس کے میلے رخساروں کو چُوما ——— اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ۔

حرث بن عبد العزیٰ نے حلیمہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے اور نہ جانے کیوں جس طرح عبداللہ کے خرخراتے ہوئے قہقہے متعدی ثابت ہوئے تھے بالکل اسی طرح حلیمہ کے آنسو بھی متعدی ثابت ہوئے ۔ حرث کی ٹھوڑی غیر اختیاری طور پر کانپی اور وہ گھوم کر دروازے سے باہر نکل گیا ۔

انیسہ اور خذامہ نے باپ کی طرف دیکھا اور اپنا اپنا سر خاموشی سے اس کے کندھوں پر رکھ دیا ۔ نہ جانے جذبات کی وہ کونسی بے پناہ شدت تھی جس نے حرث کو مجبور کر دیا ۔ اس نے اپنی ٹھوڑی اپنی دونوں بچیوں کے سر پر دبا کر دونوں کا چہرہ اپنی گھنی داڑھی کی اوٹ میں چھپا لیا ۔

رات کی گھرتی ہوئی تاریکیوں میں گوشت بھوننے کی خوشبو تحلیل ہو رہی تھی ، اور قریب کے خیموں سے قہقہے گونج رہے تھے ۔

چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ایک پست سی چٹان پر بڑھتے ہوئے اندھیرے میں لیٹا ہوا ایک انسانی سایہ کانپ رہا تھا ۔ حرث نے غور سے دیکھا ۔ ایک آدمی آسمان کی طرف ہاتھ اچھال اچھال کر پکار رہا تھا ۔ اس کی دھیمی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی ۔

"یا محشرِ یہود ـــــ یا محشرِ یہود!"
حرث نے اپنے حلق اور سینے پر گرم گرم آنسو محسوس کئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
"شمیمہ دیکھو کون ہے وہ ـــــ چلو گی تماشہ دیکھنے!"
انیسہ اور شمیمہ نے ہاتھ کی پُشت سے آنسو پونچھے اور سامنے کی طرف دیکھا۔
حرث کے پاؤں خود بخود پہاڑی کی طرف اُٹھنے لگے۔

(۲)

حرث اگر چاہتا بھی تب بھی تیزی سے نہ چل سکتا لیکن وہ جلدی جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ "یا محشرِ یہود ـــــ یا محشرِ یہود" کی آواز سُن کر مکّہ کے متموّل یہودی حریدیہ نیاں کے جُبّے سرسراتے اس کے کندھے سے کندھا چھیلتے گذر رہے تھے۔ انہیں دلچسپی تھی اس آواز میں۔ شاید تجارت میں زیادہ منافع ہوا ہو، یا شاید کوئی اور خوشخبری سُننے میں آئے۔ سنانے والا جو خبر بھی دینا چاہے حرث کو یقین تھا کہ وہ خبر یہ نہیں ہو سکتی کہ مکّہ کے کسی سردار نے غریب بدوؤں کے لئے لنگر کھول دیئے ہیں جہاں وہ اور اس کی بھوکی بچیاں پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتی ہیں۔
اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ حرث کو تو کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنا تھا۔ انتظار کا طویل دن آنکھوں میں کٹا تھا۔ اور اب ناامیدی، مایوسی اور درد و کرب کی لامتناہی گھڑیاں سامنے تھیں۔ ایک طویل رات ـــــ بھوک کی چکّی میں پِستی ہوئی بے رحم ظالم رات سامنے تھی۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پچاس قدم کا فاصلہ ختم نہ ہو۔ وہ تمام رات چلتا رہے یہاں تک کہ صبح ہو جائے "اور حلیمہ پھر قسمت آزمانے کے لئے رؤسائے مکّہ کے گھروں کی طرف نکل پڑے۔
کاش! ـــــ کاش ایسا ہو جاتا۔ کاش شمیمہ اور رغدامہ کسی بھی غلط فہمی میں مبتلا کی جاسکتیں۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چیونٹی کی چال چلنے کے باوجود حرث چٹان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے انتہائی بے دلی سے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ مکّہ کے متموّل تاجر، بڑی بڑی توندوں والے سود خور یہودی اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان کے ریشمی لبادوں میں سے لبیارخوری کی سوندھی سوندھی خوشبوئیں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سب کتنے مطمئن تھے اور کھانے کے علاوہ دوسری باتوں میں گہری دلچسپی لینے کے لئے اُن کے پاس کتنا وقت تھا؟
حرث حیران ہو رہا تھا اور اسی حیرت کے عالم میں اس نے اعلان کرنے والے کی تقریر کچھ سُنی کچھ کانوں کے پردوں تک پہنچنے کے باوجود اس کے دماغ تک نہ پہنچ سکی۔
"یا محشرِ یہود" اعلان کرنے والا کہہ رہا تھا "میں یثرب سے آیا ہوں، میں نے مہینے کا سفر آٹھ دنوں میں طے کیا ہے، راستے کی گرد ابھی تک میرے جسم پر ہے۔ میں تمہیں بہت بڑی خبر سُنانے آیا ہوں"
لوگوں نے شور مچایا "سُناؤ ـــــ سُناؤ" لیکن حرث کے ہونٹوں سے آواز تک نہ نکلی۔ اُس نے کنکھیوں سے اپنی دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا جو اس کے کندھوں پر ٹیک لگائے تھکی ہوئی آنکھوں سے پُرجوش یہودیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ دلچسپی لے رہی ہوں، شاید وہ اپنی بھوک کو بھول چکی ہوں۔ ہاں شاید! لیکن حرث اِن دونوں سے پوچھ کر اپنے خیال کی تصدیق کرنے سے ڈرتا تھا۔ اس نے پھر اسی بے دلی سے اعلان کرنے والے کی طرف دیکھا اور کچھ سُنا۔
"مقدس صحیفوں میں جس نبیؐ کے آنے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ آنے والا ہے یا آچکا ہے۔ آج سے آٹھ دن پہلے میں نے مدینے میں اُس ستارے کو طلوع ہوتے دیکھا تھا جس کے ماتحت اس آخری نبی کو آنا تھا۔"
اس کے بعد کہنے والے نے ایک پھیکی تقریر کی۔ طویل، بے مزہ۔ کہیں سلطنتوں کے اُلٹنے کا نقشہ دکھایا، کہیں پرانے مذاہب اور خیالات کی تنسیخ اور ترمیم کی خبر سُنائی۔ یہودی قوم کے سر پر خطرے کے جو گھنگھور بادل گھر رہے تھے ان کی اطلاع دی اور یہودیوں کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے ہر ہتھیار سے سج جانے کا مشورہ دیا۔ وہ سب کچھ کہتا رہا اور حرث سوچتا رہا کہ آسمانی صحیفوں میں کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نبیؐ کے پیدا ہونے کی وجہ سے بادیۂ بنو سعد پر سچ مچ کا پانی برسانے والے بادل گھر آئیں گے، ان کے جوہڑ اور تالاب بھر سکیں گے، ان کے جیلے اور سوکھے نخلستان ایک دفعہ پھر سرسبز ہو سکیں گے، ان کی بکریاں پورا چارہ حاصل کر سکیں گی "اور اتنا دودھ دے سکیں گی جس سے حرث، حرث کی اولاد اور قبیلے والے سیر ہو سکیں!
لیکن یہودی اعلان کرنے والے کی خوشخبری میں اور سب کچھ

تھا۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ عرب کے رہنے والے مشرق سے مغرب تک حکومت کریں گے۔ اگر نہیں کہا تو یہی کہ حرث کی بات بھی آرام سے کٹ جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد حرث کو نیند آ گئی اور بچے سو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے اپنی انتہائی بلند آواز میں باتیں کرنے لگے۔ اتنا شور کہ اپنا ہی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے شرارے جھڑ رہے تھے اور ان کے منہ میں جھاگ تھی۔

لیکن حرث کو ان سب پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے مڑا اور دھیرے دھیرے چل دیا۔ کدھر اور کہاں؟ اس کی اسے خود خبر نہیں تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کو آزاد چھوڑ دیا، انہیں پوری اجازت دیدی کہ جدھر چاہیں اسے لے جائیں۔

اور پاؤں اس کو اس کے خیمے کی طرف لے گئے۔ وہ عجیب خود فراموشی کے عالم میں بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے چونک کر دیکھا۔ طلوع ہوتے ہوئے چاند کی زرد اداس روشنی اس کے خیمے کو اپنے ہمہ گیر آغوش میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ قریب کے خیموں سے گانے کی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کے خیمے میں اندھیرا تھا!

حرث چند لمحوں کے لئے ٹھٹکا۔ لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اس کے ذہنی افق میں ایک سوال ابھرتا رہا۔ "حلیمہ ــــــ کہاں ہے؟ عبداللہ کا کیا ہوا؟"

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر پڑے ہوئے کمبل کو ہٹایا۔ چاند کی دھیمی روشنی کا نیم تاریک سایہ خیمے میں پھیلے ہوئے اندھیرے سے دست و گریباں ہو گیا اور تاریکیوں کے جنگل میں سسکتی ہوئی روشنی نے حرث کی پھیلی ہوئی آنکھوں کو دکھایا کہ عبداللہ فرش پر بے خبر پڑا سو رہا تھا اور حلیمہ اس کے قریب لیٹی تھی۔ جیسے بیہوش ہو گئی ہو۔ حرث لپک کر آگے بڑھا۔

"حلیمہ"۔ اس نے دروازے کے کمبل کو فرش پر چھوڑ دیا۔

"حلیمہ!" اس نے دوسری دفعہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

حلیمہ نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کی جھکتی ہوئی آنکھوں میں ایک نور تھا۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر حرکت کھیل رہی تھی۔ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا "ہاں ــــــ مجھے قبول ہے۔"

حرث اور حیران ہو گیا۔ اس نے لپک کر حلیمہ کا کندھا پکڑ لیا اور جھنجھوڑ کر کہا۔

"حلیمہ ــــــ میری طرف دیکھو میں ہوں حرث ــــــ تمہارے بچوں کا باپ۔"

حلیمہ نے غور سے حرث کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ سمٹ گئے۔

"اوہ ــــــ یہ کیا غضب کر دیا تم نے حرث ــــــ"

"کوئی خواب دیکھ رہی تھیں ــــــ؟"

"کاش ساری زندگی اس خواب میں ڈھل جائے۔"

"اونہہ ــــــ" حرث فرش پر بیٹھ گیا اور دونوں بچوں کو بغل میں لے کر بولا۔ "دیکھا ہوگا، ہماری بکریوں نے دودھ دیا ہے، ہماری کھجوریں لدی ہوئی ہیں، ہمارے گھر میں پنیر کے ڈھیر لگے ہیں۔"

"نہیں حرث ــــــ! میں نے دیکھا ایک نور کی سیڑھی آسمان سے اتری ہے اور میں اس کی مدد سے آسمان کی طرف بڑھتی جا رہی ہوں۔ بلند ــــــ آگے ــــــ اور آگے۔ کوئی غیر مرئی ہاتھ مجھ پر پھول برسا رہے ہیں، ان دیکھے ہونٹ نغمے الاپ رہے ہیں۔ میں پھولوں اور نغموں میں گھری بڑھتی جا رہی ہوں، یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی ہوں جہاں نور ہی نور ہے۔ اور پھر جیسے کہیں غیب سے ریشمی لبادہ مجھے اڑھا دیا جاتا ہے۔ اور کوئی مجھ سے پوچھتا ہے۔ حلیمہ قبول ہے یہ لبادہ؟ ــــــ! آہ حرث کاش نہ جگاتے تم مجھے۔"

"اس لبادے میں کوئی ایسی چیز بھی تھی جو ان بچوں کو کھانے کے لئے دی جا سکتی ہے۔"

حلیمہ کی لمبی لمبی پلکوں والے پپوٹے اس کی سیاہ آنکھوں پر جھک آئے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اور بولی۔

"ستو جو ہیں ــــــ تھیلے میں نیچے پڑے ہیں۔"

ان الفاظ نے جادو کی چھڑی کا کام کیا اور خیمے کی خاموش فضا میں زندگی لہرانے لگی۔

چند لمحوں کے بعد ضمرہ اور شمیہ کی ہلکی ہلکی ہنسی حرث کی بلند آواز اور حلیمہ کی مسکراتی ہوئی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔

حرث نے پوچھا "تو پھر ــــــ اس دفعہ بغیر بچے ہی کے واپس جانا ہوگا۔"

"کہا کیا جائے ——— یہ تو دراز گوش نے دھوکا دے دیا ہم کو۔ ایسی دھیمی چال چلی ہے کہ قبیلے والے منزلوں ہم سے آگے چلے آتے۔ جتنے بچے تھے ان کے حصے میں آ گئے۔"

"تو کیا بصرہ میں کوئی بچہ اور ہے ہی نہیں؟"

"سردار عبد المطلب ہیں نا ——— کعبے کے متولی ———"

"ہاں۔"

"ان کا یتیم پوتا ہے۔"

"تو سردار اپنا پوتا تمہیں نہیں دیتے کیا پالنے کو؟"

"دینے کو تو انہیں انکار نہیں۔ لیکن یتیم بچہ انہیں کیا فائدہ ہوگا اس سے؟"

"کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔ آخر اتنے بڑے سردار کا پوتا ہے۔ فائدہ کیوں نہ ہوگا۔"

"مجھے تو امید نہیں۔"

"اگر بچہ لئے بغیر واپس گئیں تو بنو سعد والے ناک میں دم کر دیں گے کہ حلیمہ کو بچہ نہیں ملا۔ اس کے علاوہ قحط ہے، بُرا حال ہو رہا ہے فاقوں سے۔ بچہ نہ کچھ آسرا تو ہو ہی رہے گا۔ میرے خیال میں تو یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔"

"کوئی اور بچہ مل جاتا تو بڑا اچھا تھا۔"

"اور اگر کوئی بھی نہ ملا تو بہت برا ہوگا ———" پیٹ میں ستو پہنچے تو حرث بن عبد العزیٰ کو بھی چلتے ہوئے فقرے سوجھنے لگے تھے۔

"یہ بات تو ہے۔" حلیمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میری مانو تو صبح صبح سردار عبد المطلب کے وہاں چلی جاؤ ——— تم نے بچہ دیکھا بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر صبح پہنچو۔ نہیں لے اڑے گا کوئی اور۔ اور تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔"

"اچھا جاؤں گی صبح۔"

"تو تمہیں لبادہ قبول ہے؟" حرث نے ظریفانہ سنجیدگی سے پوچھا۔

"حرث!" حلیمہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔ "ہر بات کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔ نہ جانے کیا راز ہے اس میں۔ ایسا خواب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"مذاق کی اس میں کیا بات ہے۔ میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ——— ہو سکتا ہے کہ جو لبادہ تمہیں اڑھایا گیا تھا وہ یہی یتیم ہو ———"

حلیمہ نے غور سے حرث کے چہرے کی طرف دیکھا۔ حرث واقعی پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور حلیمہ نہیں، حلیمہ کی روح کو جیسے یقین ہو گیا تھا کہ حرث سچے ہیں، جیسے حرث نہیں حرث کے پردے میں کوئی اور بول رہا ہو۔ وہی ان دیکھے ہونٹ جیسے حرث کے نظر آنے والے ہونٹوں کی مدد سے وہی سوال کر رہے ہوں۔

"حلیمہ قبول ہے یہ لبادہ؟"

اور حلیمہ کا دل، حلیمہ کا دماغ، حلیمہ کی روح ——— حلیمہ کی ساری کائنات اپنی بلند ترین آواز میں پکار اٹھی۔

"مجھے قبول ہے ——— مجھے قبول ہے۔"


آپ کو
معلوم نہیں
کہ آپ
ایک خطرناک فیصلہ کر رہے ہیں!
اگر آپ اپنے جلدی روگوں کے لئے
سرجنوں اور جراحوں کے نشتر میں شفا ڈھونڈتے ہیں
سرخ سپید زرد اور سبز مرہموں میں تسکین ڈھونڈتے ہیں
آپ کو لازم ہے
کہ اپنی اولین فرصت میں مقامی دوا فروش سے
ولروز طلب کریں
کیونکہ ولروز بغیر اپریشن ڈریسنگ اور پھاہے
کی مداخلت کے تمام جلدی امراض سے
نجات دلاتی ہے
قیمت
۱۲/ - ۱۲/ - ۸/
ہر مشہور دوا فروش سے ملتی ہے
۱۹۰۴ء
سے
استعمال میں ہے
آنریبل ڈاکٹر سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کے سی ایس آئی
ولروز کے متعلق تحریر فرماتے ہیں
"میرے بائیں بازو کا پھوڑا جس نے آپ کو دکھایا تھا مجھے
پچھلے دو سال سے تکلیف دے رہا تھا میں نے اس پر کئی ایک
دوائیں برتیں مگر سب بیکار۔ میں بمسرت کہتا ہوں کہ ولروز کی
دو چھوٹی شیشیوں نے اس کو بالکل اچھا کر دیا۔ جس کے لئے
میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں"
(ترجمہ انگریزی)

کی طرف گویا دستِ دعا پھیلائے تھا۔ اس نے سوچا شاید یہ درخت تنگ آکر آسمان کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے، اس پگڈنڈی کی طرح جس کی یہ خواہش ہو کہ وہ آسمان کو چھو لے، ہونہہ، آسمان کون چھو سکتا ہے۔ اک آرزوئے ناتمام ——— یہ میٹھے میٹھے پیارے پیارے دلنواز اور ناممکن خواب حقائق سے کس قدر دُور ہوتے ہیں۔ اس کے جسم کے اعضا میں ایک اینٹھن، ایک تڑپ، ایک گھبراہٹ سی دوڑ گئی۔ مکی کے لہلہاتے ہوئے کھیت پیچھے رہ گئے تھے بھٹوں کے ریشوں کی خوشگوار خوشبو فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ گاؤں قریب تھا کبھی کبھی کوئی مسافر بھی مل جاتا تھا۔ اس کے سفید کپڑوں سے متاثر ہو کر اسے سلام کرنے کے بعد دُور تک پلٹ پلٹ کر دیکھتا جاتا تھا۔ ایک پہاڑی عورت پنجوں کے بل ہولے ہولے چلی جا رہی تھی۔ اس کی برف کے مانند سفید گول بھری ہوئی بانہیں کہنیوں سے کچھ اوپر اٹھی۔ چال کی گت پر تال دے رہی تھیں اسکے سر پر دودھ بھرا مشکا یوں ٹکا ہوا تھا جیسے جسم ہی کا حصہ ہو جیسے اس پانچ سات سیر کے بڑے مشکے کو سر پر رکھے ایک بار بھی ہاتھ سے چھوئے بغیر وہ وادی تک پہنچ جائے گی۔ قریب ہی دو چار جھونپڑیاں، کھڑیا سے لپی ہوئی، ناشپاتیوں اور سیبوں کے درختوں سے گھری ہوئی تھیں کچی، سبز، چھوٹی چھوٹی ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر چند گائیں بھینسیں ایک ہی قطار میں گھاس چر رہی تھیں۔ منڈیر کے سامنے گوبر کے ڈھیر پر مرغے مرغیاں بول بول کر اور خاک اُڑا اُڑا کر اس کے چاروں طرف چکر لگا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کڑک مرغی چیں چیں کی نہ ختم ہونے والی آواز سے اپنے پنجوں سے زمین کرید کرید کر کیڑے مکوڑے ڈھونڈ رہی تھی، اور کٹ کٹ کی آواز سے دوسری مرغیوں کو بلا رہی تھی۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا۔ اور ایک کسان نمودار ہوا۔ اس کی عمر چالیس پنتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر وہ ساٹھ سے کم دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اور جھریوں سے غم، بھوک، فکر اور غلامی ——— صدیوں کی غلامی ——— ابدی غلامی ——— اور آنکھوں سے افسردگی اور بےچارگی جھلک رہی تھی۔ اس کی پیٹھ کبڑی ہو چکی تھی۔ اس کے بازو غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے وقت وہ انہیں زور زور سے حرکت دے رہا تھا۔ وہ گائیڈ کو گھورتا ہوا اس کی جانب آیا۔ گویا اسے فوراً پہچان لیا ہو گائیڈ نے رسمی طور پر علیک سلیک کی دو چار منٹ کے لئے اس کے پاس رکا اور پھر چل پڑا۔

"صاحب، اس کا نام غلی جُو ہے۔ جب یہاں برف پڑتی ہے، تو یہ نیچے میدانی علاقوں میں محنت مزدوری کے لئے چلا جاتا ہے۔ اس کے پاس آجکل دو تین سو روپیہ ہو گا، بڑا خوش نصیب ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر یہاں کوئی مناسب دل خواہ نوکری نہ ملی تو کسی میدانی علاقے میں چلا جاؤں۔ بہن کا ابھی بیاہ کرنا ہے کہتے ہیں پنجاب میں لوگ یہاں کی نسبت زیادہ خوشحال ہیں۔ ایک آدمی روزگار کی تلاش میں پنجاب گیا ہوا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا" اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں سال سے اس پگڈنڈی پر چلا جا رہا ہے۔ اسے اس امر کا احساس ہی نہیں کہ اس کی قسمت اچھی ہے یا بری۔ وہ اپنی قسمت پر نہ شاکر ہے نہ رنجیدہ۔ اس کی زندگی غربت کے بوجھ تلے پستی چلی جا رہی ہے۔ اور سر پر مفلسی اور اداسی چھائی ہوئی ہے۔ اور اس کی بہن کی شادی کا غم ایک خوفناک عفریت کی طرح اس کی روح پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک پھیکی سی نم آلود مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پنجاب میں یہ فکر معاش کے لئے جائیگا۔ وہاں کیا رکھا ہے؟ خاک کمائے گا؟ بہت میلی نیکر اپنی ہو گی پھٹی ہوئی قمیص اور ہاتھ میں ایک مضبوط سا کلہاڑی، کسی دکان کے آگے لکڑیاں چیرے گا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ، یا دو من کوئلوں کی بوری اٹھانے کے لئے بڑھے گا کہ کسی طرف یاس انگیز نگاہوں سے دیکھا کرے گا۔

"ایک من لکڑی چیرنے کا کیا لیتے ہو؟"

"چھ پیسے۔"

"چھ پیسے۔ صرف چھ پیسے" اسے آج کے دن کی کمائی صرف چھ پیسے۔"

"صاحب، لوگ چھ پیسے بھی نہیں دیتے۔"

اور ایک دن ریڈیو کا سوچ گھماتے گھماتے اچانک وہ سُنیگا "لاہور میں ہیضہ پھوٹ پڑا، بازار تیزابیاں میں کل پندرہ کیس ہوئے۔ سات مر گئے، ایک کشمیری کی حالت خطرناک ہے"...

... اچانک اگر یہ ہیضے سے بچ گیا تو ایک رنگین شام کو انارکلی کے چوک کے قریب اچانک ایک حادثہ ہو جائے گا۔ خوب بھیڑ ہو گی، پوچھنے پر معلوم ہو گا، ایک مزدور جو بھاری بھرکم ٹرنک کے اوپر ایک بستر اٹھائے ہوئے سڑک پر عین موٹر کی سمت میں دوڑا جا رہا

تھا، موٹر کے نیچے آکر بُری طرح کچلا گیا ہے۔ ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا اس نے بریک بھی دبائی، مگر جب تک بات دیر ہو چکی تھی۔۔۔ وہ مر گیا بیچارہ۔"

"او ہو! بیچارہ مر گیا!"

"صاحب، اس سڑک پر ہو جائیے، یہاں سے شیلو کی وادی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھئے! آپ کا بنگلہ ہے۔" وہ بنگلہ ایک آبشار میں اتر چکی پگڈنڈیاں لے کر وہ ایک سڑک پر آ پہنچا تھا۔ دونوں طرف اونچے اور سایہ دار درختوں نے راستے کو اپنی گود میں چھپا رکھا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں کبھی ... اور کبھی دھان کے کھیت۔ سفر قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ ... پہنچنے اور رگھو ... کا خیال آ گیا۔ شیدا ایک عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ ایک اشتیاق سا اسکے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے چنار کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند اشخاص خوف سے لوگوں کی ٹکٹکی میں دبکے ہوئے دبکے نظر آ رہے تھے ان کے ... بے حس و حرکت اور ناامید ... تھے۔ بچے اور بوڑھے عورتیں اور جوان اشکوں ... کیں ... ہونٹ ... پڑے چہرے اور جلی جلی کھوئی کھوئی سی آنکھیں، جیسے کوئی لاش کفن میں لپٹی ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات اس مختصر سے ہجوم کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ سب کے سب بڑی ... طرح پُر معنی نگاہوں سے دیکھتے اور پھر دبی دبی سرگوشیاں کرتے تھے۔

"گلاب" شیدا خوشی سے بے اختیار ہو کر زور سے چلایا اور گانے لگا

اڑ اڑ جا میرا نیلا جانور جا رے

... میاں ... مل

دل ... نہ چھپے ...

... ساتھ دیکھ لو

باغ ... کے پھول

——— اوم ... ہوئے ... کے گھیرے میں چنار کے درخت کے نیچے ازل ... !

——— برف پگھلی ہوئی ہے ندی کنارے ... پھوٹ نکلی ہیں، نرگس، گلاب، یاسمین، نشاط باغ کے پھولو!

——— شگوفہ بن کر آیا۔ بید مشک کی مہک ہمارے ڈونگے تک آ پہنچی ہے، اور حسینہ ... پر جانے کی پتیاں ڈال!

——— او حسینہ! میں ڈونگا لے کر ... ڈونگے کو باہر لے چلتا ہوں، تم چپو چلانا ۔۔!

کوہستانی گانا گانے جب دیکھا کہ وہ کافی بکا ہے اور ابھی تک گلا بھرا ... کو

سالگرہ ...

بھی اس چنار کے درخت کے نیچے سے انکے قریب نہیں آیا تو وہ دوبارہ چلایا "گلاب" ... گیا۔ اور چنار کے درخت تلے بیٹھا ہوا مختصر سا ہجوم ایک جھٹکے سا اٹھ کھڑا ہوا۔ سڑکوں پر کام کرنے والے قلی، پگڈنڈیوں پر راستہ دکھانے والے کوہستانی، کھیتوں پر کام کرنے والے کسان سب صاحب کا منہ تکنے لگے ——— یکایک بڑا دُکھ سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی اور سب نے ایک دوسرے کا منہ تکنا شروع کر دیا، مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عورت بڑا دُکھ سے باہر نکلی، منہ چھپائے ہوئے بے بسی اور شرم کے بوجھ سے اسکی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان شکلوں سے خائف ہے۔ اسکی نظر ... سے دور تک ... غائب ہو جانا چاہتی ہے۔

"بہن" کا نام ... کوہستانی چلایا اور بھاگ کر اس عورت کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ وہ عورت اسکے پاؤں پر جھک گئی اور ایک عجیب گریہ سر سراہٹ اور گڑگڑاہٹ کی مسلسل آواز جو عموماً پانی کے شکستہ نل سے پیدا ہوتی ہے اسکے کانوں میں سنائی دینے لگی۔ اس عورت کی سسکیاں، اسکی بے بسی، اسکی بےکسی جیسے اسکی روح نہایت سختی سے کچلی گئی ہے۔ جیسے کسی نے یکایک گلا گھونٹ کر ان دونوں بہن بھائی کو ارڈالا ہو۔ انکی آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے ہیں اور آواز حلق میں اٹک گئی ہے۔ کوہستانی نے گھوم کر اپنی گردن کو اس بیقراری سے گلاب کی طرف جنبش دی جیسے اسکے سر میں شعلے لہرا رہے ہوں جیسے کہہ رہا ہو تمہاری آنکھوں کے سامنے میری بہن کی بے حرمتی کی گئی اور تمہارے خون میں کسی قسم کی بھی جوش نہ آیا۔ سب کے سب جاکر و لہر میں ڈوب گئے گئے۔ زرد چہروں پر ایک نئے ناٹے کا تھپڑ پڑا ہے اور تمہاری ٹوپیاں زمین پر آرہیں اور تم ٹوپیوں کو چپکے سے اٹھا لیتے ہو اور اسکی بیقرار سرخ آنکھیں زرد چہروں پر جم گئیں اور جبڑیاں جیسے ہونٹوں سے دبی آواز میں ابھریں اور مٹ گئیں۔

"صاحب تم دیکھ رہے ہو میں برباد ہو گیا ہوں، میں کوڑی کا نہیں رہا۔ صاحب تم چپ ہو صاحب" اور صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک تاریک سا سایہ آسمان سے اتر کر زمین پر چھا گیا ہے۔ یہ چیز ایک پُراسرار تاریکی میں گم ہوتی جا رہی ہے آسمان زمین اور تاریک آلود لامحدود فضا، کوہستانی اور اسکی بہن، دو دُکھ بھرے ہوئے دھندلے دھندلے سائے کہیں کھو گئے ہیں اسکا سارا جسم جھجھک اور گھبراہٹ سے پسینہ لہرا رہا ہے جیسے اندر بجلی بھر دی گئی ہو اور سامنے کھڑے ہوئے مختصر سے ہجوم کا گلا گھٹ کر رہ گیا ہو "صاحب تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہم جانتے ہیں ہم غریب ہیں، ہم بزدل ہیں اور شاید بے غیرت بھی، کیونکہ ڈپٹی صاحب کی یہی خواہش ہوتی ہے، اور ان کی خواہش ان کا حکم ہے اور انکا حکم ہمارے لئے قانون ہے۔"

پھر فاصلے پر ایک کُتیا، کمزور، ہڈیوں کا ڈھانچہ، اپنی خارش زدہ کھال چنار کے ایک درخت سے رگڑ رہی تھی۔ اور چنار کے پتوں میں بیٹھی ہوئی فی سے ایک عجیب سرسراہٹ سی پیدا ہوئی اور ایک گلا سڑا ہوا سا لا دینے پتا ٹوٹ کر ہوا میں پھڑپھڑانے لگا۔

احمد شجاع پاشا بی اے

چنے اور چائے

ان کے لئے بسکٹ اور چائے۔ ان کے لئے چنے اور گڑ۔ چائے ایک خوبصورت طشتری میں لائی گئی۔ اور چنے ایک میلے کچیلے رومال میں۔ چائے میز پر رکھ دی گئی۔ اور چنے زمین پر۔ میز پر دودھ سا سفید میز پوش تھا اور زمین پر تھوک اور بلغم۔ وہ خود بخود کرسیوں پر آ بیٹھے۔ اور للچائی ہوئی نظروں سے پلیٹوں میں پڑے ہوئے بسکٹوں کو دیکھنے لگے۔ انہیں فوراً زرد غبار خاموش کھڑے رہنے کا حکم ملا۔ اور مٹھی مٹھی بھر چنے ہر ایک کے کیسے میں بھر دیئے گئے۔ دینے والے کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ جیسے وہ بہت بڑا سخی ہو۔ نئی دنیا کا حاتم ہو۔ اور لینے والوں کے چہروں پر سرخیاں سی دوڑ رہی تھیں۔ جیسے انہیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

وہ چائے پینے لگے اور وہ ٹک ٹک کر چنے چبانے لگے۔

دونوں انسان تھے۔ دونوں اسی دنیا کے رہنے والے تھے۔ دونوں کے سر پر آسمان اور پاؤں تلے زمین تھی۔ دونوں کو گرمیوں میں گرمی اور سرما میں سردی محسوس ہوتی تھی۔ بھوکے پیٹ نہ تو وہ سو سکتے تھے نہ انہیں چین ہی میسر ہوتا تھا۔ سینوں میں دل دھڑکتے تھے۔ دل میں امنگیں کروٹیں لیتی تھیں۔ تمنائیں مچلتی تھیں۔ سب کچھ ایک ہونے پر بھی ان میں فرق تھا۔ وہ چائے پینے والے تھے اور یہ چنے کھانے والے۔

بہت کام تھا آج۔ پو پھٹنے سے کچھ عرصہ پہلے سب کے سب کام پر چلے گئے۔ دوپہر کے وقت آدھ گھنٹے کے لئے کھانے کی چھٹی ملی۔ پھر وہی مضبوط ہات۔ وہی بھرے بھرے بازو۔ وہی پسینے میں شرابور جسم اور وہی کام۔ پہاڑ سی رات سر پر کھڑی تھی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھندلکے پھیلتے جا رہے تھے مگر مشینیں چل رہی تھیں۔ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کام باقی تھا۔ کام ابھی ختم نہ ہوا تھا۔

"آج سوائی کتنے بجے تک ہے۔۔" جھنڈے خاں نے پوچھا۔

"آج کام ختم کر دیا جائے گا۔۔" افسر نے جواب دیا۔

"مگر صاحب ہم لوگ تھک گئے ہیں۔۔" جھنڈے خاں گھگھیایا۔

"یہاں تھکن کا نام نہ لو جھنڈے خاں۔۔ تھک جانے والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔۔"

"اور اب بھوک بھی تو لگ رہی ہے۔۔" جھنڈے خاں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اس کا انتظام کر دیا جائیگا۔۔"

"اتنے آدمیوں کا انتظام کیونکر ہوگا حضور۔۔"

"دیکھو زیادہ باتیں نہ بناؤ۔۔ کام کرو۔۔ ہمیں یہ مال دوسروں سے پہلے مارکیٹ میں بھیجنا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہہ دو انہیں کام کرنا پڑے گا۔" جھنڈے خاں کے چہرے پر افسردگی چھا گئی اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے۔ پلکیں بہت بوجھل ہو گئیں۔ اور آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ابھی کام ہے۔۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مشین میں کرنٹ چھوڑ دیا گیا ہے۔ پرزوں کو چلنا ہے دن بھر۔ رات بھر۔ صبح سے شام تک۔ شام سے صبح تک مشین چلتی رہے گی۔ پرزے کام کرتے رہیں گے۔ مال تیار ہو جائے گا مارکیٹ میں چلا جائیگا۔ مگر جھنڈے خاں کو کیا ملے گا۔ اس سے اس کے بچے اسی طرح بھوکے رہیں گے۔ اس کی بیوی کی شلوار میں اسی طرح سیکڑوں پیوند لگے رہیں گے۔ وہ اسی طرح بنیے سے ادھار لیتا رہیگا اسی طرح گھر کے برتن بھانڈے بیچتا رہیگا۔ یہ سوائی کے چند ٹکے جو زیادہ ملیں گے اسے وہ ضرور دوا پر خرچ ہو جائیں گے۔ اور جھنڈے خاں خاکی رنگ کی پھٹی ہوئی شلوار پہن کر پھر مال تیار کریگا دوسروں کے مال سے پہلے مارکیٹ میں بھیجنے کے لئے۔

"تم ہمارے لئے کام کرو۔۔ ہم تمہیں بہت کچھ دیں گے۔۔" یہی کہا تھا صاحب نے۔ کتنے عرصہ سے وہ اور اس کے ساتھی کام کر رہے تھے اس کے لئے۔ کچھ بھی نہ دیا تھا صاحب نے۔ ہر نئی افتاد کے وقت نیا وعدہ کر لیا کرتا تھا وہ۔ مگر ایفائے عہد کو کسر شان سمجھتا تھا۔ کچھ دینا دلانا تو درکنار اس نے یاد دہانی کرنے والوں کو

برداشت کر دیا تھا۔ نکالا ... بابو اپنے دفتر سے۔
انہوں نے کہا

"صاحب آپ اپنا غصہ دبا لیجئے۔ ہم مزدوروں کو بھی تو اپنے حقوق ... دوسروں سے پانچ منٹ زیادہ کام لیا جا رہا ہے۔"

"... ہو گئے کہ تمہیں کچھ دبا لیا جائے۔ بہت کچھ دیا ہے ... کیا تمغہ دوں تم کو۔ کونسا تمغہ لگا دوں تمہارے ..."

انہوں نے ... کی بھویں تن گئیں۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"تم ... کام ... سب تو چپ چاپ ... کا ... میں ... کوشش کر رہے ہو ... قابل اعتراض ہے۔ تم میرے ... قابل نہیں ... اس جگہ رہنے دی جائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ خاموشی سے چلے جاؤ چپڑاسی تمہیں ... دروازے تک چھوڑ آئے گا۔۔" چپڑاسی انہیں ... دروازے تک چھوڑ آیا۔ وہ چلے گئے اور چپڑاسی واپس آ گیا۔

———خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کام کرنے والوں کے دل ... میں آ گئے۔ اور ان کے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی ———

بہت کام تھا آج۔ کوئی بغیر اجازت نہ جا سکتا تھا۔ بھوکے پیٹوں ... کا انتظام ہو چکا تھا۔ مشین کو تیل دیا جا چکا تھا۔ صرف ... ——— ان کے لئے چائے آ گئی ...

وہ چائے پینے لگے اور وہ ... پیٹ سہلانے لگے۔

"... پیتے ہیں۔۔" ... نے کہا۔

"کون جانے کیوں پیتے ہیں۔۔" جھنڈے خاں کی آواز گلوگیر تھی۔

"اوئے ایہہ چاہ" جمیل سنگھ نے کہا "لتھو کمشنگ کر دیندی ہے۔ بڑا ... کر دی ہے۔۔ آدمی میں بالکل طاقت نہیں رہندی"

"پینے تو طاقت دیتے ہیں۔۔" ... نے پھر کہا۔

"ایہہ تو ... جو ... ہیں۔۔۔ سچی بولتا ہوں تم سے چنے کھانے والا چائے پینے والوں سے زیادہ تگڑا ہوتا ہے ... ٹھیک ہے نا جھنڈے خاں۔۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔" جھنڈے خاں نے فلسفیانہ انداز سے کہا "میں روز ہی دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ چائے پی کر کچھ ایسا زیادہ کام تو نہیں کرتے۔۔"

"او جی۔۔ ہم میں ان میں بہت فرق ہے۔۔۔ ہم جمیت دا لوگ ٹھہرے۔۔ سچی کہتا ہوں پانچ پانچ چھ چھ دن بھوکے رہیں تو معلوم نہ ہو۔۔" اور وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ جھنڈے خاں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ نوکری کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کو خدا کے سہارے چھوڑ کر۔ مڈل پاس تھا وہ۔ انگریزی بھی جانتا تھا اور اردو بھی۔ انگریزی میں عرضی لکھ سکتا تھا۔ گاؤں میں لوگوں کے خط وہی پڑھا کرتا تھا۔ بڑے بوڑھے منی آرڈر بھی اسی سے لکھوایا کرتے تھے۔ وہ بھی جمیل سنگھ کی طرح زمیندار تھا۔ زمین تھی اس کے پاس۔ مگر اس میں گھاس اور دھول کے سوا کچھ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک اجنبی شہر میں آ گیا۔ کوئی ٹھکانا نہ تھا اس کا۔ کوئی دوست نہ تھا۔ کوئی ہمدرد نہ تھا۔ وہ تھا اور شہر کے سرکاری باغ کی ایک بنچ جس کا نمبر تیرہ تھا۔ اس نے نوکری کیلئے عرضی لکھی اور چند پیسے کا ٹکٹ لفافے پر لگا کر لیٹر بکس میں ڈال دی۔

———عجیب واہیات قسم کا آدمی ہے" کلرک نے سوچا۔ گھر نہیں تھا تو خط کیوں لکھا۔ بیکار مذاق کرنے کا فائدہ۔ کتنی نامعقول حرکت ہے۔ سرکاری باغ کی ایک بنچ کے پتے پر چٹھی منگوائی جا رہی ہے۔ کوئی نفنگا ہے کمبخت۔ دن بھر آوارہ گردی کرتا ہے اور شام کو پڑا رہتا ہے باغ کے اس کونے میں۔ خدا جانے پولیس اندھی ہو گئی ہے یا نظریں کمزور ہیں اس کی۔ ڈاکیے نے عینک درست کر کے پھر خط کو پڑھا۔ "جھنڈے خاں۔ بنچ نمبر تیرہ۔ سرکاری باغ" وہ بڑبڑایا۔ اس نے بہت سی ایسی چٹھیاں ضائع کر دی تھیں پہلے۔ ایسے خطوط جن کے لئے اسے کہیں دور جانا پڑتا تھا یا جن کے پتے صاف پڑھے نہ جاتے تھے۔ وہ ایسے خطوں کو اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ گھر پہنچنے پر کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے لفافے چاک کرتا خطوں کو پڑھتا اور پھر آگ کی نذر کر دیتا۔ مگر نہ جانے آج کیا ہوا تھا شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا اس عجیب قسم کے انسان کو جس نے بنچ کو گھر بنا رکھا تھا اپنا۔ یا شاید کوئی اور خیال اسے قدم بڑھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ بوڑھا ڈاکیہ۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ چٹھی کیوں لکھی گئی۔ اس میں کیا ہے وہ خود ان راہوں سے گزر چکا تھا۔ بیس سال ملازمت کی تھی پندرہ روپے مہینے پر۔ بہت کم خرچ کرتا تھا وہ اپنے اوپر۔ اور دس سال سے

بعد اس کے پاس ستر روپے کچھ آنے جمع ہو گئے تھے ——

"جھنڈے خاں بیچ نمبر تیرہ سرکاری ہاؤس" اس نے بیچ کا نمبر پڑھا اور اس پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف غور سے دیکھا۔

"جھنڈے خاں.." جھنڈے خاں ایکدم اچھل پڑا۔

"ہاں میں جھنڈے خاں ہوں.."

"تمہاری چٹھی ہے.."

"چٹھی..؟.."

"ہاں یہ لو.." جھنڈے خاں نے ڈاکیئے کے ہاتھ سے چٹھی چھین لی۔ ڈاکیہ تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا.. جھنڈے خاں نے لفافہ چاک کیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نور کی شعاعیں سی ناچنے لگیں۔

"مل گئی.. مل گئی.." وہ جوشِ مسرت سے بیخود ہو کر بولا۔

"کیا مل گئی..؟.." ڈاکیہ مجسم سوال بنا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نوکری مل گئی بڑے میاں.."

"یہ نوکری.. مگر یہ تم نے ٹھکانا خوب تلاش کیا اپنے لئے.."

"کیا کروں بڑے میاں مجبوری ہے.."

"اور وہ بھی اُلو کے پٹھے ہیں تمہیں نوکری دینے والے.. اس پتے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے ان سے مذاق کیا ہو.."

"نہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ واقعی ضرورتمند ہے.."

"خیر اب ایسی جگہوں کا پتہ دیکر ہم لوگوں کو خراب نہ کرنا.. کوئی اور ہوتا تو پھاڑ کے پھینک دیتا یہ لفافہ۔ وہ تو میں ہی تھا جو لے آیا تمہارے پاس.."

"میں بہت ممنون ہوں.."

"کیا نوکری ملی ہے نہیں.."

"مزدور ہوں اور کیا ہے.."

"ڈاکخانے میں کیوں نہیں کر لیتے نوکری.. اچھی جگہ مل جائیگی۔ تنخواہ بھی خاصی ہوگی۔ میں نے صرف دس سال میں ستر روپے جوڑ لئے ہیں.." جھنڈے خاں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکرا نہ سکا۔

"آپ نے ستر روپے جوڑ لئے..؟.."

"اور نہیں تو کیا.."

"خوب.." ڈاکیہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ مگر جھنڈے خاں کے دل پہ کچھ چھریاں سی چلنے لگیں۔ کچھ زخم سے بنتے جا رہے تھے۔ اور بوڑھے ڈاکیئے کی باتیں نمک چھڑک رہی تھیں۔ ان زخموں پر ——

ایک چھوٹا سا ایک آٹھ نو سال کی عمر شکل سے چھ سات سال کی ہو گی اس کے پاس آیا اور بغیر کچھ کہے سنے گانے لگا۔

آئے بھی وہ چلے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا

میرے لئے تو موج کا ایک بہانہ ہو گیا

اس کو ماں نے شاید سے سکھا رکھا تھا کہ بیٹا دیکھنا الگ جا کر ہاتھ نہ پھیلانا بلکہ دنیا والوں کے سامنے دستکار بنو۔ ورنہ تمہیں لوگ طعنے دیں گے اور تمہیں مجبوراً ہٹنا پڑے گا یہ لوگ کہتے ہیں ہم یہ کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگنا ہمارا پیشہ ہے تم کچھ کام کر کے دکھانا۔ کچھ تماشا دکھانا۔ ایک آدھ گانا سنا دینا۔ اور سرکاری تفریح گاہ میں آنے والے تمہاری صورت پر ترس کھا کر نہیں بلکہ تفریح کے طور پر اپنی خوشی اور اپنی دلچسپی کے لئے کچھ نہ کچھ بخش ہی دیں گے۔ لڑکا گانے جا رہا تھا۔ ختم فسانہ ہو گیا۔ موج کا بہانہ ہو گیا۔ اور جھنڈے خاں سوچ رہا تھا کہ فسانہ تو ابھی شروع ہوا ہے۔ ابھی تو پہلے باب کی پہلی سطر کا پہلا لفظ ہی نظر سے گذرا ہے ابھی تو ہیرو ہیروئن محبت کریں گے۔ ابھی تو ہیروئن کا باپ اپنی دولت دیکھ کر ہیرو کو لڑکی دینے سے انکار کرے گا۔ ابھی تو ہیرو پوٹاشیم سائنائیڈ کی پڑیا خریدے گا۔ کلائمیکس پر پہنچنے کے بعد ختم ہوگا فسانہ۔ آغاز ہی سے انجام کیسے ہو جائیگا اس کا۔

"سیٹھ.. بھوکا ہوں.." لڑکے نے کہا۔ اتنا چیخنے چلانے کے بعد یقیناً بھوک لگ گئی ہوگی اسے۔ جھنڈے خاں نے کوٹ کی دونوں جیبیں رومال کی طرح باہر کھینچ لیں اور لڑکا حسرت بھری نگاہوں سے زمین تکتا ہوا چپ چاپ چلا گیا۔

—— جھنڈے خاں ایک کارخانے میں ملازم ہو چکا تھا۔ جی تو یہی چاہتا تھا اس کا کہ وہ اپنے گھر والوں کو ڈبل تار دیدے۔ ملازمت ملنے کی خوشخبری سنا دے۔ بوڑھے باپ کو دلاسہ دے کہ وہ بیٹے کا قرض بہت جلد چکا دیگا۔ رہن رکھی ہوئی زمین چند دنوں چند مہینوں میں چھڑا لے گا۔ دمے سے بیمار ماں کے لئے کچھ دوائیں بھی خرید لے گا۔ وہ یہ سب کچھ تار کے ذریعے بتانا چاہتا تھا اپنے گھر والوں کو۔ مگر اتنی رقم کہاں تھی اس کے پاس۔ ایک تندور والے سے مہینے بھر کی روٹی کا ٹھیکہ کر لیا تھا۔ اور اسی کے پاس رات کو سو جایا کرتا تھا۔ اس نے تین پیسے ادھار لیکر ایک پوسٹ کارڈ

بٹھادیا۔ اور بیقراری سے ہیں ... انتظار کرنے لگا۔

——— اور سنسنی پھیلنے لگی سرما کی برفانی ہوا کی طرح جسم اور روح کو چھیدتی ہوئی۔ سیٹھ سکھ چند اپنے حریف نانک چند کو شکست دینے پر تل گئے۔ میونسپلٹی کے الیکشن میں نہیں ہرا دینے والا نانک چند۔ ان کا دشمن جس نے ان کے منگرٹے بیٹے کو اپنی حسین بیٹی دینے سے انکار کیا تھا۔ ... ہونے لگا۔ صبح سے شام تک شام سے صبح تک۔ اور جھنڈے خاں کی جان عذاب میں پھنس گئی۔ سیٹھ کی گالیاں۔ سیٹھ کے کارکنوں کی جھڑکیاں۔ مصیبت پر مصیبت۔ آفت پر آفت۔ اس کی ماں چل بسی۔ وہ وطن نہ جا سکا۔ اسکا باپ مرگیا۔ وہ قدم نہ بڑھا سکا۔ اس کے بچے بیمار تھے۔ اس کی بیوی اداس تھی۔ اور وہ۔ مجبور ——— وہ تنگ آچکا تھا اس ملازمت سے۔ وہ بیزار تھا اس نوکری سے۔ سیٹھ کی موٹر صاف کرتے کرتے اسکے ہاتھ گھس گئے تھے۔ سیٹھ کا ایندھن اٹھاتے اٹھاتے اسکے کندھے پتھر بن گئے تھے۔ اس کے جسم میں روح نہ رہی تھی۔ اسکی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ وہ چل پھر رہا تھا صرف ایک زندہ لاش کی طرح جیسے کسی اسٹنٹ فلم میں کوئی ڈھانچہ کسی جادوگر کے اشاروں پر ناچتا پھرے ——— اور آج بہت کام تھا ——— ان کے لئے کھانے کا انتظام ہو چکا تھا۔ وہ چاول کے پی رہے تھے اور یہ مرلوگ چنے چبا رہے تھے ——— اور رمیل سنگھ کہہ رہا تھا۔

"ہم جمیندار لوگ ٹھہرے۔ سچی کہتا ہوں پانچ پانچ چھے چھے دن بھوکے رہ لیں تو مالم نہ ہو۔۔"

ہاں۔۔ جھنڈے خاں نے سوچا جمیندار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے مضبوط۔ بڑے حوصلے والے۔۔ وہ صرف چاولوں کا پانی پی کر گزارہ کر سکتے ہیں۔ کارخانے کی مشین چل رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا ✽

ظہور الحسن ڈار

پھانسی

"کاماکے فلیٹ سے نیچے اُتر کر جب ویریندر ہتیا رچی فٹ پاتھ پر پہنچا، تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آپ کو اوپر ہی بھول آیا ہے۔

تھوڑا عرصہ پہلے جب وہ اسی فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو وہ ایک دیوتا تھا جو اپنی ایک نئی پجارن کاما کے ہاں چائے پینے کے لئے جا رہا تھا۔ جب اسے کاما کا حنائی خوشبو میں بسا ہوا دعوتی رقعہ ملا، تو اس نے سوچا کہ "چائے کی دعوت تو خیر ایک بہانہ ہی معلوم ہوتی ہے دراصل یہ لڑکی اس دیوتا کو دیکھنا چاہتی ہے جس کے افسانوں نے اسکے دل کے اندھیرے میں ننھے ننھے دیئے جلا دیئے ہیں۔" یہ سوچکر اس کے مونچھوں بھرے ہونٹوں میں ہنسی تڑپ اُٹھی، اپنے متعلق وہ ہمیشہ اسی طرح سوچا تھا۔ اور دیوتا بننے کے شوق میں اس نے سر کے بالوں اور داڑھی کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ ان میں اس کی اصل شکل کہیں گم ہوگئی تھی بچپن میں وہ ایک آوارہ گرد تھا، جنگلوں پہاڑوں اور دیہاتوں سے اسے بہت محبت تھی۔ چنانچہ گھر سے بھاگ کر جب وہ ان علاقوں میں گھومتا تو اسے ہر طرف رسیلے گیتوں کی تانیں سُنائی دیتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ گیت نہیں بلکہ دیئے ہیں جو ننھے ننھے جھلملاتے ہوئے دیئے جو ان جنگلوں پہاڑوں اور دیہاتوں کی تاریکی کو اُجال رہے ہیں۔ اس سحرکاری پر اس کا دل تڑپ اٹھا، اور اس نے ان گیتوں کے متعلق لکھنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ وہ افسانہ نگار بن گیا۔ وہ عام طور پر انہی گیتوں کے متعلق افسانے لکھتا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ انہیں پڑھکر لوگوں کے تاریک دلوں میں ننھے ننھے دیئے جل اٹھیں گے۔ چنانچہ اس کے قول کے مطابق اس نے اسی موضوع پر بے شمار افسانے لکھ کر ایک دیپ مالا رچا دی تھی جسکی روشنی سے اس دیس کا حُسن نکھر آیا تھا۔ وہ اپنے افسانہ نگار دوستوں میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ کہ "بھئی میں تو ایک آوارہ گرد آرٹسٹ ہوں مشینوں کی ہماہمی اور کارخانوں کے غلیظ دھوئیں سے دُور ہی رہتا ہوں۔ اور ان لوگوں کے دلوں کی دھڑکن سُنتا ہوں جن کے سینے ہوس سے خالی اور چہرے زہرخند سے پاک ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے دیہاتوں میں اندھیرا ہے، یہ ٹھیک ہے مگر ہندوستان کے شہر بھی تو تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ شہروں کی تاریکی میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور چیخوں کی آوازیں ہیں جو تاریکی کو اور بھی گہرا کر دیتی ہیں اور دیہاتوں کے اندھیرے میں امن و مسرت کے نغمے سُنائی دیتے ہیں، جو ننھے ننھے دیئوں کی صورت میں جھلملا اُٹھتے ہیں اور آس پاس اُجالا پھیلاتے ہیں۔ میں انہی دیئوں کو شہروں میں جلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں دیوتا ہوں، امن اور کویتا کا دیوتا۔ کیوں بھئی میں دیوتا نہیں ؟" یہ کہتے ہوئے اس کی لمبی داڑھی اور مونچھوں کے بال جیسے پھولنے لگتے۔ اور وہ اپنے آپکو ہمالہ پربت سے بھی اونچا سمجھنے لگتا۔ اس کی بیوی واقعی اسے دیوتا ہی سمجھتی تھی۔ اگر وہ اسے دیوتا نہ سمجھتی تو شادی کے بعد ویریندر ہتیا رچی کی آوارہ گردی ختم ہوگئی ہوتی، مگر ایسا نہیں ہوا وہ شادی کے بعد بھی جنگلوں، پہاڑوں اور دیہات کی خاک چھانتا رہا۔ مگر اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی، ایک سانولی اور دُبلی پتلی عورت جو دیوتا کو ایک انجانے سحر سے بچانے آئی تھی۔ مگر خود بھی اسی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ ویریندر اپنی بیوی سے بہت کم باتیں چھپایا کرتا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ ایک بہترین مشیر ہے کیونکہ دفعہ بعض ایسے مسئلوں کے متعلق جنہیں سوچ سوچ کر وہ تنگ آچکا تھا، اس نے ایسے مشورے دیئے کہ ویریندر حیران رہ گیا۔

"بھئی حد ہوگئی" وہ تعجب سے کہتا، "تم عورت نہیں دیوی ہو"

اس کی بیوی ایک دلکش انداز سے مُسکراتی اور اس کے ہونٹ دلفریب خم کھا جاتے۔

"اونہوں، دیوی نہیں بلکہ دیوتا کی پجارن" ـــــ وہ آہستہ سے کہتی اور ویریندر پھر اپنے آپ کو ہمالہ پربت سمجھنے لگتا۔ جس دن وہ زندگی کے سفر میں دو سے تین ہوئے، یعنی اس کی بیوی نے ایک

ننھی سی بچی کو جنم دیا تو وہ [illegible]

"بچی! یہ تمہیں شاید کبھی نہ سمجھ سکے گی" اس نے سوچا اور [illegible] سے پوچھا۔

"کیا اب ہم سفر کر سکیں گے؟"

"کیوں نہیں [illegible]" بیوی نے اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا "میری بچی [illegible] تمہاری شکل میں [illegible] موسیقی [illegible] ہے جیسے دیوتا نے [illegible] کی ہے۔ لیکن یہ بچی ہوگی تو ہمارے ساتھ [illegible]"

ویریندر [illegible] اس کا دل خوشی سے جھوم گیا۔ اب وہ دونوں بجائے [illegible] ہونے کے اور [illegible] دنیا پہلے سے زیادہ حسین لگنے لگی۔ وہ گیتوں [illegible] پھر کھو سے گئے۔ اور جب اچانک ویریندر کے افسانوں میں ایک ننھی سی لڑکی کا ذکر آنے لگا جو اس کے [illegible] ہندوستان کے دور دراز حصوں میں بکھرے ہوئے گیتوں کو [illegible] ہو [illegible] کہ اب ان کا ننھا [illegible] چلنا پھرنا اور بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور ان کی زندگی خلوص، وفا اور اعتماد کے جذبوں سے معمور تھی۔ ویریندر کی بیوی کو فخر تھا کہ اس کا شوہر ایک [illegible] ہے اور اس کی بیٹی اس کی لمبی داڑھی اور بالوں سے بہت مانوس تھی۔ ویریندر کو بھی اس بات کا علم تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی شہرت کی بنیادیں اپنی دو چیزوں پر استوار کی تھیں، لمبی داڑھی اور گردن سے بھی نیچے پہنچتے ہوئے سر کے بال۔ ہندوستان کا یہ [illegible] افسانہ نگار زیادہ تر اپنی اسی فقیرانہ وضع کی وجہ سے مشہور تھا۔ عام لوگ اسے درویش سمجھتے تھے۔ اور یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے، اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ویریندر کو اپنی بیوی پر بڑا بھروسہ تھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک عقلمند عورت ہے۔ چنانچہ اس نے اسے کئی ایسی باتیں بھی بتا دی تھیں جسے مرد عورت کو بتانا کبھی پسند نہیں کرتا۔ مگر اس روز کاما کا خط پا کر اس کے ذہن میں ایک عجیب قسم کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی بیوی کو بتائے بغیر کاما کے ہاں چلا جائے تو کیا ہے۔ اس کے دل کے اندر سے کوئی مسکرا کر بولا۔ کیسا رہے؟ خوب رہے، کاما کے ساتھ چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے جب تمہیں اس بات احساس ہوگا کہ تمہارے یہاں آنے کا تمہاری بیوی کو کوئی علم نہیں اس احساس کی لرزش تمہارے سینے میں جو لذت پیدا کرے گی، اس سے تو آج تک محروم ہو۔۔۔۔ اسے یہ مشورہ پسند آیا اور وہ اپنی بیوی کو بتائے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے، چپکے سے گھر سے نکلا اور کاما کے مکان کی طرف ہو لیا۔

جب وہ اس کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو وہ ایک دیوانے اور دیوتا [illegible] سوچ رہا تھا کہ اس کی نئی پجارن کیسی ہوگی۔ شاید وہ کوئی دیوداسی ہو، کشمیر کے نغمے کی طرح حسین، پرسوز اور دلفریب۔ یا وہ رات کے بالوں میں گندھی ہوئی کہکشاں کی طرح ہو۔ بے شمار ستاروں کی انوکھی خوشبوؤں کا عطر اس کے مرمریں جسم میں جھلک رہا ہو۔ یا وہ ایک [illegible] رنگ کی رسیلی اور البیلی عورت ہو۔ انار کی کلی کی طرح [illegible] ہاتھ لگتے ہی پھوٹ پڑنے کو تیار ہو۔ یا شاید وہ کچھ بھی نہ ہو، فقط ایک عورت ہو۔۔۔۔ ایک ایسی عورت جسے دیکھ کر ذہن میں کوئی احساس پیدا نہ ہو۔ نہ محبت، نہ نفرت، نہ خوشی، نہ تعلق۔ فضا خالی خالی سی نظر آئے، جیسے اس میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہو۔ یہی سوچتا ہوا وہ سیڑھیاں ختم کر کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور کمرے کے اندر سے پیانو کی دلکش سُریں نکل رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا اور اس ہوا کو جس میں پاگل بنا دینے والی حنائی خوشبو رچی ہوئی تھی، اپنے سانسوں میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔ ویریندر کا دل بھی تو کسی نغمے کا انتہائی سُر تھا، جو ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ پیانو کے راگ پر اس کا سارا جسم تال دینے لگا۔ امڈنے لگا، ناچنے لگا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے سر اور داڑھی کے بال گر گئے ہیں، پرانی تہذیب کے ستون زمین بوس ہو گئے ہیں اور ملبے کے گرد و غبار میں سے ایک حسین چہرہ، نئی تہذیب کا روشن نشان، مسکراتا ہوا نکل آیا ہے۔ اس احساس نے اس کے جسم میں تھرتھری سی پیدا کر دی، اور اس نے گھبرا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔۔

"کون۔۔۔۔" ایک رسیلی آواز آئی اور پیانو کا راگ بند ہو گیا ۔۔۔۔ پھر قدموں کی چاپ دروازے کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی اور ویریندر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اور اس کے جسم کا ذرہ ذرہ آنکھیں بن کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں کی مدھم چاپ اس کے بالکل قریب آ کر رکی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔۔۔۔ ویریندر کا دھڑکتا ہوا دل اچانک بے حس و حرکت ہو گیا، جیسے اس پر کوئی انوکھی لذت طاری ہو گئی ہو۔ مار دینے والی، بے رحم، مگر عام لذت سے زیادہ خوبصورت لذت جس میں بیک وقت

مسرت اور قہر کے جذبے پائے جاتے تھے۔ اس کی آنکھیں دروازے میں جھانکتی ہوئی لڑکی پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ اور اس کے اندر سے کسی نے کہا، یہ وہی لڑکی ہے جس نے تمہیں چائے پر بلایا ہے۔ یہ اس دیوتا کو دیکھنا چاہتی ہے، جس کے افسانوں نے اس کے تاریک دل میں دیپ مالا رچا دی ہے۔ خاموش کیوں ہو، آگے بڑھ کر کہو کہ میں ویرندر چتیارجی ہوں، سوچتے کیا ہو، تمہاری بیوی کو کوئی علم نہیں کہ تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔ چلو بڑھو، کہو کہ میں ہی ویرندر چتیارجی ہوں ——— اور ویرندر نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھنے لگی ہے۔ اس کے جسم کے پُرشوق ذرے اسے کچھ کہنے اور کچھ کرنے پر اکسا رہے ہیں۔ چنانچہ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے کہا "میں ویرندر چتیارجی ہوں۔"

"تشریف لائیے" لڑکی نے پورا دروازہ کھول کر کہا "میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی ———"

ویرندر نے چاہا کہ وہ مسکرائے مگر اس کے ہونٹ اس کی بھاری مونچھوں کے بوجھ سے تڑپ کر رہ گئے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ چکا تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی پیدا ہو گئی۔ اور اس نے اپنے ارد گرد سرسری طور دیکھنا شروع کیا۔ کاما تو اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی، مگر اس کا نفاست پسند اور آرٹسٹک مزاج سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا کمرے کی ہر چیز اس کی اپنی شکل کی طرح حسین اور موزوں تھی۔ ویرندر نے سوچا کہ دیوار پر لگی ہوئی تصویریں اس کے جسم کے خطوط کی طرح نازک ہیں۔ اور پیانو کی دھنیاں اس کی انگلیوں کی طرح پتلی اور دلفریب، اور صوفے اس کے جسم کی طرح گداز اور شیریں۔ اور میز پر رکھے ہوئے گلدان اس کے کولہوں کی طرح بھرپور اور شاداب اور ان میں سجے ہوئے پھول اس کے ہونٹوں کی طرح سرخ اور شگفتہ اور شیلف میں قرینے سے رکھی ہوئی کتابیں اس کی ناک کی طرح ستواں ——— اور شاید وہ اسی طرح سوچتا چلا جاتا اگر اس کی نگاہیں شیلف میں رکھی ہوئی اپنی کتاب پر نہ جا پڑتیں۔

اس کی اپنی کتاب جس پر اس کا داڑھی اور سر کے بالوں سے بھرا ہوا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے بادلوں کے ہجوم میں سے بجلی کی شعاع جھانک رہی ہو۔ اور پھر اچانک اس کی نظر کاما پر جا پڑی جو اپنی مسکراتی ہوئی اور چنچل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی لمبی داڑھی اور گردن سے نیچے پھیلے ہوئے سر کے بالوں کی طرف، اس کے لمبے کوٹ کی طرف، جو دو سال سے دھلا تک نہیں تھا، اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرف جن میں سے ایک ٹیڑھی ہونے کے باعث بھولی بھولی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ان نگاہوں میں جو اس کے جسم پر بے باکانہ پھسل رہی تھیں، ایک شدید طنز محسوس کی۔ ایک جلا دینے والی، پھونک کر راکھ بنا دینے والی طنز جس میں شکوہ نہیں تھا، شکایت نہیں تھی، بلکہ تضحیک تھی۔ نشتر کی طرح تیز اور زہر کی طرح تلخ تضحیک۔ اور یہ تضحیک جیسے ویرندر کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی اور اس نے ایک ان جانے اور بے پایاں سمندر کی لہروں سے خوفزدہ ہو کر جو اسے ہر لحظہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، کانپ کر کہا۔

"تو میں ——— (معاف کیجئے، مجھے معلوم نہیں کہ آپ مس ہیں یا مسز) کاما، میں آپ کا بڑا ممنون ہوں، کہ آپ نے میری اس قدر عزت افزائی کی ———"

معلوم نہیں، یہ اس کا وہم تھا یا واقعی کاما اس کی آواز سن کر چونک پڑی، شاید اس کی آواز ٹھیک نہ تھی، شاید اس نے کاما کو اونچی آواز سے مخاطب کیا تھا۔ مگر نہیں، اس کی آواز اتنی اونچی تو نہ تھی کہ کاما چونک ہی پڑتی، تو پھر اس کی آواز باریک سی ہو گی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے، اس کے دوست یہی کہتے تھے کہ اس کی آواز بہت باریک ہے۔ جیسے ——— جیسے ——— پیانو کا مدھم سُر۔ اس نے اپنی آواز کو یہ تشبیہ دے کر خود ہی اپنی ہنسی اڑائی لیکن اس کا دل شرمندہ ہونے کی بجائے یوں ہنسنے لگا جیسے اس نے یہ فقرہ اپنے آپ پر نہیں بلکہ کسی دوسرے پر چسپاں کیا ہو ———

کاما نے جو اس کا فقرہ سن کر ایک لمحے کے لئے مسکرانے لگی تھی اپنے سُرخ بلاؤز کی ایک سلوٹ کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، ممنون تو مجھے ہونا چاہئے، کہ آپ نے میری دعوت قبول کر کے اس جگہ آنا گوارا کیا، مجھے آپ کی گیتوں بھری کہانیاں بے حد پیاری لگتی ہیں، اور انہیں نے مجھے شوق دلایا کہ میں ان کے مصنف سے ملوں ———"

"جی اچھا ——— ویرندر کی داڑھی اور مونچھیں اچانک پھولنے لگیں، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہمالہ پربت ہے اور اس کمرے میں نہیں سما سکتا ——— "میری کہانیاں اچھی ہیں" اس نے دل میں سوچا" کاما بھی یہی کہتی ہے، میری بیوی بھی یہی کہتی ہے۔ اور میرے دوست بھی۔ پھر تو میں اس دیس کا

[illegible] ہوا، ازلسٹ نہیں ہوتا۔ ٹیگور اور کالی داس [illegible] بڑا ہوتا۔ میرے ادبی مندر میں اس وقت تک پھول [illegible] اس مندر ہی کو نہ گرا دے گا"۔۔۔۔

[illegible] جاگ اٹھا، اور اس احساس کے ساتھ [illegible] ہو گئی ۔۔۔۔ اس نے ایک دم پھر پی [illegible] اور کہا ۔۔۔۔

[illegible] خوشی ہوئی کہ میرے افسانے آپ کو پسند ہیں۔ [illegible] مندر میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے، وہاں [illegible] ہندوستان کے دور دراز [illegible] موتیوں کا جوہری ہوں۔ آپ نے پڑھا [illegible] یہ نہیں تھا کہ میں اب [illegible] پھول ہے، دنیا میں آ گیا ہوں، گو یہ پھول [illegible] ہندوستان کی روح کا پسینہ [illegible]"۔۔۔۔

دیویندر نے [illegible] ایسا محسوس ہوا جیسے [illegible] ہی ہے، چنانچہ وہ رُک گیا۔ کاما [illegible] سے اس کی طرف [illegible] جو شاید [illegible] اس کی، [illegible] اندر [illegible] ۔۔۔۔

"[illegible] چائے سے [illegible]"۔۔۔۔

کاما نے ایک مدھم اور نرم ہاں کہی۔ جیسے ساون کی پہلی پھوار نے گلاب کا منہ چوما ہو، اور پھر دیویندر کی طرف دیکھنے لگی۔ دیویندر کو جیسے ہوش سا آ گیا، اور اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے جو کاما کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ایک لفظ کو ساون کی پھوار کہہ سکتا ہے۔ مگر نہیں، وہ تو کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے [illegible] ٹیگور اور کالی داس سے بھی بڑا دیوتا ہے۔ چنانچہ اس نے [illegible] تو میں کہہ رہا تھا کہ میں دوسرے افسانہ نگاروں [illegible] ہوں، میرا آرٹ حقیقی بنیادوں پر قائم ہے، اس [illegible] ہیں۔ میرا جی، آپ نے میرے افسانے پڑھ کر [illegible] گا کہ"۔۔۔۔

[illegible] کہتے ہیں" کاما اس کی بات کاٹ کر بولی "آپ کے [illegible] اس ہندوستان کی جھلک نظر آتی ہے جس کی

آواز مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں نہیں دبی بلکہ بلند ہوتی چلی جا رہی ہے، اور کون جانے مستقبل میں یہی نغمہ ایک ابدی حیثیت اختیار کر لے"۔

"جی ہاں" دیویندر کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ پھر سوچنے لگا کہ کاما کو اس سے کتنی عقیدت ہے۔ وہ ایک دیوتا ہے اور کاما اس کی پجارن۔ کیا یہ پجارن صرف دیوتا کے شبدوں ہی کو پسند کرتی ہے یا اسے دیوتا سے بھی کچھ لگاؤ ہے۔ چنانچہ اس کا جی چاہا کہ وہ کاما سے پوچھے۔ اسے اس کی داڑھی کیسی لگتی ہے۔ مگر اچانک کاما کی کالی کلوٹی ملازمہ چائے لے آئی، اور میز پر کھانے کی چیزیں دیکھ کر اس کے دل کے ایک حصے نے کچھنا شروع کر دیا ۔۔۔۔ "دیوتا اور پجارن کا قصہ [illegible] ہے، مگر اس سے بھی زیادہ پرانی کہانی انسان اور بھوک کی ہے، اس لیے پہلے چائے پیو اور پھر کوئی اور بات کرو"۔۔۔۔ اور دیویندر گفتگو چھوڑ کر چپکے سے میز پر جھک گیا ۔۔۔۔

جب وہ اتنا کچھ کھا چکا کہ اس کے بعد چائے کی ایک پیالی ہی کی گنجائش رہ گئی، تو وہ پھر دیوتا بننے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے متعلق بڑے شاندار فقرے اور عظیم الشان تشبیہیں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں، اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں فوراً کہہ دے، مگر ایک چیز بڑی بُری طرح اس کے آڑے آ رہی تھی یعنی، اس کی لمبی داڑھی۔ جو باتیں کرتے وقت ناک کے بوجھل پردے کی طرح جھولنے لگتی تھی۔ [illegible] داڑھی۔ جس سے وہ اس وقت بڑا تنگ آیا ہوا تھا۔ اور یہ جانتے [illegible] باوجود کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیشمار فائدوں سے محروم ہو جائے گا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا معجزہ ہو کہ وہ کاما سے باتیں کرتا کرتا داڑھی کو اتار کر بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لے۔ اور کہے ۔۔۔۔ "جی تو آپ نے دیکھا کہ میں کس قدر بڑا آدمی ہوں [illegible] داڑھی کا صفایا کرنا تو ایک معمولی بات ہے، اگر آپ [illegible] تو ۔۔۔۔ ہاں جی ۔۔۔۔ تو خیر [illegible] ۔۔۔۔"

مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی داڑھی اتنی نرم نہیں، اور نہ دیوتا ہونے کے باوجود وہ ایسا شعبدہ دکھا ہی سکتا ہے کہ جب جی چاہے داڑھی اتار لے اور جب جی چاہے اسے لگا لے۔ کم از کم اس وقت وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ خاص خاص موقعوں پر ایسا کر سکے۔ مثلاً اسی وقت جب وہ کاما کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، مگر ۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔ اس نے ناکامی کے احساس سے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگا ۔۔۔۔

جب وہ چائے ختم کر چکے تو اس نے حسب معمول کاما کے آگے

اں لگی ہوئی تصویروں، کرسیوں اور کتابوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ یہ تصویر کس نے بنائی، یہ کرسی تو لاجواب ہے۔ اور یہ کتاب بھئی واہ! ——— میں نے جب اسے پڑھا تو تین دن تک میں بھولا ہی رہا کہ میں کون ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ اسی قسم کی بے تُکی سوال جواب باتیں وہ کرتا رہا اور کاما کے ساتھ ساتھ کمرے میں پھرتا رہا۔ جو اسے ہر شے کا حُسن قریب سے دکھا رہی تھی۔ جب وہ سب کچھ دیکھ چکا تو اس کی نظر پیانو پر پڑی ——— اور اس نے جھجکتے ہوئے کاما کو اپنی خواہش بتلا دی۔ ———

"دیوی ——— کاما ——— آپ ذرا پیانو نہیں بجائیں گی، آپ جانتی ہی ہیں کہ میں موسیقی سے محبت کرتا ہوں۔ ———"

کاما مسکرا دی، دیوتا خود پجاری کے پاس چل کے آیا تھا، اس سے وہ اس کی کوئی خواہش ردّ نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ پیانو پر بیٹھ گئی اس کی انگلیاں پیانو کی دھاریوں پر رینگیں اور فضا میں ہنگامے سے [illegible] جاگ اٹھے۔ ویریندر کا دل دھڑکنے لگا، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ منڈلانے لگا، ناچنے لگا، اور وہ بھول گیا کہ وہ ایک دیوتا ہے۔ جیسے گورا دور کالی داس سے بھی بڑا دیوتا، ہمالیہ پربت سے بھی اونچا [illegible] اس وقت وہ ایک معمولی آدمی بن گیا تصنّع اور ریاکاری سے پاک، ایک چھوٹا سا انسانی وجود جو موسیقی کی لہروں میں مست و [illegible] جذب ہو رہا تھا، اپنے آپ کو کھو رہا تھا ——— اور ویریندر کی روح تو ایک نغمے کی انتہائی متلاشی تھی جو نا تمام ہی رہ گیا تھا، اور شاید اسی وجہ سے وہ مضطرب تھا۔ اس کے جسم میں ایک ناکام تخلیق بیقرار تھی، بے چین تھی، وہ مکمل ہونا چاہتی تھی جس [illegible] ہوا اپنے آپ کو اکٹھا کرنا چاہتی تھی، جو زندہ رہنا چاہتی تھی وہ کبھی وہ کبھی اندر دیش کی خاک چھانتی پھرتی تھی اور کبھی کشمیر کی حسین وادیوں میں گھومتی تھی۔ ویریندر اپنے سینے میں اس کا بوجھ [illegible] مدت سے گھوم رہا تھا، اس کو کہیں قرار نہیں ملتا تھا۔ اس کی روح کو نئے نئے نغموں، اور موسیقی کی انوکھی تانوں کی چاہت تھی ——— وہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی داڑھی بہت [illegible] جاتا تھا۔ ——— مگر یہ تو چٹکلہ نہیں تھا، یہ تو کاما کا [illegible] تھا، اور اپنے پیانو پہ گا رہی تھی۔ ویریندر کے دل میں اس موسیقی کی لَے ایک عجیب سی تھرکن پیدا ہو گئی اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا تھا [illegible] موسیقی سے بے شمار شرر نکل کر اس کے جسم کی طرف بڑھ رہے [illegible] میں یوں ڈوب رہے تھے جیسے وہ ایک سمندر ہو ایک ازلی اور ابدی سمندر، جہاں سے انہوں نے جنم لیا ہو اور آخر کار جہاں وہ واپس جا رہے ہوں، اسے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ ان شرروں کا منبع ہے۔ جیسے وہی گیتوں کو جنم دیتا ہے۔ اسے اپنا وجود بھی ایک سمندر معلوم ہونے لگا۔ ایک ازلی اور ابدی سمندر جس میں گیت جنم لیتے ہوں۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ بیک وقت سمندر بھی ہے اور دیوتا بھی، گیتوں کا دیوتا۔ اور اس کی روح میں چھپی ہوئی ناکام تخلیق کے زخم جیسے کاما کی موسیقی سے بھرنے لگے۔ اس کی روح کا گیت مکمل ہونے لگا، اور اپنے وجود کے ذرّے ذرّے میں وہ ایک نئی امنگ محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا وہ دنیا میں اسی لازوال محبت کو پھیلانے آیا ہے۔ اس کی ہستی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اس تاریک دنیا میں میٹھے گیتوں کی دیپ مالا [illegible] وہ دیوتا نہیں، بلکہ ایک گیت ہے، کائنات کا ایک میٹھا گیت [illegible] ایک انسان جو جھوٹے دیوتاؤں سے نفرت رکھتا ہے، جو دیوتاؤں کے بُت تراشتا ہے، جو یہ سب سوانگ رچا کر خود ہی مندروں میں پھول چڑھاتا ہے۔ نہیں نہیں، اس نے سوچا، میں دیوتا نہیں بنوں گا، میں انسان ہوں، انسان ہی رہوں گا۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی لمبی [illegible] داڑھی کے بال خود بخود ڈھیلے ہو کر زمین پر جا گرے ہیں اور اس کے چہرے سے ہٹ گئے ہیں، اور ان میں سے اس کا روشن چہرہ نکل آیا ہے۔ صاف، انسانی اوصاف سے معمور چہرہ ——— اور وہ مسکراتا کاما کی طرف بڑھا ——— اور اس کے قدم [illegible] پڑے [illegible] دکھ دیا

اچانک کاما نے گانا بند کر دیا، موسیقی کے سُر ٹوٹ گئے اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ایک بھیانک سناٹا، ویریندر کو معلوم ہوا کہ ابھی تک اس کی داڑھی ناٹک کے بوجھل پردے کی طرح اس کے چہرے پر جھول رہی ہے۔

اس احساس نے اسے شدید اذیت پہنچائی اور اس نے چاہا کہ اس واہیات داڑھی کو نوچ ڈالے، اور ان لمبے لمبے سیاہ بالوں کو جنہوں نے اس کے چہرے کو تاریک بنا رکھا تھا، ہوا میں اچھال دے اور چلّا چلّا کر کہے "اب میں دیوتا نہیں رہا، میں نے بزرگی کو مار ڈالا ہے، اپنی مصنوعی عظمت کو دفنا کر دیا ہے۔ اب میں انسان ہوں، ایک معمولی انسان، اور میں اسی لئے بڑا ہوں کہ میں ایک انسان ہوں، میں ایک انسان ہوں، میں ایک انسان ہوں" ——— اور یکایک ایک انسانی آواز، کاما کی رسیلی صدا اس کے کانوں

ٹھیک ہی ——

مد کیسے گیت پسند آیا " د ، پڑ دیا بھدری تھی۔

" جی " اس نے جیسے بے خیالی میں جواب دیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی خیال بسا ہوا تھا: اپنی داڑھی اور سر کے بالوں کی فراوانی کا اذیت بخش خیال۔ —— اور وہ دھول جیکا تھا کہ اس وقت وہ کاماکے پاس کھڑا ہے۔ بچاری کی ایک ننھی پجارن ہے اور وہ خود ایک دیوتا ہے۔ کالی داس اور ٹیگور سے بھی بڑا دیوتا۔ اور دیوتا سوچا نہیں کرتا، صرف دیکھا کرتا ہے لیکن اب تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور بھی دھندلی ہو گئی تھیں اور اس دھندلاہٹ میں وہ ایک اور دیوتا کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی داڑھی غائب ہو چکی تھی اور سر کے بال بڑے سلیقے سے کٹے ہوئے تھے۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے خم بڑے واضح تھے۔ اس کے چہرے کا ایک ایک خط صاف اور روشن تھا۔ جیسے کہ اس کی دھندلی آنکھوں میں بھی ایک دلفریب چمک نمودار ہو گئی تھی۔ وہ اب دیوتا نہیں تھا بلکہ انسان تھا۔ زندگی کے تمام جذبے اس کی رگوں میں مچل رہے تھے۔

اک اور دلیر جذبے جو روح کی گہرائیوں میں جنم لے کر خون کی لہروں پر تیرتے پھرتے ہیں۔ اور دیوتا ویریندر بھلا رہی۔ انسان ویریندر ... کو دیکھ کر انہی جذبوں کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں برسوں سے تھمی ہوئی خواہش —— یہی مچل رہی ہے، اور وہ بہت دیر منفرد رہ کر اب پھر اپنے اصلی روپ میں آ رہا ہے۔ اس احساس سے اس کی روح پر اتنی شدید کپکپی طاری ہوئی کہ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا، اور جیسے اس نے ہوش میں آ کر دیکھا کہ کاماکی بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف بڑی حیرت سے تک رہی ہیں۔ اس نے اپنی خود فراموشی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن اس کے ہونٹ پہلے کی طرح مونچھوں کے درمیان پھڑک کر رہ گئے۔ بس ایک اور جھٹکا لگا، اور اسے ناقابل برداشت ... نے کہا ——

"اچھا تو پھر —— میں چلتا ہوں"

"ارے —— بیٹھئے گا نہیں" کاماکی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہیں" ویریندر اس وقت کوشش کے باوجود اپنے آپ کو بے بس ...

... میں جاؤں گا ہی —— بات یہ ہے کہ وقت کچھ زیادہ ... اور مجھے ابھی ایک ضروری کام بھی کرنا ہے۔ اس لئے

میں پھر کبھی حاضر ہوں گا" —— یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہاتھ جوڑ کر کاما کے فلیٹ سے نکل آیا —— اور جب وہ کاما کے فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر پہنچا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ اپنے آپ کو اوپر ہی بھول آیا ہے۔

× × × × × × × ×

سڑک پر بجلی کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں، لوگ آنکھوں میں دگیر سی روشنی لئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ آسمان پر دھندلے اور زرد سے ستاروں نے کانپنا شروع کر دیا تھا، اور فضا میں بے شمار آوازوں کی بے معنی گونج سنائی دے رہی تھی۔ ویریندر منیشاری اب آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر ہو لیا تھا، اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پتھرائی ہوئی آنکھوں کو بار بار جھپکتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ کوئی ایسی بیش بہا چیز جس کے گم ہو جانے کے بعد اب اس کا وجود انڈے کے خالی چھلکے کی طرح رہ گیا ہے، بالکل بیکار، بے فائدہ اور بے معنی۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یونہی چلتے چلتے اچانک سڑک پر گزرتی ہوئی کسی موٹر کے سامنے کود پڑے یا کسی تانگے کے نیچے آ جائے یا اگر کچھ نہیں تو بجلی کے کسی کھمبے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کھو بیٹھا ہے، اس کے جسم کا اصلی جوہر کہیں گم ہو گیا ہے۔ کاما کے فلیٹ پہ رہ گیا ہے۔ اور اب اس کے پاس کیا ہے، ایک مصنوعی جسم جس پر مصنوعی داڑھی ناٹک کے بوجھل پردے کی طرح جھول رہی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ اپنی داڑھی کی طرف اٹھ گئے اور لمبے لمبے سیاہ بالوں پر پھسلنے لگے۔ ان کی موجودگی کے احساس سے اسے بہت دکھ ہوا اور اس نے سوچا کہ اگر کوئی راہگیر اسے روک کر یہ کہنا شروع کر دے کہ بھئی یہ چہرے پر کیا مصیبت لٹکائے پھرتے ہو، بھلا کسی وقت تو ٹھیک، اب اس کے بغیر بھی سڑک پر نکلا کرو، آخر گلی کوچوں میں کیوں ریہرسل کرتے پھرتے ہو۔ تو کیا ہو، اور اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ایک راہ چلتے آدمی نے دوسرے کو کہنی مار کر کہا —— "ذرا اس فقیر کو دیکھنا بھئی، سالا کوٹ پتلون پہنے پھرتا ہے۔ تمہاری قسم اب تو گداگروں نے بھی بڑے عجیب بھیس بنانے شروع کر دیئے ہیں" —— اور جس آدمی سے مخاطب ہو کر یہ فقرے کہے گئے تھے اس نے جواب دیا،

"واللہ کیا بات کہی ہے، پورا جعلساز معلوم ہوتا ہے، ذرا شکل تو ملاحظہ ہو، معلوم ہوتا ہے جیسے آپ ٹیگور کا پارٹ ادا کرنے کے لئے

[illegible]میں یہ تشریف لے جا رہے ہیں" ——— اور وہ دونوں ایک [illegible] لگا کر آگے بڑھ گئے ———

ویریندر کو یوں معلوم ہوا جیسے وہ قہقہہ اپنی پوری جہنمی تلخی کے [illegible] اس کے عضو عضو میں سما گیا ہے اور اس کا سارا جسم ایک ایسے [illegible] میں مبتلا ہو گیا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں، کوئی ردِ عمل نہیں [illegible] نے اس کے اندر ایک ایسی آگ لگا دی ہے جس کے شعلے [illegible] دیر میں اس کے وجود کو جلا کر راکھ بنا دیں گے۔

[illegible] ——— دھڑ ——— دھڑ ——— اس کے کانوں میں [illegible] جانی آوازیں گونجنے لگیں اور اسے یوں محسوس ہونے لگا [illegible] یہ خطرہ مکمل ہو گیا ہے، اس کے اندر آگ جل اٹھی ہے اور [illegible] دیر میں اس کا بدن رواں شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے گا، یہیں [illegible] پاتھ پر چلتے چلتے اس کے اعضا جل جل کر گرنے لگیں گے، لوگ [illegible] ہوئے گوشت کی بو سونگھ کر اس کی طرف دیکھیں گے، اسے [illegible] کے لئے بھاگیں گے، لیکن اس کی بے رحم آگ اسے جلا کر ہی [illegible] گی۔ "میں جل جاؤں گا؟" اس نے کچھ خوفزدہ ہو کر اپنے دل سے [illegible] اور اس کے دل نے جواب دیا: "تو پھر کیا ہو گا، یہی نا کہ تمہیں [illegible] مصنوعی داڑھی سے نجات مل جائے گی جسے تم یونہی، [illegible] کے چہرے پر لٹکائے پھرتے ہو۔ اچھا ہے یہ نشان مٹ جائے۔ [illegible] کے لئے تمہیں اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے" ———

"جان کی قربانی" اس کے اندر چھپا ہوا کوئی انسان چیخ اٹھا، مگر [illegible] میں کیوں ایک بزدلانہ موت کا شکار ہو جاؤں، مجھے اس دنیا [illegible] بہت کچھ کرنا ہے، ابھی تو میں انسان کو محبت کا ابتدائی سبق [illegible] رہا ہوں، ابھی تو میں نے اس سب سے بڑی تعلیم کو مکمل کرنا [illegible] کیا میں اپنے آدرش سے غداری کر دوں، کیا میں اس حقیر سی [illegible] کے بدلے خودکشی کر لوں، بھلا کیوں نہ میں اس داڑھی ہی کا [illegible] کر دوں، اسے جڑ سے اکھاڑ ڈالوں، اس کے مکروہ بالوں [illegible] ہوا میں بکھیر دوں، میں ایسا کیوں نہ کروں، میں ایسا کیوں نہ [illegible] ——— اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اعضا جیسے اینٹھنے [illegible] اسی عالم میں وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک آدمی سے ٹکرا [illegible] ———

"اندھے ہو" اس نے غصے سے بھر کر کہا۔

اور ویریندر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، تو ایک آدمی جس کے گالوں [illegible] ہوئے صابن کے تازہ دھبے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی [illegible] [illegible] آگ کی تصدیق کرنے کی بجائے اس نے حجاموں کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا جہاں سے وہ نکل کر آیا تھا اور جب اس کی نگاہ حجاموں [illegible] پر پڑی [illegible] وہ [illegible] بھاگ کر اس میں داخل ہو گیا [illegible] حجام جو ابھی ابھی اس داڑھی مونڈنے [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] [illegible] اس کی صورت دیکھتے ہی [illegible] ہو گیا اور کہنے لگا "آئیے [illegible] کیا حکم ہے" ———

"ابھی [illegible] سے میری داڑھی مونڈ دو، اور میرے سر کے بالوں پر بھی قینچی چلا دو" ——— ویریندر نے تیزی سے کہا اور کوٹ اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا [illegible] نے پہلے تو اس کی بات سن کر سمجھا کہ وہ پاگل ہے، لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ واقعی اس کی داڑھی مونڈنا ہی پڑے گی تو اس نے قینچی اٹھا کر ہاتھوں میں چلائی۔ جیسے اس کا امتحان کر رہا ہو کہ کہیں داڑھی کے بالوں میں پھنس کر ٹوٹ تو نہ جائے گی۔ اور پھر ویریندر کی طرف جھک کر کہنے لگا ———

"آپ کیا [illegible] کہتے ہیں؟"

"نہیں [illegible]" ویریندر نے [illegible] کر کہا ——— "چلو اپنا کام کرو"

حجام اس کے لہجے کی [illegible] [illegible] کہ اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کوئی مزید بات [illegible] شروع کر دے ——— قینچی کے آہنی بازو ایک مرتبہ ویریندر کی آنکھوں کے سامنے لہرائے اور پھر انہوں نے اس کے بالوں کو [illegible] کاٹنا شروع کر دیا ———

کچ ——— کچ ——— کچ ——— ویریندر کے بال کٹ رہے تھے، اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ آواز ایک نیا نغمہ ہے، ایک انوکھا راگ ہے، جو اس کی روح کی پیاس کو بجھا رہا ہے [illegible] اس کے وجود میں جس شے کی کمی [illegible] اور اس کا دل [illegible] اٹھا [illegible] اس سے بہتر خوشی کا اور کیا موقع ہو گا کہ میں انسان بن رہا ہوں ———

× × × × × × ×

کچھ دیر بعد جب وہ حجام کی دکان سے باہر نکلا تو وہ اپنے آپ کو [illegible] نیا آدمی محسوس کر رہا تھا، ایک نیا ویریندر [illegible] جو انسان تھا، دیوتا نہیں تھا، بت نہیں تھا، بلکہ ایک چلتا پھرتا اور [illegible] آدمی تھا، اور اس کا ذہن انسانیت کی نئی علامتوں سے

بھرپور تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اب وہ آزادانہ ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ ہر چیز پر نظر ڈال سکتا تھا۔ ہر چیز سے لطف اُٹھا سکتا تھا۔

اور جب اس کے چہرے پر وہ داڑھی تھی تو جب بھی کوئی داڑھی لٹک رہی تھی، اس وقت تو زیادہ آزادی حاصل نہ تھی۔ اس وقت وہ کسی حسین عورت کو دیکھ کر چپکے چپکے چاروں طرف دیکھ لیتا تھا کہ کوئی چپکے چپکے اس کی داڑھی پر نظر نہ ڈال رہا ہو —— اور پھر عجیب بات تھی کہ جب وہ اپنی داڑھی سمیت جگہوں میں جاتا تو لڑکیاں سمجھتیں کہ وہ ایک مہاتما ہے اور وہ اپنی شوخی اور چلبلاہٹ کو رخصت کر کے اس کے ساتھ عقیدت سے پیش آتیں۔ اور جب وہ یہ داڑھی والے شریفوں سے ملتا تو وہ ایک دوسرے کے کان میں کہتے "بڑا چلتا ہے، اس کی داڑھی کو آپ نے شرافت کا سائن بورڈ ہی سمجھیے، موقع ملے تو یہ خدا کو بھی دھوکا دے جائے۔ ہاں آپ کیا سمجھتے ہیں" اس وقت اسے ان فقروں سے کتنی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر اب وہ ان چیزوں سے آزاد تھا۔ اب اس کا چہرہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ اب اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب وہ دنیا کی نظروں میں محفوظ تھا۔ بلکہ اگر چاہتا تو خود دوسروں کی [illegible] تھا۔ اس احساس نے اس کے چہرے پر ایک [illegible] مسکراہٹ پیدا کر دی اور اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

× × × × × ×

جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ جب وہ اس ہیئت میں اندر داخل ہوگا، تو اس کی بیوی اسے کس نظر سے دیکھے گی، اور اس خیال کے آتے ہی اس کے قدم دہلیز پر رک گئے، اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ایک دیوتا ہے۔ [illegible] اس کی سب سے بڑی پجارن رہی ہے۔ کیا پجارن اپنی برسوں کی پوجا کا اپمان برداشت کر سکے گی، کیا وہ اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا سکے گی یا اس کے دل میں سوال پیدا ہوں گے؟ اور خیال ہی خیال میں اس نے ایک زبردست دھماکا سنا اور کہیں سے بے شمار چیخیں بلند ہوئیں ——

"آگ —— آگ —— بچاؤ —— بچاؤ"

اور خوف —— اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں اس آگ کو کیسے برداشت کر سکوں گا۔ اس نے سوچا یہ آگ۔ عورت کی آنکھوں کی یہ آگ مجھے جلا ڈالے گی، میں اس کی بھڑک کا نظارہ نہ کر سکوں گا۔ میں اس کی جلن برداشت نہ کر سکوں گا، پھر —— پھر کیا ہوگا —— کیا ہوگا ——

اور اچانک اسے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہا ہے۔

وہ خوفزدہ ہو گیا، کیا یہ آگ ہے، کیا یہ جلتا ہوا لاوا ہے، کیا یہ عورت کی آنکھوں میں جلتی ہوئی چتا ہے۔ یہ کون ہے جو مجھ پر چپکے سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔

اور اس نے چاہا کہ وہ بھاگ نکلے مگر اسی لمحے اس کی بیوی نرگس کو دہلیز میں کھڑے دیکھ کر کہا ——

"کون"

اور ویرندر کے مُنہ سے جلدی سے نکل گیا ——

"میں" —— ——

"تو اندر آئیے نا، وہاں کیوں کھڑے ہیں" اس کی بیوی نے جواب دیا ——

اور وہ خوف زدہ، سہما ہوا، اور پریشان، جی کڑا کر کے آگے بڑھا۔

آگ اب اور بھی زیادہ قریب آ رہی تھی، جوالا پھٹنے والی تھی اس کا جسم اب لاوے کی جلن کو محسوس کرنے لگا تھا، وہ دروازے میں ایک لمحے کے لیے رکا ——

اب آگ اس کے سامنے کھڑی تھی، اب وہ اس سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ لپکتی اور بل کھاتی ہوئی آگ، اور اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے اسے اس آگ میں دھکیل دیا ——

"ہا" اس کی بیوی کی نگاہیں یکایک اس کی طرف اُٹھیں، اور اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کمرے کی ہر چیز جیسے بجھ گئی، منجمد ہو گئی، مر گئی اور سناٹا، چاروں طرف ایک بھیانک سناٹا تیرنے لگا۔ اور اس سناٹے میں ویرندر کو ایک عورت کی دو آنکھوں کی موجودگی کا احساس ہوا، جو اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، دیکھے جا رہی تھیں، دو خاموش سمندر جن میں رہ رہ کر درد کی لہر سی پیدا ہو جاتی تھی، اس کے علاوہ ان میں کچھ نہ تھا نہ آگ، نہ لاوا، اور نہ چتا۔

اور ان آنکھوں کی جو اس پر ہمیشہ محبت کے پھول نچھاور کیا کرتی تھیں، یہ کیفیت دیکھ کر اس کی روح میں وہ لرزش پیدا ہوگئی جس کے تصور سے بھی وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ وہ آنکھیں جیسے اس

سے پوچھ رہی تھیں، کہ تم نے یہ کیا کیا، وہ دیوتا کہاں ہیں جو تھوڑا عرصہ پہلے اسی مندر کے دروازے سے یہ کہہ کر باہر نکلے تھے کہ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ کیا وہ اب کبھی نہیں لوٹیں گے بتاؤ کیا وہ کبھی واپس نہ آئیں گے؟“ ———

ویرندر نے جیسے دل ہی دل میں کہا ”تم مجھے نہیں پہچانتیں! میں ہی تو تمہارا دیوتا ہوں، مگر اب میں بدل گیا ہوں، اب میں انسان بن گیا ہوں۔ کیا تم اس تبدیلی پر خوش نہیں ہو، کیا تمہیں میرے انسان بننے پر مسرت نہیں ہوئی ———

مگر نہیں، اس کی بیوی کا چہرہ مغموم اور افسردہ تھا، اس کی آنکھوں میں ایک انوکھا غم جھانک رہا تھا اور وہ خاموش تھی، جیسے اس کی آواز مر چکی ہو، اس کے ہونٹ سل چکے ہوں اور اس کی زبان کچلی جا چکی ہو ——— تھوڑی دیر تک کمرے میں بھیانک سناٹے کا راج رہا ——— ویرندر اور اس کی بیوی دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ——— پھر اچانک ویرندر کی بیٹی دوسرے کمرے سے بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اپنی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی ———

”ماں ——— پتا جی ابھی تک نہیں آئے“ ———

ویرندر کی بیوی نے چونک کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا گویا اس طرح وہ اس پیچ کو دبانا چاہتی ہو جو اس کی روح میں بری طرح چبھ رہی تھی، اور اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ———

”وہ آگئے بیٹی، دیکھو تمہارے سامنے تو کھڑے ہیں“

بچی نے مڑ کر ویرندر کی طرف دیکھا، اور ویرندر کو اس کی آنکھوں میں ایسی اجنبیت اور حیرانی نظر آئی کہ وہ اس سے زیادہ دیر آنکھیں نہ ملا سکا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس وقت جبکہ وہ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا اسے اپنی بیٹی کی مدھم آواز سنائی دی

”نہیں ماں، یہ میرے پتا نہیں ہیں، یہ تو کوئی اور ہی آدمی ہے ——— نہیں، بہت دیر ہو گئی ماں، پتا جی کب آئیں گے پتا جی کب آئیں گے؟“ ———

اور اس کے دل میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا، اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ڈھول اور تاشوں کا شور ابھر آیا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی داڑھی پھانسی کے پھندے کی طرح اس کے گلے میں پڑ گئی ہے، جس کے بل ہر لمحہ سخت ہو رہے ہیں ———

عبدالرحیم شبلی

چھبیس مرد اور ایک لڑکی

۲۶

ہم چھبیس تھے ——— چھبیس جیتی جاگتی مشینیں ———

اُن کو ایک سیلے ہوئے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور جہاں صبح سے شام تک ہم آٹا گوندھ کر خستہ بسکٹ تیار کرتے تھے۔ ہمارے تہہ خانے کی کھڑکیاں ایک قسم کی خندق کی طرف کھلتی تھیں جس کے دونوں طرف اینٹوں کی باڑ بندی ہوئی تھی۔ اینٹوں پر نمی کی وجہ سے سبز کائی اُگ آئی تھی۔ کھڑکیوں پر لوہے کی جالیاں جڑ دی گئی تھیں اور شیشوں پر قلعی پھیر دی گئی تھی۔ اس لئے دھوپ کے اندر آنے کا امکان نہ تھا۔ ہمارے مالک نے کھڑکیوں پر جالیاں اس لئے لگا رکھی تھیں تاکہ ہم گداگروں کو بھیک نہ دے سکیں، نہ اُن یار دوستوں کو روٹی کھلا سکیں جو صبح سویرے خالی پیٹ اپنے کام پر جاتے تھے۔ ہمارا مالک ہمیں عیار خیال کرتا تھا اور گوشت کے بجائے ہمیں باسی اوجھڑی کھانے کو دیتا تھا۔

اس سنگین تنگ و تاریک کمرے میں دَم گھٹتا تھا۔ چھت بہت نیچی تھی۔ اور دیواروں پر جا بجا دھوئیں کی کلونس اور مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ اِن موٹی موٹی دیواروں کے اندر، جن پر جگہ جگہ گوبر اور گارے کے پیوند لگے ہوئے تھے، اتنا حبس تھا کہ سانس رُکتی تھی، اور ہم بیمار ہو جاتے تھے۔ ہمیں صبح پانچ بجے کچی نیند اُٹھنا پڑتا تھا طبیعت سُست اور بیزار سی ہوتی تھی۔ لیکن چھ بجے تک ہم خستہ بسکٹ تیار کرنے کے لئے بنچوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ جب ہم سوئے ہوتے تو ہمارے ساتھی آٹا گوندھ کر رکھ دیتے۔ صبح اُٹھ کر ہم اسی آٹے کے پیڑے بناتے اور کبھی کبھی اپنے جسم کو جھٹک دیتے تاکہ زخم خوردہ نہ ہو جائیں۔ ہمارے بعض ساتھی آٹے میں پانی ملاتے رہتے تاکہ خشک نہ ہو جائے۔ کڑاہیوں میں سارا دن اُبلتا ہوا پانی بُڑبُڑاتا رہتا۔ اور اُس میں بسکٹ سنسناتے رہتے۔ نانبائی کی کھرپی تنور کے فرش پر گھسٹتی رہتی اور آٹے کی اُبلی ہوئی ٹکیاں گرم گرم اینٹوں پر اُچھلتی رہتیں۔ صبح سے شام تک تنور کے ایک پہلو میں لکڑیاں چیخ چیخ کر جلتی رہتیں اور کارگاہ کی دیواروں پر ارغوانی شعلوں کے سائے رقص کرتے رہتے؛ جیسے خاموشی سے ہمارا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ تنور یوں نظر آتا جیسے پریوں کی کہانی کے کسی عظیم الہیئت دیو کا بگڑا ہوا چہرہ ہو۔ اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ انگڑائی لے کر فرش پر سے اُٹھا ہے؛ اور اپنا شعلہ آفریں مُنہ کھول کر ہماری طرف گرم گرم سانس چھوڑ رہا ہے۔ اُس کے ماتھے پر دو ننھے ننھے سوراخ تھے۔ جو بے رحم، ظالم آنکھوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ یہ آتشیں آنکھیں ہمیشہ ہمیں گھورتی رہتی تھیں جیسے غلاموں کو دیکھ دیکھ کر اُکتا گئی ہوں۔ اور ان سے چونکہ انسانیت کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے وہ اپنے زعم میں نفرت آلود سرد مہری سے پیش آ رہی تھیں ——!

دن پر دن گذرتے گئے۔ اور ہم اِس تعفن آلود، گھٹے ہوئے ماحول میں، آٹے کے غبار اور اُس غلاظت کے درمیان جو ہمارے پاؤں سے چپک کر صحن سے کمرے میں آ جاتی تھی، آٹا گوندھتے اور خستہ بسکٹ تیار کرتے رہے اور یہ چیزیں ہمارے پسینے سے تربتر ہوتی رہیں۔ ہمیں اپنے کام سے شدید نفرت تھی۔ ہم اپنی محنت کا پھل بھی نہ کھا سکتے تھے۔ ہم بسکٹوں پر سیاہ روٹی کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم نو نو کی قطاروں میں، ایک دوسرے کے سامنے، بنچوں پر بیٹھ کر گھنٹوں مشین کی طرح اپنے ہاتھ چلاتے رہتے اور انگلیوں کو جنبش دیتے رہتے حتیٰ کہ ہمیں اپنی جنبشوں پر اختیار بھی نہ رہتا۔ کیونکہ ہاتھ خود بخود اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ ہم اپنے ساتھیوں کے چہرے کی ایک ایک سلوٹ سے واقف تھے۔ ہمارے پاس بات کرنے کا کوئی موضوع بھی نہ تھا۔ ہم خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے اور ہم اس کے عادی ہو چکے تھے۔ البتہ عیب جوئی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہم اپنے ساتھی کا کوئی نہ کوئی نقص نکال لیتے اور بعض اوقات جھگڑا بھی ہو جاتا تھا لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا کیونکہ جب انسان آدھا مر چکا ہو، جب وہ کٹھ پتلی بن چکا ہو، جب محنتِ شاقہ نے احساس کا گلا گھونٹ ڈالا ہو، تو وہ اپنے ساتھی کا نقص کیونکر نکال سکتا ہے؟ تاہم خاموشی

صرف اُن لوگوں کے لیے اذیت ناک ہے جو پہلے ہی سب کچھ کہ چکے ہوں۔ اور جن کے پاس کہنے کو کوئی نئی بات نہ ہو۔۔۔۔ لیکن جن لوگوں نے ابھی بولنا ہی [illegible] ہو اُن کے لیے خاموشی نہایت آسان اور معمولی کام [illegible]

بعض اوقات [illegible] شروع [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] کی طرح ایک [illegible] سروں میں وہ دھیمے دھیمے میٹھے بول گنگنا [illegible] دبے ہلکا کرنے [illegible] دیتے ہیں [illegible] طرح ہمارا ایک ساتھی گانے لگ جاتا ہے۔ ہم پہلے تو اُس کی آواز اور درد بھری نغمگیت کو چپ چاپ سنتے رہتے لیکن جب اُس کی تانیں آہستہ آہستہ مدھم ہوکر حزن کی نمناک رات کو آلاؤ کے بجھتے ہوئے شعلوں کی طرح تہ خانے کی بھاری بھرکم چھت کے نیچے خاموش ہو جاتیں تو ایک اور ساتھی اپنی سُروں کو اُونچا اُٹھاتا اور [illegible] اور غمناک آوازیں تنگ و تاریک تہ خانے کی [illegible] فضا میں تیرنے لگ جاتیں۔ اس کے بعد یکدم بہت سی آوازیں ویرانی گیت گانے لگ جاتیں۔ اور آہستہ آہستہ لہروں کی طرح اُمنڈتی ہوئی بلند اور تیز ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ یوں محسوس ہوتا جیسے [illegible] طوفان ہمارے سنگین قید خانے کی [illegible] کر دے گا۔

ابھی ہم [illegible] گا رہے ہیں۔ طویل مشق کی وجہ سے ہماری بلند آوازیں خود بخود ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ کمرے کی فضا میں نغمے کا سیلاب اُمنڈ آتا ہے۔ لیکن پتھر کی دیواریں اُس کا گلا گھونٹ ڈالتی ہیں۔ وہ اپنا سر پٹختا ہے، پیچ کھاتا ہے اور دل سے ایک جگر خراش ہوک اُٹھتی ہے۔ جس سے پُرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ اور خوابیدہ تمنائیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ گانے والے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اور ابھی ایک ساتھی یکدم اپنا گانا بند کر دیتا ہے اور دیر تک اپنے ساتھیوں کی آواز سنتا رہتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ آوازوں کے سیلاب میں اپنی آواز بہا دیتا ہے ۔۔۔۔۔! ایک اور ساتھی زور سے آہ بھرتا ہے اور [illegible] موندھ کر گاتا رہتا ہے۔ غالباً اُسے اپنے ساتھیوں کی آوازیں معلوم ہوتی ہے جیسے دُور ایک چوڑی سی سڑک دھوپ میں [illegible] اپنے آپ کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہو [illegible]

بھٹی میں شعلہ لرزتا ہے۔ نانبائی کی کھُرپی تنور کے فرش پہ گھِستی ہے۔ کڑاہی میں گرم پانی گنگناتا ہے۔ اور آگ کی لو قہقہۂ خاموش [illegible] دیوار پر ناچتی ہے ۔۔۔۔۔ اور ہم اپنے مستعار گیت کی تانوں سے اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں ۔۔۔۔۔ وہ غم جو سورج کی روشنی سے محروم [illegible] ۔۔۔۔۔ غلامانہ ادوں ۔۔۔۔۔ کی [illegible] تمناؤں نے پیدا کیا ہوتا ہے۔

[illegible] طرح ہم [illegible] ساتھی ایک [illegible] عمارت کے تہ خانے میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اور ہماری زندگی اتنی بوجھل ہو گئی کہ محسوس ہوتا تھا جیسے اِس مکان کی تینوں منزلیں ہمارے کندھوں پر رکھ دی گئی ہیں ۔۔۔۔۔!

تاہم گیتوں کے علاوہ ہمارے پاس ایک چیز ایسی بھی تھی جو ہمارے نزدیک دلکش تھی، جس سے ہم محبت کرتے تھے، اور جو ہمارے لیے دھوپ کا نعم البدل ثابت ہوتی تھی۔ ہمارے مکان کی دوسری منزل پر کشیدہ کاری کی ایک دُکان تھی اور اُس میں کام کرنے والی مزدور عورتوں میں ایک سولہ برس کی خادمہ بھی تھی جس کا نام تانیا تھا۔ ہر روز صبح کے وقت نیلی نیلی آنکھوں والا ایک گلاب سا چہرہ اُس جالی دار دروازے سے نمودار ہوتا جس میں سے ہو کر کارگاہ میں جانا پڑتا تھا اور ایک سُریلی آواز ہمیں سنائی دیتی۔

"ارے بھئی ننھے قیدیو۔ مجھے تھوڑے سے بسکٹ دینا!"

ہم سب یہ صاف اور شناسا آواز سُن کر پیچھے مڑ کر دیکھتے اور مسکراتے ہوئے حسین چہرے پر نظریں گاڑ دیتے۔ اس کی ناک دروازے کے شیشے سے لگی ہوتی اور اس کے نیم وا گلابی لبوں میں سے چمکتے ہوئے سفید دانت دکھائی دے رہے ہوتے۔ ہم اِس منظر کے عادی ہو چکے تھے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں ہمیں خاص مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ہم سب دیوانہ وار اُٹھ کھڑے ہوتے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے دروازہ کھولنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اندر آ جاتی۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی جھولی پھیلائی ہوتی۔ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہو کر مسکراتی رہتی اور اپنا سر قدرے ایک طرف کو جھکا لیتی۔ اس کے سُنہرے بالوں کی ایک لٹ کندھے کو چھوتی ہوئی سینے پر آ کر لہرا رہی ہوتی تھی۔ اور ہم ۔۔۔۔۔ غلیظ سے، کالے کلوٹے بدصورت لڑکے ۔۔۔۔۔ اُس کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے سر پیچھے کو جھکے ہوتے تھے کیونکہ جب دروازے میں وہ آ کر کھڑی ہوتی وہ فرش

بہ چار فٹ اونچا تھا۔ ہم اُسے صبح کا سلام کہتے اور ایسے الفاظ
استعمال کرتے جن کے ہم عادی نہ تھے بلکہ جن کو اُسی کے لئے ہم نے
محفوظ رکھا ہوا تھا۔ جب ہم اُس سے باتیں کر رہے ہوتے تو ہماری
آوازیں [illegible] ہوتی تھیں۔ اور ہم اپنے مسخرے پن پر قابو پا لیتے کیونکہ
اس کی موجودگی میں ہمیں شائستگی کا اظہار کرنا ہوتا تھا۔ نانبائی
خانے میں سے بہترین پکے ہوئے اور خستہ ترین جو بسکٹ نکالتے
ہم نہایت احتیاط سے انہیں تانیا کی جھولی میں ڈال دیتا۔

"دیکھنا ہمارے مالک سے ٹکرا نہ جانا" ہم ہمیشہ اُسے کہہ دیا
کرتے تھے۔ وہ شریرانہ انداز میں ہنستی اور مسکراتے ہوئے کہتی۔
"اچھا رخصت۔ ننھے قیدیو" اور چوہیا کی طرح فوراً غائب ہو جاتی۔
لیکن بات یہیں ختم نہ ہو جاتی . . . . . اُس کے جانے کے بعد
کتنی دیر تک ہم اُسی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم وہی باتیں بار بار
دہراتے جو کل یا پرسوں کہہ چکے ہوتے۔ کیونکہ وہ اور ہم اور ہمارا
ماحول بھی وہی رہتا جو کل یا پرسوں تھا . . . . . اگر ماحول تبدیل
نہ ہو تو انسان کے لئے زندہ رہنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ
اپنی روح کو کھول کر اس یکسانی کو ختم نہ کر دے تو جب تک وہ زندہ
رہتا ہے اردگرد کا جمود روز بروز ناقابلِ برداشت ہو جاتا
ہے . . . . .

ہم عورتوں کا ذکر ایسے الفاظ میں کرنے کے عادی تھے کہ بعض
اوقات ہمیں خود بھی اپنے شرمناک رویے پر ندامت محسوس ہونے
لگتی تھی لیکن اس پر تعجب نہ ہو سکتا تھا کیونکہ جن عورتوں کو ہم
جانتے تھے ان کا تذکرہ شائستہ الفاظ میں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔
تاہم تانیا کے متعلق ہم کبھی نازیبا الفاظ استعمال نہیں کیا کرتے
تھے۔ بلکہ اُس نے ہمارے منہ سے شاذ ہی کوئی بیہودہ بات سنی
ہو گی۔ چہ جائیکہ ہم اس پر انگلی بھی اٹھانے کی جرأت کرتے۔ شاید
یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے پاس زیادہ دیر تک نہ ٹھہرتی تھی۔ وہ
آسمان سے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح ہمارے سامنے آتی اور
فوراً نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی۔ ممکن ہے اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ
وہ خوبصورت سی ننھی سی لڑکی تھی۔ اور حسن تو گنواروں کو بھی احترام
کرنے پر مجبور کر دیتا ہے ——— ! اس کے علاوہ اگرچہ کام کی
نوعیت نے ہمیں نرا کودن بنا رکھا تھا لیکن آخر ہم انسان تھے
اور انسان کسی نہ کسی چیز کی پرستش کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
ہمارے پاس اُس سے بہتر پوجا کی چیز کوئی نہ تھی۔ اور چونکہ ہم
ایک قید خانہ میں رہتے تھے اس لئے ہماری طرف کوئی اور توجہ بھی
نہیں کرتا تھا۔ اُس مکان میں درجنوں آدمی رہتے تھے لیکن تانیا
کے سوا ہماری طرف مسکرا کر کوئی دیکھتا بھی نہ تھا۔ اور سب سے بڑی
بات یہ ہے کہ [illegible] سمجھتے تھے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا
جیسے اُس [illegible] ہمارے بسکٹوں پر ہے۔ ہم نے
[illegible] یہ تھا کہ اُسے گرم گرم بسکٹ مہیا کریں۔ اور
یہ فریضہ ہم اس طرح ادا کرتے تھے جس طرح بُت کو نذرانہ پیش کیا
جاتا ہے۔

بسکٹوں کے علاوہ ہم تانیا کو طرح طرح کے مشورے بھی دیا
کرتے تھے مثلاً خوب گرم کپڑے پہنا کرو۔ سیڑھیوں پر چڑھتے اور
اُترتے وقت بھاگا نہ کرو۔ لکڑیوں کے بڑے بڑے گٹھے نہ اُٹھایا کرو۔ وہ
ہماری نصیحتوں کو سُنتی اور مُسکرا دیتی۔ ہمیں ہنس کر جواب دیتی لیکن
کبھی اُن پر عمل نہ کرتی۔ اس کے باوجود ہم ناراض نہیں ہوتے تھے
— — کیونکہ ہمارا مقصد تو صرف یہ دکھانا تھا کہ ہمیں اس کا کتنا
خیال ہے۔

بعض اوقات وہ درخواستیں لیکر ہمارے پاس آ جاتی مثلاً
کہتی کہ ذرا برف خانے کا بھاری دروازہ تو کھول دو۔ یا تھوڑی
سی لکڑیاں چیر دو۔ ہم خوشی اور فخر کے ساتھ اس کا کام کر دیتے
تھے۔ بلکہ وہ جو بھی کہتی ہم اُسے پورا کرنا اپنا مذہبی فرض خیال
کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے کہا۔ ذرا قمیص میں
ٹانکے تو لگا دینا۔ تو اُس نے نفرت سے ناک سکوڑ لی اور بولی "کیا؟
کیا مطلب ہے تمہارا ؟"

ہم نے اپنے [illegible] بعد
تانیا کو کوئی کام [illegible] کی جرأت بھی نہ کی۔ ہم [illegible] محبت
کرتے تھے [illegible] لفظوں میں سب کچھ [illegible] انسان کو کسی نہ
کسی ایسی چیز کی ضرورت [illegible] ہے جس سے وہ محبت کر سکے۔ خواہ
وہ [illegible] محبت [illegible] تباہ ہو جائے [illegible] و نابود ہو جائے
اور خواہ یہ محبت اُس کے قریب ترین رشتہ داروں کی زندگی کو بھی
حرام کر دے۔ کیونکہ وہ اپنے پیارے کا احترام کئے بغیر محبت
کرتا ہے۔ ہم تانیا سے محبت کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ ہمیں محبت
کرنے کے لئے اور کوئی نہ ملتا تھا۔

کبھی کبھی ہم میں سے کوئی یوں بڑبڑانے لگ جاتا "ہم نے
اس قطامہ کو خواہ مخواہ [illegible] رکھا ہے۔ آخر اس میں کون سی بات

کیا ہے ؟ ہمیں اس کے لئے اتنا بے تاب ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

لیکن جو شخص ایسا کہنے کی جرأت کرتا ہم اُس پر بُری طرح برس پڑتے تھے کیونکہ ہم کسی چیز سے محبت کرنے پر مجبور تھے۔ ہمیں ایک بُت مل گیا تھا۔ ہم اُس کی پوجا کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہم چھبیس کے چھبیس محبت کرتے تھے وہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے قابلِ پرستش تھا۔ اس لئے جو بھی ہمارے مسلک کے خلاف ہوتا وہ ہمارا دشمن تھا۔ ہم محبت کرتے تھے اور اتفاق سے ہم نے اس معاملہ میں دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا لیکن بہرحال اب چھبیس مردوں کی عزت کا سوال تھا اس لئے ہمیشہ ہمارا فرض تھا کہ جس سے ہم محبت کرتے تھے وہ دوسروں کے لئے بھی قابلِ احترام ہے۔

ہماری محبت ہماری نفرت سے کچھ کم اذیت ناک نہیں ہے ...... اور غالباً اسی لئے بعض خود سر لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری محبت کی نسبت ہماری نفرت زیادہ اُمید افزا ہے ......

لیکن اگر یہ صحیح ہے تو وہ ہم سے بھاگ کیوں نہیں جاتے؟

بسکٹوں کے علاوہ ہمارا مالک ڈبل روٹیاں بھی تیار کرتا تھا۔ لیکن اس کام کے لئے اسی مکان میں ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کیا گیا تھا درمیان میں ایک دیوار تھی۔ لیکن ڈبل روٹی بنانے والے —— جن کی تعداد چار تھی —— ہم سے دُور دُور رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے کام کو ہمارے کام کے مقابلہ میں صاف ستھرا اور نفیس سمجھتے تھے۔ وہ ہماری دُکان میں آنا ہتک خیال کرتے تھے اور جب کبھی صحن خانے میں اُن سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ ہمارا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ ہم بھی اُن کے پاس کبھی نہ جاتے تھے۔ کیونکہ ہمارے مالک نے اُس کمرے میں جانے سے روک رکھا تھا۔ شاید اُس کا خیال تھا کہ ہم اُس کی اچھی اچھی ڈبل روٹیاں چُرا لیں گے ——!

ہمیں ڈبل روٹی بنانے والے پسند نہ تھے کیونکہ ہم اُن سے حسد کرتے تھے۔ اُن کا کام بہت ہلکا تھا اور اُن کی تنخواہ اور خوراک بھی نسبتاً بہتر تھی —— اس کے علاوہ اُن کا کارخانہ ہوا دار اور روشن تھا۔ وہ سب صاف ستھرے رہتے تھے اور اُن کی صحت بھی ہمارے مقابلے میں اچھی تھی۔ ہمارا رنگ پھیکا اور زرد پڑ گیا تھا۔ ہم میں سے تین کو آتشک ہو گیا تھا۔ ہمارے اکثر ساتھیوں کو خارش کی شکایت تھی۔ اور ایک تو جوڑوں کے درد کی وجہ سے تقریباً دُہرا ہو گیا تھا۔ چھٹی کے دن اور فرصت کے وقت وہ صدری اور چیں چیں کرنے والے بُوٹ پہن لیتے، بعض سُر ملا کر گانے لگ جاتے اور بعض باغ عامہ میں تفریح کے لئے چلے جاتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہم پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے، پاؤں میں کھڑاؤں یا چپل ہوتی۔ اور سپاہی ہمیں باغِ عامہ میں گھسنے کی اجازت بھی نہ دیتے تھے —— اس لئے ہم ڈبل روٹی بنانے والوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتے تھے ؟؟

اور آخر ایک دن ہم نے سُنا کہ ڈبل روٹی بنانے والوں کے اُستاد نے پینا شروع کر دی ہے۔ مالک نے اُسے جواب دے دیا اور اُس کی جگہ کوئی اور رکھ لیا۔ اور یہ نیا شخص ایک سپاہی تھا جو ساٹن کی واسکٹ پہنا کرتا تھا اور جس کے پاس سونے کی زنجیر والی گھڑی تھی۔ ہم اس بانکے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس غرض کے لئے ہم بار بار صحن میں جاتے لیکن مایوس ہو کر لَوٹتے تھے۔

آخر ایک دن وہ خود ہی ہماری دُکان میں آ گیا۔ اس نے ٹھڈے کے زور سے دروازہ کھولا اور اُسے بند کئے بغیر دہلیز پر کھڑے ہو کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے مُسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

"کہو بھئی! اچھے تو ہو ؟"

دروازے میں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک ریلا اندر آ گیا اور اُس کے پاؤں میں گھومنے لگا۔ وہ دہلیز پر کھڑے ہو کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی مروڑی ہوئی خوبصورت مونچھوں کی اوٹ میں اس کے بڑے بڑے زرد دانت دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کی واسکٹ واقعی غیر معمولی تھی —— پھول دار، نیلے رنگ کی، چمکدار، سُرخ رنگ کے بٹن —— اور سونے کی زنجیر والی بات بھی صحیح تھی ....

وہ ایک خوبصورت جوان تھا —— یہ سپاہی —— لمبا قد، گٹھا ہوا جسم، سُرخ رخسار، چمکدار آنکھیں اور صاف لہجہ وہ کلف دار اکڑی ہوئی، سفید ٹوپی پہنتا تھا۔ اور اُس کے نوکدار پالش کئے ہوئے بُوٹ اُس کے سفید براق پتلون میں سے جھانک رہے ہوتے۔

ہمارے فورمین نے اُسے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ اُس نے عجلت کا اظہار کئے بغیر اس کی تعمیل کی۔ اور اس کے بعد وہ ہمارے مالک کے متعلق سوالات کرنے لگا۔ ہم سب نے بلا تامل کہہ دیا کہ ہمارا مالک ظالم ہے، بدمعاش ہے، چالاک اور مکار ہے۔ بلکہ ہم نے وہ کچھ کہہ دیا جو یہاں لکھنا مناسب نہیں ہے

سپاہی نے یہ سب باتیں سُنیں اور اپنی مُونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ پھر اُس نے ہماری طرف دوستانہ انداز میں دیکھا اور اچانک بولا
"بہرحال ——— یہاں چھوکریاں تو کافی ملتی ہوں گی؟"
ہم میں سے بعض نے گھُٹے ہوئے قہقہے لگائے۔ اور بعض اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ آخر ایک ساتھی نے کہا۔
"ابھی یہاں تو چھوکریاں ہیں دو!"
"تمہاری تو پانچوں گھی میں ہوں گی!" سپاہی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

ہم نے پھر اپنی ہنسی بمشکل ضبط کی۔ لیکن اس انداز میں کہ اُسے بُرا معلوم نہ ہو . . . . . . ہمارے بعض ساتھی اُسے بتانا چاہتے تھے کہ ہم بھی کچھ کم چھٹے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ البتہ ایک نے مدہم آواز میں صرف اتنا کہا ——— "ہم کیونکر . . . . ؟"

"بھئی۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے!" سپاہی نے ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے قدرے وثوق آمیز لہجے میں کہا۔ "تم اِس میدان پر پُورے نہیں اُترتے۔ تمہاری وضع قطع ہی ایسی نہیں ہے۔ اور عورت تو وضع قطع ہی پسند کرتی ہے۔ اُسے گٹھا ہوا جسم چاہیئے وہ فوراً تاڑ جاتی ہے کہ مرد میں زور کتنا ہے ——— اُسے اِس طرح کی مُشتی چاہیئے ——— اس طرح کی . . . . ."

سپاہی نے جیب سے دایاں ہاتھ نکالا۔ اور گھونسہ تان کر ہمیں بتایا۔ اُس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، اور اُس کے بازو کہنی تک عُریاں تھے۔ اس کی جلد سفید اور چکنی تھی اور اُس پر سُنہرے بال چمک رہے تھے۔

"ٹانگیں، چھاتی ——— سب مضبوط ہونی چاہئیں۔ اِس کے علاوہ لباس بہت خوبصورت ہو۔ تاکہ عورت کو پسند آجائے۔ مجھے دیکھو ——— مجھ پر بہت سی عورتیں مرمٹی ہیں۔ میں نے اُن کو کبھی دعوت نہیں دی۔ نہ اُن پر ڈورے ڈالے ہیں۔ اِس کے باوجود ایک وقت میں پانچ پانچ عورتیں میری گردن پر سوار رہتی ہیں!"

وہ میدے کی ایک بوری پر بیٹھ گیا اور عورتوں کی باتیں سنانے لگا کہ کس طرح وہ اُس پر مرتی ہیں۔ اور وہ کس طرح بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اِس کے بعد وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اور جب اُس کے کمرے سے نکلتے ہی دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ بند ہوا تو ہم دیر تک چُپ بیٹھے رہے۔ اور سپاہی اور اُس کی باتوں پر غور کرتے رہے۔

پھر اچانک ہم سب باتیں کرنے لگے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارا موضوع وہی سپاہی تھا۔ وہ کتنا سادہ اور اچھا آدمی ہے بس وہ اندر آیا اور ہم سے باتیں کرنے لگا، حالانکہ ہمارے پاس کوئی بھی یوں سادگی سے آکر بے تکلفی کی باتیں نہیں کرتا۔ الغرض ہم اُس کی اور کشیدہ کار لڑکیوں سے اُس کے تعلقات کی باتیں کرتے رہے لیکن یہ لڑکیاں، جب صحن میں ہم سے ملتیں تو نفرت سے اپنے ہونٹ مروڑتی ہوئی ایک طرف ہو کر یا سیدھی دندناتی ہوئی گذر جاتیں، جیسے ہم موجود ہی نہیں ہیں۔ تاہم صحن میں اُن سے ملاقات ہوتی یا وہ ہماری کھڑکیوں کے قریب سے ہو کر گذرتیں، سردیوں میں اُون کی ٹوپیاں اور فر کے کوٹ پہنے ہوتیں یا گرمیوں میں پھولدار حاشیے والی ٹوپیاں اوڑھے اور خوش رنگ زنانہ چھتریاں اُٹھائے ہوتیں۔ ہم تو اُن کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ البتہ ہم اُن کا ذکر خیر ایسے پیرایہ میں کرتے کہ اگر وہ سُن پاتیں تو شاید روحانی کوفت اور شرم و حیا کے مارے پاگل ہو جاتیں . . . . !

"لیکن کہیں وہ ننھی تانیا کو خراب نہ کر دے۔" اچانک ہمارے سربراہ نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

یہ الفاظ سُن کر ہم سب خاموش بیٹھے رہے۔ ہماری زبانیں گُنگ ہو گئیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح تانیا کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ سپاہی کے چوڑے چکلے، مضبوط اور خوبصورت جسم نے ہم کو سب کچھ بھُلا دیا تھا۔ اس کے بعد خوب زوروں کی بحث ہوئی۔ بعض کہتے تھے کہ تانیا اِس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ سپاہی کی حریف نہیں ہو سکتی۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ اگر وہ تانیا کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے تو ہم اُس کی پسلیاں توڑ دیں گے۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ سپاہی اور تانیا کی نگرانی کی جائے اور لڑکی سے صاف کہہ دیا جائے کہ وہ سپاہی سے ہوشیار رہے . . . اس کے بعد بحث ختم ہو گئی ———

تقریباً ایک مہینہ گذر گیا۔ سپاہی ڈبل روٹیاں بناتا اور کشیدہ کار لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا۔ وہ کبھی کبھی ہماری دُکان میں بھی آتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی عاشقانہ مہمات کا کبھی ذکر تک نہ کیا۔ ——— البتہ مُونچھوں پر تاؤ دیتا اور ہونٹوں پر زبان ضرور پھیرتا رہا۔

تانیا ہر روز صبح کو اپنے لئے "ننھے بسکٹ" لینے آتی۔ وہ پہلے کی طرح ہنس مکھ اور خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ جب ہم نے

اُس کے سامنے سپاہی کا ذکر چھیڑ، تو تانیا نے اسے قسم قسم کے ناموں سے پکارنا شروع کیا۔ گاؤدی، احمق، بیدنگا اور جانے کیا کیا ہم اس سے مطمئن ہو گئے۔

سپاہی کے ساتھ کشیدہ تعلقات ہونے کا ایک دیکھ کر ہم اس چھوٹی سی لڑکی پر یقیناً ناز کرنے لگے تھے۔ تانیا نے سپاہی سے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اُس سے ہم بہت خوش تھے اس لئے ہم سپاہی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور لڑکی کی وقعت ہماری نگاہوں میں بہت بڑھ گئی۔ ہم اسے پہلے سے زیادہ چاہنے لگے۔ اور صبح جب وہ آتی تو ہم اس کا پر جوش خیر مقدم کرتے تھے۔

لیکن ایک دن جب کہ سپاہی ہمارے کمرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ وہ بیٹھ کر ہنسنے لگا۔ جب ہم نے پوچھا کہ کیا بات ہے، تو اس نے جواب دیا:

"دو لڑکیاں میری خاطر لڑتی رہیں ——— پیارکا اور گروشکا [illegible] ... انہوں نے ایک دوسرے کو ذلیل کیا۔ ایک نے دوسری کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اور فرش پر گھسیٹتی رہی۔ اس کے بعد اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی۔ انہوں نے ایک دوسری کے منہ پر خوب طمانچے مارے۔ بال نوچ لئے۔ بڑا مزا آیا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ عورتیں لڑنا کیوں نہیں جانتیں؟ آخر نوچنے کھسوٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہیں؟"

وہ بنچ پر بیٹھا رہا۔ وہ تندرست، مضبوط، تروتازہ اور خوش باش نظر آتا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا ہنستا رہا۔ ہم خاموش رہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے ہمیں اس کی یہ باتیں ناگوار معلوم ہو رہی تھیں۔ [illegible]

"اس میں شک نہیں کہ میں عورتوں کے معاملہ میں بہت زیادہ خوش قسمت ہوں۔ کیسے مزے کی بات ہے۔ میں ادھر ادھر بس ذرا آنکھ اُٹھاتا اور وہ چومنے کے لئے میرے ہاتھ پر گر پڑتی ہیں!"

اُس نے اپنے سفید، چمکیلے بالوں والے ہاتھ اُٹھائے اور زور سے اپنے گھٹنوں پر دے مارے۔ اس کے بعد مسرت آمیز تعجب کی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کے معاملہ میں وہ اتنا خوش قسمت کیوں ہے؟ اس کا موٹا موٹا سرخ چہرہ خوشی اور اطمینان سے دمک رہا تھا۔ وہ مزے میں آکر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا...!

ہمارے سربراہ نے غصے اور جوش میں آکر زور سے اپنی کھرپی تنور کے فرش پر چلائی اور نفرت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"صنوبر کے پودوں کو اکھاڑ لینا آسان ہے لیکن ذرا چیڑھ کے درخت پر تو زور آزمائی کر کے دیکھو ———"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟" سپاہی نے دریافت کیا۔

"ہاں، تم ہی سے کہہ رہا ہوں۔"

"تو کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ نہیں ..... یونہی منہ سے نکل گیا۔"

"نہیں، نہیں۔ ذرا ٹھہرو، تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ چیڑھ کا درخت کون ہے؟"

ہمارا سربراہ پورے انہماک سے تنور میں کھرپی چلاتا رہا۔ اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے اُبلے ہوئے بسکٹ بھٹی میں ڈالے۔ اور جو پک گئے تھے اُن کو نکال کر بے تحاشا اُن لونڈوں کے آگے پھینکے۔ جو بسکٹوں کو ایک ٹوکری میں ڈال رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سپاہی اور اُس کے ساتھ اپنی بحث کو بالکل بھول چکا ہے لیکن سپاہی بہت زیادہ بے چین نظر آتا تھا وہ رہ نہ سکا اور فوراً اُٹھ کر تنور کے پاس آگیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ فضا میں اِدھر اُدھر چمکتی ہوئی کھرپی اُس کے سینے میں آکر اچانک لگ سکتی ہے۔

"نہیں، نہیں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے؟ تم نے میری ہتک کی ہے۔ میں؟ ..... دنیا میں کوئی ایسی عورت نہیں ہے جو میرے سامنے نہ جھک سکے۔ ایک بھی نہیں۔ ہے تم کو میری ہتک کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ناراض ہونے میں حق بجانب تھا۔ ظاہر ہے وہ صرف اتنا منوانا چاہتا تھا کہ اُسے عورتوں کو پھانسنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اِس کے علاوہ غالباً اُس میں کوئی قابلیت نہ تھی۔ اور یہی وہ چیز تھی جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتا تھا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں زندگی کی سب سے قیمتی شے کسی نہ کسی جسمانی یا روحانی بیماری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ آخری دم تک اُن کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ اُسی کے بھروسے زندہ رہتے ہیں۔ اُسی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ اُسی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح دوسروں کی ہمدردی حاصل کرتے

مگر اُن کی بیماری دُور کر دی جائے، اگر وہ صحتیاب ہو جائیں تو ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی کیونکہ اُن کی زندگی کا سرچشمہ بند ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک خلا میں محسوس کرتے ہیں۔ بعض اوقات، انسان کی زندگی اس درجہ محروم ہو جاتی ہے کہ وہ غیر اختیاری طور پر اپنی اخلاق باختگی کی قیمت مقرر کر لیتا ہے اور اسی پر گزارہ کرتا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ بعض اوقات انسان محض اس لئے اخلاق باختہ ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی سے اُکتا یا ہوا ہے۔

سپاہی تلملا اُٹھا تھا۔ وہ سربراہ پر جھپٹ پڑا اور چیخکر بولا

"نہیں۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے؟"

"بتادوں؟" سربراہ اُس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ہاں!"

"تانیا کو جانتے ہو؟"

"اچھا؟"

"اچھا تو بس۔ وہی۔ ذرا آزما کر دیکھو۔"

"میں؟"

"ہاں۔ تم!"

"اُسے؟ ہُوںہہ۔ مَیں اُسے کیا سمجھتا ہوں؟"

"دیکھا جائے گا۔"

"اچھا دیکھ لینا۔ ہاہاہا۔"

"وہ بھی دکھا دے گی۔"

"بس ایک مہینہ کی مہلت دے دو۔"

"اجی سپاہی صاحب! آپ سمجھتے کیا ہیں!"

"اچھا پندرہ دن! میں تمہیں دکھا دوں گا۔ ہونہہ میں اُسے کیا سمجھتا ہوں!"

"اچھا ذرا میرے رستے سے ہٹ جاؤ۔"

"بس پندرہ دن۔ اور کام یُوں ہوگا یُوں۔ ارے تم ....."

"بس اب چلے جاؤ یہاں سے۔"

نورین اچانک سیخ پا ہو گیا اور اپنی کُرسی ہوا میں لہرانے لگا۔ سپاہی حیران ہو کر دروازے کی طرف بڑھا کچھ دیر تک خاموشی سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پُرسکون آواز میں بولا۔

"اچھا ——— تو پھر ——— میں جاتا ہوں۔"

جھگڑے کے دَوران میں ہم خاموش رہے تھے لیکن پُورے انہماک سے دونوں کی باتیں سُنتے رہے تھے۔ جب سپاہی چلا گیا تو ہم میں کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ ہم میں سے ایک نے سربراہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"یار دل تم نے خواہ مخواہ بات بڑھا دی۔"

"اپنا کام کرو۔" نورین نے جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔

ہم جانتے تھے کہ سپاہی کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی گئی ہے اسلئے اب تانیا کی خیر نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی تعجب کے احساس نے ہمارے تن بدن میں آگ لگا رکھی تھی۔ کیا ہوگا؟ کیا تانیا سپاہی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ ہم سب پورے وثوق کیساتھ پکار اُٹھے "ننھی تانیا؟ وہ یقیناً مقابلہ کریگی۔ وہ یُوں آسانی سے قابو میں آنیوالی نہیں۔"

ہم اپنی پیشگوئی کا امتحان لینے کے لئے بیقرار تھے۔ ہم سب کو یقین تھا کہ یہ پیشگوئی ضرور پوری ہوگی۔ ہم نے پورے وثوق سے ایکدوسرے کو یقین دلایا کہ ہماری پیشگوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسکے بعد ہم سوچنے لگے کہ شاید ہم نے سپاہی کو پُوری طرح بھڑکایا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے چیلنج کو بُھول جائے۔ اُسے یاددہانی کراتے رہنا چاہیئے۔ اس دن کے بعد ہم ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے۔ ہم کئی دن تک ایکدوسرے سے جھگڑتے رہے بحث کرتے رہے اور ہماری گفتگو میں روز بروز تندی و طراری پیدا ہوتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے شیطان کیساتھ بازی لگائی ہے اور جو پانسہ ہماری طرف ہے اس پر تانیا کا نام لکھا ہوا ہے۔ آخر جب ہم نے بیکری کے ملازموں سے سُنا کہ سپاہی نے تانیا سے آنکھیں لڑانی شروع کر دی ہیں تو ہم ... میں ایک اذیت ناک ... دوڑ گئی۔ اور ہم اپنی زندگی میں ... دلچسپی لینے لگے کہ نانبائی نے ہمارے جوش سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روزانہ پانسو پونڈ آٹے کی کھپت کا اضافہ کر لیا۔ ہم کام کرتے کرتے کبھی اُکتاتے نہیں تھے۔ سارا دن تانیا کا نام ہماری زبان پر رہتا تھا۔ اور ہر صبح ہم بے صبری سے اُس کا انتظار دیکھتے تھے۔ بعض اوقات ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تانیا نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے ——!

تاہم بحث کے بارے میں ہم نے ایک لفظ بھی اس سے نہ کہا۔ ہم نے اُس سے پوچھا تک نہیں۔ ہم اس سے سب تو نرمی اور خوش خلقی کا برتاؤ کرتے تھے لیکن ہمارے رویے میں ایک نئی چیز پیدا ہو گئی تھی۔ ایک ایسی چیز جو تانیا کے متعلق ہمارے پہلے جذبات سے ... ——— اور یہ نئی چیز تھی لگانے کا شوق تھا جو ... نوکیلا تھا۔

"ساتھیو! آج سزا کی مدت ختم ہو گئی۔" فورمین نے ایک صبح اپنا کام شروع کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس کی یاددہانی کے بغیر بھی ہمیں اس کا علم تھا۔ تاہم ہم بیٹھے اپنی تیاریاں مکمل کریں۔

"ہم اس کی اچھی طرح نگرانی کریں گے۔ وہ ایک آدھ منٹ میں آتی ہوگی۔" فورمین بولا۔ جس پر ایک ساتھی نے دردناک آواز میں کہا۔

"اور ہمیں نظر کیا آئے گا؟"

اس کے بعد ہم دوبارہ فکر گستر تھے۔ کم سے کم آج ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ برتن کتنا صاف اور پاکیزہ ہے جس میں ہم نے عقیدت کے بہترین جذبات کو تبرک کے طور پر محفوظ رکھا ہوا ہے۔ آج ہمیں اچانک اور پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ہم نے کتنی بڑی بازی لگائی ہے اور ہم جانتے تھے کہ ممکن ہے اپنی دیوی کے تقدس کا امتحان لیکر ہم اُسے ہمیشہ کے لئے کھو دیں۔ متواتر کئی روز سے ہم سُن رہے تھے کہ سپاہی بُری طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے لیکن یہ کیا بات ہے کہ ہم میں سے کسی نے ابھی تک تانیا سے نہ پوچھا کہ سپاہی سے اُس کے تعلقات کیسے ہیں؟ اور وہ باقاعدہ صبح کے وقت بسکٹ لینے آتی اور اُس میں ذرا بھی تغیر نہ آیا تھا۔

اور اُس روز بھی حسبِ معمول اُس کی آواز آئی —— "ننھے قیدیو! میں آگئی۔"

ہم جلدی سے دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھے لیکن جب وہ اندر آئی تو ہم نے خلافِ معمول خاموشی اختیار کی۔ ہم اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے اُسے کچا چبا جائیں گے۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اُس سے پوچھیں کیا؟ اور ہم اُس کے سامنے سکوتِ مرگ بن کر کھڑے رہے۔ وہ بھی حیران تھی کہ آخر اس غیر معمولی پُرسکون خیر مقدم کا مطلب کیا ہے؟

—— اور اچانک ہم نے دیکھا کہ اُس کا رنگ فق ہو رہا ہے۔ وہ بے چین سی ہو گئی۔ پھر گھبرا گئی اور گھٹی ہوئی آواز میں اُس نے کہا ——

"تم کیا ... اِس طرح؟"

"اور تم؟" فورمین نے جیسے پتھر کھینچ کر مارا۔ اور اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا ——

"میں ... کیا؟"

"کُ ... کچھ نہیں۔"

"تو اچھا جلدی کرو مجھے بسکٹ دو۔"

اُس نے آج تک ہمیں جلدی کرنے کو نہیں کہا تھا ....

"تمہارے پاس کافی وقت ہے!" فورمین نے اُسکی التجا کا اثر قبول کئے بغیر کہا اور اُس کی طرف بدستور دیکھتا رہا ——

وہ فوراً مڑی۔ اور دروازے میں سے نکل کر غائب ہو گئی۔

فورمین نے اپنی ٹھری اُٹھائی اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے بولا ——

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ...... کام ہو گیا .....
.... لیکن سپاہی ...... حرامخور، بدمعاش ....
.... !"

ہم بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے میز کی طرف گئے اور خاموشی سے بیٹھ کر بادلِ ناخواستہ کام کرنے لگے۔ آخر ایک نے کہا ——

"ممکن ہے ...... شاید، آخر ...."

"ٹھیک ہے ... لعنت بھیجو۔" فورمین نے چلّا کر کہا۔

ہم جانتے تھے کہ وہ بہت چالاک ہے —— ہم سے کہیں زیادہ چالاک۔ اور اُس کی چیخ سے ہم سمجھ گئے کہ سپاہی واقعی جیت گیا ہے .... ہمیں افسوس ہوا اور ہم مضطرب ہو گئے ......!

بارہ بجے کے قریب —— یعنی کھانا کھانے کے وقت —— سپاہی بھی آگیا۔ وہ حسبِ معمول بانکا نظر آتا تھا۔ اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہماری طرف دیکھا۔ لیکن ہم اُس کی طرف زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکے۔

"اچھا تو حضرات! اگر تم چاہتے ہو کہ میں اپنا فوجی کارنامہ دکھاؤں تو آج ذرا غلام گردش کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھنا ......" اُس نے فخریہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

ہم ایک دوسرے پر گرتے پڑتے باہر نکلے۔ اور اُس غلام گردش میں جمع ہو گئے۔ جو کشیدہ کاری کی دکان اور صحن خانے کے درمیان واقع تھی۔ صحن اور غلام گردش کے درمیان لکڑی کے تختوں کی ایک دیوار حائل تھی۔ ہم تختوں کی درازوں میں سے جھانکنے لگے۔ ہمیں زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہ ہوئی .... جلد ہی تانیا

[illegible] ہوئی۔ اور پگھلی ہوئی برف اور کیچڑ کو پھاندتی ہوئی تہہ خانے کے دروازے میں داخل ہو کر غائب ہو گئی۔ آج وہ کوئی خاص بات سوچ رہی تھی۔ اس کے بعد فوراً ہی سیٹی بجاتا ہوا سپاہی آیا۔ اُسے کوئی ایسی جلدی نہ تھی۔ وہ بھی تہہ خانے کی طرف بڑھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ اور وہ مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بارش ہو رہی تھی۔ اور پانی کے قطرے گڑھوں میں گر کر لہریں پیدا کر رہے تھے۔ دن نمناک اور سوگوار تھا۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر ابھی تک برف پڑی ہوئی تھی۔ لیکن زمین پر کالی کیچڑ کے انبار نظر آتے تھے۔ اور چھتوں پر بھی برف کے اوپر بھورے رنگ کے غبار کی ایک تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ پانی آہستہ آہستہ برس کر بھیانک آواز پیدا کر رہا تھا۔ ہم ٹھٹھر گئے۔ تاہم مجبوراً انتظار کرنا پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سب سے پہلے تہہ خانے میں سے سپاہی برآمد ہوا۔ وہ صحن میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پہلے کی طرح جیبوں میں تھے۔ اور وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

اِس کے بعد تانیا بھی نکلی۔ اُس کی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی آنکھیں خوشی اور مسرت کے مارے چمک رہی تھیں۔ اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یوں چل رہی تھی جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ اور اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور پاؤں بے ٹھکانے پڑ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہم اِس منظر کو برداشت نہ کر سکے۔ ہم دروازے کی طرف بھاگے۔ اور صحن میں کود پڑے۔ ہم نے اُسے شش شش کی۔ پھر آتے اُس پر بُری طرح برس پڑے اور اُس کی خوب خبر لی۔

وہ ہمیں دیکھتے ہی ٹھٹک کر ٹھہر گئی، اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ جیسے وہ کیچڑ میں دھنس جائے گی۔ ہم نے اُسے گھیر لیا۔ اور پوری بے حیائی سے اُس پر آوازے کسے، اُسے گالیاں دیں۔ اور ایسے وہ کچھ کہا جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔

تاہم ہماری آوازیں بہت زیادہ بلند نہ ہوئیں۔ اور ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہم جانتے تھے ہم نے اُسے گھیر رکھا ہے اس لئے وہ بھاگ تو سکتی نہیں۔ ہم اُسے جی بھر کر کوس سکتے تھے۔ تاہم ہم نے اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ [illegible] کیوں؟ وہ ہمارے درمیان کھڑی رہی اور جیسے جیسے ہم اُس کے کانوں پر مغلظات کی بوچھاڑ کرتے تھے وہ اِدھر اُدھر اپنی گردن مروڑ رہی تھی۔ ہم نے اُسے بے تحاشا بُرا بھلا کہا، اُسے بیہودہ الفاظ سنائیں، اُسے گالیاں دیں۔

اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھیں جن میں تھوڑی دیر پہلے ہی خوشی ناچ رہی تھی، حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اور اُس کے سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔

اور ہم نے اُسے گھیرے میں لے کر اپنا بدلہ لے لیا کیونکہ وہ ہمیں لوٹ کر لے گئی تھی۔ وہ ہماری تھی۔ ہم نے اُس پر نوازشوں کی بارش کی تھی۔ اور اگرچہ ہماری نوازشیں گدا گر کے ٹکڑوں پر مشتمل تھیں تاہم ایک طرف ہم چھبیس تھے اور دوسری طرف وہ اکیلی تھی۔ اسی لئے ہم اُس کے جُرم کی پوری پوری سزا نہ دے سکتے تھے۔ ہم نے اُس کی کتنی بے عزتی کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! لیکن وہ خاموش رہی۔ ہماری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ تاہم وہ کانپ رہی تھی۔

ہم خوب ہنسے، ہم نے قہقہے لگائے، ہم نے شور مچایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردگرد کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے تانیا کو آستین سے پکڑ لیا گھسیٹ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اچانک اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اُس نے آرام سے اپنے ہاتھ اُٹھا کر سر کے بال درست کئے اور بال سنوارتے ہوئے ہمارے منہ پر بلند آواز میں پکار اُٹھی ——

"او۔ بدبخت قیدیو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر وہ نڈر ہو کر ہماری طرف بڑھی جیسے ہم اس کے رستہ میں حائل نہیں تھے۔ ہم میں سے ایک نے بھی اس کے لئے رستہ چھوڑنے سے انکار نہ کیا۔

وہ دائرے سے باہر نکل کر اپنا منہ پھیرے بغیر پورے زور سے چلائی —— "او چمار ۔ ۔ ذلیلو"

اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی!

ہم صحن کے عین درمیان کیچڑ میں کھڑے رہ گئے آسمان

پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش ہو رہی تھی ......

اس کے بعد ہم خاموشی سے اپنے نمناک سنگین تہ خانے میں واپس آ گئے۔ سورج ہمیشہ ہماری کھڑکیوں میں سے نہیں جھانکتا۔ اور تاتیا اس روز کے بعد ہماری دکان میں کبھی نہیں آئی ...... !!

(میکسیم گورکی)

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

گھسیٹے

بیچارہ قاسم ازل ہی سے تمام بدقسمتیوں کو جمع کرکے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں مر گئی اور اسے اس کی مُردہ ماں کا پیٹ چیر کر باہر نکالا گیا۔ بچپن کا زمانہ رونے بسورنے اور دست کرنے میں گذرا۔ جب اسے کچھ ہوش آنے لگا تو دیکھا کہ گھر میں ایک ایسی عورت کا راج ہے جس کو وہ ماں کہتا ہے مگر وہ اسے اپنی اولاد کی طرح نہیں چاہتی ہے۔ یہ جب کچھ بڑا ہوا تو اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں اسے کبھی پلاسٹر کے پتھر جیسے جاکٹ میں مہینوں رکھا جاتا اور کبھی اس کی دونوں ٹانگیں رسی میں باندھ کر اوپر لٹکا دی جاتیں اور اس کو اسی طرح مہینوں پلنگ پر پڑا رہنا پڑتا۔ ہسپتال کے کھلے ہوئے روشن وارڈ میں جہاں اس کی طرح اور بھی بچے بچیاں تھیں اس کی زندگی کے پونے دو سال گذر گئے۔

قاسم کی زندگی کے یہ پونے دو سال ہسپتال میں اس وقت گذرے جب وہ کوئی دس سال کا تھا۔ اس طویل مدت میں اس کا باپ اس کو دیکھنے کے لئے کوئی دو تین بار ہسپتال میں آیا مگر قاسم کو الٹا لٹکتے دیکھ کر اُسے نہ کبھی رحم آیا اور نہ افسوس بلکہ اس نے اور بھی ڈانٹ کر غصہ کیا اور بولا "کمبخت، نرس تیری شکایت کرتی تھی کہ تو ہر وقت مُنہ میں نوالہ ٹھونسنا چاہتا ہے اور جب کھانے کو ملتا ہے تو اس قدر کھا لیتا ہے کہ دست آنے لگتے ہیں۔ ابے حرامخور، تیری موت کہاں بھٹک گئی ہے؟" یہ کہکر اس کا باپ نفرت سے مُنہ بنا کر چل دیتا۔ اور قاسم بیچارہ گھنٹوں پڑا سوچتا، کہ وہ زیادہ تو نہیں کھاتا بلکہ اسے پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا تھا۔ صبح پانی ملا دودھ، دوپہر کو موٹے چاول اور پانی جیسی دال اور پھر رات کو محض پتلی پتلی دو چپاتیاں اور ان پر ساگ کا ایک لقمہ۔ اور بس۔ وہ کروٹوں لیٹے رہنے کے سبب سے کچھ کھا نہیں سکتا تھا، نرس اسے کھلانے سے پہلے طمانچے مارتی تھی، پھر بد دلی سے ایک آدھ چمچہ چاول کا اس کے کھلے مُنہ میں انڈیل کر اپنی راہ لیتی تھی۔ قاسم نے دل میں کہا "یہاں صبح سے شام تک برسوں سے بھوکا رہتا ہوں اور ابا کہتے ہیں تو بہت کھاتا ہے"

قاسم کے پلنگ سے ملا ایک دوسرا پلنگ تھا جس پر کسی بڑے آدمی کی لڑکی تھی۔ اس کو بھی کبھی پلاسٹر کے جاکٹ میں بند کر دیا جاتا اور کبھی الٹا لٹکایا جاتا۔ اس کے والدین ہر شام اسے دیکھنے آتے اور لڑکی کو مضمحل دیکھکر خود رونے لگتے تھے۔ ماں رو رو کر کہتی "میری لال، میری بنّو نہ روؤ، تم اچھی ہو جاؤ گی تو ہم تم کو پہاڑ پر سیر کرنے لے چلیں گے، اپنی بنّو کو اچھے اچھے کپڑے لا دینگے اور خوب نئی نئی گڑیا منگا دیں گے!" باپ جھک کر بیمار لڑکی کی پیشانی چومتا اور تھپتھپا کر اس کی تسلی کرتا۔ لڑکی بہل جاتی تو ماں پٹاری کھول کر اچھے اچھے بسکٹ مٹھائیاں اور حلوے نکال کر اسے زبردستی اور اس کی خوشامد کرکے کھلاتی۔ نرس ان کے سامنے مسکراتی ہوئی آتی اور بڑے پیار سے کبھی لڑکی کے بال سنوارتی اور کبھی بھاگ کر دردمانے والی تکیہ لا دیتی۔ لڑکی کے والدین کے جانے کے بعد بھی یہ اسی پیار سے لڑکی کو دیکھتی اور اکثر اسکے پلنگ پر آکر بیٹھ جاتی اور اس کی دلجوئی کرتی تھی۔

قاسم اپنے پلنگ پر لیٹا یہ تمام تماشے حیرت سے دیکھتا اور چُپ رہتا۔ کبھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں شدت سے ٹیس اٹھتی، کبھی اس کے کاندھوں اور ایڑیوں میں ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی دہکتا ہوا انگارہ رکھا ہے۔ کبھی اس کی کمر میں ایسا درد ہوتا کہ وہ رونے لگتا۔ یوں درد پیتے اس کی اکثر راتیں جاگتے اور کراہتے گذر جاتیں۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگتے۔ قاسم ان تمام اذیتوں کو صبر سے سہتا اور کبھی زبان سے اُف نہ کرتا۔ اس کی ہلکی سی آہ پر وارڈ کی ملازمہ اور نرس ایسی چراغ پا ہو جاتیں کہ بھاگتی ہوئی آکر اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کر رکھ دیتیں اور کوسنے دینے لگتیں۔ قاسم بھوکا رہتا، بے چین رہتا اور اپنی اس دُکھ بھری زندگی سے ہر گھڑی پناہ مانگتا تھا۔

اسے ہسپتال میں رہتے دو سال ہو گئے۔ ایک دن سرجن نے آکر اسے دیکھا اور کہا کہ اس کا پلاسٹر کاٹ دیا جائے۔ یہ سُن کر قاسم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ شام تک اس کا پلاسٹر کاٹ دیا

گیا۔ مگر اتنی مدت کے بعد بھی اس کے مرض میں کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ اس کی ایڑیوں کی ہڈیاں بدستور ٹیڑھی رہیں۔ اور اس کی پیٹھ کا کوب بھی جوں کا توں رہا۔ اس کی چال بھی اسی طرح بے ڈھنگی تھی اب بھی رہی۔ دوسرے دن قاسم کو سرجن نے پھر دیکھا اور اس کی جسمانی ساخت کی کوتاہیوں پر افسوس کرتے ہوئے بولا "بیچارہ لڑکا، دو سال کی مسلسل تکلیف اور اذیت کے بعد بھی لنگڑا اور کبڑا ہی رہا۔ کیا چھ ماہ کے لئے اسے اور پلاسٹر میں رکھا جائے؟" سرجن گویا خود سے پوچھ رہا تھا۔ مگر یہ سُن کر قاسم سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ اس کی زندگی کے یہ دو سال پلاسٹر کے جاکٹ میں بند رہ کر جس دنیاوی دوزخ میں گذرے تھے اس کے خیال سے اس کا چوٹ کھایا ہوا کلیجہ پھٹ گیا۔ اس کی چیخ سُن کر پاس کھڑی ہوئی نرس نے اسے اپنی خونخوار آنکھوں سے گھورا۔ وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ بڈھے سرجن نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے قاسم کے گال چھوئے اور پچکار کر بولا "میرے بیٹے، ڈرو نہیں، بہادر بنو، میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔"

سرجن یہ کہہ کر چلا گیا۔ نرس اپنی تیکھی نظروں سے قاسم کا کلیجہ چھلنی کرتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اب وارڈ میں آزادی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے پلنگوں پر پڑے کراہ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ قاسم آج قفس سے نکلی ہوئی چڑیا کی طرح آزاد تھا اور اُڑنے کے لئے اپنے بازو ہوا میں اچھال رہا تھا۔ اس کی دنیا ایک بار پھر کھلی کھلی اور وسیع ہو گئی تھی۔ جس میں وہ روئی کے گالے کی طرح اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ خوب اچھلے کودے، بھاگے اور چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اپنے سر پر اٹھا لے۔ چنانچہ وہ اچھل کر اپنے پلنگ سے زمین پر کودا۔ اور جب اس نے اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھے اور اس کے تلوے زمین سے مَس ہوئے تو اسے ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس ہوئی۔ پہلے اسے اپنی ٹانگوں کی قوت پر بھروسہ نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کھویا ہوا اعتماد واپس آیا۔ پہلے وہ ڈگمگا کر تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے ایک قدم آگے بڑھا پھر اپنے پلنگ کا سہارا لیکر اچکتا ہوا اپنے ساتھ والے پلنگ سے جا لگا۔

قاسم نے ساتھ والے پلنگ کی مریضہ کو مخاطب کر کے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بنّو دیکھو، میں چل سکتا ہوں۔" بنّو اب تک پلاسٹر کے بکٹ میں بند الٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے صاف رنگ پر مہینوں کی تکلیف اور اذیت سے دردناک پیلا پن چھا گیا تھا۔

بنّو نے لیٹے لیٹے اپنی گردن موڑ کر قاسم کو اپنے پلنگ کا سہارا لئے کھڑا دیکھا۔ وہ خوشی سے بلبلا رہا تھا۔ بنّو نے بھی اپنی بیمار مسکراہٹ سے اُسے دیکھا اور درد بھری آواز میں کہا "قاسم میرا کولہا، اُف میری ایڑیاں اور پیٹھ میں سخت درد ہو رہا ہے، نرس کو بلا دو۔"

قاسم کو اچانک اپنی اذیتیں یاد تھیں۔ وہ بنّو کا حال سُن کر بے چین ہو گیا اور بھاگ کر نرس کے کمرہ میں جانا چاہا۔ ابھی وہ مشکل سے چار قدم چلا ہو گا کہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اس کی زبان سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی چیخ سے وارڈ کے تمام بچے اپنے پلنگوں پر دہل کر رونے لگے۔ بیچاری بنّو بھی چلائی "نرس نرس" وارڈ کی ملازمہ اور نرس آئیں۔ قاسم کو زمین پر بیہوش پا کر پہلے ٹھوکروں سے اس کی خبر لی پھر اسے سینکڑوں گالیاں سنائیں اور اس کی ٹیڑھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اسے پلنگ پر اس طرح پھینک دیا جس طرح بھنگی مُردہ کتے کو گھسیٹ کر کچرہ پیٹی میں پھینک دیتے ہیں۔

اس حادثہ کے تیسرے دن جب وہ خود پلاسٹر کے پتھر جیسے ڈبہ میں بند ہو کر کراہ رہا تھا کہ ملازمہ نے نرس کو مخاطب کر کے کہا "اور مس صاحب، سُنا آپ نے؟ اس کرم پھوٹے نے یہیں سے پڑے پڑے اپنے باپ کو بھی کھا لیا۔" نرس نے حیرت اور خوف سے قاسم کو دیکھا جیسے اس نے واقعی یہیں سے پڑے پڑے اپنے باپ کو کچا چبا ڈالا ہو اور اس کے منہ پر خون کے دھبّے اب تک لگے ہوں! نرس نے جواب دیا "یہ سخت جان ہے، مُوا مرتا بھی نہیں کہ ہماری جانوں کو آرام ملے۔ ابھی دیکھو، یہ کس کس کو کھا کر خود مرتا ہے۔" قاسم ان باتوں کو سُن رہا تھا مگر اسے اپنے درد اور ٹیس سے اتنی مہلت کہاں تھی کہ وہ اس خبر کی پوری اہمیت کو سمجھ سکتا۔ اسے تو بس یہ فکر تھی کہ کوئی اس کی کمر پر مالش کرے، کوئی اس کی ٹیری اور پیشانی پر برف کے ٹکڑے رکھے اور کوئی خدا کا نیک بندہ اُسے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بھر کر اس کے حلق میں اتار دے۔ وہ اپنی تکلیف کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا اور اگر کہتا بھی تو ایسا کون ہمدرد تھا کہ اُسے ٹھنڈا پانی پلاتا اور اس کے دُکھتے ہوئے جسم پر مالش کرتا۔ وہ لیٹا کراہتا رہا، اس کے حلق اور زبان پر کانٹے سے چبھنے لگے اور اس کی آنکھیں درد کی جانگسل اذیتیں سہتے سہتے پتھرا گئیں۔ مجبوریوں نے ننھے سے قاسم کو صبر کرنا سکھا دیا۔ وہ صبر و شکر سے لیٹا رہا۔ اور اس کے باپ کو مرے ہوئے چھ ماہ ہو گئے۔

اسی دوران میں اس کی ننھی سی پڑوسن بنّو کا پلاسٹر کھولا گیا۔ اس کی پیٹھ اور ٹانگیں سیدھی ہو گئی تھیں۔ بنّو خوش تھی۔ اچھے اور زرق برق کپڑے پہنے ہوئے۔ اس کے والدین نے اس دن خوب خوشیاں منائیں اور اپنے ہاتھوں سے اسپتال کے تمام لڑکوں اور بچوں کو مٹھائیاں کھلائیں۔ قاسم کو بنّو نے اپنے ہاتھوں سے بہت سے پھل کھلائے۔ بنّو کی ماں قاسم کے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اور اس کی گداز انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ قاسم اب تک ان کو دور سے دیکھتا رہا تھا۔ آج قاسم بنّو کی ماں کو اپنے سے اتنا قریب پا کر بہت مرعوب ہو گیا تھا۔ آج اسے اپنی پستی کا حد درجہ احساس ہوا، اتنا احساس ہوا کہ وہ اپنی اُس خوشی کو بھی بھول گیا جو اسے بنّو کے مہربان اور ہمدرد والدین کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ بنّو کی ماں نے قاسم کے منہ میں مٹھائیاں دیکر پیار سے کہا "بیٹے، ڈرو نہیں کھاؤ۔" پھل اور مٹھائیوں کے ذائقے سے اس کے منہ میں رال اُمنڈ آئی تھی اور قاسم کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان تمام پھلوں اور مٹھائیوں کو ایکدم ہڑپ کر جائے۔ مگر بنّو کی ماں کے جسم سے جو خوشبو نکل رہی تھی اس سے وہ بہت مرعوب ہو گیا تھا۔ قاسم اپنی بے کسی اور کس مپرسی کو آج شدت سے محسوس کر کے بہت غمگین ہو گیا اور دل ہی دل میں رونے لگا۔ اس کی بھکاری آنکھیں غم و اندوہ کے آنسوؤں میں تیرنے لگیں مگر وہ فوراً ضبط کر کے آنسوؤں کو پی گیا۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ بنّو صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی اور ہمدردی سے اس کی پیشانی کو چھو کر بولی "قاسم بھیا، میں گھر جا رہی ہوں۔" بنّو کی ماں نے اس کا گال چھو کر کہا۔ "بیٹے گھبراؤ نہیں، تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ میں نے نرس کے پاس تمہارے پھلوں کے لیے بہت سے پیسے دے دیئے ہیں اور اسے تاکید کر دی ہے کہ وہ تمہارا خیال رکھے۔" بنّو کا باپ کچھ فاصلہ پر کھڑا چرٹ پی رہا تھا اور اپنی بیوی اور بیٹی کے اظہارِ ہمدردی سے خوش ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر قاسم کو اپنا باپ یاد آ گیا جس نے آج تک کبھی مسکرا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اپنے باپ کے خیال سے قاسم کانپ اٹھا اور دل ہی دل میں خوش ہوا کہ وہ مر گیا اور کوئی سات مہینے سے اسے ڈانٹنے اور کوسنے نہیں آیا تھا۔ بنّو نے جاتے وقت قاسم سے کہا "اور تم جب اچھے ہو جاؤ تو میرے ہاں ضرور آنا۔ میں نے اپنے باغ میں گڑیوں کیلئے ایک خوبصورت بنگلہ بنوایا ہے، تم جب آؤ گے تو میری نرگس اور چمپ کو دیکھنا، بیچاری بڑی نیک بکریاں ہیں، سینگ نہیں مارتیں۔ ۔ ۔ ۔" بنّو یہ کہکر چلی گئی۔ قاسم نے پڑے پڑے بنّو کو دور تک دیکھا۔ وہ جب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے مڑ کر بنّو کے خالی پلنگ کو دیکھا جہاں بنّو ایک سال تک پڑی رہی تھی۔ قاسم کو اس کا خالی پلنگ دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا، اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا کہ نرس آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور لب بھینچے ہوئے تھے جنھوں نے قاسم کے دل میں اپنی جگہ چھوڑ کر خوف کے حوالہ کر دی۔

قاسم کے جسم سے اس دفعہ جب پلاسٹر کاٹ کر علیحدہ کیا گیا تو اس کی کبڑی پیٹھ قدرے سیدھی ہو گئی تھی، مگر کولہے کی ہڈی بدستور ٹیڑھی رہ گئی جس کی وجہ سے اس کی چال کا لنگڑا پن کم نہ ہوا۔ سرجن نے کہا "میرے بیٹے، انسانی ہاتھ اس سے اور زیادہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے کمزور والدین نے تم کو کمزور ہڈیاں ورثہ میں دیں، اور ان کمزور ہڈیوں میں دق کے جراثیم گھن کی طرح لگ گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ جراثیم فنا ہو گئے ہیں، مگر ان کی پیدا کی ہوئی خرابیاں باقی رہ گئیں جو شاید ہمیشہ رہیں گی۔ اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔" نرس نے قاسم کو اس کے گھر بھیجنے کے لئے خیراتی وارڈ سے بنوایا ہوا ایک کرتا اور پاجامہ پہنا دیا اور اسے ایک طمانچہ مار کر کہا "موئے حرامخور، چل دفع ہو یہاں سے، اب تو بھولے سے بھی کبھی ادھر آیا تو تجھے کچا چبا ڈالوں گی۔" نرس نے یہ کہہ کر غصہ سے اپنے موٹے موٹے اور سیاہ گالوں کے بیچ اپنا غار جیسا گہرا منہ کھول دیا جس میں بڑے بڑے پیلے اور متعفن دانت چمک رہے تھے۔ قاسم خوف سے کانپنے لگا اور اپنی لنگڑی ٹانگ سے جس طرح بھی بن پڑا بھاگ کر ہسپتال سے باہر نکل گیا۔

قاسم جب ہسپتال سے نکلا تو اس کی عمر تیرہ سال کی تھی مگر اس کی شکل و صورت بچوں جیسی تھی۔ اس کا قد ہنوز پست تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں اب بھی سوکھے اور کمزور تھے۔ اس کا سر اس کے جسم کے مقابلہ میں بڑا تھا اور اس کی پیٹھ کے کبڑے ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ ہر گھڑی اس کے کبوتر جیسے نکولے سینہ سے لگا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ چلتے وقت بھی اس کی گردن مڑی رہتی تھی اور وہ مشکل سے اپنا سر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ جسم کی اس ساخت پر اس کے کولہے کی ہڈی ٹیڑھی تھی جس کی وجہ سے اس کی بائیں ٹانگ داہنی سے دو انچ چھوٹی ہو گئی تھی۔ ٹانگوں کی اس بڑائی چھوٹائی کے سبب سے اسے چلنے میں شدید دشواری ہوتی تھی۔ اور وہ چلنے کی مشقت سے بہت

جلد تھک کر ہانپنے لگتا تھا۔ اسے چلتے دیکھکر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کوئی نئی قسم کا جانور ہے جو چلنے میں اپنی بڑی چھوٹی ٹانگوں کو آگے پیچھے کر کے اپنے سارے جسم سے بل کھاتا ہے، پھر ذرا سا آگے بڑھ جاتا ہے۔ قاسم اسپتال سے چھوٹکر سیدھا گھر پہنچا۔ راستے میں اسکی گلی کے لونڈے اس پر پل پڑے اور اُس پر پھبتیاں کسنے لگے مگر وہ اپنی نظریں نیچی کئے چلتا گیا۔

قاسم کو اپنے گھر میں داخل ہونیکی کوئی خوشی نہ تھی۔ یہاں بھی اس کیلئے کوئی سکھ اور چین کا سامان نہ تھا۔ ابھی وہ کال سٹائن میں داخل ہوا تھا کہ اسکی ماں سائبان میں جھلنگے پلنگ پر ایک اجنبی مرد کے ساتھ بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ قاسم یہ دیکھکر ہراساں ہو کر تھوڑی دیر کھڑا ہو گیا مگر چونکہ اس کا کھڑا رہنا بھی دشوار تھا اسلئے وہ وہیں زمین پر پھسل کر بیٹھ گیا اور محبت بھری نگاہوں سے صحن میں اگے ہوئے اس امرود کے درخت کو دیکھنے لگا جس میں پھل لگنا ہمیشہ اسکی خوشی اور حیرت کا باعث بنتا تھا۔ اسوقت بھی وہ درخت پھلوں سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ اسکی پھننگ پر ایک سیاہ کوا بیٹھا ٹائیں ٹائیں کر رہا تھا۔ قاسم نے سوچا شاید یہی کوا ہے جس نے ایکدن دودھ کی دیگچی اُلٹ دی تھی مگر اسکی ماں نے اُلٹا اسے پیٹا تھا اور کہا تھا "مر مُحو، موت پٹیے، لنگڑے، دودھ خود پی جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کوا پی جاتا ہے"۔ ماں کے خیال سے اس نے انکھیوں سے سائبان کی طرف دیکھا۔ اسکی سانولی سلونی ماں گنگا جمنی چوٹی سے درست پڑی پان چبا رہی تھی۔ اور اُس اجنبی مرد سے بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ ماں کو ہنستے دیکھکر قاسم کا دل باغ باغ ہو گیا۔ دراصل اس کا بھی جی چاہا کہ وہ بھی ہنس دے اور بول اٹھے "ماں، دیکھو میں ہسپتال سے اچھا ہو کر تمہارے یہاں آگیا ہوں کیا تم مجھے کھانے کو نہ دو گی؟"
کھانیکے خیال سے قاسم بے چین ہو گیا اور اسکے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ امرود کے درخت پر بیٹھا ہوا کوا اتر کر نچلی شاخ پر آگیا اور ایک پکے ہوئے امرود پر اپنی تیز چونچ سے حملہ کرنے لگا۔ امرود پک کر ٹپکنے کے قریب تھا کوے کی چونچ لگنے کی دیر تھی کہ ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔ قاسم یہ دیکھکر خوشی سے اچھل پڑا مگر امرود کے ساتھ کوا بھی نیچے آگیا اور امرود کو اپنی چونچ میں اٹھا کر لیجانا چاہا۔ قاسم سے نہ رہا گیا اس نے تالی بجا کر شور مچایا کہ کوا امرود چھوڑ کر اڑ جائے اسکے اس شور سے اسکی ماں اور وہ اجنبی مرد چونک پڑے اور پلنگ سے کود کر نیچے اتر گئے۔ اسکی ماں نے اسے دیکھا اور چشم زدن میں غصہ سے بلبلاتی شیرنی کی طرح آگے بڑھی "موئے حرامزادے، لنگڑے، حرامخور، پھر تو اس گھر میں آگیا، اب تیرا یہاں کیا رکھا ہے؟ تیرا نکھٹو باپ تو کب کا مر کھپ کر ختم ہو چکا، کیا اب تو اپنے باپ کی جگہ پر آیا، موت پٹیے، شیطان، تیری کمٹیا نکلے، تجھکو یہاں کس نے بلایا ہے؟ کیا تیرا باپ یہاں کچھ تیرے لئے چھوڑ گیا ہے کہ تو کھانے آیا ہے؟" قاسم کی ماں یہ کہہ رہی تھی اور اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہی تھی۔ قاسم نے اسکے دو ہتھڑوں سے بچنے کے لئے اپنے منہ اور سر کو اس طرح اپنے کرتے کے اندر چھپا لیا تھا جیسے خطرہ کی آمد پر گھونگھا اپنے خول کے اندر سکڑ کر چھپ جاتا ہے۔

قاسم گٹھری بنا پٹ رہا تھا کہ اس مرد نے کہا "خاتون بس کرو، بیچارہ کمزور اور ناتواں ہے، زیادہ نہ مارو کہیں اسکی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے" خاتون پھر بھی نہ رکی تو اس مرد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قاسم سے علیحدہ کر دیا۔ قاسم رو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے گنگا اور جمنا بہہ رہی تھیں رہ رہ کر اسکے حلق میں گھٹی ہوئی چیخ باہر نکل جاتی تھی۔ وہ اپنی عادت کے موافق صبر اور تحمل سے کام لے رہا تھا۔ وہ اس دنیا میں مجبور آیا تھا اور اسے مجبور بنکر رہنا تھا۔ وہ روتے وقت چیختا چلاتا تو کس پر، اس کا اس وسیع دنیا میں کون غمخوار یا ہمدرد بیٹھا تھا کہ اس کی درد بھری چیخ کو سُن کر دوڑتا ہوا آتا اور اسے اپنے سینہ سے چمٹا کر اس کی تسلی کرتا۔
قاسم پر جب اس کی ماں کے تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش بند ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر اپنے محسن کیطرف دیکھا۔ قاسم کی بھکاری آنکھیں اس سے محبت اور ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھیں، مگر قاسم نے دیکھا کہ اسکے محسن کے چہرہ پر بھی ہمدردی کا کوئی نشان نہ تھا۔

الغرض کافی پٹنے کے بعد قاسم کو اپنے گھر کی ایک بوسیدہ کوٹھڑی میں پڑا رہنے کی اجازت مل گئی۔ گھر اور باورچیخانہ کی صفائی، خاتون کے روزانہ کے نئے نئے مہمانوں کی خاطر مدارات کا فرض قاسم کے ذمہ تھا۔ وہ رو دھو کر اور روزانہ پٹ کر اپنے فرائض کو انجام دیتا۔ ہر شام خاتون سے ملنے کے لئے مرد آتے، کوئی شراب کے نشہ میں چور آتا اور کوئی آتے ہی پان، سگریٹ، چائے، شربت وغیرہ قسموں کی چیزیں مانگنے لگتا۔ قاسم کو بار بار بازار جانا پڑتا، اور یہ مصیبت اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ چلنا اور بھاگ کر جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ قاسم روتا گڑگڑاتا، اس کی آنکھیں روتیں مگر بغیر آنسو کے۔

قاسم نے صبح شام رو پیٹ کر اپنی زندگی کے چار سال اور گزار دیئے۔ شباب برسات کے سبزہ کی طرح اس کے ٹوٹے پھوٹے جسم پر بھی پھوٹ کر ظاہر ہونے لگا۔ اسے رنگین کپڑے بہت پسند تھے۔ ایک شام وہ اپنے سبز کرتے کی رنگینی میں کھویا ہوا تھا کہ ایک صاحب اس کی ماں سے ملنے آئے۔ ان کے سیاہ سوٹ، سیاہ چمکدار جوتے، سیاہ بو اور سفید کلف دار قمیص نے قاسم کو دریائے حیرت و رعب میں غرق کر دیا۔ ان کے سینے پر چھوٹے بڑے اور ہر رنگ کے تمغے پڑے چمک رہے تھے۔ اور یہ جس وقت سینہ تان کر چلتے تو ان کے تمغوں سے گھنگروؤں کی آواز نکلتی۔ ان کی مونچھیں بھی بڑی شاندار تھیں جنکو اینٹھکر

ں طرح جل رہا گیا تھا، کہ ان کے منہ کے دونوں کونوں کے اوپر دو تمام دائرے سے بن گئے تھے۔ ان کی ناک پر سونے کی کمان کی عینک لگی ہوتی اور ان کے سر کے بال اس صفائی سے سنوار کر بٹھائے گئے تھے کہ ان پر روشنی کا عکس آئینہ کی طرح جھلملا کرتا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں چاندی کے دستہ والی بید نما چھڑی تھی، دوسرے ہاتھ میں بندر سے بندھی زنجیر تھی۔ یہ بندر بھی اپنے مالک کی طرح سیاہ سوٹ وغیرہ میں ملبوس تھا اور اس کی آنکھوں پر بھی ایک سیاہ رنگ کی عینک تھی۔

قاسم کی ماں جب اپنے نئے شاندار مہمان کا استقبال کرنے آئی، تو خود یہ صاحب ڈرامائی انداز سے جھک گئے اور پھر اپنے بندر کو بھی اسی انداز سے جھکنے کے لئے کہا۔ بندر کی اس مہذب حرکت پر قاسم کی ماں ہنس پڑی اور بڑے پیار سے "ہوں" کہا۔ یہ صاحب ہنستے ہوئے اس کی ماں کے ساتھ کمرہ کے اندر چلے گئے، بندر بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

قاسم اپنی جگہ سے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ بھی ایک اسی قسم کا بندر پالے۔ قاسم اپنے خیال میں محو تھا کہ اس سے پانی پلانے کو کہا گیا۔ وہ پانی کا گلاس بھر کر اندر داخل ہوا۔ یہ صاحب قاسم کو دیکھ کر خوشی سے بلبلا اٹھے، اور بولے "واہ جی بیگم، دیکھتا ہوں، ایک بندر تم نے بھی پال رکھا ہے۔ یہ تو ہمارے پالیسٹر صاحب سے بھی زیادہ شوقین اور رنگین ہے۔ کہو میاں شبراتی، تمہارا کیا نام ہے؟" قاسم نے جھینپ کر مگر خوش ہوتے ہوئے جواب دیا "قاسم"۔ وہ صاحب بولے، "اوہو ہوں، قاسم واسم کچھ نہیں، تم تو گھسیٹے ہو گھسیٹے، گھسٹ کر چلتے ہو اور گھسٹ کر اٹھتے بیٹھتے ہو۔ میں تم کو اپنے سرکس میں رکھوں گا۔ تم تماشے دکھاؤ گے، خوب ڈٹ کر کھاؤ گے، اور طرح طرح کے کپڑے پہنو گے، بولو ہمارے ساتھ چلو گے؟" قاسم خوشی سے جھلا اٹھا اور بولا "جی ہاں"۔

رات کے بارہ بجے جب ساری دنیا سو چکی تھی اور آسمان پر ایک گھسا گھسایا اور فقیروں کے پیالہ جیسا پھیکے رنگ کا ماہتاب نکلا چاہتا تھا، کہ یہ صاحب ہنستے ہوئے اس کی ماں کے کمرہ سے نکلے اور آواز دی "گھسیٹے"۔ قاسم یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے آیا۔ اسے بڑے تپاک سے اپنے ساتھ کر لیا اور اس کی ماں سے بولے "بیگم، گھسیٹے تمہارے لئے ہر ماہ پندرہ روپیہ کی رقم بھیجتا رہے گا، اطمینان رکھو"

قاسم کی زندگی کا یہ نیا دور تھا، جس میں کامیابی بھی تھی اور سکون بھی۔ اس کو تنے ہوئے تار پر چڑھ کر چلنے کی تعلیم دی جاتی جو اس کے لئے سوہانِ روح کا باعث تھی، تعلیم کے دوران میں یہ بری طرح پٹا، مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا، اسے تار پر چڑھ کر چلنا نہ آیا۔ آخرش اس کے ذمہ یہ کام دیا گیا، کہ یہ اپنے سر پر پانی سے بھری ہوئی کڑاہی رکھ کر تماشہ کرنے آئے۔ اور اس کڑاہی سے شیر، بکرا اور بندر ایک ساتھ پانی پئیں۔ اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں بکرا اور بندر اس کے دوست ہو گئے جو اس کے یارانِ غمگسار تھے۔ بکرا اور بندر اس کے بغیر شیر کے سامنے جانے سے انکار کرتے۔ قاسم کی موجودگی سے ان بے زبان جانوروں کے دل میں ہمت پیدا ہوتی اور یہ اس کے پیچھے پیچھے گردن جھکائے ہوئے شیر کے پنجرے میں داخل ہو جاتے تھے۔

سرکس کی سخت اور محنت والی زندگی نے قاسم کی صحت بگاڑ دی۔ اسے رات کو بخار اور دن کو کھانسی آنے لگی۔ آخرش ایک دن ایسا آیا کہ رات کو بارش ہو رہی تھی، اور قاسم کے خیمہ میں اس کے دو دوست یعنی بکرا اور بندر تھے قاسم ایک ہفتہ سے بیمار تھا اور اس کی خیریت بھی پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ قاسم کا مرض بڑھ چکا تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اسی رات اس کی روح پرواز کر گئی۔

صبح کے وقت جب سرکس کے ملازمین قاسم کے خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ قاسم کی لاش کے سرہانے اس کا عزیز بندر سرنگوں بیٹھا تھا اور اس کی ٹانگوں سے لگ کر بکرہ مغموم اور مضمحل کھڑا تھا۔

قاسم جس محبت اور ہمدردی کو انسان کے دلوں میں نہ پا سکا وہ اسے بے زبان جانوروں کے دلوں میں ملی۔ اس کی لاش کے لبوں پر خفیف طنز آمیز مسکراہٹ تھی، جو دیکھنے والوں کے دلوں میں چبھتی تھی ۔

دو ہزار روپے میں جریان کی بیماری

(ایک نیا تجربہ)

جب وہ تندرست ہوگیا اور اس کی جوانی کی سب طاقتیں زندہ ہوگئیں تو اس نے حیرت کے ساتھ
بتایا کہ وہ شروع جوانی میں ہی جریان کا مریض ہوگیا تھا۔ اکثر رات کو خواب (یعنی احتلام) ہوتا تھا۔ پیشاب
کے ساتھ سفید پانی گرتا تھا۔ جوانی جواب دے چکی تھی۔ اس لمبے عرصہ میں اس نے اس بیماری کے علاج پر
تقریباً ۲۰۰۰ روپئے خرچ کیے ہر قسم کا ڈاکٹری اور یونانی علاج کیا۔ مگر مستقل فائدہ نہ ہوسکا۔ مگر جب سے جوہر دوا
جوہر اعظم کھائی تو

جریان کی بیماری ٹھیک ہوگئی

مستقل فائدہ ہوا۔ آج وہ باقاعدہ اور تندرست جوان ہے۔ اپنے جسم میں جوانی کی ہر طاقت محسوس کرتا ہے
حقیقت جریان کی بیماری کیلئے دوا جوہر اعظم نہایت ہی کارگر اور کامیاب علاج ثابت ہوئی ہے
سینکڑوں جریان کے بیمار اس دوا سے تندرست ہوچکے ہیں اور اسکی تعریف کرتے ہیں۔ ایک مریض کو تندرست
ہونے کیلئے اکثر ایک ہی شیشی کافی ہوتی ہے۔ اس کی قیمت تین روپئے آٹھ آنہ ہے جن بھائیوں کو ضرورت ہو

منیجر زنانہ دواخانہ ۱۴۶۷ بی دہلی

یہ پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل محصول نو آنہ لگتا ہے۔

شبنم ملیح آبادی

نامکمل ڈائری

زندگی اُداس ہے اور زندگی کا ہر دن گذرے ہوئے دن سے زیادہ اُداس۔ جب سے ابّا مرے ہیں ہم سب کی زندگی بسور نے لگی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیم، آم، ببول اور پھلیندے کے پیڑ بھی ہماری طرح اداس ہیں۔ آم کے پیڑ پر بیٹھکر کوکنے والی کوئل اور شیشم پر بیٹھنے والی فاختہ بھی اداس ہے۔ صبح اور شام وہ شاخ پر بیٹھکر اپنی بولی میں نہ جانے کیا کہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ روتی ہو اس کی آواز میں درد ہے۔ پھر وہ اُڑ جاتی ہے اور سناٹے میں اسکی آواز سنائی دیتی ہے۔ جب بھی میں فاختہ کو روتے دیکھتا ہوں، تو میرا جی بھی رونے کو چاہتا ہے۔ ——— اور پھر مجھے ابّا کی یاد آجاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم لوگ آج کی طرح اداس نہیں تھے۔ ابّا زندہ تھے لیکن اب وہ مر چکے ہیں۔ موت نے ابّا کو ہم سب سے الگ کر دیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور میں آموں کے پیڑوں کے اس جھنڈ کی طرف دیکھتا ہوں جس کے سائے میں ابّا کی قبر ہے ——— جس دن ابّا مرے ہیں صرف اسی دن میں ابّا کی قبر تک گیا تھا اس کے بعد سے نہیں گیا۔ اُس دن سے پہلے میں نے کبھی قبر نہیں دیکھی تھی۔ ابّا کو پلنگ پر رکھ کر قبر تک لیجایا گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا تھا کہ زمین کھود کر قبر بنائی گئی ہے۔ وہ کافی لمبی چوڑی تھی۔ ادھر اُدھر کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر تھا۔ اسی میں ابّا کو لٹا دیا گیا تھا۔ پھر تختے رکھے گئے تھے اور سب نے ملکر اوپر سے مٹی ڈالدی تھی ماموں نے مجھ سے بھی مٹی ڈالنے کو کہا تھا اور میں نے بھی مٹی ڈالی تھی ——— شاید یہ ثواب کا کام ہوتا ہے ——— اور میں یہ سوچتا رہا تھا کہ آدمی مٹی سے بنتا ہے۔ ابّا نے بھی یہی کہا تھا کہ آدمی مٹی سے بنایا جاتا ہے جس جگہ کی مٹی سے انسان بنایا جاتا ہے وہیں وہ دفن بھی ہوتا ہے اور آج مجھے یہ معلوم ہوا کہ ابّا آم کے پیڑوں کے جھنڈ والی مٹی سے بنائے گئے تھے لیکن مرنے سے پہلے شاید یہ کسی کو معلوم نہ تھا ——— موت دُنیا میں سب سے زیادہ بے رحم ہوتی ہے وہ کسی پر بھی ترس نہیں کھاتی ابّا کی موت کے بعد میں نے چڑیوں کو مارنا چھوڑ دیا ہے۔ پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ چڑیوں کو مارنا کتنا بھیانک کھیل ہے لیکن ابّا کی موت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ایسی تکلیف چڑیوں کے بچوں کو بھی ہوتی ہوگی جیسی مجھے ہے۔ امّی اور بھیا کو ہے اور میرے عزیزوں کو ہے۔ اب اس خونی کھیل سے مجھے نفرت ہو گئی ہے ———!

. . . آج مجھے ماموں اپنے ساتھ ابّا کی قبر پر لے گئے تھے۔ راستہ میں بار بار میرا دل بھر بھر آتا تھا، کئی بار میں گرتے گرتے بچا، جب قبر کے قریب پہنچا تو دیکھا قبر کے اوپر کچھ مرجھائے ہوئے پھول بکھرے ہیں اور سرہانے ایک شکورے میں بجھے ہوئے کوئلے اور لوبان رکھا ہے۔ میں دم بخود کھڑا رہا ماموں نے پھول چنے، نئے پھول سرہانے رکھے لوبان سلگایا اور سرہانے ہاتھ پھیلا کر کچھ پڑھا، پھر آکر میرے نزدیک بیٹھ گئے اور قبر کی مٹی ادھر اُدھر سے برابر کرنے لگے ——— میں بھی مٹی برابر کرنے لگا۔ مجھے کئی بار محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا نام لیکر پکارا ہے لیکن یہ میرا وہم تھا شاید وہ ابّا کی آواز نہ تھی۔ مٹی برابر کرتے کرتے میرا جی چاہا کہ میں قبر سے چمٹ جاؤں اور میں نے یہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ابّا کے سینے سے لگ گیا ہوں۔ پھر میری آنکھوں سے چند آنسو نکل کر مٹی میں جذب ہو گئے۔ ——— اور میں سوچنے لگا کہ ماموں نے سچ کہا تھا کہ تم ابّا کی قبر پر چلو تم کو سکون ملے گا کیونکہ ابّا کی روح تمہارے لئے بیقرار ہوگی۔ اور واقعی میری روح کو سکون ملا۔ اور یقیناً ابّا کی روح کو بھی سکون ملا ہوگا ——— لیکن امّی تو منع کرتی ہیں معلوم نہیں کیا سوچکر مٹی سے میرے کپڑے میلے ہو گئے تھے بہت جھاڑنے پر بھی مٹی کے داغ نہ چھٹے اور اب امّی پہچان لیں گی کہ میں بھی قبر پر گیا تھا ——— اور وہی ہوا۔ امّی جان گئیں اور پھر چمٹا کر رونے لگیں، امّی کے ساتھ میں بھی رونے لگا ——— امّی دکھیا ہیں ان کا دل دکھا ہوا ہے انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ امّی بہت چاہتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ امّی کو خوش رکھنا میرا فرض ہے۔ آج سے میں قبر پر نہیں جاؤں گا کیونکہ امّی رونے لگتی ہیں ———

روح کو اور ابا کی روح کو سکون ملتا ہے۔ آج سے شاید میری روح کو سکون نہ مل سکے گا اور ابا کی روح بھی بیقرار رہے گی۔ اور ان دونوں روحوں کو کب سکون ملے گا؟ یہ خدا ہی جانتا ہے ———!

. . . آج بڑا مرد اور عورتیں پرسہ دینے آئی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی دن سے جاری ہے۔ ماموں نے بتایا تھا کہ یہ ہر گھر میں ہوتا ہے۔ تمام عزیز، دوست، جاننے والے اور پڑوسی اظہار ہمدردی کرنے آتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، مرنے والے کے لئے دعا کرتے ہیں ——— لیکن یہ نیک کام بھی مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے ——— نہیں پسند تو ہے لیکن ہمارے یہاں پرسہ کا طریقہ بہت بُرا ہے۔ میں نے ہر پرسہ دینے والی عورت کو دیکھا ہے کہ اُسے رونا نہ بھی آئے لیکن وہ "زبردستی" رونے کی کوشش کرتی ہے اور بیچاری اُمی کو بھی رونا پڑتا ہے کیونکہ ان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ زبردستی کے آنسو تو جلد ہی رُک جاتے ہیں لیکن اُمی کی طبیعت دن بھر کے لئے خراب ہو جاتی ہے، اور آنیوالی عورتیں ہنسنے بولنے لگتی ہیں۔ دُنیا کی غیبتیں شروع ہو جاتی ہیں، گالیاں دی جاتی ہیں، جُملے کسے جاتے ہیں، پاندان کھول جاتا ہے، پان بننے لگتے ہیں۔ تمبا کو پھانکی جاتی ہے، اگر کھانا ہوا تو خیر ورنہ زمین سُرخ ہونا شروع ہو جاتی ہے اور رخصت ہونے تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے اور پُرسہ ختم ہو جاتا ہے۔ آتے ہی چند آنسو بہا دینا پُرسہ کی ابتدا اور انتہا ہے، اور ماموں کا یہ کہنا کہ ہمارے یہاں کے پُرسے بھی کھوکھلے ہو چکے ہیں تو یہ بالکل سچ ہے اور مجھے ان عورتوں سے نفرت ہو چکی ہے جو اچھی طبیعتوں کو بگاڑنے آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ تو سال بھر تک جاری رہتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اُمی سال بھر تک یونہی روتی رہیں۔ معلوم نہیں یہ ماموں کے یہ زندوں سے ہمدردی ہے یا دشمنی ——— لیکن کون کہے میں سوچتا ہوں اِن آنیوالی عورتوں سے کہہ ہی دوں کہ بلاوجہ اُمی کی طبیعت کو خراب نہ کرنا کیونکہ اب میرے چاہنے والوں میں صرف اُمی ہی رہ گئی ہیں اور اگر خدا نخواستہ اُمی نہ رہیں تو میرا کیا حشر ہوگا؟ اِن عورتوں کا کیا جائے گا، یہ دن بھر کیلئے پھر آجائیں گی خشک آنکھوں سے زبردستی چند آنسو گرا دیں گی اور شام کو چلی جائیں گی لیکن یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، خدا نہ کرے ایسا ہو، خدا کرے اُمی زندہ رہیں، کب تک ——— گنتی سے بھی زیادہ برسوں تک ——— آج میں ماموں سے اس کے بارے میں پوچھونگا کیونکہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں اور مجھے ان کے پاس بیٹھکر بہت خوشی ہوتی ہے شاید وہ کچھ اچھا سا جواب دے سکیں۔

. . . آج کئی دن ہو گئے اور کوئی بھی نہ آیا۔ خاندان والے جو ابا کی موت پر آئے تھے، اب انہوں نے لوٹ کر خبر تک نہ لی۔ ——— پھوپھا، چچا، خالو اور نانا بھائی اُن میں سے اب کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ سب ایک دن کے لئے جمع ہو گئے تھے کچھ ایسے رشتہ دار بھی ابا کی موت پر آئے تھے جو صرف خوشی یا غم کے موقع پر آتے ہیں ——— اب عورتیں بھی کم آنے لگی تھیں کھوکھلے پُرسوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک طرح سے یہ اُمی کے لئے اچھا بھی تھا۔ اب اُمی کو دن میں ہزار مرتبہ رونا تو نہیں پڑے گا ——— لیکن اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ابا کے مرنے کا سب سے زیادہ غم صرف اُمی کو ہے۔ اگرچہ اب وہ پہلے کی طرح روتی تو نہیں ہیں لیکن خاموش رہنے لگی ہیں۔ اور بجیا وہ تو جیسے ابا کو بھول گئی ہیں، اُن کے دل سے ابا کی یاد اور محبت شاید مٹ گئی ہے ——— اور ایسا کیوں ہوا ہے، یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں لیکن محسوس ضرور کرتا ہوں ——— اب بجیا اپنے سیاہ بالوں کو نہایت خوبصورتی سے سنوارتی ہیں، ریشمی خوبصورت کپڑے پہنتی ہیں، صرف دوپٹہ سفید اوڑھتی ہیں، اس سے بجیا کی اندرونی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اُمی سے الگ رہتی ہیں ——— اور یہ دیکھکر میں خود بخود اداس ہو گیا جب میں اُداس ہوتا ہوں تو جی چاہتا ہے ابا کی قبر پر جا کر خوب روؤں لیکن اُمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا ——— میں دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھا رہا، تھوڑی دیر بعد فاختہ بولنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ابا کا دھیان کرنے لگا۔ بڑی دیر بعد ابا کی دھندلی تصویر آنکھوں میں آگئی لیکن اُن کا چہرہ صاف نہیں تھا ——— بہت کوشش کے بعد بھی ابا کا چہرہ صاف نہ نظر آیا۔ شاید مرنے کے بعد مرنے والے کے خد و خال بھی دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ابا کی تصویر صاف کیوں نہیں نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے ابا کی صاف تصویر آنکھوں میں آجاتی تھی۔ اور یہ جان کر بہت رنج ہوا کہ اب تصویر صاف نہیں نظر آئے گی ——— لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دھندلی تصویر بھی ایک دن مٹ جائے۔

. . . آج میں اور دنوں سے زیادہ خوش ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں کبھی اُداس ہی نہ تھا ——— آج ایک

غیر معمولی بات ہوئی، نہ جانے اُمّی کس بات پر مسکرائیں۔ اُمّی کی مسکراہٹ مجھے پہلے سے بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے دھوپ میں کوئی کلی مسکرا دی ہو ——— بقول ماموں کے آج اُمّی کی روح مسکرائی تھی۔ کیونکہ ماموں نے کہا تھا، آدمی اُس وقت تک نہیں مسکراتا ہے جب تک اس کی روح نہیں مسکراتی ہے۔ اور اُمّی کو مسکراتے دیکھ کر میں بھی ہنس دیا تھا، اور خوشی میں ہنستے میں نے اُمّی کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں ——— اور اسی لئے میں آج بہت زیادہ خوش ہوں۔ میرے ساتھ آم اور پھلیندے کے پیڑ بھی۔ آج مجھے کوئل کی کوک میں درد نہیں محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ ماموں نے بتایا تھا کہ اُردو کے شاعر کوئل کو مظلوم سمجھتے ہیں اور کوئل کی کوک میں اُنہیں ہزاروں ٹوٹے ہوئے دلوں کی جھنکاریں سُنائی دیتی ہیں اور کوئل "کسی" کی تلاش میں سرگرداں ہے اور کوئل جب "اُسے" نہیں پاتی تو کہیں دُور، بہت دُور چلی جاتی ہے، اسے زندگی میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی، لیکن ——— آج مجھے کوئل کی کوک میں خوشی کی لہر سُنائی دیتی ہے، آج کوئل شاید "اُسے" پا گئی ہے جس کی اُسے تلاش ہے، اسی لئے وہ ڈال ڈال اچک اچک کر کوک رہی ہے ——— لیکن وہ کون ہے جس کی کوئل کو تلاش ہے، یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں، یہ یا تو ماموں جانتے ہوں گے یا پھر شاعر ——— لیکن مجھے خود بخود یہ خیال آیا کہ اُمّی پھر اُداس نہ ہو جائیں، جو کلی دھوپ میں کھلی ہے وہ گرمی سے کہیں مُرجھا نہ جائے ——— کہیں ایسا نہ ہو خاندان کی کوئی عورت اُمّی کے سامنے چند آنسو بہا دے اور اُمّی پھر دنوں کے لئے اُداس ہو جائیں ——— خدا نہ کرے ایسا ہو ——— اور آم کے وہ پیڑ جن کے سائے میں ابّا کی قبر ہے وہ بھی آج جھُوم رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے ابّا کی روح بھی آج خوش ہے ——— اسی لئے اُمّی اور بجیا بھی خوش ہیں، اور ان سب کے ساتھ میں بھی خوش ہوں ——— شاید ابّا کی روح کو آسمان پر کوئی اچھی جگہ مل گئی ہے۔ اُمّی نے کہا تھا ہمیں دُعا کرنی چاہیئے، کہ ابّا کی روح کو خدا سکون دے۔ اللہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ میں نے ہر ایک سے سُنا ہے کہ خدا ظالم اور بے رحم نہیں ہے، وہ ہر ایک پر رحم کرتا ہے، کبھی بدلہ نہیں لیتا ہے، اور خدا نے ابّا کی روح پر رحم کیا ہوگا ———

.... آج ابّا کو مرے چالیس دن ہو گئے ——— ایک دن چالیس سال گذر جائیں گے ——— اور کبھی چالیس صدیاں بھی ——— اُس وقت نہ اُمّی ہوں گی، نہ بجیا نہ میں ——— پھر دل ہوگا، خدا جانے ——— کون جانے یہ فاختہ بھی شیشم کی شاخ پر بیٹھ کر یونہی رویا کرے گی اور یہ کوئل آم کے باغ میں یونہی کُوکا کرے گی ———؟ اور اگر کوئل کو "وہ" مل جائے گا تو وہ باغوں میں پھر کیوں آئے گی اور باغ سُونے ہو جائیں گے۔ ——— لیکن یہ آسمان اور زمین یونہی رہیں گے اُمّی نے کہا تھا، یہ دونوں کبھی نہ مٹیں گے ——— آج گھر میں اُداسی پھر بڑھ گئی ہے۔ صبح سے عورتیں جمع ہو رہی ہیں۔ باہر سب عزیز موجود ہیں، کیونکہ آج ابّا کا چالیسواں ہے ——— باہر صحن میں بہت سی دیگیں جمع ہیں، کئی بکرے ذبح ہو چکے ہیں، پھوپھا، خالو اور چچا کھانا پکوا رہے ہیں، ہر آدمی خوش، خوش نظر آ رہا ہے۔ بچے اچھے کپڑے پہنے اُچھل کُود رہے ہیں۔ گھر میں عورتیں جمع ہیں، اور باتوں میں مشغول ہیں۔ اور میں سچ کہتا ہوں کسی بھی عورت کے چہرہ پہ ذرا سی بھی اُداسی نہیں ہے سوائے چند عورتوں کے جو الگ اُمّی کے پاس خاموش بیٹھی ہیں اور کبھی کبھی بولتی ہیں۔ گھر غمی کا نہیں، بلکہ شادی کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ زرق برق لباس، سنئے، خوبصورت نیلے پانوں سے بھرے ہوئے خاصدان، ہر طرف قہقہے اور اُن قہقہوں میں پکوان پکتا ——— یہ شادی کا سماں نہیں تو کیا چالیسویں کا سماں معلوم ہوتا ہے؟؟

میں نے کسی کو ابّا کا غم کرتے نہیں دیکھا۔ یہ سب عورتیں اور مرد اچھے کپڑوں، زیوروں کی نمائش کرنے، ملنے ملانے اور قہقہے لگا کر کھانا کھانے جمع ہوئے ہیں۔ اور جو لوگ کھانا پکوا رہے ہیں وہ بار بار سالن اور پلاؤ کے بارے میں ہدایتیں کر رہے ہیں کہ میٹھا نہ جائے، بدمزہ نہ ہونے پائے اور پھر ڈھکنیاں اُٹھتی ہیں اور نمک مرچ چکھا جاتا ہے ——— یہ سب منظر دیکھ کر مجھے رونا آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب روؤں ابّا کو یاد کر کے اور ان عزیزوں کی حرکتوں پر جو آج چالیسویں میں جمع ہوئے ہیں ——— اور میں یہ سوچتا ہوں تو کوئی

جواب نہیں ملتا کہ اگر چالیسواں نہ ہوتا تو کیا نقصان ہوتا —— اور اس سے ابا کو کیا فائدہ ہوگا —— امی کہتی ہیں اس سے ابا کی روح کو ثواب پہنچے گا۔ لیکن یہ بات دل کو لگتی نہیں ہے۔ جی چاہتا ہے میں امی سے پوچھوں، شاید وہ مجھے سمجھا دیں گے، لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ ناراض ہو جائیں —— لیکن آج نہیں تو کل ضرور پوچھوں گا —— آج شام تمام عزیزوں کے قریب تک میں گیا جو گھر پر جمع ہوئے تھے مجھے ان تمام بزرگوں سے نفرت ہوگئی تھی ——

آج ہر طرف سناٹا بہت تھا اور مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آج ابا کی روح خوش نہیں ہے۔ اگر ابا کی روح خوش ہوتی تو اتنا سناٹا نہ ہوتا —— آج ابا کا چالیسواں نہیں بلکہ چالیسویں کا تہوار منایا جا رہا ہے۔

ابا کی روح سب کچھ دیکھ رہی ہوگی، ابا کی روح کو اس دکھاوے سے تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔ عورتوں کی بے کیف گفتگو سے، مردوں کے بے تکے قہقہوں سے، اور پلاؤ زردے کی خوشبو سے تکلیف ہو رہی ہوگی۔ شاید روح کو ان تمام باتوں سے نفرت ہے، اسے دکھاوا پسند نہیں ہے، روح کو گھر غمی کا نہیں بلکہ شادی کا منظر معلوم ہوتا ہوگا —— لیکن ان تمام مہمانوں کو ابا کی روح سے اور اس کی تکلیف سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ صرف کھانا کھانے اور باتیں کرنے آئے ہیں۔ جی چاہتا ہے امی سے یہ سب کچھ کہہ دوں لیکن وہ ناراض ہو جائیں گی —— اگر وہ خود محسوس کریں تو کیا اچھا ہو۔

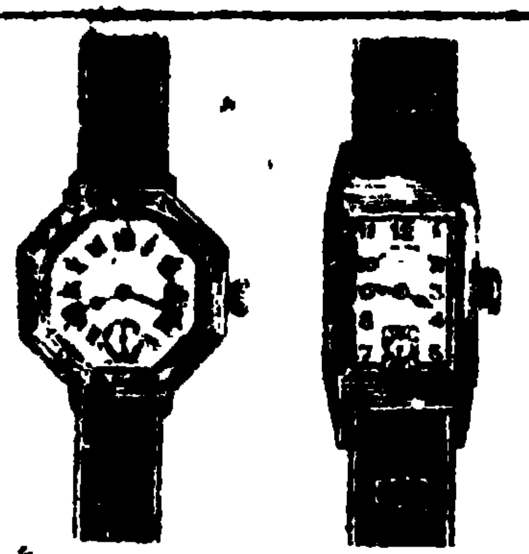
شام کو وہ کھانے جو شادی کے موقعہ پر پکتے ہیں تیار ہوئے تھے۔ نوکروں نے دریاں اور ان پر سفید چاندنیاں بچھا دیں جگہ جگہ پانی سے بھرے لوٹے ہاتھ دھونے کے لئے رکھے تھے اور پاس ہی صابن اور تولیہ۔ نوکر پنکھا جھل رہے تھے، کچھ مہمانوں کے ہاتھ دھلا رہے تھے اور مہمان ہنسی خوشی دسترخوان پر بیٹھ رہے تھے۔ تمام لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے ——

وہی شادی والا ٹھاٹھ تھا۔ وہی [illegible] —— مہمان کھانا کھا رہے تھے، بڑے بڑے نوالے —— میں دسترخوان پر نہیں بیٹھا تھا حالانکہ سب نے کہا تھا —— مجھے کھانے سے نفرت ہوگئی تھی۔ لوگ کھانے کے متعلق باتیں کر رہے تھے، پلاؤ اچھا بنا ہے ... زردہ میں مٹھاس کم ہے —— خمیری روٹیاں بہت اچھی بنی ہیں —— پھر فرمائشیں ہونے لگتیں —— ذرا گرم گرم پلاؤ اور روٹیاں دینا —— یہ سب کیسے ہنسی خوشی کھا رہے تھے —— اللہ میرا دل تڑپ رہا تھا کہ ان سب کے گلے دبا دوں، جو انگلیاں چاٹ رہے تھے —— جو پانی پی کر ڈکاریں لے رہے تھے، جو بڑے بڑے نوالے ہڑپ کر رہے تھے —— جی چاہتا تھا ان سب کو مار ڈالوں —— چاہے وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہوں —— ان خاندانی خودغرض بزرگوں کے گلے کیوں نہ گھونٹ دوں —— جو صرف شادی اور موت کا کھانا کھانے ہی آتے ہیں اور یوں کبھی بھول کر رخ نہیں کرتے —— یہ سب مکار اور دغاباز ہیں، ان میں نام کو بھی ہمدردی اور محبت نہیں ہے، ان میں سے کسی کو بھی ابا سے، امی سے یا مجھ سے محبت نہیں ہے —— اور آج مجھے اپنے سب بزرگوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ شاید نفرت ... —— آج ان بزرگوں نے ابا کی روح کو ستایا ہے، اسے بے چین کر دیا ہے۔

—— میں وہاں سے پھر چلا آیا اور الگ جا کر خوب رویا —— اور میں امی اور ماموں سے یہ کہہ دوں گا کہ ابا کی روح کو "ثواب" پہنچانے کے لئے اب کبھی کھانا نہ پکوایا جائے۔ —— اس سے ابا کی روح کو صدمہ پہنچتا ہے —— روح کو کبھی لذیذ کھانوں اور خودغرض عزیزوں کے کھانا کھانے سے نہ سکھ پہنچتا ہے اور نہ ثواب ہی ملتا ہے ——

اور میں اب کبھی ابا کی روح کو بے چین نہ ہونے دوں گا۔ ابا کی روح کو سکون پہنچانا میرا فرض ہے، امی کا فرض ہے —— خدا ابا کی روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون دے اور وہ آسمان پر جہاں بھی ہو سکون سے رہے ——

۱۰۰۰۰
دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں مفت انعام



ہماری کمپنی نے اپنی مشہور فائدہ مند دوائیوں کی مشہوری کے لئے ہر شیشی کے خریدار کو ایک نفیس ٹیلیوسٹ واچ اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے
جلدی کریں اور فائدہ حاصل کریں!

بال عمر بھر نہیں اُگتے

ہماری مشہور و معروف دوائی اصلی جوہر حسن (رجسٹرڈ) کے لگانے سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر زندگی بھر دوبارہ اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے۔ جگہ ریشم کی طرح ملائم، نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ قیمت فی شیشی صرف دو روپے آٹھ آنے (Rs 2/8/-) تین شیشی (پورا کورس) کی رعایتی قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے (Rs 6/8/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی ٹیلیوسٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ بالکل مفت بھیجی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصولڈاک بالکل معاف اور چار انگوٹھی لنڈن نیو گولڈ اور چار عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام دی جاتی ہیں۔ جلدی کریں۔ ورنہ یہ موقعہ بار بار ہاتھ نہ آئے گا۔

بال کالا تیل نمبر ۱

یہ تیل عام تیل کی شکل میں ہے جو ہاتھوں پر مل کر بالوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بالوں کو جڑ سے کالے کرتا ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے بال ہمیشہ کے لئے سیاہ رہتے ہیں۔ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔ بالوں کو لمبا اور گھنگھریالے اور چمکدار بناتا ہے۔ جہاں بال نہ اُگتے ہوں از سر نو پیدا کرتا ہے لیعنی گنج پن کو دور کرتا ہے۔ دماغ کو طاقت دیتا ہے اور حافظہ کو تیز کرتا ہے۔ ہر قسم کی دماغی کمزوری مثلاً نقاہت، سر کا چکرانا، نیند کم آنا، سر درد کو فوراً دور کرتا ہے۔ بینائی کو بڑھاتا اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ نہایت اعلیٰ خوشبودار ہے جس سے پراگندہ طبع خوش ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی صرف دو روپے آٹھ آنے (Rs 2/8/-) تین شیشی (پورا کورس) کی رعایتی قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے (Rs 6/8/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی ٹیلیوسٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ بالکل مفت بھیجی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصولڈاک بالکل معاف اور چار انگوٹھی لنڈن نیو گولڈ اور چار عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام دی جاتی ہیں۔ جلدی کریں۔ ورنہ یہ موقعہ بار بار ہاتھ نہ آئے گا۔

ملنے کا پتہ۔ **لنڈن کمرشل کمپنی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵/165 لاہور (پنجاب)**

Address: LONDON COMMERCIAL Co., Post Box No. 165, Lahore

اے آر شدی، مدیر روزنامہ "ندیم"

کسبی!

میری پیاری نلنی!

مجھے اکثر تعجب اور حیرت سے سوچا کرتی ہوں کہ تم نے اپنے بچپن پر کیا غور کیا ہے۔ اور سوائے اپنی ماں کی صورت کے کسی اور چہرہ کا بھی خیال کیا ہے۔ میری پیاری! جسے تم اپنی ماں کہتی ہو درا صل وہ نیک خاتون تمہاری ماں نہیں۔ وہ میں بدنصیب عورت ہوں جس کی بدولت تم اس دنیا میں آئیں۔

جب تم صرف تین سال کی تھیں میں نے تم کو اپنا وعدہ پورا کرنے کیلئے اس عورت کے حوالے کر دیا تھا مجھے اس کا نام تک یاد نہیں۔ جس وقت میں نے ایسا کیا تو اس نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا، کہ تمہیں ایک دن صرف تمہاری خاطر اس کی داستان بتادی جائے، گو میں نے تمہیں دور سے دیکھا ہے اور دیکھ کر بیحد خوش ہوں کہ تمہاری ازدواجی زندگی مسرت بخش ہے۔ اور سوسائٹی میں تمہیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اصل حقیقت تمہیں بتادوں۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ مجھے تامل نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن جس وقت تم یہ خط پڑھ رہی ہوگی میں اس دنیا سے کوچ کر چکی ہوں گی۔ اچھی نلنی خط کے مضمون سے دل کو ملول نہ کرنا، اپنی منہ بولی ماں سے برابر محبت کرتی رہنا، وہ بے اولاد تھی، اور اسے ایک بچے کی تمنا تھی۔ میں نے بخوشی تمہیں اس کے حوالے کر دیا۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں ماں سے زیادہ چاہتی ہے، تم اسے محبت کرتی رہو۔ اسے خوش رکھو اور اگر تم چاہو تو کبھی کبھی پیار کیساتھ میرا تصور کر لینا —— ہاں ایک ایسی عورت کا تصور، جو گنہگار سے زیادہ گناہ زدہ ہو —— جو حالات کا شکار ہوگئی ہو جن میں اس کا کوئی قصور نہ ہو اور جو —— بلا وجہ گناہوں کی فضا میں ٹھونس دی گئی ہو۔

—— ۱۱ ——

کتنے سال ہوئے جب تمہاری عمر صرف تین سال کی تھی، اس وقت میں ایک .... ہوتی میری نو.... میں آنے سے قبل ہی میں نے بھانپ لیا تھا .... وہ .... کے تمہارا .... یا تھا، اور

ہم نے —— میرا مطلب مجھ سے اور میری ہی ہم پیشہ دو اور بہنوں سے ہے —— پردہ کے پیچھے سے آنے والوں کو دیکھا۔ بوڑھی نائکہ جو ہمارے کاروبار کو چلاتی تھی۔ آنے والوں سے سودا طے کر رہی تھی اور ایک لمحہ کے بعد ہی ہمیں طلب کیا گیا، تاکہ ہم اپنے حسن و شباب کی نمائش سے گاہکوں کو متاثر کر سکیں، اور وہ اپنا انتخاب کر لیں۔ میں اس ناپاک قحبہ خانہ میں غلط سن رسیدہ تھی اور اس مختصر عرصہ میں جب ہمیں بلایا گیا تھا میں نے گاہکوں کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ مجھے ان میں سے دو کافی ہوشیار اور تجربہ کار معلوم ہوئے۔ کیونکہ وہ ہم پر سر سے لیکر پاؤں تک تنقید کر رہے تھے۔ البتہ تیسرا شخص بالکل اجنبی نظر آتا تھا۔

وہ شرما سا رہا تھا! اس نے ہم میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شاید میرے ہی حصہ میں آئے گا۔ کیونکہ اسکے دو بالغ نظر ساتھی دوسری دو لڑکیوں کی طرف ملتفت نظر آ رہے تھے، جو نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ کافی خوبصورت بھی تھیں۔ بوڑھی نائکہ ہمارے تیار ہو جانے کا کہنے کے لئے اندر آئی۔ اس نے چلتے چلتے حسب معمول بخشش وصول کرنے کا بھی اشارہ کر دیا، ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اور مجھے ذرا سکون ملا، جیسا کہ میں نے اندازہ لگایا تھا، نووارد میرے ہی پاس آیا میں نے سوچا اس سے نپٹنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ میں ایک انداز دلربائی کے ساتھ بستر پر دراز ہو گئی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا، اور اس نے اندر جھانک کر دیکھا،

"اندر آجاؤ" میں نے کہا۔ اور وہ اندر آ گیا اور چاروں طرف پریشان کن نظروں سے دیکھنے لگا، اس کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"تم میرے پاس آکر بیٹھ سکتے ہو" میں نے اس کو اپنے بستر پر بیٹھنے کی ترغیب دی۔ مگر اس نے آنے میں پس و پیش کیا، وہ چند قدم لڑکھڑاتا ہوا چلا، اس کی نظریں ایک بچے کی فراک پر جم گئیں جو کھڑکی کے پاس ایک ڈوری میں لٹکی ہوئی تھی۔ وہ فراک دیکھنے میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ مجھے پھر اس سے کہنا پڑا "کیا تم یہاں نہیں آ رہے؟" اس نے مڑ کر

اور ایک بیمارانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا جو کے قریب رکھی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا،

"سگریٹ پیو گے؟" میں نے اسے سگرٹ کا پیکٹ پیش کرتے ہوئے کہا، وہ طور پر لرز سا گیا۔

"نہیں ——— نہیں ——— شکریہ!" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کیا تم اس سے قبل بھی کبھی قحبہ خانہ میں آئے ہو؟" میں نے اس سے سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کہا۔

"ہاں ——— ہاں" اس نے کس قدر جرأت سے کہا، میرے لہجہ میں کہا میں سمجھ گئی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، مگر اس نے انجان بنتے ہوئے اس سے کہا "کیوں؟ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت ہی سست آدمی ہو، ہمیں آج ہی سے ذرا محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

میں نے اس پر اشتیاق آمیز نظریں ڈالیں، اس کے ہونٹ لرزے، جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کرسی پر سے کھینچ کر اپنے بستر پر لے لیا، گرم اور گیلا تھا، اس کو پسینہ آرہا تھا، اور میں نے پام کی تھپکی دینا شروع کر دیا، وہ پھر بچے کی فراک کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا

جھجکا اور آخر کار بولا "موہن"

"اب"

"تمہارا نام؟"

"بات یہ ہے کہ آج تک میرے نصف درجن نام ہیں اور جیسے جیسے سال گزرتے جائیں گے ان میں اور اضافہ ہوتا جائیگا۔ میرا نام لیلا بائی ہے۔"

"پیارا نام ہے" اس نے کہا۔

"اس کا یہ مطلب ہے کہ میں دلکش نہیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں، تم اب تک مجھے بیحد دلکش معلوم ہو رہی ہو ایسا ہے"

"کیا تم ابھی نوجوان لڑکیوں کو پیار نہیں کرتے؟"

"میں ایسا نہیں کرتا ——— میں ایسا نہیں کر سکتا ہے ——— دراصل میں شادی شدہ ہوں، اور میں کوئی ... کرنے سے سخت متنفر ہوں ———"

"سمجھ جائے ———"

"سمجھ گئی ہوگی کہ میرا کیا مطلب ہے؟"

"ہاں ——— میں سمجھ گئی ——— اچھا یہ تو بتاؤ تمہاری بیوی کا کیا نام ہے؟"

"پدما"

"کیا وہ نام ہی کی طرح خوبصورت ہے؟"

"نہیں اسقدر تو نہیں مگر وہ اچھی لڑکی ہے"

"کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"میرے خیال میں یقیناً"

"دراصل تم ایسا مجھے چڑانے کیلئے کہہ رہے ہو، اگر تمہاری بیوی خوبصورت ہوتی تو پھر تم اس قحبہ خانہ میں کیوں آتے؟"

"میرے دوست مجھے یہاں پکڑ لائے، وہ سمجھتے ہیں کہ میں [illegible] شادی ہوں، مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ انہیں جھوٹا قرار دے سکوں"

"کیا تم سچ بول رہے ہو؟"

"بیشک، تم کیوں یقین نہیں کرتیں؟"

"مجھے شبہ ہے کہ تمہارے دل کی گہرائی میں ممنوعہ راستہ پر چلنے اور شجر ممنوعہ چکھنے کی خواہش ہے۔"

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"مجھے اس کا یقین نہیں کہ تم ایسا نہیں سمجھتیں" اس نے آہستہ سے کہا

میں اس کے اور قریب کھسک گئی اور اپنے ہاتھ اور سر اس کی گود میں رکھ دیئے۔

"مجھے پیار کرو" میں نے اس سے کہا۔

اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا سر پکڑ کر اور میرے چہرے کو اپنے چہرہ کے قریب لا کر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، میں نے اس کا ایک پُرجوش بوسہ لے لیا، مگر اس نے پیار کا جواب پیار سے نہیں دیا اپنی ہتیلی سے اس نے اپنا گال صاف کیا اور پھر بچہ کی فراک پر نظریں جما دیں مجھے غصہ بھی تو آگیا، مجھے احساس ہوا کہ اگر میں لوگوں کے دلوں میں بیتابی اور جوش پیدا نہیں کر سکی تو پھر میرے پیشے کا خاتمہ ہو جائیگا، مجھے اس کا پوری طرح یقین تھا کہ اس نے یا اس کے دوستوں نے میرے پاس آنے کے لئے کافی رقم دی ہے۔ اور اگر عام طور پر ہر ایک گاہک جس سے رقم لی گئی ہے مجھ سے چند بوسوں کا مطالبہ کرے اور چلا جائے تو یہ میری انتہائی خوش بختی ہوگی میری لگتا ہوں کی زندگی میں اس گاہک جیسے نوجوان کبھی نہیں آئے اور میں بے چین تھی کہ یہ تودہ برف کب پگھلتا ہے۔ میں نے اپنی تجارت کے تمام ہتھیار اس پر استعمال کئے مگر سب وار خالی گئے، میری کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں، صرف ایک بار میں نے خیال کیا کہ وہ پگھلنا شروع ہوا مگر اس

نازک لمحہ میں وہ دانستہ طور پر دوسری طرف مڑ گیا اور بچے کی فراک کو دیکھنے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ پتھر کا مجسمہ ہو۔ میں نے کپڑے کی ڈوری سے فراک اتار کر ایک کونے میں پھینک دی۔ اس نے فراک اٹھالی اور اسے بار بار الٹ کر دیکھنے لگا۔

"یہ کس کی فراک ہے؟" اس نے پوچھا

"میری بچی کی" میں نے جواب دیا

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہاری اپنی ایک بچی ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا

"کیوں اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم نے کیوں غصے سے فراک اتار کر پھینک دی؟"

"کیونکہ تم مجھ سے زیادہ فراک پر توجہ دے رہے تھے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" کیونکہ بالکل اسی رنگ کی ایک فراک اسی طرح میرے مکان کی کھڑکی کے پاس لٹک رہی ہے۔"

"کیا تمہاری بھی کوئی بچی ہے؟"

"ہاں، بڑی بھولی اور معصوم بچی"

"کیا اس کا نام بھی بڑا پیارا ہے؟"

"ہاں ——— ہم اسے قاسمہ کہتے ہیں اور ہاں تمہاری بچی کا نام؟"

"شانتا! مگر وہ اتنی پیاری نہیں"

"وہ ہے کہاں؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں، مجھے بچوں سے بڑی محبت ہے ———"

"وہ اندر سو رہی ہے" میں نے ملحقہ کمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا، میں اُسے اندر لے گئی اور اپنی چھوٹی بچی اُسے دکھائی، جو چٹائی پر میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ اسکے قریب چٹائی پر بیٹھ گیا، اور میرا بازو پکڑ کر مجھے بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔

"بہت خوب ہے" میں نے اس کا گال توڑتے ہوئے کہا "تم نے مجھے بازو پکڑ کر بٹھا لیا"

"شش!" اس نے مجھے چپ کراتے ہوئے کہا "اتنے زور سے نہ بولو ورنہ وہ جاگ پڑے گی، کتنی پیاری بچی ہے! مجھے اسے دیکھ کر بہت رنج ہوا" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ معصوم بچی بھی تمہاری طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جائے گی۔"

"تم بہت ہی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو"

دروازہ پر دستک نے ہمیں چونکا دیا۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "تمہارا وقت ختم ہو گیا"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے دوست تمہارا انتظار کر رہے ہیں"

ایک اور دستک ہوئی "تیار ہو جاؤ"

"کیا میں کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکتا؟ میں تمہاری بچی کے متعلق اور حالات جاننا چاہتا ہوں۔ اور پھر میں اپنے متعلق کچھ بتاؤں گا، کیونکہ احمقانہ بات ہے ہم ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ملے ہیں ہمیں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے۔"

"کیوں؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کیوں؟ میں ابھی جانا نہیں چاہتا"

"اس صورت میں بوڑھی شیطان کی خالہ تم سے کچھ اور رقم کا مطالبہ کرے گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں، تم اس کے پاس جا کر طے کر لو، میں یہاں ابھی ٹھہروں گا۔"

میں باہر گئی اور بوڑھی چڑیل اور دونوں دوستوں کو دروازہ پر کھڑا ہوا دیکھا، ان میں سے ایک شخص نے مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی، مگر میں نے اس کو ایک طرف کر دیا اور نائکہ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں دوست بہت غضبناک ہوئے اور اپنے دوست پر سخت لعن طعن کرنے لگے جو ان کی طنز و تشنیع سے بے نیاز اندر کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے نائکہ سے بہانہ کیا اور مزید روپیہ ملنے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

جونہی میں اندر کے کمرہ میں داخل ہوئی، مجھے اپنے گاہک میں کافی تبدیلی نظر آئی۔ وہ بڑے آرام سے بالکل گھر کی طرح بیٹھا تھا، وہ ذرا بھی پریشان یا مضطرب نہ تھا، اس نے میری بچی کے تکیوں اور چادر کو ٹھیک کر دیا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ——— ایک خوشگوار مسکراہٹ!

"میرا ایک خیال ہے" اس نے کہا

"قبل اس کے کہ تم اپنے خیالات کا اظہار کرو، میں یہ کہہ دینا چاہتی تھی کہ تمہارے دوست بے تابی کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہے ہیں، بوڑھی نائکہ نے پانچ روپیہ کے عوض تم کو صرف ۱۵ منٹ کی اور مہلت دی ہے ———"

"ٹھیک ہے، اچھا سنو، اس بچی کو ایسے گندے اور ناپاک ماحول میں پلنا نہیں چاہیئے۔ اسے تمہارے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔ اور اسے کسی محفوظ مقام یا کسی ادارہ میں پہنچا دینا چاہیئے ——"

"تمہاری یہی نصیحت ہی تو میری تسکین روح کا باعث ہے جب مجھے کبھی یہ فرصت ہوتی ہے تو میں اس سے اپنا دل بہلاتی ہوں"

"درست ہے یہ سچ ہے لیکن کیا تم اس پر غور نہیں کرتیں اگر وہ یہاں رہی تو تم اس کی زندگی تباہ کر دو گی"

میں نے اس کے متعلق بہت کچھ سوچا۔ کہہ نہیں سکتا کہ بہت پسند کیا، میرے دل میں ایک حسد کا جذبہ بھڑک اٹھا، جو عورت اس کی بیوی ہے، وہ کس قدر خوش نصیب ہے!

اس نے میرے شانہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور التجا کی،
"ہاں، لیکن کیا تم اسے درست خیال کرتی ہو؟"

"میں بھی ایسا ہی خیال کرتی ہوں" میں نے کہا "مگر ہمارے طور طریق جدا جدا ہیں ——— عرصہ بعد ——— اس کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا، مجھے محبت ہو جاتی ہے"

"کیا تم اس خوابیدہ فرشتہ سے محبت نہیں کرتیں؟"

"دل و جان سے محبت کرتی ہوں"

"اور پھر بھی تم اس کو اپنی ہی طرح زندگی بسر کرنے کی تربیت دو گی؟"

"پتا تو یہ ہے کہ اس کے متعلق میں نے بھی بہت غور کیا ہے مگر کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا، یہ مقدر ہی ٹھہرا"

"فضولیات! اگر تم چاہو تو مقدر کو اپنی ایک انگلی سے مسل سکتی ہو مجھ سے وعدہ کرو کہ اسے گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرو گی"

"کیا تم ایک بیسوا کے وعدہ پر اعتبار کر سکتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ایک ماں سے وعدہ لے رہا ہوں، تم نے اسے جنم دیا کیا تم اسے جہنم میں دھکیلنے کی ہمت رکھتی ہو؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آج تم نے مجھے بے حد مسرت بخشی ہے آج رات خرچ کئے ہوئے ایک پیسہ پر بھی مجھے افسوس نہیں۔ مجھے تم پر اعتبار ہے، میں جانتا ہوں کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گی۔

——— اور جب یہ بچی جوان ہو جائے تو تم اس سے آج رات کی داستان بیان کر سکتی ہو"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا دم گھٹنے لگا، وہ اٹھا اور اس نے میرا بازو پکڑ کر میرے ابرو پر ایک پاکیزہ بوسہ ثبت کر دیا۔

حیدر قمری

بھوکا فنکار

وہ ایک انسان تھا ـــــ ایک گمنام افسانہ نگار۔ اور اسی لئے تواتر دو روز سے بھوکا تھا۔ اس وقت وہ شدت کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ بھوکے انسان کے خیالات میں گہرائی اور پاکیزگی نہ سہی مگر شدت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے سامنے اس کا اپنا لکھا ہوا افسانہ دو تین کاغذوں پر بیکار بکھرا ہوا پڑا تھا، جسے اس نے کچھ دن پیشتر جبکہ وہ آج ہی کی طرح بھوکا تھا لکھا تھا اور اس کا عنوان ـــــ "بھوکا فنکار" تھا۔ یہی افسانہ وہ ایک مقامی مقتدر رسالے کے ایڈیٹر کے پاس بھی لے کر گیا تھا، لیکن ایڈیٹر نے ایک آدھ صفحہ پڑھ کر اور پھر اپنے چشموں کو ناک پر سے قدرے کھسکا کر اسے گھورا اور فیصلہ دے دیا تھا "یہ افسانہ ناقابل اشاعت ہے۔"

"وجہ؟"

"کوئی تُک نہیں ہے" ـــــ ایڈیٹر نے جواب دیا اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے کتنی محنت سے وہ افسانہ لکھا تھا، اس کی اپنی زندگی کی تصویر ہی سہی لیکن ایک بھوکے انسان کے خیالات کی کس قدر صحیح عکاسی اور ترجمانی تھی۔ اسے اپنے اس افسانے پر ناز تھا، اس نے دل میں بڑی بڑی امیدیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن مدیر رسالہ نے ایک ہی جھٹکے سے ان سب کو خاک میں ملا دیا۔ "افسانہ ناقابل اشاعت ہے" ـــــ کورا جواب۔ اگرچہ اس کے بعض افسانے دو تین عام رسائل میں چھپ چکے تھے لیکن وہ اپنی اس برائے نام سستی شہرت سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا وہ افسانہ جسے وہ اپنا شاہکار خیال کرتا تھا ضرور کسی معیاری رسالہ میں شائع ہو جائیگا لیکن اس کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور محض خواب و خیال کی دنیا میں بھٹکتا رہا۔ اس نے اپنے کئی اور افسانے بھی مختلف معیاری رسائل کو بھیجے لیکن ان میں سے کسی کو بھی اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ دن میں کئی کئی بار سوچتا اور پھر دل میں نئی امیدیں قائم کر کے رسالوں میں افسانے بھیجنے لگتا۔ ان طریقوں سے اس کا ڈاک کا خرچ اتنا زیادہ بڑھ جاتا کہ اسے کئی وقت بھوکوں رہنا پڑتا۔ اور اب بھی جب وہ متواتر دو روز سے بھوکا تھا تو اس کا باعث بھی یہی اس کے افسانوں کی مختلف رسائل کو ترسیل تھی۔ وہ نتیجہ سے بے خبر ایک ہی دھن، ایک ہی وہم اور عقیدہ سے ایڈیٹروں کے ہاں جوابی خطوط، افسانے، لفافے وغیرہ بھیجتا رہتا اور پھر اپنی خالی جیبوں کو بار بار بے سود ٹٹولتا اور سوچتا رہتا کہ شاید کوئی بچا کھچا ایک آدھ آنہ ان میں سے نکل آئے جس سے وہ اپنی بھوک کی بھڑکتی ہوئی آگ کو قدرے بجھا سکے کیونکہ شہرت کی حسرت بھری بھوک کے دوزخ میں دن رات جلنے کے ساتھ ساتھ وہ معاشی بھوک بھی مول لے بیٹھا لیکن باوجود اس کی انتہائی کوششوں، بلند توقعات اور امیدوں کے اس کا ایک افسانہ بھی کسی معیاری رسالہ میں شائع نہ ہو سکا، اور پھر رفتہ رفتہ اسے تھک ہار کر اپنے اس خیال کو دل سے نکال دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ کبھی مشہور نہیں ہو سکتا۔ اسے کوئی شخص فنکار نہیں مان سکتا، وہ افسانہ نگار رہے ہی نہیں۔ اس کی تحریروں میں دلکشی، جاذبیت، سوز، اثر کچھ بھی نہیں۔ اس کی تحریر کو ادبی دنیا فن نہیں تسلیم کر سکتی لیکن ان تلخ حقائق اور خیالات کے باوجود بھی نجانے وہ پھر کیوں خود کو فنکار سمجھنے لگتا تھا ـــــ "گمنام فنکار" ـــــ جیسے اس کے اندر سے کوئی آواز سرگوشیوں میں اسے کہہ رہی ہو۔

اب اپنے اسی افسانے کو سامنے دھرے ـــــ وہ دو روز کے فاقوں سے چُور، وہ مختلف خیالات میں کھویا ہوا تھا لیکن اس کے ان شدید خیالات کا سلسلہ بار بار ٹوٹ جاتا تھا کیونکہ اسے بھوک بُری طرح سے نڈھال کر رہی تھی۔ آج اسے رہ رہ کر اپنے انہی خیالات پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات، اپنے ذہن، بھوک، ماحول، اپنے افسانے اور اپنے آپ پر جھنجھلا رہا تھا۔ وہ کیوں ان ایڈیٹروں کو افسانے بھیج بھیج کر اپنے پیسے ضائع کرتا رہا ہے؟ اس ذریعے سے اس کی اپنی روٹی کے لئے رکھے ہوئے سب پیسے ایڈیٹروں کی بے اعتنائی کی نذر ہو گئے، یہ کتنی حماقت تھی؟ یہ کتنا غلط خیال اور بے سود توقع تھی ـــــ وہ سوچ رہا تھا ـــــ کہ وہ کبھی

شہرت حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ تو کوئی اچھا افسانہ لکھنا جانتا ہی نہیں وہ اب دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ بھوک کی شدت بڑی سُرعت سے اس کے جسم اور ذہن کو [illegible] وہ [illegible]۔ کاش وہ آج سے دو روز پہلے اتنی [illegible] اور [illegible] نہ بھیجتا۔ اس کی وہ سب [illegible] اس کی شہرت کی بھوک نے نگل لی ہے۔ اور اب یہ بھوک! اُف اُس نے محسوس کیا جیسے اس کی روح آہستہ آہستہ پھڑ پھڑا رہی ہے۔ اس کا سانس ہولے ہولے ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ مدھم ہوئی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن کہیں ڈوب رہا اور [illegible] انگاروں پر لوٹ رہا ہے اُس کی انتڑیاں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کی سکت سلب ہو رہی ہے، اور آنکھوں کی چمک نہ معلوم کہاں غائب ہوتی جا رہی ہے، ان میں خوفناک اندھیرا سمٹا آ رہا ہے۔ اور پھر یہ اندھیرا بتدریج پھیل کر چاروں طرف محیط ہو گیا ہے۔ آہ یہ ہولناک تاریکی ——— اور دفعتہً جیسے اُسکے ڈوبتے ہوئے ذہن میں کوئی خیال اُبھر آیا ہو اس وسیع تاریکی میں کچھ روشنی [illegible] جھلملائی۔ اُس کے جسم اور [illegible] آگ بڑی شدت سے بھڑک [illegible] تھی۔ آگ کے کو نارے ذہن میں ناچنے لگے تھے ——— شاید یہ جھلملاتی ہوئی روشنی اسی بھڑکتی ہوئی آگ کی لَو تھی اور اسی ——— روشنی میں اُس نے ایک [illegible] سا چہرہ دیکھا ——— "خان بہادر" ——— اُس نے خیال کیا اور تیزی سے چارپائی پر سے اُٹھ کر وہ قلم اور دوات لینے کے لئے میز کی طرف بڑھا لیکن اُس کی دوات خشک ہو چکی تھی گویا [illegible] اُس معصوم بچے کی طرح جو روٹی کے لئے بے سُود رو رو اور چلّا چلّا کر خاموش ہو گیا ہو۔ پھر اُس نے اپنے پڑوسی کلرک کے ہاں سے دوات [illegible] کا خیال کیا اور سوچا کہ وہ اُن سے خان بہادر کی کوٹھی کا پتہ بھی پُوچھ لے گا کیونکہ اُسی نے دو ایک بار اُس خان بہادر کے بارے میں اُسے بتایا تھا۔

وہ جب اپنے پڑوسی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے دفتر کے کاغذات پر جُھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ عرصہ وہاں رُکنا پڑا اور پھر اُس کے لکھائی ختم کر دینے کے بعد وہ دوات لیکر واپس اپنے مکان میں آ گیا۔ اور باوجود بڑھتی ہوئی بے چینی کے اپنے اُس افسانے کو خوشخط کر کے نقل کر ڈالا۔ پھر خان بہادر کے ہاں جانیکے ارادے سے اُٹھا اور چھوٹے سے آئینے میں جو دیوار میں لگی ہوئی کسی میخ کے ساتھ لٹک رہا تھا اپنے زرد چہرے کو دیکھنے لگا۔ اُس کی نظریں اپنے بکھرے ہوئے بالوں پر پڑیں جن میں کئی روز سے تیل نہ پڑنے کے باعث اُلجھاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنے خشک بالوں میں پھیر پھیر کر گویا کنگھی کر لی اور پھر اپنے کام سے مطمئن سا ہو کر اپنے کپڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ یہ بہت میلے ہو چکے تھے۔ ڈھیلی سی پتلون میں کئی شکنیں پڑ چکی تھیں، اور کریز کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ اُس کی قمیص کا کالر کے قریب سے نہایت غلیظ ہو چکی تھی۔ اُس نے سامنے لٹکتے ہوئے کوٹ پر نظر ڈالی اور اگرچہ اُس کے پہننے کی چنداں ضرورت نہ تھی تاہم اُس نے قمیص کی غلاظت کو کسی حد تک چھپانے کے لئے اسے پہن لیا پھر آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اُس نے اپنے بوٹوں پر نظر ڈالی۔ جو ایک عرصے سے پالش سے محروم تھے۔ اور داہنے بوٹ کی سلائی بھی ٹو کے قریب سے اُدھڑ چکی تھی لیکن اُس نے اِس کا زیادہ خیال نہیں کیا کیونکہ اُسے بھوک کی شدت بُری طرح ستا رہی تھی۔ وہ جلدی سے اپنا افسانہ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال مختصر مکان کے دروازے پر تالا لگا، تیز تیز قدموں سے اُس سڑک پر ہو لیا جو خان بہادر کی کوٹھی کی طرف جاتی تھی، اور جس کا پتہ وہ اپنے پڑوسی کلرک سے بخوبی دریافت کر چکا تھا۔

اب وہ شہر سے باہر ایک کھُلی سڑک پر جا رہا تھا جس کے دونوں جانب خوبصورت باغات، پھولوں سے لدے ہوئے پودے سبز ملائم گھاس سے بھرپُور پلاٹ تھے جن کے بطن میں قہقہوں سے کھیلتی ہوئی حسین لڑکیاں اور خوش وضع لڑکے سمائے ہوئے تھے لیکن وہ اِن سب سے بے نیاز غافل ہو رہا تھا ——— بھوک کا دوزخ لئے ——— اُس خان بہادر کی کوٹھی کی طرف جس کی امارت کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا، شام ہو رہی تھی اور وہ تیز تیز قدموں سے باوجود اس کے کہ بھوک کے باعث اُس کے جسم میں پُوری سکت نہ تھی، وہ چلا جا رہا تھا ——— جلدی جلدی ——— ایک اُمید ——— ایک توقع لئے . . . . .

. . . . دفعتاً وہ چونک گیا۔ ایک لڑکی جس کے خوبصورت لباس میں سے اُس کا گداز، اُبھرا ہوا جسم رہ رہ کر جھانک رہا تھا، سائیکل پر سوار جا رہی تھی۔ اور دو قہقہے لگاتے ہوئے لڑکے بھی اُسی لڑکی کے تعاقب میں بڑی تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے اُس کے نزدیک سے

---

[1] چند ادبی تصنیفوں کے علاوہ۔

گنگناتے۔ ایک لمحہ کے لئے ان کی ہنسی اُس کے ذہن میں برچھی کی طرح جا چبھی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ "دنیا بھر کی مسرتیں ہنسی، مسکراہٹیں اور قہقہے انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں؟ ہمارے لئے محض غربت، بھوک اور ابدی حسرت ہی رہ گئی ہے۔ آہ! خدا یہ کیسا نظام ہے تیرا۔؟ یہ کیسی خدائی ہے؟ ہم پر عرصۂ زیست کیوں تنگ کر دیا گیا ہے؟ اور وہ لوگ ——!"

اور اُس کا دل چاہا کہ وہ بھی اُن قہقہے لگاتے ہوئے لڑکوں سے ایک سائیکل چھین کر اُسے تیزی سے چلاتا ہوا اُسی خوبصورت لباس والی لڑکی کے تعاقب میں نکل جائے اور اس قدر دُور نکل جائے اُس کے تعاقب میں کہ شہر کی آبادی سے بہت پرے ایک ویران جگہ پر وہ لڑکی تھک ہار کر ہانپتی ہوئی سائیکل پر سے گر پڑے اور پھر وہ اس کو اپنی دونوں باہوں میں تھام، جکڑ کر سینے سے چپٹا لے۔ اس کے نرم، پتلے ہونٹوں پہ اپنے جلتے لرزتے ہوئے ہونٹ .... ٹنن ٹنن ٹنن، ایک رئیس کی بگھی اُس کے قریب سے گذر گئی "اپنے ہاتھ چلو" کالے سے کوچوان نے چلّا کر اُسے کہا۔ وہ خیالات میں محو سڑک کے قریباً درمیان میں چل رہا تھا۔ وہ جلدی سے بائیں ہاتھ فٹ پاتھ پر ہو گیا، ایک کار شوں کرتی ہوئی قریب سے گذر گئی۔ اُس نے آندھی کی طرح اڑتی اور خاک اڑاتی ہوئی کار پر نظر دوڑائی —— کاش —— وہ سوچنے لگا —— کہ اُسے بھی لاکھوں دُنیاوی مسرتوں میں سے ایک ہی حاصل ہو جائے —— ایک معمولی —— حقیر سی مسرت —— اُس کی بھوک مٹ جائے اُسے شہرت حاصل ہو جائے۔ اور وہ لڑکی —— اُس کے ذہن کی سطح پر دوبارہ وہی لڑکی اُبھر آئی۔ اور معاً اُس کی نظریں اپنے بُوٹوں پر پڑ گئیں۔ داہنے بُوٹ کی ٹو کے قریب کا اُدھڑا ہوا حصہ گویا اُس کا مُنہ چڑانے لگا اور پھر بھوک کا غلبہ "نہیں نہیں" —— اُس نے سوچا —— اُسے اِن سطحی اُلجھنوں سے آزاد ہونا چاہئے۔ یہ پست سے خیالات ہیں —— تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا —— فنکار کا نقطۂ نگاہ —— نظریۂ حیات بلند —— بہت بلند ہوتا ہے "فنکار" —— وہ ہنس دیا —— زہر خند ہنسی —— اپنی احمقانہ خود فریبی پر کیا وہ فنکار تھا؟" یقیناً نہیں"۔ اُس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ اُسے کبھی ایڈیٹر، کسی رسالے، اخبار نے فنکار نہیں لکھا۔ افسانہ نگار تسلیم نہیں کیا۔

اُس کی تحریر میں کوشش، اتنی ...... کچھ بھی نہیں، نہ وہ فنکار کیونکر ہو گیا؟ .... ایسے ہی خیالات میں غرق وہ خان بہادر کی کوٹھی پر جا پہنچا۔

ایک گھنٹے تک جان لیوا انتظار کے بعد اُسے اندر بلایا گیا۔ خان بہادر نے اُس کی آمد کا مدعا پوچھا، اور اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے وہ افسانہ نکال کر آگے بڑھا دیا۔ بڑی کوشش اور مشکل کے بعد اُس کے خشک ہونٹوں پر الفاظ تھر ... —— "میں نے ... لکھا ... تھا ...... کہ آپ ...... بہت ... بلند ادبی ذوق ...... رکھتے ہیں ... اگر ... آپ ...... برا محسوس نہ کریں ...... تو ...... میرے ...... میری اس حقیر ... کوشش کو ...... میرا مطلب ہے ...... اپنے ...... نام ... سے ......"

اور اس کی آواز اس کے خشک حلق میں اٹک کر ڈوب کر رہ گئی۔

"ہوں" —— انہوں نے افسانہ اُس کے ہاتھ سے لے کر اور اپنی شیروانی کی جیب سے عینک نکال کر اُسے چیچک کے داغوں سے گھری ہوئی آنکھوں پر جماتے ہوئے کہا —— "یہ بات ہے"

گویا وہ اُس کا مطلب بخوبی سمجھ گئے ہوں۔ اور پھر افسانے کو پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس تھوڑے سے وقفے میں اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکتا رہا۔ نامعلوم خوف اور اُمید کے ملے جلے احساسات ہوائیوں کی صورت میں اُس کے چہرے پر منڈلا رہے تھے۔ گویا وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہو —— کچھ دیر بعد خان بہادر نے کاغذوں پر سے نظریں ہٹا کر اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے سگریٹ کو داہنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اس کی راکھ سامنے چھوٹی سی میز پر پڑی ہوئی ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا "دیکھو میاں اس میں غلطیاں تو بہت سی ہیں لیکن خیر، تم اُمید لے کر آئے ہو، میں تمہیں مایوس کرنا نہیں چاہتا" اور انہوں نے جیب سے بٹوہ نکال کر پانچ روپے کا تہ کیا ہوا نوٹ بڑے ہمدردانہ انداز سے میز پر رکھتے ہوئے کہا "یہ لو" —— پھر ان کی نگاہیں اُس کے میلے کپڑوں پر دوڑنے لگیں۔ گویا اُس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے رہے ہوں —— "یہ صرف اس لئے دے رہا ہوں کہ تمہیں اس کی اشد ضرورت معلوم ہوتی ہے، ورنہ افسانہ تو کچھ یونہی سا ہے اور اس کا عنوان بھی —— "بھوکا فنکار" کچھ جدید سا نہیں ہے" اور انہوں نے عینک کو آنکھوں پر سے

... قریب ہی ... دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایسا ... جیسے رعشہ پڑ گیا ہو لیکن اُس نے میز پر سے نوٹ ... لے کر ایک ... کے لئے ... مسکراتی ہوئی آنکھوں ... اور اُسے یوں ... جیسے وہ آنکھیں قہقہے لگا کر کہہ رہی ہوں "بیوقوف ... کہ بھوک تمام ذاتی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے ... اور آسودگی کی ضرورت ہے تو کبھی ... تو مجبوراً ... دولت ، ہمارے رحم و کرم کا محتاج ... ہے۔ تو اسی طرح بھوک سے چلاتا تڑپتا رہے گا۔ تجھے ہمیشہ بھوک اسی طرح نڈھال کرتی رہیگی —— روٹی —— شہرت —— عورت کی بھوک —— ازلی بدقسمت انسان !! اور اس کی روح میں تیز برچھیاں سی چبھنے لگیں۔ زخمی روح نے چلا کر اُسے کہا کہ " ہاتھ میں لئے ہوئے کاغذ کے اس حقیر چیتھڑے کو اس بھیک سے بھرے ہوئے منہ پر دے مار اور کہہ دے کہ ... —— تیری دولت کا ہرگز محتاج نہیں ، اُسے اپنی بھوک مٹانے کی بھی اتنی ضرورت ... نہیں۔ وہ بھوکا رہ کر بھی فنکار رہے —— صحیح معنوں میں فنکار" "جھوٹ" —— اس کے جسم اور ذہن نے بھوک کی انتہائی شدت کے زیر اثر ... کی آواز کو دبا دیا ، اُسے اپنے جسم میں لاغری محسوس ... دل کے ساتھ ... کے گرداب ... از خود دروازے ... اُٹھ گئے۔

وہ کوٹھی کے احاطے سے نکل کر پھر اُسی سڑک پر جس پر سے گذر کر وہ اپنے گھر سے یہاں تک پہنچا تھا۔ یوں چل رہا تھا جیسے کوئی غریب عاشق اپنی جان سے عزیز محبوبہ کے جسم کو شہر سے باہر دور قبرستان میں ہاتھوں من مٹی کے نیچے دفن کر کے واپس جا رہا ہو۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے اپنی روح کو جسم کے پنجرے سے نکال کر باہر پھینک دیا ہو ... آپ ہی گھونٹ لیا ہو۔ خودکشی کر لی ہو ، اپنے ذہن کو نیلام کر دیا ہو —— ٹکے ... کاغذ کے ایک چیتھڑے کے عوض۔ اور اُس نے مٹھی کو کھول کر اس میں دبائے ہوئے نوٹ کو دیکھا جو ہاتھ کے پسینے کی وجہ سے کسی قدر گیلا اور میلا سا ہو چلا تھا۔ اُس کے ذہن کی کتنی سستی قیمت تھی ... لیکن پھر اُس کے ان خیالات کو بھوک کی شدت نے مفلوج کر دیا

اُس نے سوچا کہ بھوک اور مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کرا دیتی۔ چوری ، قتل ، ڈاکے۔ انسان فاقوں سے اُکتا کر تو خودکشی بھی کر لیتا ہے۔ پھر اگر اُس نے اپنے بیکار اور گمنام فن کا ایک ٹکڑا بیچ دیا تو کیا حرج ہے ؟ یہاں تو صدہا انسان ایک دولتمند انسان کے آگے بک جاتے ہیں —— کوڑیوں کے مول —— گندم کی ایک مٹھی کے لئے۔ اور اگر اُس نے بھوک سے نالاں ہو کر اپنے افسانے کو مجبوری بیچ دیا ہے تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے ؟

انہی خیالات کی کشمکش میں وہ تیز —— بہت تیز چلتا ہوا بازار میں پہنچ گیا۔ رات کا سیاہ دیو شام کی سُرخ پری کو اپنی آغوش میں جذب کر رہا تھا ، اور کئی دکانوں میں بجلی کے لمپ روشن بھی ہو چکے تھے ، اُس نے پہلے ہی ہوٹل میں بے تحاشا داخل ہو کر کھانا طلب کیا اور دو چار نوالے بڑی عجلت کے ساتھ پیٹ کے دوزخ میں ڈالے اور اس کی بھوک کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ وہ جلدی جلدی کھانا کھاتا گیا اور پھر پانی کے دو ایک گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد ... کے بعد اُس نے پیٹ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا لیا۔ اور ایک روپیہ ہوٹل میں ادا کر کے باقی کے چار روپے کوٹ کی اندرونی جیب میں باحتیاط ڈالنے کے بعد وہ گھر کی طرف جانے لگا۔ اگرچہ اطمینان کے کئی ٹھنڈے سانس اُس کے سینے میں سے ... کر فضاؤں میں بکھر چکے تھے تاہم اسے اپنا اپنا احساس کچلا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اُس فنون کی ماری غریب گھرانے کی لڑکی کی طرح جو اپنے اور ننھے ننھے بھائی بہنوں کی بھوک سے ... ہو کر پہلی بار اپنی عصمت کو بیچنے پر مجبور ہو جائے اور عصمت ... کے اُن پیسوں سے پیٹ بھر کر کھانا کھا لے .....

پھر تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گذر گیا ، اس دوران میں اُس نے اپنے تمام گذشتہ لکھے ہوئے افسانے ضائع کر دیئے تھے ، اُن تمام بیکار کاغذات کو پُرزے پُرزے کر دیا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ وہ کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھے گا۔ اُس نے اپنا وہ افسانہ پانچ روپے میں بیچ دینے کے بعد اپنی شہرت کی تمام توقعات اور امیدیں دل سے محو کر دی تھیں۔ وہ کبھی شہرت حاصل نہیں کر سکتا ، وہ فنکار —— افسانہ نگار ہے ہی نہیں۔ اس کی تحریر میں دلکشی ، جاذبیت سوز ، اثر کچھ بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ گمنامی کے گڑھے میں پڑا سسکتا رہے گا۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ جب اُس کے خیالات و احساسات میں بہت ہلچل پیدا ہو جاتی اور اُس سے افسانہ لکھے بغیر رہا نہ جاتا تو

وہ ایک آدھ افسانہ لکھ تو لیتا لیکن پھر اُسی وقت اُن کا غذات کو پھاڑ کر آگ لگا دیتا۔ اُس کی نگارش ——— افسانوں کا فائدہ ہی کیا تھا؟ تمہی بھی شام کے وقت ابھی ابھی اُس نے اپنے ایک لکھے ہوئے افسانے کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ صبح سے اُسے کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تھا——— وہ دن بھر کا بھوکا تھا——— ایک ماہ کی اِس قلیل مدت میں عالمگیر جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ ہٹلر اور اس کی ہمدرد فسطائی قوتیں کچلی جا چکی تھیں۔ دُنیا پھر امن اور آشتی کے خواب دیکھنے لگی تھی لیکن وہ دُنیا کے ان سب حالات سے غافل، بے خبر اپنے تاریک کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھا بھوکا دبکا پڑا تھا۔ دن بھر رستے اخبار فروش بازاروں میں چیخ چیخ کر اخبار فروخت کر رہے تھے "جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے——— ہٹلر کا جنازہ——— محوریوں کا خاتمہ——— دُنیا کی تین بڑی سلطنتوں نے عالمگیر امن اور آزادی کے لئے تجاویز اور اصول وضع کر لئے......"

لیکن اُس کی بھوک اُسے کچھ سوچنے، سمجھنے، سُننے کی مہلت نہ دیتی تھی ——— "امن ——— صلح اور آزادی کی تجاویز......

...... معاً وہ قدموں کی آہٹ سُن کر چونک گیا۔ اُس کا پڑوسی داخل ہوتے ہی کہنے لگا:۔ "بھئی تم بھی عجیب آدمی ہو، شہر بھر میں فتح کی خوشی میں جشن منایا جا رہا ہے اور تم یہاں اُداس سے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہو۔ اُٹھو باہر چلیں۔ اور ہاں ہمیں فتح کی خوشی میں کل اور پرسوں کی دو تعطیلات بھی دی گئی ہیں، سب دفاتر بند رہیں گے۔ چلو آؤ میرے ساتھ، آج اکٹھے کھانا کھائیں گے۔" اور وہ اُس کے اصرار پر چپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا ہوا اُس کے گھر میں جا داخل ہوا۔

اُس کا پڑوسی اُسے وہاں کمرے میں جس کے وسط میں میز پر پڑی ہوئی ایک شمع جل رہی تھی بٹھا کر خود کھانا لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شمع کے قریب ہی اُس نے ایک رسالہ پڑا ہوا دیکھا۔ وہی مقتدر رسالہ جس کے ایڈیٹر کے پاس وہ اپنا افسانہ لے کر گیا تھا اور جسے ایڈیٹر نے "ناقابلِ اشاعت" قرار دے دیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اُس رسالے پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ اُسے سب رسالوں خصوصاً اِس رسالے سے چڑ ——— دلی نفرت ہو چکی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر نگاہیں گاڑے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن بھوک کی شدت کی وجہ سے اُسے وہ چند گھڑیاں بھی کاٹنی دشوار ہو گئیں۔ اُس نے انتظار کی زحمت کو کم کرنے کے لئے یونہی بغیر کسی مقصد کے وہ رسالہ ہاتھ میں لے لیا اور ورق گردانی کرنے لگا...... معاً اس کی نظر اٹھا کر

وہیں ——— پھر اسی اور پھر ہم ... صفحہ کو دیکھا ——— اور بھی غور سے، اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ اُس کا وہی افسانہ جسے ایڈیٹر نے ناقابلِ اشاعت کہہ کر رَدّ کر دیا تھا، اُس میں چھپا ہوا تھا۔ اُس نے افسانے کی دو تین سطریں بھی پڑھ ڈالیں۔ وہی سطریں ——— وہی الفاظ ——— وہی حروف، اُس کے اپنے ذہن کی تخلیق۔ اُس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی تڑپنے لگیں۔ فوراً ہی دماغ کے داغوں سے بھرپور چہرہ، پانچ روپے کا قلیط نوٹ۔ اُس کے ذہن میں گھوم گیا۔ انتہائی غم سے سینہ پھٹنے لگا، اور آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیرنے لگے۔ پھر وہ سطریں ——— وہ الفاظ ——— وہ حروف اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا گئے۔ صفحے کی چوٹی پر لکھا ہوا اس بد در کا نام بھی دھندلا گیا۔ اور وہ موٹے موٹے حروف بھی ——— اُس کے اپنے افسانے کا عنوان ——— اُس کی حقیقت ——— اُس کی اپنی حسرت نصیب بھوکی زندگی کا عنوان ——— "بھوکا فنکار" ———

اور ٹپ سے دو آنسوؤں کے قطرے اس صفحہ پر لڑھک کر رہ گئے۔

آنسہ محمودہ رضویہ

پاگل

آپ نے بہت سے پاگل دیکھے ہوں گے۔ بیگانہ از ہوش و حواس، عقل و خرد سے بے نیاز، اور دہر کی دلچسپیوں سے متنفر۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی دیوانگی پر آپ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے ہوں۔ شائد ان کی عجیب و غریب حرکات پر ہنسے بھی ہوں گے اور ان کے بڑھتے ہوئے جنون پر قہقہے لگائے ہوں گے لیکن کیا یہ بھی سوچا کہ یہ لوگ فی الواقع پاگل ہوتے ہیں یا فطرت کی شوخ پرستی کے تمسخر کا شکار؟ کائنات کی رنگینیوں سے خود ہی قطع تعلق کر لیتے ہیں یا ماحول کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر فارغ از حواس ہو جاتے ہیں، اور بیزار از زیست ــــ!

کریم بھی ایک پاگل تھا۔ بچوں کے [illegible] نوجوانوں کیلئے باعث عبرت [illegible] بوڑھوں کے لئے وجہ ترس!

شام [illegible] وہ کائنات کی لامتناہی وسعتوں کو چیرتا نظر آتا کسی پرند اڑتے ہوئے شاہین کی طرح، غیر مبہم الفاظ میں انسان کی شوریدہ سری کا ماتم کرتا، اور غرق تخیل رہ کر شائد کوئی بھولی بسری کہانی یاد کرتا۔ کبھی تو وہ سمندری موجوں کی طرح غضبیلا معلوم ہوتا، اور کبھی کسی پتھریلی چٹان کی مانند ساکت و صامت۔ اس کے متعلق بہت سے قصے مشہور تھے۔ کوئی کہتا زندگی [illegible] شاکی ہے۔ کسی کی رائے تھی کہ شدت غم و غصہ کی وجہ سے یہ حال ہو گیا ہے۔ اور کسی کا خیال تھا کہ جذبہ انتقام سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے!

لیکن بوڑھا کریم تھا کون؟ اور اگر کوئی پیدائشی نقص نہ تھا تو پاگل کس طرح ہوا؟ یہ اک راز سربستہ تھا جس کی تشریح ابتک نہ ہو سکی تھی۔

مجھے بوڑھے کریم سے دلی ہمدردی ہو گئی تھی لیکن دیوانے کا کیا بھروسہ؟ نہ معلوم حالت غیظ و غضب میں حملہ کر بیٹھے۔ اسلئے دور ہی دور سے دیکھ کر اظہار افسوس کرتی۔ اور آج کل تو اس کی حرکات اور بھی پر اسرار ہو گئی تھیں۔ میں اسے اپنے مکان کے سامنے والے سبزہ زار میں گھنٹوں بے مقصد پھرتے دیکھتی۔ کبھی کبھی تو وہ پہروں ہمارے مکان کی طرف تکتا رہتا، اور خصوصاً اس دریچہ کی طرف جہاں میں بھی جا کھڑی ہوتی تھی۔ اور ایک مرتبہ تو خود میں نے اُسے "حنا! میری حنا!" کہتے سنا لیکن اس امر کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور اب تو اس کا روزانہ معمول ہو گیا تھا کہ گھنٹوں اسی دریچہ کے سامنے کھڑا رہتا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے رہتے۔ اور کبھی کبھی سرد آہیں بھی بھر لیتا۔ یہ شہر العجائب! میں ان نت نئی باتوں سے پریشان سی ہو گئی۔ آخر دیوانے کو مجھ سے کام ہی کیا ہے؟ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟؟ اور! اور!! اس طرح افسردہ نگاہوں سے مجھے کیوں تکتا رہتا ہے؟؟؟

لیکن اس قدر ہمت نہ تھی، کہ اس کا سبب دریافت کرتی۔ دو چار بار ایسا ہی ہوا، کہ اگر میں کہیں باہر گئی ہوئی ہوتی تو واپسی پر اسے دریچے کی طرف تکتا ہوا پاتی۔ اس قسم کی حرکات سے میں اس قدر پریشان ہو گئی تھی کہ انتہائی احتیاط رکھتی کہ کہیں اس کا سامنا نہ ہو جائے۔ ایک رات میں کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک دریچہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اور آپ میری حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُسوقت بھی کریم اس کی سلاخوں سے چمٹا کھڑا تھا۔ مجھے دیکھا تو اپنے ورد زبان الفاظ مدھم سی آواز میں دہرانے لگا۔ اور میں نے صاف سنا۔ کہ "حنا! میری بچی حنا!" کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے اپنی لڑکی سمجھ کر یہاں آتا ہے۔ یہ پاگل؟! میں بری طرح دہشت زدہ ہو گئی۔ "میرے معبود! کہیں یہ مجھے لے جانے کے ارادے سے تو اس وقت یہاں نہیں آیا" عالم بے اختیاری میں میں یکایک چلا اٹھی۔ باہر سے قدموں کی آہٹ سن کر کریم نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ اُف! افسردگی کس طرح تیر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یکبارگی دریچہ سے ہٹا اور چشم زدن میں فضا کی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔

میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ حنا! اگر واقعی کریم کی دختر کا نام ہے۔ تو وہ کہاں ہے آج کل۔ اور یہ اس طرح اکیلا کیوں پھرتا ہے!

ہے۔ اور کیا ۔۔۔ کیا وہ لڑکی حقیقتاً میری مشابہ تھی؟ ۔
خوف و دہشت سے میری بُری حالت ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس دریچہ میں تو درکنار، کمرے تک میں بھی نہ آؤں گی۔ لیکن مقدس داور! اس طرح تو کریم کا جنون اور بھی ترقی کر گیا۔ لاابالی اور بے تکی باتیں کرتے کرتے وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگتا، فضاؤں میں کسی چیز کی تلاش کرتا، اور دریچہ کی طرف دیکھتے دیکھتے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا!

مجھے اس پر رحم بھی آتا اور اس کی بیچارگی پر افسوس ہوتا۔ اور پُراسرار حرکات پر تعجب! لیکن بعض اوقات وہ اس طرح سایہ کی مانند پیچھا کرنے پر تُل جاتا [illegible] اور اب تو وہ حد سے زیادہ پریشان کرنے لگا تھا۔ مجھے تو اب ہر لمحہ ہی خوف معلوم ہوتا تھا کیونکہ بارہا ایسا ہی راستے پر ملتا [illegible] جہاں سے گزرنا میرا روزمرہ کا معمول تھا!

ایک مرتبہ مجھے چند روز کے لئے کسی دوسرے شہر میں جانا پڑا۔ واپس آئی تو معلوم ہوا کہ کریم ان دنوں بے حد بے چین رہا [illegible] بار آکر دریچہ کھٹکھٹاتا، چیختا چلاتا!! [illegible] آوازیں دیتا۔ اور اس [illegible] بیچارے [illegible] دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ [illegible] شرارتوں [illegible] اور راہگیر مذاق موقوف کر دیتے!

دوسرے روز [illegible] کوئی [illegible] مقدس [illegible] کہ کریم کی [illegible] چونک اٹھی۔ وہ دریچے کی سلاخوں پر [illegible] مار رہا تھا۔ شاید اندر آنا چاہتا ہو۔ مجھے دیکھا تو بہت زور سے چیخ اٹھا۔ لیکن یہ چیخ مسرت و اطمینان کی تھی۔ گویا مجھے دیکھ کر مسرور ہو گیا ہو۔ اور پھر عالم جنون میں سلاخ سے سر دے [illegible] سخت چوٹ کی ضرب [illegible] ضعیف آدمی، پیشانی سے سُرخ سُرخ خون بہنے لگا۔ اس عرصے میں ادھر ادھر سے لوگ بھی اکٹھے ہو چکے تھے۔ مجھے غریب کی بیچارگی پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ بے ہوش و سخت مجروح کریم کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ تو میری حالت ضعف تک پہنچ چکی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی، اور شام سے رات لیکن اس دریچہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ کبھی اپنے آپ کو قصوروار ٹھہراتی، کبھی کریم کی وارفتگی پر حیرت ہوتی اور کبھی ان غیر اضطراری حرکات پر تعجب۔ کئی بار ہسپتال سے خبر بھی منگوائی، لیکن ہر دفعہ یہی سننے میں آیا کہ ابھی تک ضعف کی حالت میں ہے، اور باوجود کئی پٹیاں بدلنے کے ابھی تک خون کا بہنا موقوف نہیں ہوا۔

میں چاہتی تھی کہ ہسپتال چلی جاؤں، اور اس کے اپنے ساتھ اس لگاؤ کا سبب دریافت کروں لیکن سب کی رائے تھی کہ اگر اب اس نے مجھے دیکھ لیا تو شاید ایسی حرکت کر جائے جو اس کے لئے زیاں کا باعث ہو۔ یا ممکن ہے کہ شدتِ مسرت و جوش میں جان ہی سے گزر جائے۔ اور میں یہ سوچ کر رُک گئی کہ اگر واقعی کوئی ایسی حرکت کر گیا، تو اس کا باعث میں اور صرف میں ہوں گی۔!

تمام رات بہت بُری طرح کٹی۔ تخیل بار بار کریم کی صورت سامنے لے کر آ موجود ہوا ۔ اور پھر اس کا دریچہ کی طرف تکتے رہنا اور سلاخوں سے سر ٹکرانا!! خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میں سخت تشویش کے عالم میں تھی اور کریم کی خبر سُننے کے لئے مضطرب۔ کہ ہسپتال کے ملازم نے آکر اطلاع دی کہ اس غریب کا انتقال ہو گیا ہے کئی بار [illegible]!! کہتے ہوئے پلنگ کی پٹیوں سے بھی سر دے دے مارا تھا۔ اس قدر خون نکل جانے کے بعد طاقت تو ویسے ہی ختم ہو چکی تھی، اس پر مستزاد بار بار کی چوٹ۔ باوجود [illegible] ہسپتال والوں کے سنبھالنے کے بھی نہیں سنبھلتا تھا۔ اور آخر کار تھک کے ہمیشہ کی نیند سو گیا!

"بیچارہ کریم مر گیا؟" میں قلبی افسوس محسوس کرتے ہوئے [illegible] صاحب [illegible] میری اور بیچارگی میں!!"...

"نہیں خاتون۔ اس کا چھوٹا بھائی عین موقع پر ہسپتال آ پہنچا تھا"... ملازم مجھے اس طرح پژمردہ دیکھ کر بول اٹھا...

"کس کا بھائی؟ کریم کا! میری حیرت دوچند ہو گئی.....

"تب تو میں [illegible] اس سے ملوں گی"..... اور میں ملازم کے ساتھ ہی ہسپتال چلی گئی!....

سفید براق سے بستر پر لیٹا ہوا کریم حالتِ سکون میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے زرد زرد لبوں پر لازوال تبسم کھیل رہا تھا اور چہرے سے طمانیت ظاہر تھی۔ بیچارہ بھائی پاس ہی بیٹھا سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو بے حد غم انگیز پیرائے میں کہنے لگا..... "مرحوم کی حیرت انگیز حرکات سے آپ پریشان ہوں گی خاتون!۔ اور اس کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی شوریدگی سے نالاں تاہم میں اس پاگل پن اور وارفتگی کا سبب بتاتا ہوں۔ آپ ضرور اور بھی زیادہ اذیت محسوس کریں گی۔ لیکن اس کے سوا

ہو وہ ہی کیا ہے؟ انتقال کے وقت تک مرنے والے نے یہ تصویر [illegible] ہوئی تھی۔ لیجئے، آپ بھی دیکھئے!"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور میں نے ہاتھ بڑھا کر تصویر لے لی۔ لیکن یہ کیا۔

"معبود! میری تصویر!! میری اپنی تصویر!!!"۔ ۔ ۔ میں [illegible] رہ گیا۔ [illegible] لیکن پھر جو غور سے دیکھا تو اس لباس میں اور اس انداز سے تو میں نے کبھی تصویر کھنچوائی ہی نہ تھی۔ تو پھر یہ کیا [illegible]۔ میری عقل چکرا رہی تھی۔ اگر یہ میری تصویر نہیں، تو [illegible] کس کی ہے؟ اور اس غضب کی مشابہت!۔ ۔ ۔ ۔

"آپ حیران ہیں خاتون!"۔ ۔ ۔ مرحوم کریم کا بھائی کہنے لگا "[illegible] کی مشابہت کہ ہر گز کوئی فرق نہ ہو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ تاہم اب آپ اندازہ لگا لیں گی کہ میرا غریب بھائی کیوں آپ کو تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ یقینی طور پر آپ کو جنا ہی سمجھتا تھا۔ اور یہی نام اس کے ورد زبان بھی تھا"۔ ۔ ۔ ۔

"لیکن جنا تھی کون؟" میں نے وہی سوال دہرایا جو کبھی خود سے پوچھا کرتی تھی "اور کیا یہ تصویر جنا ہی کی ہے؟؟"۔ ۔ ۔ ۔

"بے شک"! اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "جبھی تو مرحوم جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھ کر اس طرح لئے لئے پھرتا تھا۔ تا وقتیکہ آپ کو ہی جنا سمجھنے لگا"۔ ۔ ۔ ۔

"خدا کے لئے! خدا کے لئے!! مفصل طور پر سنایئے" میں اپنی دکھتی ہوئی پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولی۔ شب بیداری کی وجہ سے سر بھاری بھاری ہوتا جاتا تھا۔ اور آنکھوں میں بھی درد ہوتا ہو رہا تھا۔

"مرحوم میرا حقیقی [illegible] بڑا بھائی تھا، اور اچھا خاصا خوشحال بیوی کی موت کے بعد اکلوتی بچی جنا کی محبت میں سکون کے دن بسر کر رہا تھا! اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس لڑکی کو ہی وہ اپنے لئے باعث رحمت سمجھتا [illegible] گھر کی رونق اور وجۂ مسرت! اسکی معمولی سی تکلیف پر اندوہگین ہو جاتا اور [illegible] خوش دیکھکر دنیا کے تردد بھول جاتا۔ دن اسی طرح گذر رہے تھے۔ جنا بڑھ رہی تھی اور اسکے ساتھ ہی باپ کا دل بھی۔ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے خوش آیند خواب دیکھتا۔ اس کی شادکامی اور کامرانی کی دعائیں مانگتا، اور ہر ممکن کوشش کرتا کہ اپنی تمام محبت اس میں مرکوز کر دے!

آج سے چار سال پہلے جو وبا آئی تھی وہ غریب جنا کو بھی [illegible] کر گئی۔ بیچارہ باپ سینکڑوں روپیہ ٹھیکریوں کی طرح لٹا کر بھی فرشتۂ موت کو رشوت نہ دے سکا اور جنا کے ساتھ ہی اس کی اپنی دنیائے سکون بھی درہم برہم ہو کر رہ گئی!

[illegible] یقین نہ آتا کہ جنا مکان میں موجود نہیں [illegible] آوازیں دیتا، ادھر ادھر تلاش کرتا اور کوئی چارہ یا فت نہ پا کر چلانے لگتا۔

[illegible] موت نے [illegible] وجود [illegible] لوٹ [illegible] وہ [illegible] ڈالتا، اور ادھر ادھر ٹہلتا رہتا۔ جنا کی تلاش [illegible] ایسے وقت [illegible] تصویر [illegible] سہارا ہوتی۔ نہ معلوم کب [illegible] مشابہت [illegible] دیکھنے لگا تھا۔ چار سال پیشتر جنا کی بھی یہی عمر تھی اور بالکل اتنا ہی قد! اور تصویر تو آپ خود ہی دیکھ چکی ہیں۔ بتایئے! ایک پاگل کس طرح نہ دھوکا کھاتا [illegible] اس کا جنون خطرناک حد تک پہنچ [illegible] کی طرح کی روک تھام کے باوجود [illegible] بالکل [illegible] جاتا۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا تھا کہ آپ کے مکان کا محاصرہ کئے رہتا تھا۔ جب آپ شہر سے باہر گئی ہیں کریم مرحوم نے کبھی کبھار بھی گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ میں اگر برادرانہ الفت سے مجبور ہو کر پاس جاتا بھی کہ بھائی کو تسلی دیکر ساتھ لیجاؤں گا تو اس طرح جھنجھلا اٹھتا گویا اس دنیا اور معقولات پر سخت بیزار ہے۔ مجبور ہو کر اسے اسی کے حال پر چھوڑ دیا اس کے بعد جو کچھ گذرا اس سے آپ خود بھی پوری طرح واقف ہیں۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ آپ کی جنا سے مشابہت ہی میرے غریب بھائی کیلئے مصیبت ہوا ثابت ہوئی"

میں نے بیحد افسوس کیساتھ اس امر کو تسلیم کیا اور دل سے بہا بہا کر مرحوم کیلئے دعائے مغفرت کی۔ اس تصویر کو بھی کریم کے ساتھ ہی دفن کیا گیا اور میں خود بھی اکثر اس کی قبر پر جا کر دعا مانگتی ہوں کہ بیچارے کی آ بتک بھٹکتی ہوئی روح کو سکون نصیب ہو! وہ جنا مرحومہ کی تربت [illegible] کریم [illegible] اسکی روح اسی بیقراری سے جنا کو ڈھونڈیگی [illegible] اٹھتے ہوئے [illegible] کی طرح چکر کاٹتی رہے گی!

اب بھی اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود میں اس واقعہ کو فراموش نہیں کر سکی۔ ہر اوپر والے کی چیخ پر مجھے کریم کی پکار کا دھوکا ہوتا ہے میرے کانوں میں وہی الفاظ "جنا! میری بچی [illegible]!" گونجنے لگتے ہیں گونجتے ہی [illegible] اور [illegible] وحشت سی ہونے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں [illegible] کھڑی ہوں تنہا، اور [illegible] اور دور سے ایک آواز مجھے بلا رہی ہے [illegible] پکار رہی ہے اور [illegible] کہ قدرت کی [illegible] آنکھوں [illegible]!

وکرمادتیہ

امن و آزادی کی خواہاں دلیر بہادر جنگجو آزادی کی علمبردار راجہ کی سوانح حیات سکرین پر

پرکاش پکچرز کا ناقابل فراموش کارنامہ

یہ حقیقت ہے کہ وکرمادتیہ کے عہد جیسی شاندار ترقی ہندوستان نے نہ تو اس عہد سے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ ہی اسکے بعد نصیب ہوئی۔ بہرحال پرکاش پکچرز جیسا کہ آنے والا شاہکار "وکرمادتیہ" بتا دیگا۔ قدیم ہند کے زریں دور کی یادگار ہستیوں اور انکی شان و شوکت کی حقیقی جھلک کو یاد دلا رہے ہیں جبکہ ہمارا ملک علم و ادب۔ آرٹ۔ کلچر۔ سائنس۔ علم ریاضی وغیرہ کیلئے تمام دنیا کیواسطے ایک نہ بجھنے والی شمع کا کام دے رہا تھا۔ وکرمادتیہ کے عہد میں ہر چیز اپنے نصف النہار پر تھی۔ "وکرمادتیہ" کی دو ہزار سالہ برسی منانے والی کمیٹی کو سب سے پہلے اس زبردست شخصیت کو پردہ سیمیں پر اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انکی نگاہ پرکاش پکچرز پر پڑی جو اس سے پہلے "رام راج" جیسی فلمیں تیار کر چکے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ محض آرٹ ہی فلم کی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے تاریخی حقائق۔ آرٹ کے علاوہ دیگر لوازمات کی بھی سخت ضرورت ہے اور "وکرمادتیہ" میں ہر چیز آپ کو اپنے بام عروج پر نظر آئے گی۔ تاریخ ہند میں وکرمادتیہ کا درجہ بالکل ایسے ہے جیسا انگلینڈ والوں کے نزدیک الفرڈ کا۔ فرانس والوں کے نزدیک شارلیمین اور مسلمانوں کے نزدیک ہارون الرشید کا۔ اس کی پروقار شخصیت۔ جاہ و جلال۔ بے خوفی اور جرأت واقعی حیرت انگیز تھی۔ وکرم بہت بڑا راجہ تھا۔ مگر اس نے دنیا کو غلام نہیں بنایا۔ اس نے تخت مالوہ کیلئے بیرونی خونخوار درندوں۔ شکوں کو آریہ ورت سے باہر دھکیل دینے کیلئے خونخوار لڑائیاں کیں۔ مگر سب کچھ انسانی بہبودی کی خاطر۔ لوگوں نے اسکی بے پناہ شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے نام سے سن بکرم جاری کیا۔ وکرم عہد جنگ و عہد امن دونوں میں یکساں طور پر ملک کا لیڈر رہا۔ اس کے ماتحت آرٹ۔ سائنس۔ کلچر۔ تمدن ہر چیز نے ترقی کی اور یہ ہندوستان ان تمام علوم کا مرکز بن گیا۔ اس نے طاقت کے مظاہرے کئے تو صرف دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے امن کی بحالی کیلئے۔ ناجائز قبضہ و غلبہ کیلئے نہیں۔ وہ ایک زبردست مفکر بھی تھا۔ اسکے علم کے تحت ہندو دھرم۔ بدھ مت اور جین مت تینوں نے خوب ترقی کی۔ وکرم کی پُر وقار ہستی نے کبھی اختلاف پیدا ہونے کے مواقع پیدا نہیں کئے۔

ہندوستان کے اس قابل صد فخر و تعظیم راجہ کے حالات زندگی فلمانے کے اہم ترین فرائض کی ذمہ داری۔ لائق ترین ڈائرکٹر وجے بھٹ نے جس حسن و خوبی سے سرانجام دی ہے اسکا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں جنہوں نے پرکاش کی گزشتہ شاہکار دیکھے ہیں۔ وکرمادتیہ کا ٹائٹل پرتھوی راج سکرین کے سب سے بیدار مغز کیریکٹر ایکٹر کے سپرد کیا گیا ہے۔ کالیداس شاعر کا پارٹ مشہور ترین اداکار پریم ادیب کر رہا ہے۔ وکرم کے وزیر اعظم دنیال بھٹ کا مختصر لیکن والا رول زبردست کیریکٹر ایکٹر بابو راو پینڈھارکر نے بنھایا ہے اور ان تینوں شخصیتوں کے علاوہ بہت سے ستارے اہم کام کر رہے ہیں۔ اس یادگار فلم پر بہت بڑی کاسٹ دی گئی ہے۔

شمالی ہند میں جلد از جلد پیش ہوگا۔

پکار، سکندر، اور پرتھوی ولبھ جیسی عظیم الشان تاریخی تصاویر کے خالق

مسٹر سہراب مودی پھر ایک عالیشان فلم پیش کرتے ہیں۔

مغلیہ تہذیب کی عظمت و شوکت کا آئینہ دار۔

MINERVA PRODUCTION

منروا کا چوتھا تاریخی فلم

ایک دن کا سلطان

ادا کار

مہجبیں، مہتاب۔ واسطی۔ غلام محمد۔ صادق علی۔ شانتارن۔ غوری۔

غلام حسین اور اے شاہ و متعدد دیگر

کہانی و مکالمے ——— آغا جانی کشمیری ؛ گانے ——— ولی صاحب

WORLD RIGHTS CONTROLLED BY:-

INDIA CINE PICTURES LTD.

چند نایاب کتابیں

رہنمائے قرأت بغلط قرأت کا مکمل کتاب جس میں ایسا ماں سے ہر ایک قرآن مجید درستی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں ان تمام الفاظ کو لکھ دیا ہے۔ جن میں زیر زبر کی غلطی پڑھنے سے کفر ہو جاتا ہے۔ قیمت ۸

محکمات مولانا عبد اللہ العمادی جس میں قرآن پاک کی تعلیمات فلسفیانہ روشنی میں [illegible] ہیں اور دکھایا ہے کہ آیات کے حقیقی معنی کیا ہیں قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ/)

الایمان جس میں ایمان اور کفر کی تمام شرائط اور اسباب کا مفصل ذکر ہے اور بعض آیات قرآنی سے استشہاد کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

تذکرۃ العباد عہد رسالتمآب کے مشہور غلاموں۔ حضرت اسامہ۔ بلال۔ خباب۔ زید۔ سالم۔ سلمان۔ حبیب۔ عامر اور عمار کے دلچسپ اور سبق آموز حالات بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ تیرہ آنے (عہ)

حیاتِ صالح سوانح عمری نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہان بادشاہ قیمت آٹھ آنہ (۸)

کتاب الزکوٰۃ مولفہ عبد اللہ العمادی قیمت چار آنہ (۴)

اسرارِ حکمت انگریزی انگریزی پیٹنٹ ادویات کے نسخہ جات قیمت عہ 1/8

مجاہدین مراقش سرزمین مراقش میں یورپی سیاسی پیچیدگیوں کا کچا چٹھا قیمت 3/-

القانون انسان کی موجودہ صحت کو قائم رکھنے اور زائل شدہ تندرستی کو واپس لانے کے حق میں بہترین کتاب قیمت 5/-

معلوماتِ خانہ داری کی پہلی کتاب کپڑا اکترنے سینے پرونے کھانے پکانے کی ترکیبیں درج ہیں قیمت چار آنے (۴)

مینیجر مسلم جنرل بکس ایجنسی ٹکسالی گیٹ لاہور

الیکٹریسٹی ایم ٹی خراد ورکشاپ بائلر آئل وکروڈ آئل نے

کاریگر بنو

ذریعہ معاش وہی اچھا ہے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے یعنی اسے علوم اپنے پاس رکھو جن کی مشہور ہیں جبکہ آپ اپنے گھر بیٹھے سیکھ کر اور انجنیئر و ڈرائیو الیکٹریشن مستری بن کر عزت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں کتب ذیل ماہرین فن کی تصنیف کردہ ہیں جو ۵ سال سے کئی ایڈیشنوں میں فروخت ہو چکی ہیں۔

رہنمائے انجنیئری حصہ اول سٹیم انجن۔ بائلر کنڈنسر وغیرہ کا م و متعلقہ پرزوں کے کل حالات مع اشکال اور سوال و جواب درج انگریزی میں ہیں انجنیئری کے مشکل الفاظ انگریزی و بالتفصیل ڈکشنری بھی دیئے گئے ہیں۔ مجلد قیمت چار روپے 4/-

رہنمائے انجنیئری حصہ دوم اس میں ہر قسم کے انجنوں کے مالیشن لوبیلالیب کنڈنسر کے علاوہ ڈائنیمو ڈائیگرام [illegible] امتحان انجنیئری کے سوالات مع حل بھی دیئے گئے ہیں حصہ دوم مجلد پانچ روپے 5/-

الیکٹرک گائیڈ جس میں ہر قسم کی الیکٹریکل مشینری مثلاً ڈائنیمو موٹر [illegible] ٹرانسفارمر وغیرہ کرنٹ سوئچوں کے کل حالات [illegible] نقائص و اشکال اور ڈکشنری دیئے گئے ہیں الیکٹریسٹی ورکشاپ حاصل شدہ امتحان سپرنٹنڈنٹ پنجاب بھی درج ہیں قیمت 4/-

رہنمائے بجلی اس میں ہر قسم کے انجنوں [illegible] ہیٹنگ بورڈ [illegible] کی خرابیوں چھوٹی بڑی موٹروں اور وائرنگ کے مکمل حالات نقشہ جات امتحانی سوال جواب [illegible] وغیرہ تین روپے آٹھ آنہ 3/8

آئل گیس انجن گائیڈ مجلد باتصویر مع ضمیمہ یہ کتاب ہر قسم کے آئل انجنوں کے کل حالات چلانے [illegible] مع حالات [illegible] تفصیل و اشکال [illegible] قیمت 3/-

کروڈ آئل انجن گائیڈ میں ہر قسم کے انجنوں [illegible] کل حالات مکمل [illegible] باتصویر [illegible] مع ضمیمہ مجلد قیمت تین روپے 3/-

معاون الخراد [illegible] کتاب [illegible] باتصویر 1/8

معاون ورکشاپ [illegible] اوزار [illegible] ہر ایک مشینری [illegible] قیمت 1/8

گلٹ سازی مکمل [illegible] چاندی [illegible] 1/2

انجنیئرنگ فارمولا [illegible] 9/4

سید رحمت علی اینڈ سنز [illegible] انجنیئرنگ بکس ٹکسالی گیٹ لاہور

اُردو کی تازہ ترین مطبوعات

محترمہ ... کے قلم سے ... [illegible]
[illegible] ... کے
[illegible] ... کی ... [illegible]
[illegible] ... قیمت مجلد ... [illegible]
محترمہ ... کے شاہکار افسانوں کا
[illegible] مجموعہ ہر افسانہ نئے رومان سے
[illegible] ...
کتاب قیمت دو روپے چار آنے۔ مجلد

[illegible] اُن افسانوں کے تاریخی رومان
جنہوں نے خود محبت کی یا جن
سے محبت کی گئی۔ محبت کرنا انسان کا ایک فطری
جذبہ ہے محبت ... محبت حاکم و محکوم کے
درمیان امتیازی نشان نہیں رکھتی محبت تاج و تخت سے
بے نیاز ہوتی ہے اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب
... مصنفہ ... کا مطالعہ فرمائیں قیمت ...

راکھی ... دوسرا ... ناول راکھی
... داستان جس کو قدرت نے
[illegible]
[illegible] ... افسانوں سے ...
[illegible]
[illegible]
[illegible] قیمت ایک روپیہ ... مجلد

باندی [illegible]
[illegible]

[illegible] ... مکمل ... پیش کیا ہے پڑھیا
اور لطف اٹھائیں۔ مجلد کتاب ایک روپیہ بارہ آنے مجلد

دنیا کے تین بہترین ناول یورپ کے نامور ادیب ...
اور ... کے شہرہ آفاق ... ناولوں کا اردو ترجمہ
ایک جلد میں ... انتہائی دلچسپ ناول مجلد کتاب تین روپے

رزم و بزم جاں فروز عبرت آموز افسانوں کا ... مجموعہ مرتبہ ...
[illegible] قیمت غیر مجلد دس آنے۔ مجلد

نئی فضائیں ہندوستان کے اُن بلند پایہ ترقی پسند
افسانہ نویسوں کی ادبی کاوشوں
کا حسین ... مجموعہ جن کا نام آسمانِ ادب پر درخشندہ ستاروں
کی طرح جگمگا رہا ہے مجلد کتاب قیمت دو روپے آٹھ آنے مجلد

[illegible]: حسن فروشی کی ... کہانی جس کو پڑھ کر
[illegible]
[illegible] ... دنیا ...
[illegible]

پہلا گناہ [illegible]
[illegible]
[illegible]

داستانیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ... حال میں ... [illegible]
[illegible]
[illegible] ... قیمت ... مجلد

قلوپطرہ کی ایک رات [illegible]
کا ترجمہ ... [illegible]
[illegible]
[illegible] ... قلوپطرہ کی ایک رات ...
[illegible]
خواب ... [illegible] ... مجلد قیمت ...

شعاعیں مرتبہ شبلی ... [illegible]
زبانوں میں لکھنے والے ... افسانہ نویسوں ... [illegible]
شاہکار اردو میں پہلی مرتبہ اپنی قسم کا ... مجموعہ ضخامت
تین سو صفحات سے زائد مجلد کتاب قیمت تین روپے ...

خلش ... خالد حسن قادری کے ... تازہ ترین افسانے
جن میں حقیقت و رومان کو ... خوبی سے سمویا
ہے ... [illegible]
[illegible] ... افسانے ... [illegible]
[illegible] ... صفحات مجلد کتاب قیمت ...

خوشبوئیں مرتبہ شبلی ... [illegible]
افسانہ نویس ... کے ... [illegible]
[illegible]
[illegible] ... ضخامت ... قیمت
[illegible] ... قیمت ... مجلد

[illegible]

عالمگیر بک ڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

[illegible]

SEPTEMBER

1945

عالمگیر

لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۰ — نمبر ۳

فہرست مندرجات ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا سے شائع کیا

ادارہ

ملاحظات

گزشتہ اشاعت میں ترقی پسند ادیبوں کی سالانہ کانفرنس کے متعلق ڈاکٹر زور کی ایک اپیل شائع ہوئی تھی - جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے سقوط کے ساتھ ہی فاشیت کا خاتمہ ہو چکا ہے - اس لئے اب ادیبوں اور شاعروں کو سوچنا ہے کہ ان کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا؟ اس مرتبہ پنجاب کے جواں فکر ادیب ظہور احسن ڈار نے اس عامیانہ خیال کا پوری قوت سے محاسبہ کیا ہے اور واقعات و حقائق کی روشنی میں بتایا ہے کہ ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی نے فاشیت کو جنم نہیں دیا بلکہ یہ لوگ خود فاشیت کی پیداوار ہیں - اور فاشیت آج بھی "ملوکانہ جمہوریت" کی قبا میں "پائے کوب" ہے - لہٰذا ادبا و شعرا کا فرض ہے کہ وہ فاشیت کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک مشرق و مغرب کے تمام ممالک آزادی کی سانس لینے کے قابل نہیں ہو جاتے - اسی اشاعت میں ڈار صاحب کا ایک تازہ افسانہ بھی شامل ہے - جو جذباتی ترنم، شدت احساس اور حسنِ تخلیق کے لحاظ سے اردو ادب میں یادگار حیثیت رکھتا ہے - ان کے ہر لفظ میں ماحول کے خلاف ایک اعلان بیزاری اور عزم جہاد کروٹیں لے رہا ہے - انھوں نے الفاظ کے ساز پر ایک ایسا "دیپک راگ" چھیڑا ہے - جو دل و دماغ کے تاریک گوشوں میں بھی آگ لگائے بغیر نہ رہے گا - ڈار صاحب افسانوں کا مجموعہ زیر طباعت ہے - زیر نظر اشاعت میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ناصحانہ دیباچہ ملاحظہ فرمائیے + محمد ابراہیم مدہوش کے پہلے مقالہ کے متعلق یہ عام شکایت آئی تھی کہ ثقالت نے ان کے عندیہ کو اجاگر ہونے نہیں دیا - یہ شکایت تو ممکن ہے اس مرتبہ بھی ہو لیکن مدہوش صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ سادہ زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی کوشش کریں گے - میرزا محمد بشیر کبھی کبھی "عالمگیر" کو یاد فرما لیتے ہیں - آپ تاریخ ادب اردو پر محققانہ نظر رکھتے ہیں - "شہیدی" کے عنوان سے آپ نے تاریخ ادب کے ایک نیم متعارف ورق پر روشنی ڈالی ہے - عزیز احمد صاحب کا مضمون "پروپیگنڈے کا تاریخی پہلو" معلومات افزا ہے - افسانوں میں گڑیا - ایک ڈائری اور وصیت نامہ خاص طور پر جاذب توجہ ہیں - میرزا ادیب نے ہندوستانی ذہنیت کے ایک گھناؤنے پہلو کی نقاب کشائی کی ہے - ایوب سرور کا ہر قدم ترقی کی جانب اٹھ رہا ہے - ان کے افسانوں میں جذباتیت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے - سلام مچھلی شہری شاعر پہلے ہیں اور ڈراما نگار بعد میں - اس مرتبہ بھی انھوں نے ایک ہلکی پھلکی چیز اپنے مخصوص انداز میں پیش کی ہے - شریف عنایت اللہ کے افسانے میں "استانی جی" کا کیرکٹر سبق آموز ہے - جمیل زبیری نے ایک مشہور افسانے کا ترجمہ "آتش انتقام" کے عنوان سے کیا ہے - منظومات کا حصہ حسب معمول وقیع ہے ---!

اداریہ

اخبار و افکار

نظامِ نو میں اُردو کا درجہ

جنگ کا ساز آخری ہچکی لے کر خاموش ہو چکا ہے۔ اقوامِ عالم آتش و خون کے دریا میں غوطے کھانے کے بعد ساحلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بغض و عناد کے دلخراش راگ کی جگہ صلح و صفائی کا میٹھا گیت سنائی دے رہا ہے۔ تباہی و بربادی کی راکھ سے تہذیب و تمدن کا ققنس ایک مرتبہ پھر بال و پر جھاڑ کر اُٹھا ہے اور ایک نئے افق کی تلاش میں سرگرداں ہے ہر ملک بوسیدہ نظام کی ہڈیوں پر ایک نیا ایوان تعمیر کیا چاہتا ہے۔ اور ہر مدبر کی خواہش ہے کہ اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں اسی کا ناخنِ تدبیر کامیاب ہو۔ ہندوستان اگرچہ براہِ راست جنگ میں شریک نہیں ہوا تاہم وہ حرب و ضرب کی ہمہ گیر تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس لئے جدید مسائل تو اس کے پیشِ نظر بھی ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ اہم معاملات وہ ہیں جن پر جنگ سے پہلے غور و خوض ہو رہا تھا۔ اور جو اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی کھٹائی میں پڑ گئے تھے۔ ان میں زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک ذریعہ اظہار کا تعین نہ کیا جائے گا۔ ہماری ثقافت ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں جدید حالات کی روشنی میں اس سوال کا جائزہ لینا ہے۔

جنگ کے دوران میں ہندی ساہتیہ سمیلن نے اُردو کے خلاف کافی زہر اُگلا ہے۔ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر ہندی کی تائید و حمایت میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ لیکن اس جوش و خروش کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا جواب ساہتیہ سمیلن کے ارکان کو خود ہی دینا چاہئے۔ لیکن ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کو اُن کی غوغا آرائی سے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ بلکہ اُردو کا ہر قدم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ جنگ کے زمانہ میں لاکھوں ملکی و غیر ملکی سپاہیوں کو اُردو زبان سکھائی اور پڑھائی جا چکی ہے۔ اب یہ سپاہی جب اپنے اپنے وطن کو واپس جائیں گے تو قدرتی طور پر وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اُردو کا مطالعہ جاری رکھیں گے۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان تو کیا یورپ اور امریکہ میں بھی اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی ایک معقول تعداد پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ماسکو، برلن، ٹوکیو اور لندن نے بھی اُردو کا ذوق پیدا کرنے میں کافی حصہ لیا ہے۔ اس لئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی امتیازی درجہ حاصل رہے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کیا اہلِ اُردو اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار ہیں؟ جب مواد تیار ہو چکا ہے تو عمارت کھڑی کرنے میں کیا دیر ہے؟ اگر مسلم لیگ، انجمن ترقی اردو (ہند) اور دوسری باہمت ادبی مجالس کوشش کریں تو اُردو کو نئے حالات کی روشنی میں مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تقریباً ہر ملک میں اُردو جاننے والے کافی تعداد میں موجود ہیں اگر ان میں مرکزیت پیدا کر دی جائے اور ان کی منظم صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھایا جائے تو مغربی ممالک میں بھی اُردو کی جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے جو سپاہی بلا امتیاز مذہب و ملت میدانِ جنگ سے اُردو سیکھ کر آئے ہیں ان کی حوصلہ افزائی بہت زیادہ ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنا شوق جاری رکھ سکیں۔ اور اُردو کو ہمہ گیر درجہ حاصل ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور تمام ادبی انجمنیں اس معاملہ پر پوری سنجیدگی سے غور فرمائیں گی۔ اور جلد سے جلد کوئی ایسا قدم اُٹھایا جائے گا جس کے نتیجہ میں دنیا کے نظامِ نو میں اُردو کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو سکے۔

ظہور الحسن ڈار

میں خاموش نہیں رہ سکتا

ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کے سلسلے میں جو ستمبر کے آخری دنوں میں حیدرآباد (دکن) میں منعقد ہو رہی ہے ڈاکٹر زور نے ایک اپیل شائع کی ہے۔ اس اپیل میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی اہمیت جتلانے کے بعد ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ۔

"آج جبکہ یورپ میں فاشزم کو شکست ہو چکی ہے۔ ہر طرف ترقی پسند قوتیں آگے بڑھ رہی ہیں اور ہمارے ملک پر سے سیاہی کی چادریں ہٹ رہی ہیں۔ تمام ادیبوں پر خاص ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ ہم زمانہ جنگ کے ادب کا جائزہ لیں۔ اور یہ دیکھیں کہ ہمیں اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی اور کیا کوتاہیاں ہمارے کام میں رہ گئیں۔ اور اس کے بعد آئندہ کے لئے اپنی راہ متعین کر دیں ——" جہاں تک اپیل کے دوسرے حصوں کا تعلق ہے۔ بلکہ بڑی حد تک اس حصے سے بھی جسے میں نے بحث کے لئے چھانٹا ہے مجھے نہ صرف اتفاق ہے بلکہ میں اس کا پوری طرح حامی ہوں۔ لیکن زور صاحب کے اس مفروضے سے کہ یورپ میں فاشزم کو شکست ہو چکی ہے میں متفق نہیں ہوں۔ فاشزم کے خاتمے کے متعلق ڈاکٹر زور کی رائے بنیادی طور پر غلط ہے۔ جان بوجھ کر یا انجانے میں انھوں نے ہٹلر اور مسولینی کی موت یا موجودہ جنگ میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کی شکست کو فاشزم کی شکست سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ فاشزم ہٹلر اور مسولینی کی پیداوار نہیں بلکہ ہٹلر اور مسولینی کو فاشزم نے جنم دیا تھا۔ فاشزم افراد کا نام نہیں اور نہ افراد کے مٹ جانے کو اس کے خاتمے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ وہ چند رجعت پرور اور انسانیت دشمن اصولوں کا مجموعہ ہے جو ہٹلر اور مسولینی جیسے افراد اور جرمنی، اٹلی، اسپین اور جاپان جیسی رجعت پسند طاقتوں کی نشو و نما کا ذریعہ بنے۔ فاشزم ایک نظام کا نام ہے ایک ایسی قوت کا جو اخلاق اور تہذیب کی تمام قدروں کی منکر ہے۔ جو رنگ و نسل کا امتیاز پیدا کرتی ہے جو چند انسانوں کو دنیا کے عوام پر مسلط کر دینا چاہتی ہے جو طبقاتی کشمکش کی سب سے بڑی سرپرست اور انسان کی آزادی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک یہ اصول برباد نہیں ہوتے۔ جب تک یہ نظام پارہ پارہ نہیں ہوتا۔ جب تک اس خطرناک قوت کو اجتماعی طور پر شکست نہیں ہوتی۔ چند افراد کی موت یا چند فاشسٹ نواز حکومتوں کی شکست کا سہارا لے کر فاشزم کے خاتمے کا اعلان کرنا تاریخ کے عمل سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ میں اس مسئلہ پر اس لئے زیادہ زور دے رہا ہوں کہ بدقسمتی سے جرمنی اٹلی اور جاپان کی شکست سے واقعی یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ فاشزم جو ایک بہت بڑی بربادی تھی دوسروں کو برباد کرتے کرتے خود برباد ہو گئی۔ پچھلی جنگ عظیم میں بھی یورپ کے بعض ادیبوں نے زمانہ جنگ کے جذباتی دور سے متاثر ہو کر یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ ان کی سامراجی حکومتیں در اصل دنیا کی آزادی اور امن کی علمبردار ہیں۔ ادب کے سچے مقاصد کو چھوڑ کر انھوں نے سامراجی حکومتوں کی پیٹھ ٹھونکی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب جنگ ختم ہوئی تو ان ادیبوں نے دیکھا کہ سامراج کی حمایت میں آواز بلند کر کے انھوں نے دنیا میں ایک دوسری جنگ کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ جو پہلی جنگ سے کہیں زیادہ بھیانک اور مہیب ثابت ہو گی۔

پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد سرمایہ دار ممالک کے باہمی تضاد نے چپکے چپکے دوسری جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک طرف سامراجی حکومتیں، دوسری طرف سامراجیت کی مہیب انتہا فاشزم اور ان دونوں کے بیچ میں کمزور اور محکوم ممالک اور نوآبادیاں —— جب جنگ شروع ہوئی تو روس کی حیثیت محض ایک تماشائی کی معلوم ہوتی تھی لیکن در پردہ وہ اس خونیں ڈرامے میں حصہ لینے کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔ سامراجی

فاشسٹ طاقتوں میں جنگ کی گھما گھمی زوروں پر تھی۔ محکوم ممالک اور نوآبادیاں موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں اور ان کی نظریں روس کی طرف اٹھتی تھیں جو سامراج دشمنی کا جھنڈا اٹھائے ایک طرف کھڑا تھا۔ پھر ایکا ایکی وہ بھی رزم گاہ میں کود پڑا۔ اور ساری دنیا تیرہ وتار ہو گئی۔ جنگ کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے روس کو اس حقیقت کے باوجود کہ وہ سامراجی طاقتوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بذات خود فاشزم کے مقابلے میں سامراجی حکومتوں کا اس لئے ساتھ دینا پڑا کہ فاشزم سامراجیت اور سرمایہ داری سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب نہ صرف یورپ کے ادیبوں بلکہ نوآبادیوں کے ادیبوں نے بھی پھر وہی غلطی کی جو وہ ایک مرتبہ پہلے کر چکے تھے۔ یعنی انھوں نے دوبارہ سامراجی حکومتوں کو فاشزم کے مقابلے میں امن و آزادی کی نقیب اور محافظ سمجھ لیا۔ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ فاشزم دراصل سامراجیت ہی کی مہیب شکل ہے اس لئے اگر ہم فاشزم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں یا اسے فنا کر دینے کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سامراجی حکومتوں کو کھلی چھٹی دے دیں کہ وہ جہاں جی چاہے پاؤں پسار لیں۔ اور من مانی کارروائیاں کریں۔ اس میں شک نہیں کہ آج فاشسٹ نواز حکومتوں کو شکست ہو چکی ہے اور فاشسٹ لیڈر مر چکے ہیں۔ لیکن کوئی بھی صاحب نظر یہ نہیں کہہ سکتا کہ فاشزم کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اب بھی جرمنی، جاپان، اٹلی اور سپین کے کروڑوں آدمی یہ یقین رکھتے ہیں کہ دشمن کے برتر جنگی وسائل ہی ان کی شکست کا باعث ہوئے ہیں۔ فاشزم کے اصول آج بھی ان کے دلوں میں محفوظ ہیں اور ایک بین الاقوامی تربیت ہی ان کے نظریہ حیات کو بدل سکتی ہے۔

اس کے علاوہ وہ بیج جس سے فاشزم کا پودا پھوٹ کر پھلتا اور پھولتا ہے بدستور موجود ہے۔ سامراج آج امن اور آزادی کا محافظ بن کر زندہ ہے۔ فاشزم کی شکست کا سہرا اسی کے سر باندھا گیا ہے اور زمانہ حال کے بہت سے ادیب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ فاشزم کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہی غلطی ہے جو انھوں نے پہلی جنگ میں کی تھی۔ اور اگر جلد ہی تمام دنیا کے ادیبوں نے اجتماعی طور پر اس کا احساس نہ کیا اور سامراجی قوتوں کے خلاف اپنی جدوجہد شروع نہ کی تو انہی سامراجی قوتوں کی کوکھ سے ایک تیسری جنگ عظیم جنم لے گی۔ جس کی آگ میں ساری دنیا جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔ آج کا ادیب سامراج سے دنیا کے عوام کی نفرت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نفرت تھی جس کی وجہ سے جنگ کے ابتدائی دور میں عوام فاشزم کو سامراجیت کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے تھے۔ اور جب تک انھیں فاشزم کی تباہ کاریوں سے مکمل طور پر واقفیت نہیں ہوئی وہ بدستور فاشسٹ قوتوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ اگر فاشزم کو اس جنگ میں شکست ہو گئی تو دنیا کے کسی ملک میں بھی آزادی کی مشعل روشن نہیں ہو گی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں عوام کے اس خیال کے پس منظر میں سامراج دشمنی کا اہم جذبہ موجود تھا۔ وہ ہر قیمت پر سامراجی گرفت سے آزاد ہونا چاہتے تھے اور یہ جذبہ فاشزم کی شکست سے معدوم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آج عوام یہ سوچ رہے ہیں کہ جب فاشزم جیسی مذموم قوت برباد ہو سکتی ہے تو سامراج کیوں زندہ رہے۔ وہ قوت جس نے مدت سے کروڑوں انسانوں کو محکوم بنا رکھا ہے اس کا انجام بھی فاشزم جیسا کیوں نہ ہو۔

زمانہ جنگ میں ہندوستانی ادب بڑی حد تک ایک خاموش تماشائی رہا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ادب اپنے ماحول ہی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ تو ہندوستانی ادب کی پوزیشن اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ محاذ جنگ کے دو فریقوں کے درمیان خاموش کھڑا رہے۔ فاشزم سے ہندوستانی ادیبوں کی دشمنی میں کسی کو کلام نہیں۔ لیکن جہاں وہ فاشزم سے نفرت کرتے ہیں وہاں وہ سامراج کے متعلق بھی یہی جذبہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے موجودہ جنگ میں ہندوستانی ادیب کے ذہن میں ایک ہولناک کشمکش جاری رہی۔ سوال یہ تھا کہ وہ دونوں قوتوں میں سے جن کے ساتھ اسے یکساں نفرت تھی کس کا ساتھ دے؟ اس کشمکش میں ہندوستانی ادیبوں نے پوری ہم آہنگی کے ساتھ کسی بھی ایک فریق کا ساتھ نہیں دیا۔ روس کے جنگ میں شامل ہو جانے سے اگرچہ اشتراکی ادیبوں میں ہلچل پیدا ہوئی مگر وہ بھی اشتراکی تحریک اور سامراج کے میل سے مطمئن

[illegible] ہوئے۔ اور مجموعی طور پر سارے ہندوستانی ادب پر جمود اور یاسیت کی کیفیت طاری رہی۔ [illegible] کہیں کہیں امید اور امنگ کی بجلیاں کوندتی رہیں۔ [illegible] جنگ کا ہندوستانی ادب اس دیس کی محکومی [illegible] کے خلاف ایک صحت مند صدائے احتجاج ہے۔ بنگال [illegible] کے متعلق جو افسانے یا نظمیں لکھی گئی ہیں۔ آسام۔ گجرات اور [illegible] میں فاقوں سے بچنے کے لئے عورتوں کی عصمت فروشی، بچوں کی فروخت اور مردوں کی دلالی کے متعلق جو فن پارے [illegible] گئے ہیں اور غیر ملکی سپاہیوں کی دل آزار حرکتوں کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر مستقبل کا نقاد بڑی آسانی سے اس دیس کی مظلومی اور بیچارگی کا اندازہ لگا سکے گا۔ اس کے علاوہ زمانہ جنگ میں ہندوستانی ادب نے جو سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ملک کے لئے اس کی حیثیت ایک خاموش تماشائی کی نہیں رہی بلکہ وہ باقاعدہ طور پر اور پوری ہم آہنگی کے ساتھ ہندوستانی عوام کی ذہنی تربیت میں مصروف رہا ہے۔ انھیں ان کے مصائب سے آگاہ کرتا رہا ہے اور ان کے جذبہ آزادی کو تیز تر کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیبوں کا ایک گروہ ادب میں تحلیل نفسی کی رنگ لگا کر راہ فرار اختیار کر گیا لیکن ادیبوں کی بڑی تعداد نے ادب کے سچے مقاصد کو مشعل راہ بنا کر اپنے قافلے کو اصلی راہ پر چلایا۔

اب جبکہ موجودہ جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے ہندوستانی ادیبوں کے سامنے بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں، جن کا حل انھیں سوچنا ہے۔ ملکی آزادی کے حق میں اور سامراج کے خلاف جد و جہد کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں ہندوستانی ادب کو ایک زندہ اور ترقی پسند قوت بنانا ہے۔ ہندوستانی عوام کی پست حالت سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں خاک کے ذروں سے ستارے کی صورت میں ڈھالنا بھی انھیں کا کام ہے۔ غرضیکہ مستقبل میں ان کے کندھوں پر یہ اہم اور عظیم ذمہ داری ہے کہ وہ جہاں ہندوستان کو دنیا کی ایک ترقی پسند قوت بنا دیں وہاں ہندوستانی عوام کو بھی دنیا کے عوام کی سطح پر ابھار دیں۔ آج ہر ایماندار ادیب کا فرض ہے کہ وہ ماحول کے تقاضوں سے باخبر رہے۔ اور ایک ایسی دنیا کی تعمیر میں کوشاں ہو۔ جہاں انسان رنگ و نسل کے امتیاز سے آزاد ہو کر امن و مسرت سے زندگی بسر کرے۔

مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں مستقبل کے متعلق سوچتے ہوئے ہندوستانی ادیب تاریخ کی نبض اپنے ہاتھ میں رکھے گا — اور کسی ایسی طاقت کے سامنے نہیں جھکے گا جس سے دنیا کی آزادی اور امن کو ذرا سے بھی خطرے کا اندیشہ ہو۔

عبدالحمید عدم

قطعات

زندگی کی دراز پلکوں پر
راستے کا غبار چھایا ہے
آب کوثر سے آنکھ کو دھو لے
میکدہ پھر قریب آیا ہے

دیکھ افق کے حسیں دریچے سے
اک کرن مسکرا کے نکلی ہے
جام اٹھا اور ثواب اکھٹا کر
صبح تو پی پلا کے نکلی ہے

آرزو ایک زلف کا [illegible]
[illegible] ایک زخم کا پھیلاؤ
دل کی دھڑکن نہ بند ہو جائے
زیست نازک ہے ایک جام پلاؤ

کوئی مندر سے لو لگاتا ہے
کوئی مسجد میں سر جھکاتا ہے
بے سہارا جہاں میں اے ساقی
زیست کا بوجھ کون اٹھاتا ہے

جب مقام نیاز آتا ہے
ساقیٔ جاں نواز آتا ہے
دیکھ دشنام شیخ و قاضی کو
مجھ کو لطفِ نماز آتا ہے

مُرسلہ: یعقوبی رضوانی

علامہ اقبالؒ کا ایک منظوم خط

حُسنِ اتفاق سے اپنے ایک عزیز دوست کی کتابوں میں رسالہ "مخزن" بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء جلد ۲ نمبر ۳ دستیاب ہوا جس میں علامہ اقبالؒ کی یہ نظم بھی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم کے کسی مجموعۂ کلام میں یہ نظم درج نہیں۔ اور بہت ممکن ہے تلاش کرنے پر علامہ مرحوم کی اور چیزیں بھی دستیاب ہوں۔

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کامِ مئے فنا ہوں میں

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پہ مٹا ہوا ہوں میں

کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پر
وہ دلِ درد آشنا ہوں میں

تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں

گل پژمردۂ چمن ہوں مگر
رونقِ خانۂ صبا ہوں میں

کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں میں

دستِ واعظ سے آج بن کے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حمد کی حیا ہوں میں

ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق
سننے والے کو دیکھتا ہوں میں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں

میں کسی کو بُرا کہوں؟ توبہ
ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے!
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سرا ہوں میں

بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفرِ غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے پہ رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکوں کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر گزر فلک پہ مری
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

علم پلتا ہے میری گودی میں
رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں

رہبری دہر میں ہے کام مرا
رشکِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسرِ کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

تو مری ہمسری کرے توبہ
دیدۂ ہست کی ضیا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

میرے دم سے جہان بستا ہے
اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن کو دیکھتا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بیتابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی
حُسن کی بزم کا دیا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرشِ ربِ جلیل کا ہوں میں

گلشنِ طور ہے بہار مری
قطرۂ بحر آشنا ہوں میں

تو ہے وابستۂ زمان و مکاں
اور اس قید سے رہا ہوں میں

ہائے یہ دل جو میرے پہلو میں
تو یہ سمجھے کہ دہر یا ہوں میں

اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب
سب بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں

فیضِ اقبال ہے اُسی در کا
بندۂ شاہِ لافتا ہوں میں

(غیر مطبوعہ)

گڑیا

منیرہ ادیب بی اے آنرز

سکول سے واپسی پر وہ ابھی گھر سے کچھ دور ہی تھی کہ اس کا دل بے اختیار اچھلنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت اس کے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر آنکھ جھپکنے میں گھر کے اندر پہنچ جائے۔ اس دن سکول میں سارے کا سارا وقت اس نے انتہائی بے تابی کے عالم میں چھٹی کا انتظار کرتے کرتے گزار دیا تھا۔ استانی جی گزرے دن کو کیا بتا رہی ہیں یا آج نئے سبق میں اس نے کیا پڑھا ہے۔ ان باتوں میں سے وہ کسی کی طرف بھی توجہ نہ کر سکی تھی۔ اس کے ذہن پر صرف ایک ہی خیال مسلط تھا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی آرزو چٹکیاں لے رہی تھی اور وہ خیال، وہ آرزو یہ تھی کہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر حسب معمول بھائی کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو جائے۔ چنانچہ جیسے جیسے گھر قریب آ رہا تھا اس کی بے قراری بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے سینے میں ایک انوکھی ہلچل مچ رہی تھی جس میں بے چینی کم تھی اور خوشی زیادہ۔ اور ایک ہی لمحے میں کئی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے فوراً اس کے ارد گرد پھیل گئیں مسعود کا مسکراتا چہرہ، [illegible]، رنگین گیند، چینی کی بڑی سی سفید گڑیا اور نہ معلوم کیا کیا کچھ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانا چاہتی تھی بلکہ اڑنا چاہتی تھی لیکن ایک تو اس کے پیچھے ہانپتی ہوئی [illegible] آہستہ آہستہ چلنے کے لئے مسلسل چیخ رہی تھی اور دوسرے بازار میں بھاگنا اور وہ بھی بغیر کسی اہم معاملے کے اسے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا تاہم وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی اور ہر لمحہ اس تیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس وقت وہ اپنی گلی میں داخل ہوئی تو یہ معلوم کئے بغیر کہ مائی اس سے کتنی دور رہ گئی ہے۔ وہ بھاگ کر گھر کے اندر چلی گئی۔ یکایک ایک گول سی چیز ہوا میں اچھلی۔ اس کے چہرے کے قریب آئی اور دوسرے ہی لمحے میں وہ درد سے بیقرار ہو کر "سی" کر کے وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں امی کی آواز آئی۔ وہ مسعود کو اس کی شرارت پر کوس رہی تھیں۔ درد کی شدت کے باوجود اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرانے لگی۔ امی ہمدردی سے پوچھ رہی تھیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹی؟ کتنے زور سے مُردار نے گیند ماری ہے میری بچی کے منہ پر۔ دکھاؤ تو چہرہ۔ ہائے میں مر جاؤں سوج گیا ہے۔ آنکھوں سے پانی بھی بہہ رہا ہے۔ جب اسے تیری پرواہ ہی نہیں ہے تو کیوں کھیلتی ہے اس کے ساتھ ——" ماں کے لہجے میں ہمدردی کی بجائے اب غصے کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ وہ امی کو بتانا چاہتی تھی کہ اسے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مگر یہ بات کہنے کے لئے اس کے پاس صبر کہاں۔ وہ گیند کے پیچھے بھاگی اور چند ہی لمحوں میں بھائی بہن کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگی۔ رضیہ کو اپنی پیشانی کا درد بھول گیا تھا۔ کھانے کا خیال بھی بھول گیا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ کھیلنے میں اس طرح محو تھی جیسے اسے نہ تو بھوک ہے نہ کسی اور چیز کا خیال۔ دونوں بچے اچھل رہے تھے، بھاگ رہے تھے، قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ کھیل سے اکتاتے نہیں تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے قہقہے، ان کی خوشی بھری آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ امی جان بھڑک اٹھیں ——

"اے لڑکی! چھوڑ بھی یہ کھیل۔ بڑی ہو کے [illegible] تیرے لئے تو وہ خاک بھی نہیں لاتے۔ گیند لاتے ہیں اپنے لاڈلے لڑکے کے لئے۔ تجھے تو سوتیلی بیٹی سمجھتے ہیں اور تو ہے کہ —— ادھر آ —— ہاتھ دھو کر کھانا کھا ——"

رضیہ کو اب اپنی چینی کی گڑیا کا خیال آیا۔ ابا جان سے اس نے کئی بار کہا تھا کہ میرے لئے چینی کی بڑی سی گڑیا لا دیجئے اور آج تو انہوں نے پکا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ مگر گیند تو لے آئے تھے مسعود کے لئے اور اس کے لئے گڑیا نہیں لائے

تھے ــــ وہ بھائی سے لڑنا چاہتی تھی۔ جب کبھی اباجان مسعود کے لئے طرح طرح کی چیزیں خرید کر گھر میں لاتے اور اس کے لئے کچھ نہ لاتے تو وہ بھائی سے ضرور لڑتی۔ یہ لڑائی چند منٹ میں اس وقت ختم ہو جاتی۔ جب دونوں کھیل کود میں مصروف ہو جاتے۔ رضیہ کو اس بات کا خیال کبھی نہ رہتا کہ اباجی اس کے لئے کچھ بھی نہیں لاتے۔ مسعود نے گیند اس کی طرف پھینکی کہ اسے اندر لے جا کر رکھ دے۔ لیکن اس نے غصے سے گیند کو پرے پھینک دیا۔ بھائی کے ساتھ یہ اس کے انتہائی غم و غصے کی علامت تھی۔ مسعود منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ رضیہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے دماغ پر جو ہلکا سا بوجھ پڑا تھا وہ اب دور ہو گیا تھا ــــ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر امی نے اس کا چہرہ دیکھا تو مسعود پر برس پڑیں گی ــ اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ امی اس کے بھائی کو برا بھلا کہیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سامنے مکان پر پڑی۔ اس کی سہیلی اپنی گڑیا کو نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنا رہی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس وقت گڑیا نہ ملنے کا اسے بڑا افسوس ہوا۔ اگر اباجی میرے لئے گڑیا لے آتے تو کیا اچھا ہوتا۔ میں اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتی۔ خوب سجاتی، دلہن بناتی اور کسی گڈے کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیتی۔ اور اسے کئی گڑیوں کے بیاہ یاد آ گئے۔ وہ ہر ایک بیاہ میں نقص ڈھونڈنے لگی۔ ایک سہیلی کنجوس تھی۔ اس نے اپنی گڑیا کو اچھے کپڑے نہیں پہنائے تھے۔ دوسری سہیلی نے باجوں کا اچھا انتظام نہیں کیا تھا ــــ اور ایک اور سہیلی نے تو مہمانوں کی خاطر مدارات ہی نہیں کی تھی وہ سوچنے لگی آخر اباجان اس کے لئے گڑیا کیوں نہیں لاتے اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ مسعود سے روٹھ جائے گی اسے کئی گزری ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ پرسوں اس نے اپنی سہیلیوں کو گھر پر بلایا تھا۔ بار بار کہنے کے باوجود اباجی پیسٹری نہیں لائے تھے۔ وہ کتنی شرمندہ ہوئی تھی۔ اس وقت ــــ اور جب مسعود کے دوست آئے تھے تو پیسٹری کے علاوہ پھل بھی آیا تھا ــــ نہیں اباجی کو میری پرواہی نہیں ہے۔ میں اب ان سے کچھ بھی نہیں مانگوں گی کبھی نہیں کہوں گی۔ بچی کا باپ اور خیال اس کے ذہن میں جاگ اٹھا۔ امی جان کی آنکھیں سوجی ہوئی کیوں تھیں وہ سمجھ گئی کہ اباجی امی پر ناراض ہیں وہ اکثر ناراض رہتے ہیں معلوم نہیں، نہیں کیا ہو گیا ہے ــــ امی جان ماموں کے یہاں جانا چاہتی ہیں کیونکہ وہ بیمار ہیں تو اباجان کیوں روک رہے ہیں ــــ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھی۔ اور یہ دیکھنے کے لئے اپنے کمرے سے نکل آئی کہ امی جان کیا کر رہی ہیں وہ اپنے کمرے میں نہیں تھیں وہ کمرے سے نکل آئی۔ اچانک اباجی کی گرجتی ہوئی آواز گونجی۔ اس کی رفتار خود بخود مدھم پڑ گئی۔ وہ اباجی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اب امی کی آواز آئی ــــ "میں نہیں جاتی ــ نہیں جاتی! ہم عورتیں تو گڑیا ہیں۔ بے جان گڑیا جن کے سینے میں کوئی دل نہیں ہے۔ کوئی آرزو نہیں ہے ــــ بے جان پتلے۔ گڑیا بس گڑیا ــــ" امی کی آواز میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے رخسار گیلے ہو گئے ہیں۔ امی کمرے سے چلی گئیں تو اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ اباجی اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس کی سہیلی کی گڑیا اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ وہ کمرے میں گئی۔ اباجی اسے دیکھ کر بولے "کیا ہے؟" اس نے واپس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ٹھہر گئی ــــ "اباجی ــــ وہ ــــ وہ میری گڑیا اباجی جیسی کی بڑی سی خوبصورت ــــ آپ نے وعدہ کیا تھا" ایک ہی فقرے میں اس نے سب کچھ کہہ دیا۔ سرخ آنکھیں شعلہ ناک ہو گئیں ــــ "جاؤ اس وقت دفع ہو جاؤ ــــ" خاموشی کے ساتھ اس نے سر جھکا لیا۔ اب اس میں باپ کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ ایک مختصر سے ہنگامے کے بعد گہری، نمناک، بوجھل خاموشی چھا گئی۔ رضیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ جس چیز کو اٹھائے پھر رہی تھی وہ چیز چھٹ کر فرش پر گر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈرتی تھی، پیچھے جانا بھی نہیں چاہتی تھی ــــ اباجی نے اپنی نگاہیں اخبار کے ورق پر جما

دی تھیں ——— وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور بغیر کچھ سوچے بغیر کسی مقصد کے الماری کی کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔ ——— دونوں کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ اور پھر اسی وقت انہیں بند بھی کر دیا۔ میز پر سے میز پوش ہٹا دیا اور کلاک کو یونہی گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اب تک اسے درد محسوس نہیں ہوا تھا مگر اب اسے اپنا چہرہ دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ پیشانی سوج گئی تھی۔ "کتنے زور سے ماری ہے گیند مسعود نے اگر میری آنکھیں نکل جاتیں تو ——— میں اندھی ہو جاتی تو ——— کتنا برا ہے میرا بھائی ——— سب لڑکیوں کے بھائی بڑے بھائی ہی ہوتے ہیں ——— تنگ کرتے ہیں ——— بیچاریوں کو ———" وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی ——— اس کے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ ابا سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ امی سے کچھ کہنا چاہتی تھی ——— اور بھائی سے لڑنا چاہتی تھی ——— مگر کیوں ——— یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا ——— وہ ایک مبہم ہیجان تھا۔ ایک ناقابل فہم اضطراب تھا ایک عجیب قسم کی بے چینی تھی۔ سامنے چارپائی پر اس کا نیا بوٹ پڑا تھا۔ بوٹ اس نے بڑے شوق سے خریدا تھا ——— مگر اب وہ حقیر سا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی کتابیں حقیر معلوم ہو رہی تھیں۔ کمرے میں اپنی ہر ایک چیز حقیر معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک کسی کے ہاتھ اس کی آنکھوں کو چھو گئے۔ اس کے دل میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ مسعود کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ مسعود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بھلا بوجھو تو میں نے پیٹھ کے پیچھے کیا چیز چھپا رکھی ہے ———" بھائی نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارت کا ایک نیا ارادہ جھانک رہا تھا۔

"میں کیا جانوں ———" اس نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا۔

"دیکھو گی تو اچھل پڑو گی ——— پہلے یہ بتاؤ انعام کیا دو گی ———؟"

اس نے بھائی کی طرف دیکھا۔ مسکراتا ہوا شریر چہرہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا ——— آگے بڑھ کر پھر پیچھے ہٹنے لگا۔

"میں کیا جانوں ———" وہ جل کر بولی۔

"لو ——— میں نے جتنے پیسے جمع کئے تھے ان کی خرید کر لایا ہوں ——— یہ گڑیا چینی کی ——— اب تو خوش ہو نا ——— کتنی خوبصورت ہے۔"

اور واقعی چینی کی وہ گڑیا بہت خوبصورت تھی ——— اتنی خوبصورت گڑیا اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی ——— مسعود نے گڑیا کو ہوا میں اچھالا اور پھر اسے پکڑ کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ رضیہ کی باچھیں کھل گئیں ——— مسعود کو توقع تھی کہ وہ ابھی معمول کے مطابق اس کے پیچھے بھاگے گی۔ اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہیں گے ——— ہر روز یہی کچھ ہوتا تھا کبھی مسعود بہن کو پکڑنے کے لئے اپنی پوری رفتار سے بھاگتا تھا اور کبھی رضیہ بھائی سے آگے نکل جانے کے لئے انتہائی کوشش کرتی تھی! رضیہ کا دل بے تاب ہو گیا۔ "کتنا اچھا ہے میرا بھائی" ——— اسے پچھلے تمام شکوے بھول گئے اور وہ بھائی کے پیچھے بھاگنے لگی ——— دونوں بچوں کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ دوسرے کمرے سے صحن میں۔ یہ گردش جاری تھی۔ یکایک اباجی کی غصے سے بھری ہوئی آواز گونجی ——— "او رضو کی بچی! کیا طوفان اٹھا رکھا ہے تو نے ——— مردار ——— شرم نہیں آتی تجھے!"

رضیہ کے قدم وہیں رک گئے۔ اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی۔ مسعود اسے گھر سے باہر چلنے کا اشارہ کر رہا تھا مگر وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی جیسے ٹانگیں حرکت کرنے سے جواب دے چکی ہیں جیسے وہ بولنے کی طاقت سے محروم ہو چکی ہے ——— جیسے اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔

سامنے کمرے سے امی باہر آئیں ——— اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہیں وہ دوڑ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی ——— ماں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی ——— "کیا ہوا میری بچی! میری گڑیا!"

لوح ناروی

بڑی بات

یاس و حسرت میں ہے یہ بات بڑی
حشر کے دن سے غم کی رات بڑی

عشق کا ایک ایک کام بڑا
حسن کی ایک ایک بات بڑی

دل اڑا لے گئے ملا کر دل،
کر گئے آپ مجھ سے گھات بڑی

کیا خبر صبح تک مرا کہ جیا
تھی اذیت کسی کو رات بڑی

بوالہوس اور عشق کا دعویٰ
منہ ہے چھوٹا مگر ہے بات بڑی

تھر ڈھالنے میں آپ کی محفل
ہے قیامت سے چار ہاتھ بڑی

زحمت ہجر یار نا محدود
رات سے دن ہے دن کی رات بڑی

قیس و فرہاد کا فسانۂ عشق
درحقیقت بڑوں کی بات بڑی

وہ کئی روز تک یہاں سے نہ جائیں
کم سے کم اس قدر ہو رات بڑی

آپ سچ کہہ رہے ہیں بندہ نواز
نہ بڑا میں نہ میری بات بڑی

دل کے لینے سے ہے تجھے انکار
یہ بھی ہے اک طرح کی گھات بڑی

کیوں نہ طوفان عشق نوح اٹھائیں
وہ بڑے اور ان کی بات بڑی

رضا علی خاں وحشت

چراغ آرزو

مجھے یوں شکل آسانی نظر آتی ہے مشکل میں
کہ اس کو یاد آ جاؤں گا جس کی یاد ہے دل میں

وہ دل ہی اب نہیں جس کو ہو لطفِ راحتِ منزل
کچھ ایسی سختیاں میں جھیل کر پہنچا ہوں منزل میں

پسِ جورِ تغافل یہ عنایت کی نظر کیسی
ابھی تک تم کو کچھ شک ہے مری بربادیِ دل میں؟

کہا تو ہے کچھ اپنا حال میں نے آپ سے لیکن
وہی سننے کے قابل تھا جو حصہ رہ گیا دل میں

حریفِ قعرِ دریا ہے بلندی میری ہمت کی
نہیں میرے لئے کوئی کشش آغوشِ ساحل میں

ڈبویا ہے مجھے امید ہی کی سادہ لوحی نے
وہی حسرت بنا ہے پہلے جو ارمان تھا دل میں

بس اک شکل تقاضائے جنوں ہے جستجو میری
مجھے شوقِ سفر کیا چین لینے دیگا منزل میں

ہوا سب فوت اپنی منزلِ مقصود کا مقصد
طلب کی لذتیں جاتی رہیں جب فکرِ منزل میں

ضرورت روشنی کی تھی وہ حاصل ہے مجھے وحشت
کہ اک مدت سے جلتا ہے چراغِ آرزو دل میں

ڈاکٹر اختر حسین رائپوری
ڈی۔ لٹ (پیرس)

سویرا

اُردو میں مختصر افسانہ ادب ... میں فروغ حاصل ہوا جب سماج کی پرانی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں اور ... کسی نئے نظام کا اسلوب متعین ہوا تھا۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے ... جنگ منشی پریم چند نے اس صنفِ ادب کا ... شروع کیا۔ اُس جنگ اور اس جنگ کے بیچ کا زمانہ کس قدر پُر آشوب تھا۔ ہر طرف انقلاب و انتشار، ہیجان و ہنگامہ کی گونج گرج۔ جب ماحول کی یہ کیفیت ہو تو کیسے ممکن تھا کہ افسانہ نویس کی طبیعت میں سکون و قرار ہو۔ یوں بھی ہماری ... کی عمر تھوڑی سی۔ روایات خام۔ طرفہ یہ کہ ناشروں نے ادیبوں کی بجائے ناظروں کا منہ تاکا اور ان کی بدمذاقی کو بڑھایا اور ادیب غریب سے یہ توقع کی وہ ہوا کھا کر زندہ رہے کیونکہ خدا یا ... کے سوا ... کر اور معاملات ... تھی۔ شاعروں کے لئے پھر بھی آسانی تھی کہ مشاعروں نے ان کی گزر بسر کا تھوڑا بہت انتظام کر دیا تھا۔ لیکن افسانہ نگار کیا کرتا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ بھی پنواڑی کی دکان پر بیٹھ کر افسانہ گوئی شروع کر دیتا۔ لیکن یہ فن بھی ایک دوسرے فن کی طرح "دریاؤ" سے کم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار روٹی کے لئے کچھ اور کرے اور فرصت کے وقت کچھ اور کر لیا کرے۔ ان ساری دشواریوں کے باوجود اس قلیل مدت میں افسانہ نگاری نے ہماری زبان میں جو ترقی کی وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ اگر اس میں خامیاں ہیں تو وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ماحول کا تلون اور وقت کی تنگی احساس و تجربہ میں وہ گہرائی پیدا نہیں ہونے دیتی جس کے بغیر عظمت و وسعت ناممکن ہے۔

اس زمانہ میں اور اس ماحول میں افسانہ نگاروں کی پرورش ہو رہی ہے اور ان میں سے اکثر کی عمر اتنی ہی مختصر ہے جتنی اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کی عمر۔ ان میں تخلیقی جوہر کی کمی نہیں لیکن اچھے سے اچھا بیج بھی ہوا، روشنی اور پانی کا محتاج ہوتا ہے۔

ذہنی اعتبار سے یہ مارکس اور فرائڈ کا دور ہے۔ خارجی دنیا کا جس قدر واضح تجزیہ مارکس نے کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ نفسِ انسانی کے تجزیہ میں فرائڈ نے بڑا کمال دکھایا گو ہماری نظر میں اس کا نظریہ نفس کی تمام گتھیوں کو نہیں سلجھاتا۔ زندگی ایسی سیدھی سادی نہیں کہ اسے کسی فارمولا کی بوتل میں اتارا جا سکے۔ اس پس منظر میں اپنی افسانہ نگاری کا مطالعہ ہونا چاہئے۔

انہی نوجوان افسانہ نگاروں میں ایک ظہور الحسن ڈار ہیں۔ وہ ان خوش نصیبوں میں نہیں جن کی سرپرستی کے لئے رسائل و جرائد حصول منجیرہ لئے تیار ہوں۔ جن کے ہر لفظ پر ہر طرف سے مرحبا و احسنت کا شور اٹھے۔ خدا رکھے ادب کے میدان میں ابھی اناڑی ہیں لیکن اس کی دشواریوں سے واقف۔ اور اگر ہمارے کارواں میں وہ بھی شریک ہیں تو قصور صرف اُس روحانی بے قراری کا ہے جو انہیں کچھ کرنے اور کچھ کہنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

ان کا فن ابھی پہلی منزل پر ہے۔ ان کے افسانوں میں بھاؤ نہیں۔ ان کے کرداروں میں شخصیت نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جن لوگوں کو دیکھا۔ اور حق یہ ہے کہ غور سے دیکھا۔ ان کی زندگی بے رنگ ہے اور وہ سب زندہ درگور ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کیوں پیدا ہوئے اور کیوں زندہ ہیں۔ ان کے لئے زندگی اور موت محض اتفاق ہے۔ حسنِ اتفاق بھی نہیں! افسانہ نگار انہیں غم و غصہ سے دیکھتا ہے۔ دل کی تلخی قلم میں جھلک آتی ہے۔ وہ انہیں جھنجھوڑتا ہے لیکن وہ بیدار نہیں ہوتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس طرح جگائے۔ لیکن یہ کتنا امید افزا ہے اور وہ اس راہ پر چلنے کے نئے منصوبے باندھنے لگتا ہے۔

یہاں افسانہ نگار ہمیں چھوڑ جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہی صراطِ مستقیم ہے اور یہ جاندار زندگی کے نقشہ میں جُتتے ہوئے ہیں۔ وہ بہ سویرا اسی طرف روانہ ہوں گے۔

اس کے قلم میں روانی ہے اور اگر کہیں خیال کا کوئی موڑ اسے روکتا ہے تو نیت کا خلوص اس مشکل کو آسان

...رہا ہے۔

ظہور الحسن ڈار کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے فن پر ثابت رہیں اور اس اصول پر عمل کریں کہ نقاد وہ چور ہے جو ... پر کان لگائے فن کار کی سرگوشیوں کو سن رہا ہے۔ ... کی ان سنی پر دھیان نہ دیں۔ ناظر کی داد کی تمنا کریں ... پسندوں کی لعن طعن کی پروا کریں۔ سچے فن کار کا ... بے نیازی کے سوا کچھ نہیں لیکن یہ ضرور یاد رکھیں کہ مظلوم انسانیت ہمارے غم و غصہ کی نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق ہے۔

مستقبل نہیں جاد ... رہے گا۔ شہرت بھی نہیں ہمیشہ دامن ... لیکن وہ یقیناً ... تاریکی میں مشعل جلا کر زندگی کے مقصد کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہیں ... کو ... جاتے ہیں۔

مہر عثمانی

تجلیات

کرم بھی ہو ہمہ رنگ ستم اے مہرباں کیوں ہو
جو شایانِ لقب ہو وہ خرابِ امتحاں کیوں ہو

لطافت التفاتِ رنگ و بو کی رائگاں کیوں ہو
ہوئے تم - بارہ گر جس کے وہ بے یادِ جہاں کیوں ہو

کسی کی یاد جب آتی ہے دل گھبرا ہی جاتا ہے
لگے جب چوٹ دل پر کوششِ ضبطِ فغاں کیوں ہو

میں اپنے جذبِ دل کو رہبرِ منزل سمجھتا ہوں
مرا ذوقِ طلب منت گزارِ کارواں کیوں ہو

مجھے منظور اب جو کچھ مرے دل پہ گزر جائے
وہ چشمِ ناز حسنِ حال پر شبنم فشاں کیوں ہو

جہاں کا ہر حسیں منظر پیامِ کیف دیتا ہے
مری بادہ کشی وقفِ شرابِ ارغواں کیوں ہو

کہاں کی کامیابی اور کیسا دردِ ناکامی
محبت ہے تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کیوں ہو

"خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید"
مری روداد غم حسنِ سماعت پر گراں کیوں ہو

میں جس ذرے کو چاہوں قابلِ سجدہ بنا ڈالوں
مری آزاد فطرت کے لیے قیدِ مکاں کیوں ہو

ادھر آ تیلیوں میں اے مہ خوبی تجھے رکھ لوں
لطافت تیرے جلووں کی جہاں میں رائگاں کیوں ہو

کچھ اہلِ درد ہی کو درد کا احساس ہوتا ہے
جو خود تڑپا نہ ہو وہ واقفِ دردِ نہاں کیوں ہو

شفق میں، ماہ پاروں میں، گلوں میں ہو کے پوشیدہ
مری جلوہ طلب نظروں سے تم دامن کشاں کیوں ہو

میں جذبِ شوق کو اے مہر اپنے روک لیتا ہوں
مری خودداریٔ ضبطِ محبت رائگاں کیوں ہو

ایوب سرور

ایک ڈائری

...تی آنے کے بعد میں پہلی مرتبہ جوہائی کے ساحل پر تفریح کی غرض سے چلا اب جوہائی سے مشرق کی سمت دور تک کشادہ اور فراخ ریت پھیلی ہوئی ہے جس پر شام کے وقت شہر کی تمام رنگینیاں بکھری ہوئی سی اڑتے ہوئے نظر آتا۔ آنچل ... آفتاب کی طرح دوڑتے ہوئے ننھے ننھے اور ننھی ننھی ... کا ترنم بے اختیار ہی چاہتا ہے کہ یہ ہنگامہ رنگ و بو کبھی ختم نہ ہو۔

ساحل کے ساتھ ساتھ کمر کی اونچائی تک دیوار بنی ہوئی ہے ... کا کام دیتی ہے میں اس پر بیٹھ گیا۔ لڑکیاں اٹھکھیلیاں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ خرم و مسرور جوڑے ہنستے بولتے جا رہے تھے ... معاشرت کی ... محبتوں کا ردعمل نوجوان کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے نمایاں تھا۔ چمکتی ہوئی ملتہب آنکھیں ——— جن میں نا آسودہ جنسی آرزوؤں کے انگارے بھرے ہوئے تھے۔

میں ساحل کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر منظر کے پیچھے ہوتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ دونوں جانب ساحل کے دو بازو دور تک سمندر کو آغوش میں لینے کے لئے بڑھے ہوئے تھے ... ایک مست شباب حسینہ کی طرح سمندر اس کے آغوش میں مچل رہا تھا۔

افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ ڈوبتا ہوا سورج ... اور تابانی کھونے کے سبب زرد رنگ کا ایک بڑا سا گولا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر صبح وہ نہیں معلوم کیا کیا امنگیں اور آرزوئیں پہلو میں دبائے اُبھرتا ہے دن بھر اس کی تپش اور چمک کمال پر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کا جوش و خروش ہر آن بڑھتا جاتا ہے۔ مگر ہر شام اُفق کا سرد مہر دیوتا اسے نگل لیتا ہے۔ اس کا غیظ و غضب اس کی شعلہ افگنی بیکار ہے اُس بھیانک اور طاقتور دیو کے سامنے۔ اُسے دیکھتے ہی اس کا جوش و خروش مدھم پڑ جاتا ہے۔ اس کی بے پناہ طاقت کے سامنے اس کی بغاوت ہیچ ہے۔ بالکل ہیچ۔

سورج غروب ہو گیا رات کی دیوی نے اپنی سیاہ زلفیں عالم کے مدہوش شانوں پر پھیلا دیں۔ اُفق پہ سرخ رنگ کے دھبے اب تک چمک رہے تھے۔ نہیں معلوم یہ سورج کے خون کے شرارے تھے یا پھر اُفق کے غیظ و غضب کی علامتیں؟

سمندر کی موجیں پیہم ساحل سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ ایک موج آ کر ٹوٹتی تو دوسری ... دور سے سر بلند کرتی۔ ایک کے بعد ایک موجیں سر پٹک رہی تھیں۔ مگر ساحل ٹس سے مس نہ ہو رہا تھا۔ یہ غیظ و غضب کیوں مدغم پڑ جاتا ہے؟ یہ اضطراب و بے چینی کیوں کوئی ... نہیں کھاتی؟ ... اور طاقت کیوں کامیاب رہتی ہے؟ ... کیوں کا جواب ... دے سکتا ہے۔ یہ کائنات کیوں بنی آخر؟ ہماری تخلیق کی غایت کیا ہے؟ نوع انسان ... فرقے گروہوں میں کیوں بٹ کر رہ گئی؟ سرمایہ دار کیوں چین کی بنسی بجا رہا ہے؟ غریب پر کیوں ستم توڑے جا رہے ہیں؟ اور خدا اگر کہیں ہے۔ تو کیوں نہیں دیکھتا؟ کیوں نہیں سنتا؟ آہ کیوں ...... کیوں ...... کیوں ......

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید سوچتے سوچتے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ رات کی تاریکیاں پھیل چکی تھیں میں واپس جانے کے لئے اٹھا۔ اندھیرے میں دور دور تک ہزاروں برقی قمقمے جھلملا رہے تھے اور مجھے خیال آیا کہ اگر یہ بھڑکتی ہوئی چنگاریاں اکٹھی کر دی جائیں تو ...... تو یہ ظلمتِ شب کافور ہو جائے اور ہر جا نور و ضیا کی حکمرانی ہو۔ مگر کیا کبھی ایسا ہو سکے گا؟

. . . .

اپریل کی ... رات تھی۔ میرا کمرہ تنور کی طرح تپا ہوا تھا۔ گرمی سے گھبرا کر میں اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں نکل آیا یہاں قدرے خنکی تھی۔ طبیعت کو فرحت محسوس ہوئی۔ برآمدے کے جنگلے پر دونوں کہنیاں ٹیک کر میں قدرے خمیدہ ہو کر کھڑا ہو گیا ... آسمان کو دیکھنے لگا۔

وسیع و عریض ... رہیں چاند تیر رہا تھا۔ گرد آلود سی چاندنی میں دور تک بلند عمارتوں کا ناہموار سلسلہ نظر آ رہا تھا اور مجھے یاد آیا کہ ... پہلے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ جہاں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں ... جھونپڑیوں کی اونچان یا وسعت تقریباً

مساوی ہوا کرتی تھی۔ اور ان جھونپڑیوں کے رہنے والے بھی تقریباً ہر لحاظ سے یکساں ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ مطمئن اور آسودہ حال تھے ان کی خوشیاں اور رنج و غم مشترک ہوا کرتے تھے۔

اور اب یہ ناہموار اونچا نیچا سلسلہ ہماری زندگی کی بے ترتیبی کو نمایاں کر رہا ہے جس میں نام کو یکسانی یا ہم آہنگی نہیں۔ جس کا کوئی نظام نہیں۔ ہر ایک اپنی رو میں بہہ رہا ہے۔ ایک خوفناک انفرادیت نے ہم سب کو محیط کر لیا ہے۔ ایثار یا قربانی کا شائبہ تک نہیں۔ خود غرضی نے دل و دماغ کو مسموم کر دیا ہے۔ کیا یہ نفسا نفسی ہنگامۂ قیامت سے کم ہولناک ہے؟

اگر ایک طبقہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے کوئی مکر و فریب اُٹھا نہیں رکھتا تو دوسرا اقتدار قائم کرنے کے لئے بے چین ہو رہا ہے۔ اس عالمگیر کشمکش میں بھی خود غرضی کارفرما ہے۔ اعتدال کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی ہے۔ یہ ناہمواری و بے ترتیبی ہماری اجتماعی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ اور اس کے ردِعمل کی رفتار جتنی آہستہ ہے۔ اتنی ہی بھیانک بھی ہے۔

اُسی ٹیلے نما مکان کے برآمدے میں جو کسی کھنڈر سے مشابہ ہے۔ میں دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ یہ بدنظمی نسلِ آدم کی غلطیوں کا نتیجہ ہے یا قدرت کی ستم ظریفی۔ مگر میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

کھڑے کھڑے بے اختیار میرا جی چاہنے لگا کہ کاش میرے ہاتھوں میں اتنی قوت آ جائے کہ ان سربلند مکانوں کو دبا کر نچلے مکانوں سے ان کی سطح ہموار کر سکوں۔ اور پھر میں خود بخود مسکرایا اس خیال سے کہ شاید میں بھی "انقلابی" بنتا جا رہا ہوں۔

بھوں بھوں کرتا ہوا ایک موٹر نیچے سے گزر گیا۔ گلی سے دو ایک کتوں نے لپک کر اس کا استقبال کیا۔ اس شور و شغب نے مجھے پھر اپنے ماحول سے آگاہ کر دیا۔ رات اُسی طرح گرم تھی۔ اور برآمدے کی خنکی حد درجہ دلآویز۔ مگر نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ بے دلی سے مڑ کر میں پھر اپنے کمرے میں گھسا۔ اور دھڑ سے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔

. . . .

میں تنہا ہوں۔ اس گنجان آبادی کے شہر میں بالکل تنہا۔ یہ تنہائی کا احساس مجھے مارے ڈالتا ہے۔ زندگی ایک خلا کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ بھیانک اور اُداس۔ کوئی مونس نہیں کوئی دمساز نہیں۔ اُف کتنی پُرہول زندگی ہے۔

سڑک پر چلتے ہوئے جب میرے دائیں بائیں آگے پیچھے انسانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ انسانوں کے اس انبوہ کے اندر — صرف میں ہی نہیں۔ ان میں کا ہر فرد تنہا ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو دوسرے کے درد و دکھ کو سُنے یا اس کے مصائب پر ترس کھائے۔ ان کا آپس میں ہنسنا بولنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔

اس تنہائی سے ہر ایک دل برداشتہ ہے۔ دل بیزار اور نا آسودہ روح کے لئے یہ بے اطمینانی انتہائی بے حد اذیت کا موجب ہے مگر ہم مجبور ہیں کہ ان ہی روح فرسا حالات میں رہیں۔ ہمارا ماحول ہی ایسا ہے کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتا۔ جہدِ للبقا کی دشواریاں اتنی سخت اور جانگداز ہو گئی ہیں۔ کہ انسانیت اس کے ہاتھوں نالاں ہے۔

قوت کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح بے بس زندگی کے اس خاردار راستہ پر ہم گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا اقتصادی نظام ایسے بے درد ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ جو ہماری رگِ حیات سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے بچاؤ میں منہمک ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رحم اور ہمدردی کا جذبہ ہم میں مفقود ہو چکا ہے۔

یہ صورتِ حال نسلِ آدم کے لئے انتہائی تباہ کن ہے۔ یہ احساسِ تنہائی ایک مہیب تخریبی شیطان ہے۔ دل و دماغ کی سمّیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ کشمکش کہاں جا کر ختم ہو گی ———؟

. . . .

رات کے دو بج چکے تھے۔ جب میں اپنے گھر کے قریب پہنچا۔ گلی کی نکڑ پر مڑتے ہی میں نے دیکھا موسم گرما کے زرد اور اُداس چاند کی روشنی میں فٹ پاتھ پر سونے والوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی پلنگ بچھائے ہوئے تھا۔ کوئی زمین پر لیٹ لگائے اور کوئی ان سب سے بے نیاز دھرتی ماتا کی سخت چھاتی پر غافل پڑا تھا۔

میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ خانہ بدوش انسان جو زندگی کی حقیقی لذتوں سے کبھی آشنا نہیں ہوئے یہ انسانیت کے جسم پر رستے ہوئے ناسور ہیں۔ یہ لوگ حیاتِ انسانی کی اصل حقیقت سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ یہ صرف [illegible]

جیسے پبلک کر خرید نا جانتے ہیں۔ اور کم سے کم دام میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا ان کا مدعائے حیات ہے۔ ایثار یا قربانی کی لذت انہوں نے کبھی نہیں چکھی۔ بیٹا، شوہر یا باپ بن کر فرائض کی ادائیگی یہ جانتے ہی نہیں۔ یہ تو ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں جس کا آغاز بھی ہولناک ہے۔ اور انجام بھی ہولناک۔

سماجی سختیوں نے ان پہ ہر ایک دروازہ بند کر دیا ہے۔ ذلت اور بدبختی نے انہیں چاروں جانب سے گھیر لیا ہے۔ احساس کی دولت سے محرومی ان کے محدود جذبات پہ بدبختی کی مُہر ثبت کر چکی ہے۔ یہ سڑک پہ پیدا ہوتے ہیں۔ سڑکوں ہی پر پروان چڑھتے ہیں اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ ان کی نام لیوا وہی نسل رہ جاتی ہے۔ جو ذہنی یا جسمانی اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ پست اور جذبات کی غلام ہوتی ہے۔ اور اس طرح یہ گھناؤنا ناسور بڑھتا ہی جاتا ہے۔

ان کے وجود کی ہیئت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہماری سماج کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ زندگی کے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچنے کی کوشش کرتی ہوئی ان مظلوم ہستیوں کی امداد کے لئے کوئی آمادہ نہیں۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں۔ کہ ان کی لاشیں سڑ کر پانی میں عفونت پیدا کر دیں گی۔

. . . .

کل پھرتے پھراتے میں ایک تنگ سے بازار میں جا نکلا۔ یہ بازار اور بازاروں سے بہت مختلف تھا۔ دو طرفہ دکانوں میں سلاخوں والے دریچے لگے ہوئے۔ اور ہر دریچے کے پیچھے عورتیں بیٹھی ہوئیں سوکھی کالی پیلی عورتیں اُن کے چہروں پہ خباثت برس رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو دعوت دیتی معلوم ہوتی تھیں۔ دروازوں کے باہر آدمیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے حریص کتوں کی طرح انہیں گھور رہے تھے۔ اس مکروہ فضا میں مجھے اپنے سینے میں دم گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ مڑ کر میں ایک چلتی ہوئی ٹرام پہ چڑھ گیا۔ اور سیدھا گھر آ کر دم لیا۔

رہ رہ کر بازار کا وہ مکروہ منظر میری نظروں میں پھر جاتا۔ اور نفرت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ بدی نے دنیا کو کیوں کر محیط کر لیا ہے؟ یہی میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے وہی کالے پیلے سوکھے ہوئے چہرے آ جاتے۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ اس تصور سے میں پریشان ہو چکا تھا۔ مگر اب تو ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ آوازیں میرے کانوں کو نیچے لگیں۔ کوئی محزون کوئی غضبناک۔ یہ شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ہمیں روٹی دو۔ ہمیں بھوک لگ رہی ہے"

"بھرے پیٹ تم بھوکوں کے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے"

"تمہیں کیا حق ہے کہ بھوکوں کے سامنے اخلاق و مذہب لے کر آؤ"

"بھوک سب کچھ کرا سکتی ہے"

آوازیں بڑھتے بڑھتے اتنی زیادہ ہو گئیں کہ اب سوائے بھوک بھوک۔ روٹی روٹی کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور بڑی دیر کے بعد جب ذرا سکون ہوا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خدا، اخلاق اور مذہب اس شور و غوغا میں کھو کر رہ گئے۔ اس خاموشی میں درد کی کراہوں اور ہچکیوں کے درمیان ایک کمزور آواز بھٹکتی سنائی دی۔

"ہم مظلوم ہیں۔ ہم سے نفرت نہ کرو۔ ہم رحم کے قابل ہیں"

ہاں سچ ہے۔ مجھے خیال آیا۔ یہ مظلوم ہستیاں رحم کے قابل ہیں زمانے کے بے درد ہاتھوں نے انہیں قعرِ مذلت میں دھکیل دیا ہے۔ اور مجھے ان آدمیوں کا خیال آیا۔ جو حریص کتوں کی طرح عورتوں کے آس پاس منڈلاتے پھرتے تھے۔ اس بے غیرت ملک میں جہاں شدید مالی مشکلات نے انہیں خانہ بدوش بنا رکھا ہے۔ اگر وہ اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ تو یہ ان کا قصور نہیں۔

اور پھر میں خود بخود بڑے زور سے ہنسا۔ کیونکہ جب ہر ایک بے قصور ٹھہرا۔ تو پھر مورد الزام کسے قرار دیا جائے؟

. . . .

میں اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑا ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ سڑک پہ لوگ آ جا رہے تھے۔ کچھ اُدھر سے اِدھر آتے ہوئے کچھ اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے۔ انسانوں کا ایک انبوہ کثیر۔ نہیں معلوم یہ دو ٹانگی کیوں اتنی بڑھ گئی ہے؟ کیوں اتنی بڑھتی جا رہی ہے؟ ٹرامیں، موٹریں، بسیں، وکٹوریہ گاڑیاں دوڑتی ہوئیں۔ کوئی خاص سمت متعین کئے بغیر۔ کسی ایک جگہ کو منزل مقصود ٹھہرائے بغیر۔ کبھی مشرق سے مغرب کبھی مغرب سے مشرق۔ بلا مقصد بلا ارادہ۔ چلانے والوں کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ——!

اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہماری ساری زندگی بھی یونہی بے مقصد گذر جاتی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم کیوں پیدا کئے جاتے ہیں؟ کیوں جئے جاتے ہیں؟ بے کار، بالکل بے کار ——— !

کیا اس زندگی میں کبھی آہنگ نہ پیدا ہوگا؟ کیا یہ نظام حیات فطرت کے محور پر کبھی گردش نہ کرے گا؟ شاید کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ اس بے ڈول اور بے محور زندگی سے میں اکتا گیا ہوں۔

جیسے لامحدود سمندر کے تھپیڑوں پر کوئی تنکا بہا جا رہا ہو۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کیوں کر اس طوفان بلا میں آ پھنسا؟ اور کہاں جا کر یہ مہیب اور بے پایاں سفر ختم ہوگا؟

مجھے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اس بے مقصد اور بے ارادہ زندگی سے جس کے بے رحم ہاتھوں میں ہم کھلونوں کی طرح حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار توڑ پھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اُف فطرت کی کتنی ہولناک ستم ظریفی ہے۔

میں برآمدے کے جنگلے پر جھک کر بیٹھ گیا۔ اور بازار سے نظریں ہٹا لیں۔ ٹراموں اور موٹروں کی گھڑگھڑاہٹ یا لوگوں کی بے معنی چیخ پکار کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں اور میرا جی چاہا کہ اس دنیا کو ملیا میٹ کر دوں۔ یہاں کی ایک ایک شے کو مٹا دوں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کی تخلیق کی غایت کیا ہے؟

اور میں نے ارادہ کیا کہ اب اس کتاب میں اور کچھ نہ لکھوں گا۔ بھلا اس بے ہودہ اور مہمل زندگی کی تصویریں کھینچنے سے فائدہ؟

اختر نگینوی

شمع

آپ کی محفل میں ٹھنڈے دل سے کب آتی ہے شمع / رشک سے جلتی ہے جل کر خاک ہو جاتی ہے شمع
شعلۂ جانسوز سے اک آگ برساتی ہے شمع / خود بھڑکتی ہے، لگی اس دل کی بھڑکاتی ہے شمع
جذبۂ دل ہو تو کیا ہے جاں نثاروں کی کمی / ڈھیر پروانوں کی لاشوں کے پٹے پاتی ہے شمع
دیکھتی رہتی ہے، جل مرتے ہیں کیونکر اہل عشق / مانتا ہوں، کیا ترا دل کیا تری چھاتی ہے شمع
درحقیقت گریۂ شبنم برائے نام ہے / اشک حسرت رات بھر رہ رہ کے برساتی ہے شمع
خود جلے وہ، تھے جو اوروں کو جلانے کے لئے / پہلے اپنی آگ میں کیا آپ جل جاتی ہے شمع
داغہائے دل نے چمکایا ہے یوں سینہ مرا / ہر طرف جیسے ضیا محفل میں پھیلاتی ہے شمع
خون پروانہ کا کس منہ سے کوئی الزام دے / پانی پانی آپ اپنے دل میں ہو جاتی ہے شمع

ہم ہیں اختر کیا ہمارے سامنے اس کا فروغ
اک ذرا سی روشنی پر کیسی اتراتی ہے شمع

اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

پردہ!

ازل کی ابتدا پردہ ابد کی انتہا پردہ
ہے رازِ زندگیٔ جاوداں سے آشنا پردہ

چراغِ قدس کے انوار پوشیدہ ہیں پردے میں
حقیقت کے ہزار اسرار پوشیدہ ہیں پردے میں

اسی سے شہرِ ہستی میں حیا کا نام باقی ہے
حیا کا نام باقی ہے، خدا کا نام باقی ہے

عیارِ خیر و شر ہے افتخارِ زندگانی ہے
حقیقت ہے کہ پردہ آدمیت کی نشانی ہے

کیا فطرت نے بہرِ حفظِ فطرت آدمی پیدا
ہوئی ہے جانور کے واسطے بے پردگی پیدا

بھرے ہیں نغمہ ہائے زندگی سے تار پردے کے
جو دانا ہیں انھیں معلوم ہیں اسرار پردے کے

فرشتے جس سے ہیں محروم وہ عظمت ہے پردے میں
نہیں معلوم نادانوں کو کیا حکمت ہے پردے میں

رسول اللہ کا، قرآن کا فرمان ہے پردہ
زنانِ ملتِ اسلام کا ایمان ہے پردہ

حکیمِ دو جہاں نے قوم کی تنظیم کردی ہے
خدا نے مرد و زن میں کام کی تقسیم کردی ہے

اسے دی سلطنت گھر کی اسے کارِ جہانبانی
اسے تخلیق کی خدمت اسے تبلیغ قرآنی

بلا فرمان عورت کو نہ آئے عام منظر پر
ضرورت سے ہی آئے تو حدِ دیں سے نہ ہو باہر

نگہ نیچی کئے آئے چھپائے حسن و زینت کو
[illegible] نظر ہر حال میں حکمِ شریعت کو

نہیں اک حرف بھی پیچ آئینِ شریعت کا
کتابِ حق میں [illegible] روشن حکم ہے اخفائے زینت کا

یہی اخفائے زینت ہے جسے کہتے ہیں ہم پردہ
زنانِ بے حمیت کا یہی ہے گنجِ گم کردہ

یہی عریانیٔ زینت فنا کرتی ہے عورت کو
یہی بیگانۂ شرم و حیا کرتی ہے عورت کو

دکھاؤں تجھ کو اعجازِ بیاں زورِ کلام اپنا
کرے گر اے بہن معلوم تو مجھ سے مقام اپنا

وہی تو ہے کہ مردانِ جری پیدا کئے جس نے
وہی تو ہے کہ فاروقؓ و علیؓ پیدا کئے جس نے

جلو میں جس کے صدہا مہر و مہ وہ آسماں تو ہے
ترا رتبہ بڑا ہے بوذرؓ و سلمانؓ کی ماں تو ہے

بہت مردانِ کامل انجمن آرا کئے تو نے
ہزاروں خالدؓ جنگ آزما پیدا کئے تو نے

کئے سو حشر تو نے پہلوئے خاموش سے پیدا
ہوئے شمشیر زن غازی تری آغوش سے پیدا

کسے بھولا ہے تیری تربیت کا ماجرا اب تک
تری تعلیم کی شاہد ہے ریگِ کربلا اب تک

اُچھالا نام دینِ مصطفیٰ کا تیری جرأت نے
بدل ڈالا تھا تقدیرِ عمرؓ کو تیری قرأت نے

متاعِ علم و عرفاں ہے صدائے جانگزا میری
اگر تو دخترِ اسلام ہے تو سُن نوا میری

جو تو ہے پیروِ خیر النسأ اے بنتِ عثمانی — پسند آتی ہے کیوں تجھکو زنِ مغرب کی عُریانی
جو تو چرچل کی بیٹی ہے جو تو لینن کی دختر ہے — کنیزِ فاطمہؓ سے پھر بھی تو رتبہ میں کمتر ہے
نہیں شرم و حیا گر تیری آنکھوں میں تو کیا تو ہے — دیارِ غرب کے عشرت کدے کی بیسوا تو ہے
جو زینت کی نمائش کو ترقی تو نے سمجھا ہے — تو سچ کہتا ہوں میں تجھ سے کہ یہ دھوکا ہی دھوکا ہے
ترقی اور ہی شے ہے یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں — فقط یورپ کے عیاشوں کی چالیں اور گھاتیں ہیں
کریگی جو بہن فلمی اداکاروں کی نقالی — گنوا بیٹھے گی وہ نسوانیت کا جوہرِ عالی
دلِ مغرب شرابِ معصیت سے مست ہے کتنا — خبر بھی ہے تجھے اخلاقِ یورپ پست ہے کتنا
حیا سوزی، تصنع، شیشہ سازی اور مےخواری — نہیں تجھ سے نہاں تہذیبِ مغرب کی ہوسکاری
ترقی یہ نہیں عورت کرے مردوں کی نقالی — حقیقت میں یہی ہے توقیرِ نسوانی کی پامالی
تجھے منظور کیوں ہے جنس سے ناجنس بن جانا — تری توقیر کے شایاں نہیں منبر پہ تن جانا
لٹائے رہگذر میں حُسن و زینت کے خزانے تو — غلامی کی سند لے، دفتروں کی خاک چھانے تو
سند تیری فضیلت کی متاعِ شرم و غیرت ہے — یہ عورت پن ترا مردانہ پن سے بیش قیمت ہے
تجھے کیوں فکرِ نان و آب نے گھر سے نکالا ہے — شریعت نے ترا یہ بار تو مردوں پہ ڈالا ہے
کرے کیوں فکرِ روزی میں تو اے ہمشیر دلسوزی — ہے از روئے شریعت مرد کے ذمے تری روزی

یہ سب کیوں ہے کہ دینِ مصطفےٰ پردے کا حامی ہے
سمجھتی ہے اگر تو اور کچھ تو تیری خامی ہے

سُنا تو نے نتیجہ حکمت و دانش کی خامی کا — ہوا بے پردگی کے ہاتھ سے کیا حال شامی کا
سکونِ دل کہیں جس کو، نہ گلشن میں ملے ہے گھر میں — کہ ہے شرم و حیا حرفِ غلط مغرب کے دفتر میں
اسی آتش نے پھونکا مزرعِ ایراں کے حاصل کو — اسی تہذیب نے غارت کیا روما کو بابل کو
اسی بیدادگر نے ختم کی یونان کی عظمت — اسی دیوِ ہلاکت نے مٹا دی مصر کی شوکت
فریبِ رنگ ہے تہذیبِ حاضر کی درخشانی — نہاں ہے سازِ حکمت میں نوائے نامسلمانی
تعلق جان و تن کا آخر اک دن ٹوٹ جاتا ہے — قفس سے طائرِ رشتہ بیاں نے چھوٹ جاتا ہے
اُسی آوازکو سُن جو اٹھی تھی کوہِ فاراں سے — اسی وادی میں آ، روشن ہے جو خورشیدِ تاباں سے

یہاں بھی شادمانی ہے وہاں بھی شادمانی ہے
محمدؐ کی غلامی دو جہاں کی حکمرانی ہے!

محمد ابراہیم مدہوش

شاعری اور حقیقت نگاری

ہم سب کو اس بات کا کچھ نہ کچھ احساس ضرور ہے کہ حقیقت نگاری اور شاعری سے کیا مراد لی جانے۔ اگرچہ یہ دونوں غیر واضح اور مبہم الفاظ ہیں۔ حقیقت نگاری سے شاید یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہ اپنے سب سے فرومایہ رنگ میں انسانی زندگی کے زیادہ کثیف پہلوؤں کا ان کی حقیقی شکل میں اظہار ہے۔ اور اپنے سب سے بہترین رنگ میں عام کاروباری انسانوں یہاں تک کہ سائنس دانوں تک کی ذہنی کیفیت کا پیرایہ اظہار ہے۔ بہرحال ہر دو مضمونوں کا اگر صرف سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ وہم شاید ہمارے دماغ میں تسلط جمانے لگے کہ اس کا تو شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ شاعری کا تعلق عموماً روحانیت اور کشور تخیل ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن شاعری خواہ وہ کتنی ہی متلون مزاج و تخیلی کیوں نہ ہو اس کے لئے کسی نہ کسی حد تک ترجمانِ حقیقت ہونا ضروری ہے۔ بہرحال اس کو حقیقی اشیاء سے لگاؤ رکھنا پڑتا ہے یہ ضروری نہیں کہ ان کا اس وقت واقعی کوئی معین وجود ہو یا کسی زمانے میں رہ چکا ہو۔ بلکہ وہ اشیا جو قوانین خارجیت و واقعیت کے تحت میں آتی ہوں۔ یہی کچھ دیگر اقسامِ آرٹ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے جن میں شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ زبان کو بطور اپنے آلہ کے استعمال کرتی ہے اور چونکہ زبان بھی منطق اور روزمرہ کے واقعات کے اظہار کا ذریعہ ہے لہٰذا ان تمام ظاہری حقیقی مساعی کے ساتھ براہِ راست تقابل کی متقاضی ہے۔ اس مضمون میں یہی مسئلہ میرے درپیش ہے کہ آیا حقیقی شاعر کا رجحان جو اس کی تخلیقات میں نمایاں ہوتا ہے بجا طور پر "حقیقت پسندانہ" کہا جا سکتا ہے، لیکن یہاں میں یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پاس اس سوال کا کوئی "قطعی" جواب نہیں ہے لہٰذا مندرجہ ذیل سطور کو تشریح و تفسیر سے زیادہ ایک طرح کی تحقیق و تفتیش کا درجہ دینا چاہیئے۔

خود شعرا نے "شاعری" پر مختلف انداز میں طبع آزمائی کی ہے اس لئے یہ سوال خود بخود ذہن میں ایک الجھن سی پیدا کر دیتا ہے کہ آیا ایک غیر شاعر کو اس موضوع میں دخل در معقولات دینے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے دور میں کہ جب مہارتِ خصوصی (SPECIALISATION) کا اس کی حیثیت سے زیادہ احترام کیا جاتا ہے چند موضوعات ہیں جن پر ایک اناڑی کو بھی محض اس لئے بولنے کا حق حاصل ہے کہ وہ اناڑی ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے اکثر شعراء اپنی شاعری کی تخلیق کسی خاص فرد یا طبقہ کو خوش کرنے کی شعوری خواہش کے زیر اثر نہیں کرتے (ہو سکتا ہے کہ چند شعراء کسی خاص طبقے کے لئے کسی خاص مقصد مثلاً روپے کمانے کی غرض سے شاعری کرتے ہوں۔ لیکن ان کا ذکر خارج از بحث ہے) وہ اس بات کا خود اقرار کریں گے کہ ان کی تخلیقات کی قدر کچھ حد تک دوسروں کے فیصلے پر بھی منحصر ہے۔ اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ ان دیگر حضرات کے لئے بھی کیا شاعر ہونا لازمی ہے تو اس کا جواب بلا تامل یہ دیا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اگرچہ شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا مرتبہ عوام سے کچھ بلند تر ہو جاتا ہے اور اگرچہ ان کی تخلیق شعری کی بنیادی ترغیب محض خود اظہاری ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس خود اظہاری میں وہ اپنی نسل کے عوام سے یا ان کے لئے مخاطب ہو رہے ہیں۔ تاہم ایک نقاد کی حیثیت سے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ممکن ہے کوئی نظم ہمارے ہر تارِ نفس کو جھنجھوڑ دے لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ مخصوص ذہنی کیفیت جو یہ ہمارے دماغ میں چھوڑ جاتی ہے اس نوعیت ہی کی ہو جس نے شاعر کو اسے رقم کرنے پر اکسایا تھا لیکن یہ فرض کر لینا بھی عین قرین قیاس ہے کہ اگر ایک نظم ہم میں صرف اکراہ پیدا کرنے کے بجائے قدر افزا تاثر یا ردِ عمل پیدا کرتی ہے تو ہم شاعر کی اس ذہنی کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر سکتے ہیں

جس نے اس شکل میں راہِ فرار اختیار کی ہے۔

چونکہ ہم یہاں شاعری اور حقیقت نگاری کے تعلق کی کھوج میں منہمک ہیں اس لئے سب سے زیادہ تسلی بخش ذریعہ پہلی نظر میں ہمیں یہ سجھائی دے گا کہ ہم ان دونوں کی تعریف کریں اور جب ان دونوں کے متعلق ایک معین خیال ہمارے دماغ میں جاگزیں ہو جائے تب شاعری پر اس کی ہیئت اور مضمون دونوں لحاظ سے غور کریں اور دیکھیں کہ حقیقت نگاری اس میں کہاں تک داخل ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ طریقہ کار کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ تو میں حقیقت نگاری اور شاعری کی تعریف کر سکتا ہوں جو ہمارے مقصد کو پورا کرے اور نہ شاعری کی ہیئت کو اس کے مضمون سے جدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں چند عام مشاہدات تک ہی خود کو محدود رکھوں گا اس امید میں کہ اس طرح اس دقیق موضوع پر شاید کچھ روشنی پڑ سکے۔

"حقیقت نگاری" شاید اشیا و واقعات کو ان کے اصلی خدوخال میں دیکھنے اور پیش کرنے کا طبعی میلان ہے۔ اور گو اس تعریف نما قیاس آرائی سے ہمارے علم میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح اس کے معنی ایک ناعاقبت اندیش انسان کے اندیشے سے زیادہ (ELUSIVE) ہو جاتے ہیں کیونکہ اشیاء کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے کی صلاحیت کوئی ایسی قوت نہیں جو کسی خاص طبقۂ انسانی پر ان کے مزاج و کسب کو نظر میں رکھتے ہوئے ودیعت کی گئی ہو بلکہ یہ ایک معیار ہے جس کی رسائی کے لئے سعی درکار ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ چند ذہنی کیفیات دیگر ذہنی کیفیات سے زیادہ "حقیقت پسندانہ" ہوتی ہیں مگر ان کا پتہ لگانا ذرا دشوار ہے مثلاً یہ نتیجہ اخذ کرنا عین قرینِ فطرت ہے کہ وہ اشخاص جو کسی خاص عورت کے دامِ محبت میں گرفتار نہیں ہیں اپنے ذہن میں اس عورت کی زیادہ حقیقی تصویر رکھتے ہیں بہ نسبت اس شخص کے جو اس عورت کی زلفِ چلیپا کا اسیر ہے۔ اس کی کچھ توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اکثریت میں ہیں اور کچھ یہ کہ سرد مہری بمقابلہ ہمدردی انسانی دماغ کی زیادہ عام کیفیت ہے اور اسی لئے زیادہ قیاساً زیادہ "حقیقت پسندانہ"۔ حقیقت نگاری کو اکثریت کے نظریہ کے ساتھ "علم" سے بھی لگاؤ رکھنا پڑتا ہے کیونکہ چند واقع ایسے بھی آئے ہیں جب اکثریت کی ترجمانی حالات کو رد کر دینا پڑتا ہے مثلاً کسی طبی مسئلہ میں کہ جب سیکڑوں دوسرے آدمیوں کی تجاویز سے زیادہ صرف ایک ڈاکٹر کی رائے کو صحیح مانا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہم اس موقع پر محض تعداد کے وزن کو خاطر میں نہیں لاتے اس لئے یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ جس عاشق کو بھی اس معاملہ پر یوں ہی ایک ماہر مان لیا جائے کہ اسے اس عورت کے متعلق زیادہ مخصوص معلومات حاصل ہیں جن سے دوسرے لوگ محض ناواقف ہیں۔ اس نکتہ کو زیادہ طول دیئے بغیر اب ہم شاید یہ نتیجہ اخذ کر سکیں کہ "حقیقت نگاری" بنیادی ایک ایسی ذہنی کیفیت ثابت ہوتی ہے جو تمام انسانوں کے لئے مختلف اوقات میں کم و زیادہ حد تک ممکن الحصول ہے نہ کہ ایک ایسی کیفیت جو اکثر انسانوں میں ہر وقت پائی جائے اس لئے جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں اس خیال کے تحت کہ شاعری ایک ایسے نظریہ کی عکاسی کرتی ہے جو روزمرہ کے ردعمل سے قطعی کوئی دوسری چیز ہے اسے غیر حقیقت پسندانہ گردانے میں ہم حق بجانب نہیں

حقیقت نگاری یا حقیقت پسندی پر یہ زیادہ تر منفی ارشادات ہی اس وقت کے لئے کافی ہیں۔ اس مسئلہ پر لوٹنے سے قبل میں شاعری کے متعلق ایک عام نکتہ پیش کر دینا چاہتا ہوں لیکن اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے شاعری کی ایک ایسی خصوصیت کا انتخاب کر لیا ہے جس کے ذریعے سے نثر، مذہب، تاریخ اور ہر اس چیز سے صریحاً مابہ الامتیاز ہو سکتی ہے جس سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ لیکن میرا اتنا عقیدہ ضرور ہے کہ کائناتِ حسی میں زندگی کا ایک ایسا ردعمل ضرور پایا جاتا ہے جسے ہم زیادہ صحیح طور پر "شاعرانہ ردعمل" کی فہرست میں جگہ دے سکیں خواہ ہمیں اس کا وجود کسی پیشہ ور سائنس دان یا پادری کی تحریروں ہی میں کیوں نہ نظر آئے۔

اگرچہ شاعری کی تکنیک بڑی حد تک مختلف ہو سکتی ہے اور اسی لئے وزن، بحر، قافیہ یا کسی اور شاعرانہ بندش پر مصر ہونا اس جگہ نامناسب ہے ــــ پھر بھی میرے ذہن میں ایک ایسی خصوصیت کا تصور موجود ہے جسے تمام اقسام شاعری کی بنیادی یا مرکزی خصوصیت کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "شاعری ایک ایسی دنیا کی عکاسی کرتی ہے جس میں

انسانی وقوف و شعور کو خلیج کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہو ——— ایک حساس مفکر کی معترفانہ تجربہ کی ہوئی دنیا" علوم طبیعیہ کے تصور میں جس مادی دنیا کا خاکہ ہے وہ ناظر سے جداگانہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور ایک دوسرے سے ممتاز ان گنت اشیا پر مشتمل ہے۔ سائنس ان کی توضیح کے لئے جو طریقہ اختیار کرتی ہے اسے تحلیل یا تجزیہ کہتے ہیں یعنی ایک وحدت (UNIT) کا اپنے سے چھوٹے ترکیبی واحدات میں منقسم ہو جانا مثلاً پانی کی توضیح ہائیڈروجن اور آکسیجن کی صورت میں کی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے شاعری مادی دنیا کو اس کے ترجمان کے دماغ سے علیحدہ کرنے کی قسم کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ اشیا و واقعات کو منفصل کرنے اور ان کو تجزیئے میں رکھنے میں سائنس جتنی زیادہ دلچسپی لیتی ہے اتنی دلچسپی شاعری نہیں لیتی اور اس کا انہیں پیش کرنے کا طریقہ بھی تحلیلی سے زیادہ ترکیبی ہے کیونکہ شاعری کا انحصار ارتباط و جذبات کی ترکیب و ترتیب کو ایک ایسے سادہ و منفرد وجود میں تشکیل دینے پر ہے جس کا ادراک کیا جا چکا ہو۔ البتہ اگر سائنس کا طریق خارجی ہے تو شاعری کا بہت کافی حد تک داخلی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شاعری انسانی مسائل و جذباتی ہیجان سے وابستہ ہے۔ عشقیہ غزل اس کی ایک کھلی ہوئی مثال ہے۔ ایسی غزل کا تعلق صرف اور محض جذبات سے ہوتا ہے اور یہی کچھ رزمیہ شاعری اور ڈرامہ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ جن میں محض بیانیہ واقعات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے ان کا عالمگیر اطلاق اور وہ ہمدردی جو اس کے مطالعہ کرنے کے دماغ میں غیر شعوری طور سے جاگ اٹھتی ہے یہی کچھ وہ خصوصیات ہیں جو ایسے آرٹ کی جان کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اس عام نظریہ کے مطابق بھی شاعری اپنے ذاتی (PERSONAL) ہونے کی وجہ سے داخلی ہی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی سے کم تعلق رکھنے والے موضوعات کی تفصیلی بحث میں بھی شاعری داخلی ہی ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ شاعری سائنس کے برخلاف ہر اس شے میں انسانی خودی کا مطالعہ کرنے کی پشت پناہی کرتی ہے جو نگاہوں کے سامنے آئے۔ اور یہ میلان مختلف اندازوں مختلف مدارج میں ہر انداز کی نیچرل شاعری میں نظر آ سکتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ایک سیدھے سادے "تجسیم" (PERSONIFICATION) کی شکل اختیار کرتا ہے۔

رات چھپکاتی ہے تارے صبح برساتی ہے نور
موسمِ باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دور دور
چاندنی شب بھر دکھاتی ہے ضیائے روئے نو
ذرہ ذرہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برقِ طور
رات زلفیں کھول دیتی ہے سلانے کے لئے
تاج پہنے صبح آتی ہے جگانے کے لئے

اکثر اس منظر کشی میں تماشائی کا ذاتی رجحان بھی کنایۃً مضمر ہے:

میرے گذرے ہوئے لمحات کے ویرانوں سے
سسکیاں لینے کی مغموم صدا آتی ہے
ہائے پھر جانے کہاں سے مرے شکووں کی طرف
اس کی الجھی ہوئی سانسوں کی ہوا آتی ہے

اور وہ دھندلائی سی بے رنگ گھٹا کے گیسو
ان کی لہروں میں کوئی صبح کوئی شام نہیں
شب کے ہاتھوں میں یہ مہتاب کا ٹوٹا ہوا جام
دعوتِ زیست نہیں موت کا پیغام نہیں

میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے
جانے اس کی وہی پہلی سی نظر ہے کہ نہیں
میری بے مائگیٔ غم کو تو وہ کیا جانے
اس کے عارض پہ وہ ٹوٹا سا گہر ہے کہ نہیں
زرد رو چاند بھی خاموش ہے بادل کے قریب
پھر وہ شعلہ سا گرا ٹوٹ کے جنگل کے قریب

شاعر نے اس جگہ ذاتی رائے زنی کی بظاہر جسارت نہیں کی لیکن 'لمحات کے ویرانے، الجھی ہوئی سانس، دھندلائی سی بے رنگ گھٹا کے گیسو، مہتاب کا ٹوٹا ہوا جام، ٹوٹا سا گہر، زرد رو چاند، شعلہ جیسے الفاظ و تراکیب نظارہ و نظارہ بین کے درمیانی تعامل یا ملاعبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ تماشائی کا اثر خصوصاً ان نظموں میں زیادہ غالب نظر آتا ہے جہاں مشاہدہ میں آئی ہوئی محض ایک سادہ سی شے سے انفرادی تخیل و تصور کی ایک پوری

[illegible]بنات منکشف ہو جاتی ہے۔ اپنے باغ سے بہت اونچے درخت اگے ہیں [illegible] کا وجود بوڑھا پادشاہی کے ذہن میں بچپن کے ان ایام کی یاد تازہ کرتا ہے جو دیہات کی خاموش دلربائیوں میں بسر ہوئے تھے اور [illegible] اس کے ازالۂ وہم کی اضطراری آواز کا موجب ہوتی ہے۔ اسی طرح کی آواز جو کیٹس [illegible] کی نغمہ سرائیاں سن کر بلند ہوتی ہے۔ شاعر کے حواس کے پیش نظر بظاہر ایک سادہ سی حقیقت اس کے ذہن کے لئے ایک گذرگاہ کا کام کرتی ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ ذہنی تحلیل میں تبدیل ہو جاتی ہے شاید آرزوؤں سے بے چین مجموعۂ اتصالات یا ایک تصوراتی دنیا [illegible] بدست تجربہ سے بہت دور ......

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہے میں
چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

اگر پرواز فکر کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو شاعری کی داخلیت میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں میرا مقصد [illegible] حقیقی اور رومانی و کلاسیکی کا فرق بتانا نہیں ہے۔ ان نظموں تک میں جن میں شاعر اپنی شخصیت کی بظاہر مداخلت سے پرہیز کرتا ہے مکمل خارجیت حاصل نہیں ہوتی اور نہ اس کے [illegible] دل کا کوئی مدعا ہی ہوتا ہے۔

Landscape plotted and pieced
—— fold, fallow, and plough,

اس سطر میں بظاہر کوئی آرائش نہیں۔ قریب قریب سب ہی اسمار ہیں لیکن اس کے مختصر و جامع حروف تہجی اس کے [illegible] اور اس کے حروف تہجی میں ہم جس امتیاز کو کچھ اس طرح محسوس کر سکتے ہیں گویا یہ حسن اس "LANDSCAPE" کی روح میں حلول کر گئی ہو۔ لیکن اس جگہ بھی اس امتیاز کے وجود کے لئے ایک شعور کی ضرورت ہے جو اس کا ادراک کر سکے۔ قصہ مختصر جب میں یہ کہتا ہوں کہ شاعری داخلی ہے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر اچھی شاعری میں ایک تجرباتی اور شعوری ذہنیت نمایاں ضرور ہوتی ہے۔ خواہ وہ اقبال، جوش و مجروح کی [illegible] بطور مثال [illegible] یا ایک یونانی [illegible] کی نازک سادگی۔

لیکن آخر ان سب کو حقیقت نگاری سے کیا واسطہ؟ آئیے ہم چند ثانیوں کے لئے اسی پرانے موضوع کی طرف لوٹ پڑیں۔ میں نے شاعری اور حقیقت نگاری کی یہ حیثیت اب تک برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری ایک ایسے میلان و رجحان کا نتیجہ ہے جسے وقتاً فوقتاً نہ صرف شعراء بلکہ عوام بھی محسوس کرتے ہیں۔ اور حقیقت نگاری بھی کسی حد تک انسان کے عام و مشترک نظریات و تصورات کا ایک حصہ رہی ہے۔ اگر یہ دونوں نتیجے صحیح ہیں تو شاعری اور حقیقت نگاری کم سے کم اس لحاظ سے تو متضاد نہیں۔ درحقیقت خود شعراء نے اپنی تخلیقات کو اپنے تجربہ کے ان پہلوؤں سے باخبر رکھنے کی انتھک کوشش کی ہے جو [illegible] نہیں موجود اساسی اور حقیقی نظر آتے ہیں۔ برخلاف اس کے "داخلیت" جسے میں نے شاعری کا ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے [illegible] "انفرادی تخم" پر دلالت کرتی ہے جو حقیقت پسندانہ تصورات [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت کہ شاعری میں جذباتی بے خودی، شدت احساس اور الہامی کیفیات کی جھلک پائی جاتی ہے جو متکلم و دیگر ذہنی کیفیات سے کبھی متصف نہیں ہوتی ایک اور مشکل ہمارے سامنے لا کھڑی کرتی ہے۔ ان دونوں متعلق بہ یکدیگر مسائل کے جو تجرباتی اور آزمائشی جوابات دیئے جا سکتے ہیں وہ سب انہی تمام باتوں میں پوشیدہ ہیں جو میں اب تک بیان کر چکا ہوں۔ سب سے پہلے خطا، التباس، فریب اور وہم کی طرف اس کے جبلی رجحان کے باوجود جو تشریح و توضیح میں روشنی ڈالتا ہے میں اس پر سنجیدگی و متانت سے شک نہیں کر سکتا کہ داخلیت اس وسیع معنی

میں جس کی میں نے یہاں توضیح کرنے کی کوشش کی ہے حقیقت نگاری کی "شرط پیش" ہے۔ کیونکہ حقیقت نگاری ہی اشیاء و واقعات کو ان کے حقیقی رنگ میں دیکھنے اور پیش کرنے کی قوت یاد، تخیل اور تصور کی روشنی میں کسی حد تک ترجمانی کے بغیر ہم ہی کس حد تک پا سکتی ہے جبکہ یہی ایک وسیلہ ہے جن کے ذریعہ ہمارے پیش نظر اشیا کی ہم چھان بین کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی مجھے ایک ناگزیر حقیقت دکھائی دیتی ہے کہ حقیقی دنیا اگر ہے کم و بیش وہ دنیا جس کا ہم بھی تجربہ کر سکیں۔ خواہ اس کا حلقہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، ہماری "ذہنی حد بصیرت" میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ انسانی دماغ کے طرز تخیل کے سانچے میں ڈھلتی ہے اور جذبات اس میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ یہ دنیا عقلی مطالعہ کے لئے ماورائی ہیولی دنیا کی بہ نسبت ہماری اس دنیا کے زیادہ قریب ہے جس کا ہم روزانہ ادراک کرتے ہیں۔ شاعری جس کے محرکات جذبات و تخیل میں "حقیقت" کی جھلکیاں دکھائی دینا ناگزیر ہے حقیقت نگاری کے زیادہ قریب ہے بہ نسبت سائنس کے جو ایک ایسی کائنات کا تصور کرتی ہے جس کی فطرت میں واقف و احساس شعور کوئی تعمیری کام انجام نہیں دیتا۔ اس سے پہلے میں ایک عاشق کی مثال دے چکا ہوں جس سے مجھے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حقیقت پسندی بھی جذبات کی مقتضی ہوتی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اشیا کی حقیقی فطرت کی مکمل معلومات کے لئے ذہنی تسکین کے علاوہ چند اور عناصر کی ضرورت ہے جو عاشق کے تجربہ یا شاعر کے وجدان کے ہم سرشت ہیں۔ اور یہ تجربہ یا وجدان تعقل سے بالاتر ہے لیکن یہ بھی بالکل درست ہے کہ اشیا کو ان کے اصلی خدوخال میں دیکھنے کی صلاحیت کے لئے ایک ایسی مستحکم "غیر مذبذب رویت" درکار ہے جو دوررس بصیرت، بے حسی و بے ذوقی کے تبادل سے بالکل مختلف ہو مگر اس "تبادل" سے نہ تو شعراء ہی بری ہیں اور نہ عشاق۔ اس "نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن" والی مصیبت سے چھٹکارے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ حقیقت نگاری دنیا کے ایسے تصور پر مشتمل ہے جسے انسان کی پوری تجرباتی زندگی میں اسی ایک سطح پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ نام نہاد "الہام" اشیا کی حقیقی فطرت کے منافی ایک ناقابل توجیہ وسوسہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دوسری راہ یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قبول کر لیں جو میں تجویز کر چکا ہوں۔ یعنی حقیقت نگاری کا رجحان ہم میں سے ہر ذی کیلئے مختلف اوقات میں مختلف حد تک ممکن الحصول ہے۔ اس کے مکمل حصول کے لئے یا یوں کہئے کہ اشیا کے اصلی خدوخال کی حقیقی آگاہی کے لئے ہر فرد کو بغیر کسی وقفہ کے اس ذہنی کیفیت کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے جو انسان کی افضل ترین بصیرت کے لمحات کی ہمرکاب ہے۔ اس مضمون کا رجحان زیادہ تر یہ تجویز کرنے میں ہے کہ دونوں جوابات میں سے دوسرا جواب حقیقت کے تقریباً زیادہ قریب ہے۔ زیر نظر دماغی میلان ایک احساس ترفع و غایت مسرت پر دلالت کرتا ہے اور یہ احساس اس دماغی کیفیت سے مختلف نہیں جسے شاعری ہی میں اپنے اظہار کا سب سے تسلی بخش ذریعہ نظر آتا ہے۔

دل کا راز

عالی لکھنوی

زباں ہو بند، خاموشی مری آواز بن جائے
طلسم زندگی ٹوٹے طلسم راز بن جائے

حدود شوق میں رہ کر جو دل ممتاز بن جائے
تو ہر کروٹ زمانہ کی تمنا ساز بن جائے

جو بہ کر نوک مژگاں پر چلا آئے وہ آنسو ہو
رہے جو دل میں سربستہ وہ دل کا راز بن جائے

تمہارا نام جب آئے تو نکلے موت کی ہچکی
ہمارا راز طشت از بام ہو کر راز بن جائے

اگر مشتاق پابوسیٔ جاناں ہے تو بسم اللہ
حریم ناز کا دل فرش پا انداز بن جائے

مجھے اے بیخودیٔ شوق دنیا سے الگ کر دے
یگانوں کی صدا بیگانوں کی آواز بن جائے

حریم ناز میں مضبوط دل والے قدم رکھیں
بہت ممکن ہے جلوہ صاعقہ انداز بن جائے

زمانہ ہجر میں خاموشی کا آوازہ ہے اے عالی
کہیں ایسا نہ ہو افسانہ دل کا راز بن جائے

ظہور الحسن ڈار

وصیت نامہ

(کل رات میں نے خواب دیکھا کہ میں مر چکا ہوں۔ ایک تاریک کمرے میں میرا مزار ہے۔ بے جان جسم چارپائی پہ پڑا ہوا ہے، اور ساتھ والے کمرے میں ملک کے تمام بڑے افسانہ نگار اور شاعر جمع ہوکر ایک وصیت نامہ سن رہے ہیں جو شاید میں نے خودکشی سے قبل لکھ کر اپنے ایک شاعر دوست کو بھیج دیا تھا مجھے اس وصیت نامے کے کچھ حصے یاد رہ گئے ہیں اور اس وقت جبکہ میں انہیں لکھ رہا ہوں، میری نگاہوں میں وہ آنسو کانپ رہے ہیں جو یہ وصیت نامہ سنتے وقت حاضرین کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے)

"جس وقت یہ تحریر پڑھی جائے گی، اس وقت میرا چہرہ بے رونق اور میری آنکھیں بے نور ہو چکی ہوں گی، وہ آنکھیں جو عمر بھر زندگی پر موت کے خونخوار حملوں کا نظارہ دیکھتی رہیں جن کے لئے حسن ایک سراب رہا اور بدصورتی ایک تلخ حقیقت اور یہ تلخ حقیقت میرے دل میں زہر بجھے کانٹے کی طرح اترتی چلی گئی، اور آخرکار اس نے ایک صدق وخلوص سے معمور اور مظلوم انسانیت کی بے بسی سے بے چین اور مضطرب روح کا خاتمہ کر دیا۔ بدصورتی کی دیوی کے مندر میں جب وحشی نغمے گونج اٹھے اور سینکڑوں گھنٹیوں کی ٹناٹن میں اس نے اپنی قربان گاہ پہ ایک اور بھینٹ لی۔ ملک کے ایک انصاف پسند اور انسان دوست افسانہ نگار کی ——— ایک ایسے انسان کی جو زندگی بھر غلامی، ظلم اور افلاس کے خلاف دلیری سے لڑتا رہا اور بالآخر اسی جدوجہد میں اس نے خونیں پھولوں کا سہرا سجا کر موت کی دلہن کو اپنی آغوش میں لے لیا ....

اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، رات کی تاریکی اور بھی گہری ہو گئی ہے، کھڑکی سے [illegible] سیاہ بادل چپ چاپ زمین کو گھورتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ میری میز پر موم بتی کے ایک ٹمٹماتے ہوئے شعلے کے علاوہ اور کہیں روشنی کا نشان نظر نہیں آتا۔ شاید بجلی بھی سو چکی ہے، آہ اپنے اردگرد چھپی ہوئی گھنگھور اندھیری گھٹاؤں میں میں کب سے بجلی کی کڑک کا انتظار کر رہا ہوں [illegible] اس روشنی سے میری کتنی بہترین آرزوئیں وابستہ ہیں جو بجلی کی کڑک کے بعد پیدا ہوگی، وہ روشنی جو کروڑوں آنکھوں کے دل کا جوہر ہوگی اور جس کی تڑپ پاتے ہی [illegible] بے شمار [illegible] جل اٹھیں گے، یہ دنیا راکھ کا ڈھیر بن جائے گی اور اس راکھ سے ایک نئی دنیا جنم لے گی، جس کی فضا میں انسان ستاروں کے گیت گایا کرے گا، کاش میری کم نصیب آنکھیں جنہوں نے اس دنیا میں بدصورتی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا اس حسن دلآرا کو دیکھ سکتیں۔ اسے چھو سکتیں، محسوس کر سکتیں، مگر نہیں ابھی منزل دور ہے اور میں زخموں سے چور ہو رہا ہوں۔ آسمان کے آنسو ٹوٹے ہوئے تاروں کی صورت میں ٹپک رہے ہیں، ہوا کا ماتمی راگ شدید تر ہو گیا ہے اور کئی ان جانی آوازیں کہکشاں کی پراسرار وادیوں سے مجھے بلا رہی ہیں۔ اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اپنی یاد میں میں صرف دو افسانے چھوڑ رہا ہوں، جنہیں میں نے خون جگر سے لکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک ادب کی کیاری ہری بھری رہے گی [illegible] ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے ....

میں جانتا ہوں کہ میری خودکشی پر کئی لوگ یہ کہیں گے کہ میں بزدل تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھ پر بزدلی کا الزام دھرنے والے خود کس قدر دلیر اور بہادر ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں انسانیت کے بچاؤ کے مورچوں میں لڑتا ہوا مر رہا ہوں۔ میں اس حالت میں جان دے رہا ہوں کہ میرا جسم زخموں سے نڈھال ہو چکا ہے مگر میرے ہاتھوں نے بندوق کو اور بھی بھینچ لیا ہے تاکہ نشانہ خطا نہ جائے۔ میں نے اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے زندگی کی مردانہ وار لڑائی سے منہ نہیں موڑا۔ میں ایک سچا سپاہی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میرا ضمیر ہمیشہ ہشیار اور روشن رہتا

ہے، اسے کوئی نہیں خرید سکتا، اسے کوئی نہیں مار سکتا، وہ میری موت کے بعد بھی زندہ رہے گا اور ان مجاہدوں کی راہنمائی کرے گا جو آزادی اور مساوات کے گیت گاتے ہوئے آگے بڑھیں گے

. . . .

مجھے ان لوگوں پر رحم آتا ہے جنہوں نے وقتی مسرت کے لئے اپنے آپ کو تاریک موریوں میں گرا دیا ہے۔ وہ لوگ جو کل تک آزادی و مساوات کے گیت گاتے تھے ان کے ہونٹوں پر آج خاموشی کے پہرے ہیں۔ ان کی روح چاندی کی چٹانوں کے نیچے پس چکی ہے۔ ان کے دلوں میں پگھلا ہوا سونا تیر رہا ہے، اب وہ خاموش ہیں، کبھی وہ حسن کے نغمے چھیڑتے ہیں اور کبھی حسن کے گیت گاتے ہیں، مگر حسن کہاں ہے؟ آہ انہوں نے اپنی بہترین آرزوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اب وہ ان کی یاد کو بھی بھول جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بزدلی نہیں، کیا یہ فرار نہیں زندگی کے اصلی مورچوں سے مفرور اب ظلم و جبر کے دیوتاؤں کے مندروں میں بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان سیاہ خانوں کے دروازوں پر وہ اپنے کشکول پھیلائے کھڑے ہیں اور وحشی دیوتاؤں کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ کاش وہ اب بھی اپنے دل میں اس احساس کی لرزش محسوس کر سکیں۔ جس نے جنم لیتے ہی ان کے آنسوؤں میں لہو کے چھینٹے دیئے تھے اور انہیں سچے مقصد کے لئے لڑنا سکھایا تھا، مگر شاید اب یہ ممکن نہیں، انسانی ضمیر پر سب سے زیادہ نازک وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اپنی قدروں کا معیار بدلتا ہے۔ ستاروں کی طرف یا پاتال میں ——— منزل کے تصور کا فیصلہ زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ ہے، اور اگر اس وقت انسان کے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو پھر اس کا سنبھلنا بے حد مشکل ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس بلا کا شکار نہیں ہوا، میرے عزم نے اس نازک مرحلے پر میری راہنمائی کی، میری روح کے کونے کونے سے آزادی و مساوات کا بے باک نعرہ گونجا اور میں نے اس صدائے حق کو لبیک کہا اور آج جبکہ میں زندگی بھر اسی سچے مقصد کے حصول کے لئے لڑتا ہوا مر رہا ہوں مجھے پورا اطمینان ہے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے میرے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے اور میرے دل میں خوف کی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔

. . . .

اس وقت میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں لوہا کٹنے اور زنجیریں ٹوٹنے کی آوازیں سن رہا ہوں۔ شاید میرے نعروں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اب میری موت اس عمل کو اور بھی تیز کر دے گی، کل ساری دنیا جان لے گی کہ میں انسانیت کے لئے قربان ہو گیا ہوں، میرے لہو کا ایک ایک قطرہ بہار کی آمد کا پیام دے گا، میری کمزور ہڈیاں سرخ کر آنے والے انقلاب کا اعلان کریں گی۔ اس انقلاب کا، جس کو برپا کرنے کے لئے میں نے موت کے مندر میں زندگی کے محبوب ترین پھول تک کا تحفہ پیش کر دیا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آزادی اور مساوات کے مورچوں پر لڑنے والے تمام سپاہی آنے والے انقلاب کو اسی قسم کی سلامی دیں۔

. . . .

میں چاہتا تو اپنا ضمیر بیچ کر عیش و آرام کی دلدل پر پھولوں کی سیج بچھا سکتا تھا۔ مگر میں سپاہی ہوں، آزادی اور مساوات کے مورچوں کا سپاہی، میرے ضمیر کا تقاضا تھا کہ میں بدبودار پھولوں کو سونگھنے کی بجائے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں مگر اپنے مورچوں کو نہ چھوڑوں، چنانچہ میں نے یہی کیا اور اس وقت بھی جبکہ میں مر رہا ہوں، میری بندوق جوش غضب سے میرے ہاتھوں میں کانپ رہی ہے۔

. . . .

مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں اس طرح کیوں مر رہا ہوں کیونکہ یہ ایک مردانہ وار لڑائی کا نتیجہ ہے اور ایک بدترین زندگی کے سینے پر ایک اچھی موت کا کاری وار ——— اور مجھے اس بات کی پرواہ بھی نہیں کہ لوگ میرے متعلق کیا خیال کریں گے ——— مجھے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں نے راہ طلب سے منہ نہیں موڑا اور موت کے قہقہوں سے سہم کر کسی گندی موری میں نہیں جا گرا۔ میں مسکراتا ہوا موت کے مندر میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ میری روح اندھیرے بادلوں میں پہنچ کر بجلی بن کر کڑکے گی اور اس سے وہ چمک پیدا ہو گی جس کا میں زندگی بھر منتظر رہا۔ وہ وقت کس قدر مقدس ہو گا جبکہ میں خود ہی جا کر اپنا تماشا آپ دیکھوں گا

میں چاہتا ہوں (اور اسے میری وصیت سمجھا جائے) کہ آزادی اور مساوات کے مورچوں پر لڑنے والے سپاہی آنے والے انقلاب کی سلامی میں زندگی کے سجدوں کا تحفہ پیش کریں۔ جب وہ آزادی اور مساوات کے گیت گاتے ہوئے موت کے مندر میں داخل ہوں گے تو موت کا چہرہ زرد پڑ جائے گا اور اندھیرے بادل بجلیوں سے بھر جائیں گے، یہ بجلیاں ہر طرف کوندتی پھریں گی اور ان کی کڑک اور چمک، سے چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل جائے گی، اور جب یہ دنیا جل کر راکھ ہو چکے گی تو پھر مضبوط اور دیوقامت ہاتھ ایک نئی دنیا کو جنم دے گا جس کے کناروں پہ آزادی اور مساوات کی قندیلیں ابد تک جلتی رہیں گی۔

کوکب شاہجہانپوری

زندگی

کان کب سے سن رہے ہیں داستانِ زندگی
آج تک دیکھی نہیں آنکھوں سے شانِ زندگی

دوست دارانِ وطن خدمت گزارانِ وطن
ڈھونڈتے پھرتے ہیں مدت سے نشانِ زندگی

ہر نظر اک قبرِ حسرت، ہر نفس ایک آہِ سرد
کیا یہی شہرِ خموشاں ہے جہانِ زندگی

پتہ پتہ زہر خوردہ، ہر شگوفہ خوں شدہ
کون کہہ سکتا ہے اس کو گلستانِ زندگی

حسرتیں ٹھٹھری ہوئیں، ارمان مرجھائے ہوئے
یہ بہارِ زندگی ہے یا خزانِ زندگی

مضمحل دل، بے دم امیدیں، سسکتے ولولے
موت کے آثار پر وہم و گمانِ زندگی

آمد و رفتِ نفس پہ ہے تجھے زعمِ حیات
آہ اے بیگانۂ روحِ روانِ زندگی

اے فسردہ آرزو، بے حوصلہ، غفلت شعار
تیرا ناکارہ وجود اور امتحانِ زندگی

زندگی سے تجھ کو نسبت ہائے پراگندہ خیال
مسجدِ فکر و نظر ہے آستانِ زندگی

اے غلام آباد اے ہندوستاں اے مُردہ کار
اور ہوتے ہیں زمین و آسمانِ زندگی

نورِ ہستی موت کے سایہ میں آسکتا نہیں
ضامنِ عمرِ ابد ہے ایک آنِ زندگی

آلم مظفرنگری

افسانہ

کہیے کس رنگ سے دل عشق کا دیوانہ بنے
شمع بن جائے سرِ بزم کہ پروانہ بنے

باعثِ گرمیٔ محفل ہے یہ پروانہ بنے
رونقِ بزمِ وفا شمع بنے یا نہ بنے

سربسر مصلحتِ وقت سے بیگانہ بنے
اس سے پہلے کہ کوئی آپ کا دیوانہ بنے

ظرف اس قطرۂ ناچیز کا دیکھے تو کوئی
عین دریا ہو مگر صورتِ دریا نہ بنے

محفلِ شوق کو برہم نہ ابھی ہونے دو
شمع کشتہ سے بھی شاید کوئی پروانہ بنے

ٹوٹ کے جڑ نہ سکے گا یہ مرا دل ساقی!
غیر ممکن ہے کہ ٹوٹا ہوا پیمانہ بنے

غرق ہو ہو کے کئی بار تو ابھرے لیکن
پھر بھی ہم رازشناسِ تہِ دریا نہ بنے

کعبہ و دیر مجھے راس نہ آئیں گے کبھی
میری خاطر تو نیا کوئی صنم خانہ بنے

ضبطِ اسرار کا یہ حکم ہے بعدِ منصور
اب کوئی آ کے سرِ دار تماشا نہ بنے

دل ہے اک لفظ مگر کوئی اسے کیا جانے
دونوں عالم اسی عنوان کا افسانہ بنے

حسن کے ہونٹوں میں ازل سے تھا نہاں رازِ جنوں
وہ کہیں بھی تھے مگر وقت پہ دیوانہ بنے

ذوقِ وحشت میں کمی آئے گی دیوانوں کے
پھر چمن از سرِ نو صورتِ ویرانہ بنے

وسعتیں ہیں یہ فقط میری کہانی میں آلم
کیجیے شرح تو ہر لفظ اک افسانہ بنے

سید فضل الحسن شفقت کاظمی

اضطراب

اب تو راس آ ہی چکا تھا رنجِ تنہائی مجھے
یاد اُس بے مہر کی ناحق کو پھر آئی مجھے!

یاد ہے وہ داستانِ عہدِ برنائی مجھے
جس کا ہر ہر لفظ ہے سامانِ رسوائی مجھے

ہر طرف دیکھا کیا لاکھوں بلاؤں کا ہجوم
سیرِ دنیائے محبت کی نہ راس آئی مجھے

العجب رکھتا ہوں تیری یاد سے پھر بھی غرض
کر دیا ہے جس نے محرومِ شکیبائی مجھے

کیوں نہ ہوں ممنون اپنی حسرتِ ناکام کا
بارہا جو تیری بزمِ ناز میں لائی مجھے

اے گلستانِ محبت! واہ کیا کہنا ترا
تیرے ہر ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی مجھے

اضطرابِ شوق دل میں کارفرما ہو چکا
اب کہاں اے کاظمی تابِ شکیبائی مجھے

سالم مچھلی شہری

ایک فیچر

دیواریں

(ایک طویل دبی ہوئی سسکی کے بعد)

آواز:- خان بہادر صاحب کا لڑکا غائب ہو گیا - لوگ کہتے ہیں وہ مر گیا - بھری جوانی میں دنیا سے اُٹھ گیا - ؟ ؟

دوسری آواز:- کب ؟

تیسری آواز:- پرسوں ! ———— اس دن جب سب کے برابر اولے پڑے تھے -

(دو بوڑھی عورتیں باتیں کرتی ہیں)

پہلی:- زندگی کا کوئی اعتبار نہیں -

دوسری:- خان بہادر صاحب کا گھر اُجڑ گیا - بیچارے باپ کی کمر ٹوٹ گئی - ماں خوش نصیب تھی - پہلے ہی اُٹھ گئی -

پہلی: جوان بیٹا - انتہائی قبول صورت !!

دوسری:- اور اتنی دولت ، اتنی مسرت ، اتنی بے فکری ————

واقعی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں -

(دو نوجوان مرد باتیں کرتے ہیں)

پہلا:- تمہارا گھر کیا ابھی دُور ہے ؟

دوسرا:- گھر نہیں ———— بس اس وقت نسرین کے یہاں جاؤں گا - بیچاری نسرین ! کیا حال ہو گا اس کا ؟

پہلا: کیوں ؟ کیوں ؟

دوسرا:- وہ خان بہادر صاحب کے لڑکے کی منگیتر تھی

پہلا:- اور خان بہادر صاحب کا لڑکا ———— ؟

دوسرا:- مر گیا ———— کیا بھروسہ ہے زندگانی کا !

خان بہادر:- بیٹی نسرین ! یہ مجھ پر پہلی ہی مصیبت نہیں مختلف پریشانیوں ہی کا نام تو زندگی ہے - دوستوں نے دھوکے دیئے ، افسروں نے وعدہ خلافی کی - کئی بار تو گودام میں آگ لگ چکی ہے - نسرین بیٹا ، تم سُن رہی ہو - دیکھو اس طرح گھُلتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں - اور دیکھو شاہ صاحب نے ہمیں کتنا بڑا اطمینان دلایا ہے - نسرین !

نسرین:- (ایک آواز قدرے بھرائی ہوئی ہے) جی !!

خان بہادر:- شاہ صاحب نے فرمایا : ہم ہی لوگ زندگی میں کامیاب نہیں !

نسرین: کس لئے ؟

خان بہادر:- اس لئے کہ ہم ابھی رنج و غم میں غرق ہیں - کیا بات فرمائی ہے شاہ صاحب نے - اُس اُفق پر جہاں زندگی اور موت کی حدیں ملتی ہیں ، بڑے سے بڑا رنج اور بڑی سے بڑی مسرت ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ کی طرح مٹ جاتی ہے -

(دور قدموں کی چاپ)

خان بہادر:- کون آ رہا ہے ؟

نسرین:- جاوید ہوں گے ، اور کون ؟

خان بہادر:- لیکن جاوید کا اس وقت یہاں آنا کیا ٹھیک ہو گا ؟

نسرین:- کیا مطلب ؟

(بہت نزدیک قدموں کی چاپ)

خان بہادر: وہ ہماری ان باتوں کا مذاق اُڑاتا ہے وہ یہ سب نہیں سمجھ پاتا -

(کھٹکھٹانے کی آواز)

خان بہادر:- آؤ بھئی جاوید !

جاوید:- آداب عرض ، آپ کے مزاج ....

(پھر نسرین سے) اور تم کیسی ہو نسرین ؟ بہت مضمحل نظر آتی ہو میں تمہارے گھر گیا تھا تمہیں دیکھنے -

خان بہادر:- میں نے نسرین کو یہیں بُلا لیا ہے میں نے کہا - پرویز نہیں رہا تو نسرین تو اُس کی جگہ لے سکتی ہے میں کہا - بیٹی نسرین آؤ - سب کچھ تمہارا ہے - میں کس لئے ہوں ؟

(ہنستا ہے - لیکن اُسے بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ مذاق عامیانہ ہے - اس لئے وہ اُلجھن میں پھنس جاتا ہے)

جاوید:۔ (خان بہادر صاحب سے) میرا خیال تھا کہ آپ کچھ دنوں کے لئے آب و ہوا تبدیل کرنے کے لئے کسی پُر فضا مقام پہ چلے جاتے اور نسرین . . .

نسرین:۔ اور نسرین کیا ——— ؟

جاوید:۔ (نسرین سے) تم ذرا ان جھنجھٹوں سے دُور رہ کر اپنے دل و دماغ کو آرام دو۔

نسرین:۔ (دل سے) یہ سب کتنا اچانک ہو گیا جاوید۔

جاوید:۔ کوئی بات نہیں۔ زندگی یہیں تو ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ خان بہادر صاحب کو دیکھو ———

خان بہادر:۔ اس حادثے نے تو میری زندگی ہی ختم کر دی ہے۔ میں تو جیتے جی ہی مر گیا تھا۔ تم جانتے نہیں پرویز کو (نسرین سے) نسرین! تم اس کی منگیتر تھیں۔ وہ تم سے محبت کرتا تھا ———

جاوید:۔ تم اس کے دوست تھے اور اس کے دل کے ان رازوں سے واقف تھے جو ایک جان سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا۔ پھر بھی مجھے اس کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ ہم اسے نہیں جانتے تھے جیسے زندگی میں کسی کو جاننا سمجھنا ناممکن ہے۔ موت ہی سارے پردوں کو اٹھا سکتی ہے۔

خان بہادر:۔ میرا بیٹا۔ جیسے مر کر ایک نئی سلجھی ہوئی زندگی پا گیا ——— جانتے ہو جاوید؟

جاوید:۔ جی، (توقف) آپ جانتے ہیں خان بہادر صاحب میں کیا سوچتا ہوں؟

نسرین:۔ (ابھی آدھی بات) ہم لوگ بہت سوچتے ہیں۔ ہمیں اتنا نہ سوچنا چاہیئے۔

خان بہادر:۔ خوب! جانتے ہو ڈاکٹر رشید نے یہ سن کر کیا کہا؟ ——— فوت صرف دماغ کی موت ہے، دماغ کی لاتعداد الجھنوں سے نجات ———

جاوید:۔ (فیصلہ کن آواز میں) نسرین! میرا اپنے مرحوم دوست کی خاطر یہ فرض ہے کہ تمہیں ان بے وقوفیوں سے دُور رکھوں۔ کوئی بات نہیں ہے کہ پرویز کو گئے ابھی مہینے بھر بھی نہیں ہوئے اور ہم لوگ یہ دوانگی رچائے بیٹھے ہیں۔ یہ چاروں طرف سیاہ پردے کیوں ٹانگ رکھے ہیں؟ (گھبرا کر) یہ رنگ برنگ روشنیاں کیوں لگائی گئی ہیں؟ یہ بھی کوئی تھیٹر ہے؟ (نفرت آلود پیرایہ میں) اور نسرین، تمہیں یہ مغالطہ کس نے دیا کہ تمہارے سانولے رنگ پر کالے کپڑے کھلتے ہیں۔

نسرین! تم میری ستائش کر رہے ہو!

خان بہادر:۔ (بزدلانہ انداز میں) تم پرویز کے دوست ہو جاوید، لیکن واقعی تم حد سے بڑھتے جاتے ہو۔

جاوید:۔ اُف! آپ لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی کہ پرویز واقعی مر بھی ہے یا نہیں چل دیا۔ کون یقین کرے گا . . . . .

خان بہادر:۔ (غمگین لہجے میں) یعنی تمہارا خیال ہے کہ پرویز ابھی زندہ ہے (ناممکن)۔

جاوید:۔ (قہقہہ) اب کوئی اسے المیہ کہے یا طربیہ۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس لاش کو ہم پرویز سمجھ کر دفن کر آئے شاید وہ پرویز کی لاش نہ ہو۔ جسے ان ریسرچ کے شوقین لڑکوں نے چیر پھاڑ کر اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ پہچانی جا سکے اور ——— اور یہ تو ثابت ہی ہو گیا کہ وہ موت ڈوبنے سے نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندہ پرویز آپ لوگوں کے لئے کوئی مصرف ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کو تو مرنے کے بعد پہچانا گیا ———

خان بہادر:۔ جاوید! تم بہت گھبرائے ہوئے ہو ——— بس تم گھبرائے ہوئے ہو!

جاوید:۔ (بے پروائی سے) اور ——— کیا اس کے پاس یہاں سے چپکے سے موت کا کھیل کھیل کر چھپ جانے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی خان بہادر صاحب! ان دیواروں ——— ان دیواروں کو توڑ کر نکل جانے کے لئے کون بیتاب نہیں رہتا؟ اور کون جانتا ہے۔ کب کوئی روشنی کی بہشت اور جگمگاتی ہوئی ضیافت منظور کر لے۔ رہے خان بہادر صاحب! جس روز بھی اس نے خود کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کی، تو آپ نے فرض، ادب، تمیز کی آڑ لے کر دبا دیا۔

نسرین:۔ (جو سب سے پہلے سکون حاصل کرتی ہے) جاوید! مسٹر جاوید! کسی پارک یا کسی خوشگوار سڑک پر اپنا دماغ ٹھنڈا کر آئیے۔

جاوید:۔ معاف کیجئے! میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ ایک دن ایسا بھی آئے کہ پرویز ہماری اوچھی زندگی اور اوچھی

ت کی تمام منزلیں پار کر کے آجائے تب شاید اس کے سامنے ہماری مرجھائی ہوئی پژمردہ زندگی اور موت کا بے حس کرنے والا اندھیرا پناہ مانگے گا (گھبرائے ہوئے قدموں کی چاپ)

دوسرا منظر

(ایک مہینے کے بعد)

(موسیقی کچھ لطیف، پھر سہمی سہمی گھنٹیوں کی شان ہے۔ گاہے گاہے پرندوں کی چوں چوں۔ یکایک یہ آوازیں رک جاتی ہیں اور نسرین مہر سکوت توڑتی ہے)

نسرین:۔ کیا ہوا مسٹر رشید؟

رشید:۔ کیا تم نے اپنے آپ کو کوئی کوشش کی تھی؟

(سکوت، بولو!

نسرین:۔ ہاں! میں اُن سے معافی مانگنا چاہتی ہوں ۔ زندگی میں کئی موقعے آئے جب میں نے اُنہیں اپنے قابل نہیں سمجھا۔

رشید:۔ میرا خیال تھا کہ آپ خود کو انتہا سے بے بس نہ سمجھتی ہوں گی۔

نسرین:۔ آپ کیوں اتنے بے رحم ہیں۔ آپ مجھے میری کمزوریاں کیوں یاد دلاتے ہیں؟ میں پرویز کے سامنے ہمیشہ بے بس رہی ہوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے بس رہنا چاہتی ہوں ـــــ سمجھے ـــــ کتنا تھکا دینے والا ہے یہ سب!

رشید:۔ خود کو پورا پورا دوسرے کو سونپ دینے پر بھی ـــــ!

نسرین:۔ (یکدم گھبرا کر) یہ کس نے کہا؟ کس نے اپنے آپ کو سونپا؟ میں نے؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا

(قہقہے ـــــ قدموں کی چاپ)

خان بہادر:۔ (جاوید اور پھر نسرین سے مخاطب ہو کر)۔ (باہر سے) جانتے ہو مسٹر رشید ابھی کیا ہوا؟ میں معلوم ہے نسرین! پرویز نے ابھی کیا کہا؟ (وقفہ) ـــــ اُس نے میری وہ پرابلم حل کر دی۔ کسی نے اُس کا ذکر کیا ہوگا، لیکن میں اسے بالکل فراموش کئے ہوئے تھا۔ ابھی غسل خانہ میں یکایک پرویز کی آواز آئی۔ پہلے دیوار پر وہی دو گلے کالے دائرے بنے اور پھر آواز آئی۔ اس نے … کچھ

مشینیں کیوں نہ خریدیں۔ اس طرح میں آسانی سے دس بارہ کھڈیوں کی بچت کر سکتا ہوں۔ بیٹی نسرین! تم خود سوچ سکتی ہو کبھی وہ اپنی زندگی میں میرے کاروبار میں دلچسپی لینے کی بات خواب میں بھی سوچ سکتا تھا!!

رشید:۔ ایسا نہیں ہے خان بہادر صاحب! … سنیے گا مجھے آپ سے اختلاف ہے۔

خان بہادر:۔ یعنی ـــــ؟

رشید:۔ وہ ہمیشہ مجھ سے آپ کے کاروبار کے متعلق گفتگو کرتا رہتا تھا۔ ایک دن تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اُسے کوئی با اعتبار آدمی مل جائے جس پر اُسے پورا پورا اطمینان ہو اور اُس کا اس دنیا سے رشتہ قائم رکھ سکے تو وہ آپ کا سارا کاروبار سنبھال لے۔

خان بہادر:۔ (متاثر ہو کر) خدا اسے زندہ رکھے اور (محسوس کرتے ہوئے) آہ!

نسرین:۔ (عجیب آواز میں) مردہ رکھے گا۔

رشید:۔ موت ـــــ زندگی اور موت کاذن شادی ہے۔

نسرین:۔ گویا ـــــ مرتے ہوئے لوگ زندہ ہیں ـــــ اور زندہ انسان، یعنی ہم لوگ مردے ـــــ سڑتی ہوئی لاشیں؟

خان بہادر:۔ کیا تمہاری طبیعت کچھ ناساز ہے؟

نسرین:۔ جی ـــــ بالکل نہیں۔ صرف دوسری طرح کی ہے۔ ایک حد کی طبیعت رکھتے رکھتے ایک عجیب موڈ (مسکرا کر) بن گیا ہے۔ ذرا تبدیل آب و ہوا کے لئے میں شام کو آپ کے ساتھ باغ میں چلی گئی تھی بس ـــــ

رشید:۔ اعتماد ہی زندگی ہے اور بے اعتمادی موت ـــــ اور ان دونوں سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے ـــــ

خان بہادر:۔ (بات کاٹ کر) آپ کا کیا خیال ہے نسرین کو کبھی سکون نصیب ہوگا؟

رشید:۔ ہوگا کیوں نہیں۔ ضرور ہوگا لیکن ـــــ نسرین کو سکون کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ہے۔

خان بہادر:۔ آپ کو!

رشید:۔ (پہلی مرتبہ مضطرب ہو کر) یہ آپ کی اور آپ

سے زیادہ نسرین کی خود غرضی ہے ۔ اگر آپ نے اس سے پہلے نہیں جانا (جذباتی انداز میں) میری نسیں ٹوٹ رہی ہیں میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں ۔ کیا آپ نے سوچا تھا کہ میں پتھر کا بنا ہوا ہوں !

خان بہادر :۔ میری سمجھ میں تو اس بھید کا مطلب خاک نہیں آیا ۔

رشید :۔ (پر سکون آواز میں) آپ نہ سمجھیں گے ، نسرین نہ سمجھے گی ——— سمجھنے کی ساری ذمہ داری خود مجھی پر ہے ——— اور میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر کیوں لی !

خان بہادر :۔ آپ یہ سب باتیں کیوں کر رہے ہیں ؟ ——— آخر ان باتوں سے مطلب ! آپ زندگی کے راز اور موت کے اسرار سے خوب واقف ہیں ۔ آپ نے مجھ جیسے اونٹے بڈھے باپ کو اس کا مرا ہوا بیٹا دلا دیا ۔ (جذباتی انداز) اور کیا نسرین آپ کا احسان نہیں مانتی ؟

رشید :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) شاید ——— !

خان بہادر :۔ اور دیکھو ——— (باہر شور ہوتا ہے ۔ قدموں کی چاپ)

(پرویز اور جاوید داخل ہوتے ہیں)

جاوید :۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ؟ ——— خیر انہیں پہچانئے ——— یہ پرویز ہیں اور ان سے پوچھئے کہ یہ مذاق انہوں نے کیوں کیا ؟

رشید :۔ (سب سے پہلے بولتا ہے) تم آگئے ——— لیکن ———

(خان بہادر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کرسی پر گر پڑتا ہے)

پرویز :۔ کیا ہے ابا ؟

جاوید :۔ تم مت بولو پرویز ، دیکھتے نہیں ہو تمہارے بولنے سے تمہارے والد کا کیا حال ہو گیا (اٹھ کر) خان بہادر صاحب ! دیکھئے ——— !

رشید :۔ پرویز ، تم جاؤ ۔

پرویز :۔ جاؤں ؟ ——— کیوں جاؤں ؟ یہ کون ہے

جاوید :۔ (نسیم کے قدموں کی نرم آہٹ)

رشید :۔ پرویز ! یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تم مر چکے ہو ۔ دیکھو تمہارے آنے سے تمہارے والد کو کیا ہو گیا ہے کیا تم ان کی جان ہی لینا چاہتے ہو ؟ ——— اب تم چلے ہی جاؤ ۔

پرویز :۔ آپ لوگ تو مجھ سے ڈر رہے ہیں ، جیسے میں کھوت پریت ہوں ۔

رشید :۔ بلکہ پریت سے بھی بدتر ——— تم تو زندہ ہو

پرویز :۔ آپ لوگ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں ؟

نسرین :۔ پرویز ، تم جاؤ ——— یہاں واقعی تمہارے لئے جگہ نہیں ہے ۔

پرویز :۔ نسرین !

نسرین :۔ نہیں پرویز ! تم ہم لوگوں سے دور رہو ، کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا بہروپ ہم آسانی سے قبول کریں گے ۔

پرویز :۔ تم اور تمہارے ———

نسرین :۔ نہیں ! تم ہمارے خواب مت مٹاؤ ، اپنے والد کا دل نہ توڑو ۔

پرویز :۔ لیکن اس سے بڑا فریب کوئی ہو سکتا ہے ؟

نسرین :۔ شاید غلط نہیں کہتے ۔ لیکن زندگی سے زیادہ آسان ہم لوگوں کے لئے فریب میں رہنا ہے ، یہ تم نہیں سمجھتے ۔

پرویز :۔ سمجھتا ہوں ۔ نہیں تو یہاں سے چلا ہی کیوں جاتا ! کیسے نہ جاتا ! ——— میرا دم گھٹا جا رہا تھا ۔

رشید :۔ تو پھر واپس کیوں آگئے ؟

نسرین :۔ (خواب آسا آواز میں) تم تو میری بات سنتے ہی نہیں ۔ ہم ایک روشن آفتاب کی طرح ہیں ۔ میری زندگی کا آفتاب بجھ چکا ہے ۔ شاید کبھی روشن رہا ہو ۔ تمہارا آفتاب ابھی روشن ہے ۔ تم اپنی خاطر ، ——— اور ہم لوگوں کی خاطر جاؤ ۔ ہمیں اسی فریب میں پھر سے مبتلا کر دو کہ مر چکے ہو ——— اور ہم سب تمہاری روشنی میں جیتے رہیں گے ۔ تم نہیں سمجھتے ——— پرویز ! تم اپنے والد ——— اپنی محبوبہ پر ترس کھاؤ گے ۔ ہم زندگی پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور نہ موت پر یقین رکھتے ہیں ——— تم ایک بار ان دیواروں کو توڑ کر نکل گئے تھے ، لیکن پھر کیوں وہیں آگئے ——— تم جاؤ !!

(فیڈ آؤٹ)

عزیز الحسن عزیزؔ متھراوی

امکانات

اگر تم نے نہیں تو یاد نے برباد کی ہوگی　　میں کیسے مان لوں دنیا مری خود لٹ گئی ہوگی
عناصر کی بہم قدرت نے جب ترتیب دی ہوگی　　محبت نے مرے سینے میں پہلی سانس لی ہوگی
کنارے لگ کے جب غرقاب کشتی ہو رہی ہوگی　　تمہارے ڈوبنے والے کو دنیا دیکھتی ہوگی
زبانِ حال سے افسانۂ غم کہہ رہی ہوگی　　ہماری نعش کی صورت ترا منہ دیکھتی ہوگی
محبت میں تمہاری جب سرِ دم پر بنی ہوگی　　مرے دل کو تمہیں نے آخری آواز دی ہوگی
نظر جلووں کی جانب بیخودی میں جب اٹھی ہوگی　　تماشائی کی دنیا بھی تماشا بن گئی ہوگی
محبت میں وہی منزل یقیناً آخری ہوگی　　جہاں خود حسن کی فطرت بھی کچھ مجبور سی ہوگی
سہارا جب وہ دینے آئیں گے میری امیدوں کو　　محبت آخری ہچکی بھی شاید لے چکی ہوگی
جھکا دوں سر یہ کس کا آستاں مجبور کرتا ہے　　مرے سجدوں سے تکمیلِ نمازِ عاشقی ہوگی
میں جب گلشن سے گزروں گا مرقع بن کے وحشت کا　　گلوں میں بھی مرے چاکِ گریباں کی ہنسی ہوگی
نہ وہ جلوہ نہ وہ منظر نظر کے سامنے ہوگا　　مجھے جب ہوش آئیگا تو دنیا دوسری ہوگی
توجہ کی ضرورت ہے ابھی دنیا بدل جائے　　محبت کی تڑپ لیکن تمہیں محسوس بھی ہوگی؟
طبیعت خوگرِ احساسِ ناکامی تو ہو جائے　　خوشی کا آج غم ہے کل مجھے غم کی خوشی ہوگی
تصور عین مجبوری میں جب گھبرا گیا ہوگا　　نظر نے ہو بہو تصویر ان کی کھینچ دی ہوگی
بھلا وہ عالمِ گم گشتگی میں کیوں نہ رہ جائے　　جو منزل کاٹ کر سمجھے کہ منزل دور ہی ہوگی
تغافل کیش مجبوری کا عالم کوئی کیا جانے　　مرا کیا حال ہوگا جب تری یاد آ رہی ہوگی
بڑھاؤں گا میں ان سے کم سے کم جتنا محبت کو　　زیادہ سے زیادہ ان کی الفت میں کمی ہوگی
گئے ہیں جب سے وہ کچھ بھی نظر آتا نہیں مجھکو　　مری آنکھوں میں بھی یارب کسی دن روشنی ہوگی
گراں حرفِ تمنا طبعِ نازک پر نہ گزرے گا　　شکستِ رنگ کی آواز میں بھی خامشی ہوگی
بہت سجدے کئے ہیں میں نے ان کو دل کے دھوکے میں　　بھلا اب اور کیا معراجِ حسنِ بیخودی ہوگی

میسر ہی نہیں افکار سے جمعیتِ خاطر
عزیزؔ اپنی پریشانی کسی دن دور بھی ہوگی؟

پروفیسر مرزا محمد بشیر ایم۔ اے

شہیدی

ادب اُردو کی اکثر تاریخوں میں بعض شاعر جو دہلی یا لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے وہ مرتبہ نہ پا سکے جس کے کہ وہ مستحق تھے چنانچہ کرامت علی خان متخلص بہ شہیدی بھی ادبی تغافل و بیگانہ وشی کا نشانہ بنے۔ شہیدی بانس بریلی کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالرسول خان تھا۔ انہوں نے تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی اور بعد ازاں سرکار انگریزی کے ملازم ہو گئے۔ اسی ملازمت کے سلسلے سے وہ نیمچہ چھاؤنی پہنچے جہاں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا۔ بات یہ ہے کہ وہ نہایت خوش طبع، یار باش اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔ چھاؤنی میں ان کا تعلق کمسریٹ سے تھا۔ اسی یار باشی میں انہوں نے بہت سا روپیہ اڑا دیا۔ "جب حساب طلب ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تھے طبیعت دار جس مکان میں دفتر تھا اسی کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ رات کو اس میں آگ لگا دی۔ ان کے سامان کے ساتھ دفتر بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ کچھ دنوں کے لئے دیوانے بن گئے اور خدا خدا کر کے جان بچی"۔[1]

اس ملازمت سے دستبردار ہو کر کہیں نوکر نہیں ہوئے۔ انہوں نے سیر و سیاحت میں عمر بسر کی۔ بھوپال، دہلی، اجمیر، پنجاب اور گجرات اکثر جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ان سے دہلی میں ملے اور وہ اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں فرماتے ہیں: "ہنگام ورود دہلی با راقم اثم بارہا برخوردہ۔ مرد بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب ست"۔

شہیدی نے جب لکھنؤ میں ہوش سنبھالا تو وہاں کی فضا نغمہ و شعر سے معمور ہو رہی تھی۔ جرأت کی رنگیں نوائیاں اور انشاء کے چہچے گونج رہے تھے۔ مصحفی سا حکیمت گرو اپنے اعجاز دکھا رہا تھا۔ شہیدی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ مصحفی امروہہ کے تھے اور شہیدی بریلی کے۔ استاد نے شاگرد پر خاص توجہ کی اور اس کی طبیعت اپنا اصلی جوہر نمایاں کرنے لگی۔ شہیدی کو بڑا درد آشنا دل ملا تھا۔ وہ اپنے ستم رسیدہ دل کی دکھ بھری کہانی جب اپنے سادہ و سلیس طرز میں بیان کرتے ہیں تو اپنے معاصرین ناسخ و آتش سے کسی طرح کم نظر نہیں آتے۔ ان کے یہ تین مقطعے سننے کے قابل ہیں ؎

شہیدی سے نہیں واقف ہیں ہم اتنے تو واقف ہیں
کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پہ
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

دل کے جلنے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ! اگر ہم عمر بھر رویا کئے

ان کے بعض شعر حسن خیال و حسن بیان کا مرقع ہیں۔ وہ مضمون کو بڑی صداقت اور جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں ؎

دے چکی تھی مری قسمت تو مجھے صاف جواب
مرحبا جذبۂ دل وقت پہ کیا کام آیا

ان کی زبان و بیان میں ایک خاص لوچ اور لطافت تھی خود ان کا بیان یہ ہے ؎

ہے طرفہ تر زبان شہیدی میں چاشنی
سودا سے اس نے لی ہے شکر میر سے نمک

اس "چاشنی" کی دلاویزی کا خاص سبب سادگیٔ بیان ہے

بیٹھ جاتا لب فرش آ کے اگر ایک گدا
اس میں نقصان ترا کیا صاحب محفل ہوتا

میں تو سمجھاؤں ہزار اس کو شہیدی لیکن
میرے سمجھانے سے اب یہ دل شیدا سمجھا

کلام کی مقبولیت کا بین ثبوت ان کے وہ اشعار ہیں جو زبان زد خلائق ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کی گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

---

[1] گل رعنا صفحہ ۳۴۳

شہیدی نہایت خوش طبع ظریف شخص تھے۔ مزاح و ظرافت کے پردوں میں ان کی طبیعت کی رنگینی اپنے رنگا رنگ جلوے دکھاتی ہے ؎

یہ عاصی رہے نار میں یاالٰہی
بہشت بریں میں وہ کافر نہ ہوگا

شرم آتی ہے وگرنہ ان بتوں کی ضد سے میں
جیتے جی اللہ سے اک حورِ جنت مانگتا

اس زمانہ میں جراءت کی رنگینیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اسی رنگ کے گل بوٹے ان کے کلام میں بھی کثرت سے ہیں۔ ان کی غزلوں میں عموماً قطعہ بند اشعار ہوتے ہیں اور ان رنگین اشعار میں محض معاملہ بندی ہی نہیں ہوتی بلکہ زبان کی چاشنی کے علاوہ کوئی نہ کوئی سبق آموز نکتہ بھی ہوتا ہے۔ یہ قطعہ ہے ؎

خلوت میں پاکے میں نے کہا اس سے ایک رات
کچھ دل میں صبر آج ذرا دیکھتا نہیں
در بند ہمنشیں کو نشے کی ہے بے خودی
یاں کوئی میرے تیرے سوا دیکھتا نہیں
آنکھوں میں آپ شمع کے چربی ہے چھا رہی
گل خود ہے زرخرید ترا دیکھتا نہیں
بولا کہ اتنے روزوں سے صحبت تجھے ملی
پر حیف تو مزاج مرا دیکھتا نہیں
تیرے اگر لحاظِ ادب پر پڑا نقاب
کمبخت میری شرم و حیا دیکھتا نہیں
اے بے خبر اندھیرے اجالے کے کام کو
دیکھے نہ دیکھے کوئی خدا دیکھتا نہیں

لکھنؤ کا مکتب شاعری عورتوں کے خدوخال، لباس اور زیورات کے کھلم کھلا ذکر کو معیوب نہیں سمجھتا۔ شہیدی نے لکھنؤ میں پرورش پائی۔ ان کا تعلق جس ماحول و معاشرت سے تھا اس کے رسوم و خیالات کا عکس ان کے کلام میں ہے

ہرا بھرا رہے تیرا شباب لاکھ برس
دکھا ہمیں بھی ذرا چوڑیوں کا دھانی رنگ

عاشق کے سوگ میں انہیں ہرگز نہ توڑنا
چوڑی سے تیرا ہاتھ ہے دلبر بھرا ہوا

قہر ہے صاحب عصمت کا وہ جھک کر چلنا
پس دیوار کہ ہے تا بہ کمر کوٹھے پہ

ان کے کلام کی ایک یہ بھی خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ بقول مصنف گل رعنا[1] وہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو ایک طرح میں چھ چھ اور پانچ پانچ غزلیں لکھتے تھے اور کوئی غزل چھبیس اور تیس شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ ہمارے سامنے دیوان شہیدی (مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۲ء) موجود ہے۔ اس میں کوئی دو غزلہ نہیں اور نہ ہر غزل چھبیس شعر کی ہے حالانکہ دیوان میں علاوہ رباعیات و قطعات وغیرہ کے ۲۴۵ غزلیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اکثر مشکل زمینیں پسند کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کا عام مذاق تھا اور پھر وہ مصحفی کے بعد شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کو اس سے خاص ذوق تھا۔ خود شہیدی فنِ عروض کے ماہر تھے اور ان کی منچلی طبیعت بھی نئی راہوں کی متلاشی رہتی تھی ؎

نورِ شہیدی ابر سیہ سے کہہ دو شراب پیتے ہیں جس جگہ
وہیں جابرس وہیں جابرس وہیں جابرس وہیں جابرس

ان کے کلام کی اس ممتاز خصوصیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نعتیہ و حمدیہ غزلیں ہمارے ادب میں ایک اہم مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کو رسالتمآب ؐ سے جو والہانہ عشق تھا اس کا پرجوش اظہار جس صداقت و لطافت سے کیا ہے وہ شاعری کی جان ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر جامیؒ کے نعتیہ کلام نے ان کو بہت متاثر کیا تھا اور پھر خود ان کو اسی شراب نے متوالا بنا رکھا تھا ع

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

حمد میں ان کے یہ اشعار بہت مشہور ہوئے ؎

وہ گنج ذات کیا کچھ ہوگا یارب میں تو حیراں ہوں
حفاظت کے لیے جس پر طلسم دو جہاں باندھا
شہیدی کثرتِ عصیاں سے مجھ کو خوف آتا ہے
سفر ہے دور کا اور دوش پر بارِ گراں باندھا

نعت میں ان کا مقطع ہے ؎

خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

---

[1] گل رعنا۔ صفحہ ۲۳۲۔

اسی نعت میں ان کے یہ دو شعر بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوئے وہ اشعار یہ ہیں ؎

ہوئی ہے ہمت عالی میری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیرے مرقد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

وہ ۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے اسی سال فریضۂ حج ادا کر کے مدینۂ منورہ جا رہے تھے کہ راستے میں بیمار پڑے۔ ۴ صفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت تمام منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے مقام پر پہنچے جہاں سے روضۂ مطہر نظر آتا تھا ایک حسرت ناک نظر اس پہ ڈالی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا[1]۔ رسول عربی کی محبت ایک ہندی شاعر کو کشاں کشاں مدینۂ منورہ لے گئی جہاں اس کی شاعرانہ آرزو بر آئی۔ ہمارے گھروں میں مولود شہیدی کا چرچا اب بھی ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور رنج بھی کہ ہماری اکثر مستند ادبی تاریخیں ان کے حالات و کلام دونوں سے خالی ہیں۔ مصحفی نے سچ کہا ہے ؎

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

[1] گل رعنا صفحہ ۳۳۳

حکیم صغیر حسین زیبا ناروی

دِل بنا

غم بنا، راحت بنا، آساں بنا، مشکل بنا
تم نے جو چاہا محبت میں وہ میرا دل بنا

عشق کا آئینہ بن کر حسن کی محفل بنا
کچھ نہیں تھا پہلے پھر سب کچھ ہمارا دل بنا

عشق کی دنیا میں سوز و ساز کا حامل بنا
خاکِ پروانہ کا ہر ذرہ تڑپ کر دل بنا

حسن نے دیکھا ازل میں اس نگاہِ سخت سے
ٹوٹ کر آئینۂ کونین ہمارا دل بنا

خارِ غم بن کر چبھا چبھ کر نہ نکلا عمر بھر
دشمنِ دل رفتہ رفتہ مدعائے دل بنا

جلوہ جلوہ پہ جبینِ آرزو جھکنے لگی
حسن کا آئینہ خانہ سجدہ گاہِ دل بنا

غم نے لوٹا یاس نے روندا مٹایا درد نے
جب کبھی راہِ وفا میں دل ہمارا دل بنا

آئے دن تازہ بہ تازہ حسرتیں بڑھتی رہیں
ذوقِ بے حد کی بدولت دل ہمارا دل بنا

بادِ غم، اشکِ وفا، خاکِ جنوں، سوزِ فراق
یہ ہیں وہ چاروں عناصر جن سے میرا دل بنا

دستِ قدرت میں کسی شے کو تڑپتا دیکھ کر
بے تحاشا ہم پکار اُٹھے۔ ہمارا دل بنا

دل کے ارمانوں پہ زیبا اوس پڑ کر رہ گئی
آشنائے دل جو تھا نا آشنائے دل بنا

سرکش

شریف عنایت اللہ

آج شام ہی سے اُس کے یہاں کانفرنس ہو رہی تھی۔ ریڈیو کے قریب اس کی بڑی بہن اُما بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی۔ پاس ہی اس کی دو سالہ بچی کھیل رہی تھی۔ ریڈیو کے مقابل اس کی ماں بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔ دروازے کے پاس اس کا باپ بیٹھا تھا پریشانی کے عالم میں بار بار اس کی نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھ جاتیں۔ دس بجنے کو آئے تھے مگر اب تک بینا کا پتہ نہ تھا۔ سریش بابو کے مقابل کوچ پہ بینا کی اُستانی بیٹھی تھیں۔ بارش ہو کر ابھی ابھی تھمی تھی۔ آسمان پہ تیرتے ہوئے بادلوں میں سے اب چاند نکل آیا تھا ——— "دس بجنے کو آئے مگر اب تک نہیں آئی کم بخت"۔ باپ نے غصہ سے انگلیاں چٹکا کر کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ لونڈیا کو کالج میں داخل نہ کرو۔ مگر میری کوئی مانے تب نا۔ اب بیٹھے روؤ اپنی قسمت کو" ماں نے بڑبڑایا۔ "اب تم چپ بھی رہو"۔ باپ نے کہا۔ "تم تو ایسی باتیں کر رہی ہو جیسے میں نے خود اپنی بیٹی کو بُرائی کے راستے لگایا ہے۔ اوروں کے بچوں کو دیکھتا تھا۔ کوئی وکیل تھا کوئی ڈاکٹر۔ اما کو پڑھانے کا ارادہ کیا لیکن میری آرزو پوری نہیں ہوئی۔ تم نے اس کی شادی کر دی اور پھر شادی کے بعد وہ ماں بن گئی۔ بینا ذہین تھی۔ میں اپنی بیٹی کو گریجویٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ سوسائٹی میں لوگ جب اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی اعلیٰ تعلیم کے تذکرے کرتے تو شرم سے میرا سر جُھک جاتا۔ میں نے بینا کو صرف اس لئے کالج بھیجا کہ وہ ایک دن گریجویٹ ہو کر کانووکیشن گون پہنے میرے سامنے ہوگی اور میں فخر سے گردن اٹھا کر سوسائٹی سے کہہ سکوں گا کہ میری بیٹی بھی بی۔اے ہے۔ بھگوان نے مجھے بیٹا نہیں دیا تو کیا ہوا۔ بیٹے کی کمی میری بہادر بیٹی پورا کئے ہوئے ہے۔ لیکن واہ ری قسمت! اب یہاں تو اپنی عزت ہی کے لالے پڑ گئے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ وہ یوں ایک مسلمان بچے کے ساتھ آوارہ گردی کرتی پھرے گی"۔ ——— ماں نے کچھ کہنا چاہا لیکن

باپ کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ بوڑھی استانی نے چشمہ ٹھیک کیا اور پھر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "سچ ہے سریش بابو۔ کلجگ آ گیا ہے۔ کلجگ۔ ہم بھی تو آخر کبھی جوان تھے۔ تم لے بیٹے جو کبھی کسی غیر مرد سے بات تک کی ہو۔ ان آج کل کی لڑکیوں کے تو کچھ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ اب اُما بیٹی ہی کو لیجئے نا۔ کیسی شرمیلی ہے شادی ہوئے تین سال ہو چکے ہیں مگر اب تک غیر مرد کی شکل سے بھی گھبراتی ہے بیچاری۔ میں تو بچپن ہی سے دیکھتی آئی ہوں اسے"۔ اُما کے ذکر پر سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ماں نے فخر کے ساتھ اپنی فرمانبردار بیٹی کو دیکھا اور اُما نے سب کی نظروں سے بچنے کے لئے تیزی سے نٹنگ کرنا شروع کر دیا۔ غیر مردوں کے ذکر پر اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ چہرے کا اُتار چڑھاؤ اس بات کو نمایاں طور پر ظاہر کر رہا تھا کہ ماضی سے متعلق کچھ خلش انگیز یادیں، کچھ پریشان کن خیالات اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا رہے ہیں جیسے سمندر کی سطح پہ تاریکی کے کالے کالے سائے۔ اُسے چندر کانت کی یاد آ گئی۔ شادی سے پہلے اپنے ماں باپ سے چھپ کر وہ اکثر اس سے ملا کرتی تھی۔ کیسی محبت تھی اُسے چندر کانت سے! مگر کیا وہ محبت تھی یا صرف جوانی کا نشہ؟ اس خیال ہی سے اُس نے ایک جھرجھری لی۔ نٹنگ کی تیزی میں اور اضافہ ہو گیا

"تو مسز چکا بش! آپ نے خود اُسے محمود کے ساتھ دیکھا تھا؟" باپ نے پریشان کن لہجے میں پوچھا ———

"جی ہاں۔ میں نے ہی انہیں دیکھا۔ بھلا میں دوسروں کی باتوں پہ اعتبار کر کے یہاں تک کیوں دوڑی آتی۔ کیا بتاؤں سریش بابو۔ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ حد ہو گئی بے حیائی کی۔ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ وہ اُس مسلمان چھوکرے کے شانے سے لگی کھڑی

تھی اور اُس کا سر اُس محمود کے بچے کے سینہ پر تھا۔ مجھ سے تو دیکھا نہ گیا اور میں سیدھی یہاں چلی آئی۔" اُستانی نے دوبارہ چشمہ ٹھیک کیا۔ باپ غصہ سے انگلیاں چٹکانے لگا اور ماں نے چِڑ کر آنکھیں جلدی جلدی جھپکاتے ہوئے کہا "سُن لیا نا تم نے۔ اور اُس مسلمان کے بچے سے ملنے دیا کرو۔ میں تو شروع ہی سے کہتی آئی تھی کہ غیر مذہب کے لوگوں سے جوان لڑکی کا میل ملاپ اچھا نہیں۔ مگر تم تو ڈاکٹر صاحب کی دوستی میں سرشار ہو۔ وہ غیر تھوڑے ہی ہیں۔ اپنا ہی تو بچہ ہے۔ ابھی بِٹیا کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ تو محمود کو اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ دیکھ لیا نا اب اِن بھائی بہن کے کرتوت۔ ناک ہی کاٹ ڈالی اپنی ——"

"سچ پوچھو تو سرسوتی بہن۔ تمہاری بیٹی کو اسکول کی نئی اُستانی بھارتی دیوی نے بگاڑا ہے۔ بھارتی دیوی تو کلوپیٹرا ہے کلوپیٹرا۔" —— "آج یہ اس وقت کلوپیٹرا کی کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" —— بِٹیا نے اندر داخل ہوتے کہا۔ آج وہ کچھ لنگڑا لنگڑا کر چل رہی تھی ——

"اوہ دیدی آپ اِس وقت اور یہاں؟" ——

اُس نے اُستانی کو نمستے کیا —— "ماں آج میں بہت تھک گئی ہوں ——" یہ کہتے ہوئے وہ دھم سے کوچ پر گر پڑی اور ننھی لتا کو گود میں لے لیا جو بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔

"کیوں ری! تو تھی کہاں اب تک؟" ——

ماں نے کڑک کر پوچھا۔

"کون میں؟ —— ذرا محمود بھائی کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی گئی تھی۔" اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"شرم نہیں آتی تجھے اُسے بھائی کہتے ہوئے؟" —— باپ نے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ بِٹیا چونکی۔ یہ آج آخر سب منہ پھُلائے کیوں بیٹھے تھے؟ باپ کے انوکھے سوال پر اُس نے تعجب سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔ "پتاجی، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ کل تک تو وہ میرے بھائی ہی تھے۔" بِٹیا نے جواب دیا۔

"لو اور سُن لو۔ بِٹیا رانی کو کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ اَری مُردار! اگر اُس پاپی کے سینے ہی لگنا تھا تو پھر ہمارا منہ کالا کرنے یہاں کیوں آئی؟ مری ہوتی اُسی کے یہاں جا کر ——" ماں کا غصہ سے بُرا حال تھا۔

"کون کس کے سینہ لگا؟ یہ آپ سب آج پہیلیاں کیوں بُجھوا رہے ہیں؟ بولئے نا دیدی آپ ہی ——" اُس نے اُستانی سے پوچھا۔ بُڑھیا نے ناک صاف کرنا شروع کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ باپ نے کہا "کم بخت اب ہمیں اُلو بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیا تو محمود کے ساتھ پکچر دیکھنے نہیں گئی تھی؟" —— "جی ہاں۔ گئی تو تھی۔" بِٹیا فوراً بولی۔

"کیا اُس نے تجھے ریگل کے سامنے دن دہاڑے گلے سے نہیں لگایا؟ بول —— بولتی کیوں نہیں؟ ——" وہ گرجا۔ اُس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ باپ کی باتیں سُن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی اس تحقیر سے اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ خودداری نے شرم و لحاظ اور ادب و اطاعت کے تمام جذبات پہ غلبہ پا لیا۔

"کس پاپی نے آپ سے یہ سب کہا ہے؟" —— اُس نے پوچھا۔ غصہ و شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ تھا۔

"سُن لیا نا آپ نے سرلیش بابو۔ —— میں پاپی ہو گئی ہے بھگوان! بچپن سے پڑھایا لکھایا اور اس کا آج یہ صلہ ملا ہے مجھے۔" اُستانی نے گھُٹتے ہوئے گلے میں شکایت کی —— "اوہ۔ تو آپ تھیں دیدی۔ آپ کو ایسی جھوٹی باتیں کرتے شرم تو نہیں آئی ——" پھر اُس نے باپ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا —— "بات صرف اتنی سی ہے پتاجی کہ محمود بھائی میرے لئے ٹکٹ خرید رہے تھے میں جلدی میں تھی کہ فٹ پاتھ پر میرا پاؤں پھسل گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا۔ اگر وہ وہاں موجود نہ ہوتے تو میرے تمام کپڑے کیچڑ سے ستیاناس ہو جاتے۔ چونکہ پیر میں موچ آ گئی ہے اس لئے انہی کا سہارا لے کر مجھے چلنا پڑا۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔ سرلیش بابو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ اس کے گلے لگے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی —— اور ——"

"بی بی جی۔ محمود صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" نوکر نے اطلاع دی۔ محمود کی آمد کی خبر نے سب کو خاموش کر دیا۔ اَماں نے بِننگ کرنا بند کر دیا۔ اُستانی چشمہ ٹھیک

کر وہ بھول گئیں۔ باپ نے انگلیاں چٹخانا چھوڑ دیا اور ماں کا جلدی جلدی آنکھیں جھپکانا ختم ہو گیا۔ بینا کو کچھ عجب سا لگا۔ ابھی تو وہ اُسے چھوڑنے بنگلے تک آئے تھے۔ پھر ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ نہیں؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے۔ باپ نے کہا "بلایا تو نہیں یہاں"۔۔۔۔ اور بینا نے چونک کر باپ کو دیکھا جو ریڈیو پر ہاتھ رکھے گہرے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور محمود داخل ہوا۔

۔۔۔۔ "معاف کرنا چاچا جی۔ مجھے اس وقت تکلیف دینی پڑی۔ تانگے میں بینا کا ہینڈ بیگ چھوٹ گیا تھا۔ اسے واپس کرنے آیا ہوں ۔۔۔۔ یہ لو بینا ۔۔۔۔ ایسی غفلت بھی کیسی؟ ۔۔۔۔" اور اس نے آگے بڑھ کر بینا کو بٹوہ دے دیا۔ سب کو خاموش دیکھ کر اُسے کچھ تعجب سا ہوا ۔۔۔۔ "کیا بات ہے بینا؟ تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے؟ ۔۔۔۔"

"محمود بھائی! اب تم ہی چاچا جی سے پوچھ دیکھو۔ یہ سب آج مجھ پر برس پڑے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ سینما کیوں گئی؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے چاچا جی؟ کیا آپ بینا سے سچ مچ اس لئے خفا ہیں کہ وہ میرے ساتھ سینما گئی۔ اس کے بجائے اگر آپ مجھ سے خفا ہوتے تو بہتر ہوتا۔ میں ہی اُسے زبردستی لے گیا تھا۔ لہٰذا قصوروار میں ہوں"۔۔۔۔ محمود نے مریش بالو سے کہا۔ ان سب کو اب بھی خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی کہنا شروع کیا ۔۔۔۔ "مجھے اگر معلوم ہوتا چاچا جی کہ بینا کو سینما لے جانے سے آپ سب کو خفگی ہو گی تو بخدا میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ بچپن سے وہ میری بہن ہے۔ خدا نے مجھے بہن نہیں دی تو کیا ہوا۔ میں نے بینا کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا۔ چونکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ میرے ساتھ فلمیں دیکھ چکی ہے اس لئے میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اُسے ساتھ لے جانے میں کوئی برائی نہیں سمجھا۔"

"بات تو ٹھیک ہے محمود، لیکن تم نے میری عزت کا تو خیال کیا ہوتا؟" ۔۔۔۔ باپ نے آہستہ سے کہا ۔۔۔۔

"عزت کا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ ۔۔۔۔"

محمود پریشان نظر آ رہا تھا۔

"محمود بھائی! بس سنو۔ یہ تمہاری دیدی نے یہاں آکر سب آگ لگائی ہے۔ ابھی یہ نئی نئی باتیں کی ہیں، خدا کی پناہ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی آج شام تمہارے سینہ سے لگی پورا رستہ بے رنگی سے تمہارے ساتھ پیدل آ رہی تھی۔"

"چپ رہو بے شرم۔ زبان بند رکھو اپنی۔ ایسی باتیں اپنے بزرگوں کے سامنے کہتے تجھے شرم نہیں آتی؟" باپ غصہ سے کانپ سا رہا تھا ۔۔۔۔ "اور کبھی پتا جی جب آپ لوگوں کو اپنی بے گناہ بیٹی پر بے جا تہمت لگاتے شرم نہیں آتی تو مجھے اپنی عزت کے لئے جھگڑنے میں شرم کیسی ۔۔۔۔" تڑاخ سے باپ نے بیٹی کے منہ پہ طمانچہ لگایا۔ اگر محمود آگے بڑھ کر اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ لڑکھڑا کر کرسی پہ گر جاتی۔ ماں کے غصہ کا پارہ اب ساتویں آسمان پر تھا۔ زبان تیز قینچی کی طرح چل رہی تھی ۔۔۔۔ "کمبخت پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو اچھا ہوتا۔ آج اپنے باپ سے زبان درازی کر رہی ہے ۔۔۔۔ عزت لٹا کر آئی ہے اپنے یار کی حمایت کرنے ۔۔۔۔ اے خدا! ۔۔۔۔"

"چپ رہو ماں، خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو" ۔۔۔۔ بینا نے تڑپ کر کہا۔

"چپ رہوں؟ کیوں چپ رہوں؟ ایسی بے حیا اولاد پیدا ہی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ سارے سماج میں ناک کٹ گئی اپنی۔ بے شرم، مردار! تجھے اپنے باپ کی عزت کا بھی خیال نہ رہا۔"

"تو ماں! تم سماج اور دنیا کے ڈر سے ہی اپنی بے قصور بیٹی پر الزام لگا رہی ہو" ۔۔۔۔ بینا نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔ عورت دنیا میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اگر برداشت نہیں کر سکتی ہے تو اپنی عصمت پر دھبہ۔ بینا بھول گئی کہ وہ اپنے ماں باپ سے بحث کر رہی ہے۔ وہ بھول گئی کہ تین گز لمبی زبان رکھنے والی اس کی بوڑھی اُستانی بھی وہیں بیٹھی ہے۔ وہ بھول گئی کہ اس کا ظالم باپ اُسے گھر سے نکال باہر کر سکتا ہے۔ اُسے صرف یہ یاد رہا کہ وہ ایک عورت ہے، وہ عورت جس کی عصمت پر شبہ کیا گیا تھا جس کی خودداری کو دھکا لگایا گیا تھا۔ سوئے ہوئے جذبات جاگ اُٹھے۔ خودداری نے دل و دماغ پہ قبضہ جما لیا۔ نسوانی

وقار نے اس کی گردن کو اٹھائے رکھا۔ محمود کی موجودگی نے اس کی ہمت بڑھائی۔ اور پھر اس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ماں سے کہا ـــــ "تو ماں! تمہیں مجھے اب اپنی بیٹی کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے؟ صرف اس لئے کہ میں اب تک خاموش رہی۔ کان کھول کر سن لو ماں! میں محمود بھائی کے ساتھ سینما گئی تھی۔ سو بار گئی ہوں۔ ہزار بار جاؤں گی۔ مجھے تمہاری دنیا اور اس کے اصول کی پروا نہیں بارش کی وجہ سے شو کے بعد سینما ہال کے دیران برآمدے میں میں نے محمود ہی کے ساتھ ایک گھنٹہ گزارا۔ سڑک پر انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر گرنے سے بچایا تھا پیر میں چوٹ کے سبب میں انہی کے بازو کا سہارا لئے چلتی رہی۔ جی ہاں ـــــ مجھے ان سے محبت ہے ـــــ بے انتہا محبت ـــــ میں اکثر اُن سے ملتی رہی ہوں اور ملتی رہوں گی۔ دیکھتی ہوں کون روکتا ہے مجھے ـــــ پتا جی ـــــ" اس نے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ـــــ "مجھے آپ کی دنیا اور آپ کے سماج کی ستی بھر بھی پروا نہیں ـــــ چاہیے اپنے سماج کے کتوں سے کہئے وہ جو چاہیں کریں میں اُن کے ذلیل اور دقیانوسی اصول کے خلاف بغاوت کر رہی ہوں ـــــ بے دریغ ـــــ آؤ محمود بھائی"ـــــ اُس نے محمود کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ـــــ "جس گھر میں عورت کی عزت نہیں۔ جہاں عورت کی حالت ایک قیدی کی سی ہے جہاں حق کے لئے آواز بلند کرنا جرم ہے ایسے گھر سے بے گھر ہی بھلے"ـــــ ماں باپ نے گھبرا کر باغی بیٹی کو دیکھا ـــــ "لیکن بینا ـــــ میں ـــــ یعنی"ـــــ محمود نے گھبرا کر کہا ـــــ "کیوں بھیا۔ کیا ابھی سے گھبرا گئے؟ بھول گئے کیا وہ باتیں جو تم عرصہ ہوا کہا کرتے تھے ـــــ آزادی لڑ کر لو ـــــ بھیک مانگ کر نہیں ـــــ میری ننھی بہن کو ساری دنیا ٹھکرا دے لیکن پھر بھی بھائی کا گھر ہمیشہ اُس کے لئے کھلا رہے گا ـــــ یاد ہے نا محمود بھائی! اب کیا مجھے اپنے بھائی کے گھر سے بھی ناامیدی ہوگی؟"ـــــ بینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

"یہ بات نہیں ہے بینا، خدا گواہ ہے مجھے اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہوگی کہ آج میری بہن خود میرے گھر آ رہی ہے ـــــ"

"دیکھتا ہوں ڈاکٹر صاحب تم دونوں پا پیوں کو کیسے پناہ دیتے ہیں!"ـــــ باپ نے قہر آلود نگاہوں سے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"چاچا جی! آپ کو شاید معلوم نہیں مجھے سو روپیہ ماہوار پر نوکری مل گئی ہے۔ اگر ابا جان نے اجازت نہ بھی دی تو میں اپنی بہن کے لئے گھر چھوڑنے کو تیار ہوں ـــــ یہ خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ تاروں کی چھاؤں میں ہمیں کہیں نہ کہیں پناہ ضرور مل جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا بینا!"ـــــ اور اس نے محبت سے بینا کا ہاتھ تھپتھپایا ـــــ "چلو بینا! تم آج اندرا کے یہاں رہنا۔ کل ہی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لوں گا۔ ہر روز میں اپنی ننھی سی بہن کے لئے اچھی اچھی چیزیں لایا کروں گا ـــــ"

"اور میں اچھے اچھے پکوان پکا کر اپنے بھائی کا انتظار کیا کروں گی ـــــ"

"اور میں پھر ایک دن بہت سے تحفوں کے ساتھ اپنی بہن کے لئے ایک چاند سا دولہا بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا بینا؟ یا تو خود ہی اپنا ساتھی تلاش کر لے گی ـــــ؟" بینا نے شرما کر سر جھکا لیا ـــــ "چلو گی نا میری بہن؟"ـــــ اور بینا نے عقیدت مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لئے مسکرا رہی تھی۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے، چہروں پر استقلال لئے، آنکھوں میں باغیانہ چمک نمایاں کئے دونوں سرکش ہمیشہ کے لئے تنگ نظر والدین کے گھر سے باہر نکل آئے۔

باپ نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ ماں نے پریشان ہو کر استانی جی کو دیکھا۔ مگر استانی ناک صاف کر رہی تھیں چشمہ سرک کر نیچے چلا آیا تھا۔ اماں بیگم چھوٹے دریچے سے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے باغی بہن بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے اور دور کالے کالے بادلوں میں اسے چند رکانت کا اداس چہرہ نظر آنے لگا ـــــ!

عبدالکریم ثمر

رازِ نجات

خیالِ دوست نہ کر مشتعل مرے جذبات　　ترے فریبِ محبت سے پاچکا ہوں نجات
اُلٹ کے دیکھ کبھی خود صحیفۂ قدرت　　کلامِ شاعر و صوفی تو ہیں فقط شذرات
جہاں ادب سے رسالت کی روح کانپ اٹھی　　وہاں ہے زاہدِ ناداں کو فخرِ زہد و صلوات
مقامِ علم و نظر بھی ہے اک بلند مقام　　بلند تر ہیں مگر اہلِ حال کے درجات
جحیم و خلد پہ میری نظر ٹھہر نہ سکی　　مجاہدوں پہ ہے قیدِ حیات بعدِ ممات
زمانہ ضربِ محمدؐ کے انتظار میں ہے　　ہنوز زندہ ہے روحِ یغوق و لات و منات
یہ اضطرابِ مسلسل مصائبِ پیہم　　سنبھل کہ سیرت و کردار میں ہے رازِ نجات
ہے کون محوِ تکلم خموش راتوں میں　　ہنوز سنتا ہوں نبضِ حیات کی ضربات
محلِّ شترم ہے اب تک ملاتوزِ عظیم　　ازل سے گرمِ عمل ہے بشر کا پائے ثبات
فروغ بخشِ دو عالم ہے روحِ آزادی　　مگر غلام پہ طاری ہے عالمِ سکرات
ملا نہ سوزِ سکندر کو چشمۂ حیواں　　کہ نورِ خضر کے سائے میں تھی رہِ ظلمات
ادھر تو سازِ دو عالم کے تار چیخ اٹھے　　ادھر خموش ہے اب تک جہاں کا سازِ حیات

حریمِ دوست کی منزل تھی کہکشاں بکنار
ستارے کوئے محبت کے بن گئے ذرّات

صاحبزادی آدا ٹونکی

دیکھ رہی ہوں

میں شام کے پردے میں سحر دیکھ رہی ہوں　　اب دل میں اسے پیشِ نظر دیکھ رہی ہوں
اتنی تو نہیں تاب انھیں دیکھ سکوں میں　　ہاں دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہی ہوں
تھا جن کو یہ دعویٰ کہ مسیحائی کریں گے　　اب ان کی بھی مایوس نظر دیکھ رہی ہوں
آجا مری تسکین کا کر دے کوئی ساماں　　میں کب سے تجھے جانبِ در دیکھ رہی ہوں
بیمارِ غمِ عشق کا مشکل ہوا جینا　　پیوستِ رگِ جاں میں شرر دیکھ رہی ہوں
گردش سے زمانے کی نہیں کوئی سکوں مند　　دنیا ہی کا اب رنگِ دگر دیکھ رہی ہوں
مجھ کو نہیں بھاتیں مہ و خورشید کی کرنیں　　میں تیری نظر، تیری نظر دیکھ رہی ہوں
پابند نہیں حسن بجا آپ کا ارشاد　　یہ کس کو گرفتارِ نظر دیکھ رہی ہوں

کیا تم نے خفا ہو کے نگہ پھیری ادا سے
بدلی ہوئی دنیا کی نظر دیکھ رہی ہوں

جمیل زبیری

آتشِ انتقام

میری ایک غریب بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے انٹوان کے ساتھ عمر کی گزران کر رہی ہے۔ اپنی تمام امیدیں انٹون سے وابستہ کئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز، محبت کے نشہ میں چور، ایک سرمدی زندگی کے تصور میں محو ہو کر زندگی گزار رہی ہے، وہ اپنی دنیا آپ ہے، قلعہ کی چہار دیواری پر ایک چھوٹا سا مکان اس کی کل کائنات ہے۔

سارڈینیا کی چٹانوں پر ایک چھوٹا سا قصبہ نظر آتا ہے۔ جو بیرونی دنیا کی تجلیوں سے ناآشنا اپنی خاموش اور نامعلوم تاریخ کو دہرا رہا ہے۔ ماہی گیروں اور ملاحوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات ان چٹانوں کی واحد زینت ہیں۔ چٹانیں آباد کہیں غیر آباد ساحل پر دور تک چلی گئی ہیں۔ کہیں جھک کر سمندر کی سطح پر پھیل گئی ہیں اور کہیں فلک بوس دیوار کی طرح ساحل کی محافظ ہیں۔

ایک ایسی چٹان پر جو کسی زمانے میں قلعہ کی دیوار تھی میری کا مختصر مکان ہے۔ اس کی تین کھڑکیوں سے طوفانی سمندر نظر آتا ہے جس کی صبح و شام کا کیف بخش منظر اس بڑھیا کی اداس کٹیا کو کبھی اپنا ہم رنگ بنا دیتا ہے۔ سمندر میں جگہ جگہ مستغرق چٹانوں کی چوٹیاں لہروں کے تھپیڑوں میں ڈوبتی ابھرتی سمندر کی سطح پر موتی بکھیرتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ساکن سمندر میں یہی چٹانیں ہیبت ناک آبی جانوروں کی طرح منہ پھاڑے نظر آتی ہیں اور ملاحوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے لئے خطرہ مہیب ہیں۔ کشتی کو سلامتی کے ساتھ اس خطرناک جال سے نکال لینا ملاحوں کا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ ہر صبح و شام ماہی گیر اپنی چھوٹی کشتیاں لئے چٹانوں سے بچتے بچاتے سمندر میں نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے جہاز شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

انٹون اس چھوٹی سی جھونپڑی کا چشم و چراغ، اپنی ماں کے دل کا سکون و قرار گاؤں میں ایک ماہر ملاح اور ہوشیار ماہی گیر مشہور ہے۔ گاؤں کے بچے اس سے بات کرنے اور نوجوان اس کی دوستی کے مشتاق رہتے ہیں۔ گاؤں کی ضعیف العمر خواتین مشفقانہ تبسم سے اس کی دلنوازی کرتی ہیں۔ اس کے جمال پر سنجیدگی اور خوشی پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ دوشیزائیں خاموش امنگوں سے اپنے دل کو مالامال کئے دزدیدہ نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ کوئی بیباک اپنے جمال آتشیں کے پرتو سے اسے متاثر کرنے کی تڑپ میں اسے دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ غریب نوجوان اکثر اس قسم کے التفات کا عادی ہونے کے باوجود عادتاً گردن جھکا کر تیزی سے نکل جاتا ہے۔ محجوب اور شرم سے پسینہ میں تر...... حجاب...... ہاں یہ اس کی ضعیف بیوہ ماں کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ یہ اس کی لاانتہا کوششوں کا ثمر تھا۔ جسے دیکھ کر اس کا دل تفاخر آمیز خوشی سے دمک اٹھتا تھا۔

انٹون شکار کا شوقین تھا۔ اپنے کتے جیک کی ہمراہی میں سارا سارا دن سیر و شکار میں گزار دیتا۔ شام کو تھکا ماندہ گھر کو لوٹتا تو ماں ہزاروں بلائیں لیتی۔ مدارت میں بچھ بچھ جاتی۔ سادہ لیکن قسم قسم کے کھانے اور پھل جو زحمت انتظار کو کم کرنے کے لئے وہ سارے دن کی مصروفیت سے مہیا کرتی، اس کو پیار سے کھلا کر سلا دیتی۔ رات کو بار بار اٹھ کر اس کی عافیت کا اطمینان کرتی۔ اس کا کتا جیک بھی غالباً کسی فطری حس کے ماتحت ماں بیٹے کے درمیان اس جذبے کو محسوس کرتا تھا اور کچھ آرام کے بعد تمام رات اپنے آقا کے پلنگ کے ارد گرد گھوم کر آنکھوں میں کاٹ دیتا تھا۔ اور جب صبح اٹھ کر میری اس کی پیٹھ کو شفقت سے تھپکتی تو ادائے فرض کی تمکنت سے اونچی گردن کر کے اور جسم کو تان کر سنجیدگی سے سر اٹھا دیتا۔

ایک شام انٹون کو اس کے دوست نکولس نے جذبۂ حسد کے ماتحت قتل کر دیا۔ اور خود خلیج کو پار کر کے سامنے

... میں سماں گیا۔ راہگیر انتون کی نعش کو گھیرے آئے
... ماں پر رنج کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن آنکھ سے ایک آنسو
... مردہ جسم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتی رہی خاموش
... کھوئی کھوئی سی۔ پھر اس نے لرزتا ہوا ہاتھ بیٹے
... نعش پر رکھ کر اس کی روح کو خطاب کرتے ہوئے
... لینے کا عہد کیا۔ اس نے اپنے آپ کو نعش کے ساتھ
... کمرے میں بند کر لیا اور کسی کو پاس تک نہ آنے دیا۔
شاید اس کی محبت کسی شریک غم کی بھی متحمل نہ ہو سکتی
تھی۔ جیکب اپنے آقا کی پائنتی کھڑا مردہ جسم پہ ٹکٹکی جمائے
... دونوں ٹانگوں کے درمیان سمیٹے پُر درد آواز سے کراہتا
... بیوہ کے جسم میں کوئی حرکت نہ تھی۔ اور کتے کی آواز ایک
... بھیانک تھی۔ بیوہ تمام رات مردہ جسم پر جھکی نگاہ جمائے
اسے گھورتی رہی۔ بڑے بڑے آنسو اس کی آنکھوں سے
گویا ایک سیلاب پیہم تھے۔ جیکب وفور درد سے کراہ رہا تھا۔

انتون اپنی شکاری واسکٹ پہنے کچھ اس طرح سیدھا لیٹا ہوا تھا گویا سو رہا ہے۔ اس کی واسکٹ سینے پر سے خنجر کی چوڑائی کے برابر کٹی ہوئی تھی۔ اس کی تمام قمیص جسے زخم کے کھولنے کے لیے پھاڑ دیا گیا تھا خون میں تر تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ خون سے سرخ تھے۔ بال گاڑھے منجمد خون میں جکڑے ہوئے تھے۔

میری تمام رات یہ منظر دیکھا کی۔ خاموش اور ساکن۔ گویا جذبات کے طوفان کو اپنے ہونٹوں سے دبا رہی تھی آخر ... رک کر بولی اور اس کی آواز سن کر کتا دم بخود ہو گیا "گھبرا مت بچے ..... میرے پیارے ..... غریب بیٹے
..... اپنی ..... روح کو ...... سکون دے
... گھبرا مت ...... میں وعدہ ......
کرتی ہوں کہ تیرا ...... بدلہ لوں گی ......
یہ تیری پیاری ماں کے الفاظ ...... ہیں ......
تو جانتا ہے ...... کہ وہ ...... اپنے الفاظ
کی پابند ...... ہے۔" ہر جملے کے ساتھ ساتھ بیوہ کا چہرہ جھکتا چلا گیا اور آخر جذبات کی فراوانی کی تاب نہ لا کر بیوہ کے لب مردہ پیشانی پر مرتسم ہو گئے۔ جیکب نے پھر کراہنا شروع کر دیا۔ وہ چیخ لمبی لمبی دلسوز اور روح فرسا آہیں کھینچ رہا تھا اور اس حالت میں بیوہ اور کتے دونوں نے رات گزار دی۔ اگلے دن انتون کو دفن کر دیا گیا۔ اور جلد ہی اس کا نام قصبہ کی دلچسپ باتوں اور کہانیوں سے نکل گیا۔ زندگی کی ہماہمی میں لوگ جلد ہی اسے بھول گئے۔

اس کے نہ کوئی بھائی تھا اور نہ کوئی ایسا دوسرا رشتہ دار جو اس کا بدلہ لے سکے مگر ہاں اس کی ضعیف ماں ایفائے وعدہ کی دھن میں لگی رہی۔ صبح سے شام تک کھڑکی میں بیٹھی خلیج کے پار دشمن کے گاؤں کی طرف نظریں جمائے دیکھتی رہتی جہاں گرد و نواح کے ... ڈاکو اور قاتل پولیس سے بچنے کے لیے جا چھپتے تھے۔ گاؤں کی تمام آبادی میں وہی لوگ تھے۔ موقع پا کر کبھی کبھی چلے آتے اور کسی غریب کے خون میں ہاتھ رنگ کر پھر خلیج کو پار کر کے لینڈھم کے تاریک غاروں یا الجھے جنگلوں میں غائب ہو جاتے ...... یہ سیاہ زندگی انہیں خوب راس آئی تھی ...... لینڈھم فرمانروا کی عملداری سے باہر دوسرے شخص کی قلمرو میں تھا اور دونوں ریاستوں کے تعلقات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے ایک ریاست کے مجرم دوسری ریاست میں بے خطر پناہ گزین ہو سکتے تھے۔

بیوہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی کے چراغ کو گل کرنے والا اسی گاؤں کے کسی حصہ میں اپنے سیاہ جرم کی ہیبت یاد کو بھلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے وہ سارا سارا دن کھڑکی میں بیٹھے خلیج کے پار گھورتے ہوئے بدلہ لینے کی تدابیر سوچتی رہتی۔ لیکن وہ کمزور تھی اور نحیف —— اس تازہ حادثے نے اسے اور بھی بے جان کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی "کیا میں تنہا اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہوں ...... افسوس اگر آج خاندان کا کوئی فرد موجود ہوتا تو یہ آگ بجھ سکتی تھی۔" اب زیادہ ڈھیل نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اپنا جام حیات بھی لبریز ہونے والا تھا۔ وہ "اگر میں کامیاب نہ ہو سکی" یہ سوچ کر اس کا دل لرز اٹھتا ..... جسم میں رعشہ پیدا ہو جاتا ..... اُف! ..... اس کے بعد اس کا وعدہ ...... وہ وعدہ جو اس نے اپنے بیٹے کی نعش پر کھڑے ہو کر کیا تھا۔ وہ آخری الفاظ جو اپنے بیٹے کی روح کو مخاطب کر کے اس نے کہے تھے ......

کون پورا کرے گا۔ انتھونی کی روح کبھی سکون نہ پا سکے گی۔

یہ اور اسی قسم کے خیالات اسے ایک آن چین نہ لینے دیتے۔ وہ ساری ساری رات سر دھنتی۔ جیک اس کے پاؤں کے پاس سوتے سوتے اچانک دلدوز چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھتا۔ جب سے اس کا مالک غائب ہوا تھا۔ اس کی یہ عادت ہو گئی تھی۔ گویا وہ بھی اپنی روح میں متوفی کی یاد کا نہ بھرنے والا زخم رکھتا تھا۔ یکایک دُم ہلاتا ہوا یوں اٹھ کر چل دیتا گویا اسے کوئی آواز دے رہا ہے۔ مایوس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اور جسے آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسے نہ پا کر بیوہ کے پاؤں پر پھر آ کر لیٹ رہتا گویا اپنے اندوہ سے کچھ سکون انہی قدموں میں پاتا تھا۔

ایک رات اچانک جیک نے کراہنا اور غرانا شروع کیا بیوہ کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور اس کی آنکھیں غضب ناک ہو گئیں۔ رات بھر ایک ہیجانی کیفیت سے کمرے میں ٹہلتی رہی اور جوں ہی افق پر ہلکی روشنی نمودار ہوئی گرجا میں گئی۔ اور دو زانو ہو کر خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اور اس کے جسم میں بس اتنی طاقت اور اس کی زندگی میں صرف اتنی طوالت دے دے کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے کا بدلہ لے کر اس کی آخری خدمت کر سکے۔ گھر واپس آئی تو جیک کو ستون سے باندھ دیا۔ اور اپنے کمرے میں حسب دستور ٹہلنا شروع کر دیا۔ یکایک اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ آنکھیں ابل پڑتیں چہرے پر کبھی ہراس کبھی غصے کے آثار نمودار ہو جاتے۔ دماغی اور جسمانی تکان سے مغلوب ہو کر پلنگ پر گر پڑتی۔ لیکن بھلا چین کہاں؟ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اور اندرونی خلجان سے کوئی سکون نہ پا کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی اور ٹہلنے لگتی۔ بندھے ہوئے کتے کی چیخ پکار اس کے جذبات کو اور بھڑکاتی رہی۔

اگلے دن صبح بیوہ نیچے آئی اور کتے کے سامنے پانی رکھ دیا کتے نے حسب معمول گوشت یا روٹی نہ پا کر مایوسانہ نگاہوں سے مالکہ کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کی نظروں میں رحم کی کوئی جھلک نہ پا کر بے بس اپنی قسمت پر شاکر ہو گیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گذر گیا۔ بھوک کی شدت بڑھ گئی۔ آنکھوں میں بھوک کے بھیڑیے کی سی چمک پیدا ہو گئی وہ بے چینی سے زنجیر کو توڑ ڈالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن بیوہ کے دل میں اس کے لئے کوئی رحم نہ تھا۔ تیسرا دن بھی گذر گیا لیکن اسے پانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

چوتھے دن بیوہ ہمسائے کے یہاں سے کچھ بھس لائی اور اپنے مرحوم بیٹے کے کپڑوں میں اسے بھر کر ایک قد آدم مجسمہ بنایا۔ پرانے چیتھڑوں کی مدد سے سر اور گردن بنائی اور جیک کے سامنے اسے لوہے کی سلاخوں پر کھڑا کر دیا کتا اپنی بے رحم مالکہ کی ان حرکات کو متعجب نگاہوں سے دیکھتا رہا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر وہ قصاب سے گوشت کا ایک لمبا پارچہ لائی اور کتے کے سامنے اسے بھوننا شروع کیا بھوک کی شدت اور گوشت کی خوشبو سے کتا دیوانہ وار اچھل اچھل کر زنجیر کو توڑ ڈالنے کی کوشش کرنے لگا غصہ اور کمزوری سے اس کے منہ پر جھاگ آ گئی لیکن بیوہ اطمینان سے گوشت بھوننے میں مصروف رہی۔ خوب بھوننے کے بعد اسے مجسمے کی گردن پر لپیٹ کر مضبوط دھاگوں سے ایسا جکڑ دیا کہ گوشت ملائم کپڑوں کے اندر گھس گیا اور اس کے بعد بیوہ نے کتے کو کھول دیا۔ آن واحد میں کتا مجسمے کی گردن پر کودا اور اس کے شانوں پر پنجے رکھ کر اس کی گردن سے گوشت کو جھنجھوڑنے لگا۔ ایک ٹکڑا حاصل کر کے زمین پر آتا اور پھر جھپٹ کر دھاگوں اور کپڑوں کو پھاڑنے لگتا۔ بار بار گرتا اور زقند لگاتا۔ یہاں تک کہ مجسمے کے شانوں اور گردن کی دھجیاں اڑ گئیں۔

خاموش ساکت اور شعلہ انگیز آنکھوں سے بیوہ یہ تماشہ دیکھتی رہی اور تجربے سے مطمئن ہو کر کتے کو پھر باندھ دیا۔ اسے دو دن بھوکا رکھنے کے بعد پھر یہی عمل کیا۔ تین ماہ کی کوشش کے بعد اس نے کتے کو حملے سے اپنی خوراک حاصل کرنے کی عادت ڈال دی۔ اب اسے زنجیر باندھنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ اب اپنی مالکہ کے ایک اشارے پر مجسمے کی گردن کی دھجیاں اڑا کر گوشت حاصل کرنے لگا یا اگر گردن پر گوشت نہ ہوتا تو بھی ایک اشارے پر مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا۔ اس کامیابی کے بعد بیوہ ہمیشہ اسے بھنا ہوا گوشت بطور انعام کھلاتی۔

ایک اتوار کی صبح وہ پھر گرجا میں گئی اور خدا سے مدد کی دعا مانگی اور فقیر کا بھیس بدل کر ایک ملاح سے طے کیا کہ وہ

ہے اور اس نے کتے کو اپنی کشتی سے خلیج کے پار اتار دیے۔ ایک دو دن کا بھوکا تھا اور گوشت کے ٹکڑے کی خوشبو جو بیوہ کپڑے میں لپیٹے ہوئے اپنی بغل میں لیے تھی، اسے مست کیے دیتی تھی۔ وہ بار بار منتظر آنکھوں سے اپنی مالکہ کی طرف نظر اٹھاتا لیکن اپنی جانب کوئی التفات نہ پاکر اپنی دم مالکہ کے گرد گھومنے لگتا۔ بیوہ اور اس کا کتا خلیج کی دوسری طرف اینڈھم گاؤں میں داخل ہوتے۔ بیوہ نے ایک نان بائی سے نکولس کے مکان کا پتہ پوچھا اور جاڑے کی ایک دنیا بیتنے میں وبائے الزمان کو سیاہ اور خالی ہاتھ نکولس کے مکان پر پہنچی۔ وہ اپنی دکان میں بیٹھا انہماک کے ساتھ اپنی بھٹی دھونک رہا تھا۔ ہاتھ کی جنبش سے شعلے تیز اور سرخ ہو رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چنگاریاں اڑ رہی فرشتہ موت کے سامنے اس کے سر پہ کھیل رہی تھیں۔ وہ خیالات میں محو دکی دروازے پر دستک سن کر .... بیوہ نے دوبارہ دستک دی جواب نہ پاکر ہلکے سے دروازہ کھولا، اندر داخل ہوئی اور آہستہ سے جیک کی گردن سے زنجیر کا حلقہ نکال کر زور سے نکولس کو آواز دی۔ اور جیسے ہی نکولس نے پلٹ کر دیکھا چیخ اٹھو جیک اسے پھاڑ ڈال کتا پاگل کی طرح اس کی گردن پر ٹوٹ پڑا۔ نکولس ہاتھوں سے روکنا چاہا لیکن فضول۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ نکولس نے جد وجہد کی۔ ایسا ہو کر کچھ دیر تک زمین پر ایڑیاں رگڑیں۔ آخر ایک ابدی سکوت میں نائم ہو گیا۔ جیک نے اس کی گردن اور چہرے کی دھجیاں اڑا دیں۔

چند دن کے بعد نکولس کے دو ہمسائے اپنے ذہن پر زور ڈال کر یہ بتا سکے کہ انہوں نے ایک ضعیف فقیر کو دکان سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے سیاہ رنگ کا ایک کتا تھا۔ فقیر کتے کو کچھ کھلاتا جاتا تھا اور وہ دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا۔

شام تک بیوہ اپنے گھر پہنچ گئی اور بیٹے کے قتل کے بعد آج پہلی مرتبہ اطمینان کی نیند سوئی —— !

(ترجمہ)

گل کاریاں

نہال ملیح آبادی

چمن سے آئے ہو شانوں پہ کاکلیں بکھرائے — خطا معاف! اک آب حسن کو نہ لائے؟

خلاف عقل جو ہم نے فریب حسن سے کھائے — بہت دنوں رہے نادم، بہت دنوں شرمائے

یہ تو ہی کہہ اسیر اس کی عمر کیونکر ہو — بھلا دے تو جسے دل سے تجھے جو بھول نہ پائے

جو خوش ہوا نہ کسی طرح اک مراد دل تھا — نسیم صبح بہاری نے لاکھ پھول کھلائے

یہ رحم و عدل خدا، وائے حسرتا اے دل! — کہ چین ایک نفس کے لئے نہ انساں پائے

ہمیں کو اک نہیں ترک تعلقات کا رنج — کہ ترک محبت پہ بارہا پچھتائے

ہوئی ہے عشق میں انجام کار محرومی — خدا کبھی کسی دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے

ترے شباب کی گل کاریاں ہیں روز افزوں — کلی سی جیسے نسیم سحر میں کھلتی جائے

وہ عہد شوق ہوس یاد کیا ہے اب بھی نہال
کسی کے عشق میں کیا کیا نہ اشک تم نے بہائے

عزیز احمد بی۔ اے (علیگ)

پروپیگنڈے کا تاریخی پہلو

آج ہم ایک زبردست کشمکش اور بحران کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ماضی کے تلخ تجربوں، حال کی بے سروسامانی اور مستقبل کی بے اطمینانی نے ہمارے دماغوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ ساری دنیا گومگو کے عالم میں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہوگا۔ اس عہد میں ہمیں افکار کے مختلف دبستان نظر آتے ہیں۔ ہر دبستان کے پاس دنیا کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے لئے علیحدہ علیحدہ حل ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہے کہ وہ دنیا کو یقین دلا دے کہ اسی کے پیش کردہ حل میں دنیا کی نجات ہے۔ یہ کوشش تبلیغ کی شکل اختیار کرتی ہے اور اسی تبلیغ کو ہم پروپیگنڈے کا نام دیتے ہیں۔ آج "جنگ" کے بعد جو لفظ عام گفتگو میں سب سے زیادہ بولا جاتا ہے وہ "پروپیگنڈا" ہے۔

پروپیگنڈے کا لفظ سب سے پہلے سولھویں صدی میں ہم سے متعارف ہوا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یورپ میں رومن کیتھولک فرقے کے خلاف پروٹسٹنٹ جماعت کھڑی ہو گئی تھی۔ اور دونوں میں زبردست کشمکش ہو رہی تھی۔ لوگ عام طور پر پروٹسٹنٹ خیالات کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ اور رومن کیتھولک فرقے کے اثرات زائل ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس فرقے نے اپنے نظریوں کی تبلیغ کے لئے ایک مجلس قائم کی جس کا نام کمیشن آف کارڈنلس (۸۲-۱۵۷۵ء) رکھا۔ اس مجلس کا صدر کارڈنل پریفیکٹ آف پروپیگنڈا کہلاتا تھا۔ یہیں سب سے پہلے پروپیگنڈا کا لفظ اپنے موجودہ مفہوم سے قریب ترین معنوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد رومن کیتھولک مبلغین کے تعلیمی مرکز کا نام کالج آف پروپیگنڈا رکھا گیا۔ اسی اثنا میں پروپیگنڈے کا لفظ ہر اس جماعت کے لئے استعمال ہونے لگا تھا جو کسی نظریے کی تبلیغ کرے۔ کچھ عرصہ تک اسی مفہوم میں استعمال ہونے کے بعد خود اسی نظریے کو پروپیگنڈا کہنے لگے آخر اس تبلیغ کے طریق کار یا ٹکنیک کو پروپیگنڈا کہا گیا۔ اور آج کم و بیش انھیں معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پروپیگنڈے نے سب سے پہلے مذہب کی کوکھ سے جنم لیا۔ چنانچہ اس کی بنیادیں مذہبی ذہنیت پر استوار ہیں۔ چونکہ مذہب میں دلیل سے زیادہ اعتقاد کو دخل ہوتا ہے۔ اس لئے پروپیگنڈے میں بھی دلیل کو اتنی اہمیت نہیں رہی جتنی اعتقاد کو اور اس کی یہ خصوصیت معمولی فرق کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔

سترھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک پروپیگنڈے کا لفظ گمنامی میں رہا۔ لیکن جب انگلستان میں کراموپل برسر اقتدار آیا اور اس نے پیوریٹن خیالات کی ترویج شروع کی تو باقاعدہ پروپیگنڈے کی ضرورت پیش آئی اور اشتہار بازی کو فروغ ہوا۔ چونکہ پروپیگنڈا عام طور پر بحران اور کشمکش کے زمانے میں زور پکڑتا ہے۔ اس لئے اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکہ کی جنگ آزادی اور انقلاب فرانس میں بھی اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ دونوں نظریاتی جنگیں تھیں اور ان میں لوگوں کے خیالات کو متاثر کرنا اور ان کو عمل کے لئے تیار کرنا ضروری تھا اس لئے لازمی طور پر لوگوں کو پروپیگنڈے کا سہارا لینا پڑا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ امریکہ کی جنگ آزادی کی کامیابی کا راز جنگی برتری سے زیادہ اس جذبہ آزادی میں تھا جو پروپیگنڈے نے امریکنوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔

پروپیگنڈے کی ضرورت دراصل اس لئے ہوتی ہے کہ افراد کے ذہنوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہوتی اس لئے انھیں لازمی طور پر کسی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ بحرانی دور میں ہر شخص کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ہر مسئلے پر غور کر کے خود کسی نتیجے پر پہنچے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ خواص کا طبقہ اس کے دماغ کی

رہبری کرکے عمل کا رستہ تباتے ۔ بحرانی دور میں عام طور پر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ سوچنے سے پہلے عمل کیا جائے ۔ اگر ہر فرد سے یہ امید رکھی جائے کہ وہ خود ہر مسئلے پر غور کرکے عمل کی طرف راغب ہو تو لازمی طور پر حرکت و عمل کی رفتار میں غیر معمولی سستی آجائے گی ۔ اور ایسے دور میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نقصان دہ ہوتی ہے ۔ خیال ہے کہ یوٹوپیا میں پروپیگنڈا ناپید ہو جائے گا ۔ کیونکہ وہاں ہر فرد کے پاس اتنا وقت اور موقع ہوگا کہ وہ خود حالات کی چھان بین کرکے کسی نتیجے پر پہنچے۔

سائنسدان ، معلم اور پروپیگنڈسے میں بہت سی باتیں مشترک ہوتے ہوئے بھی تینوں کے درمیان لطیف فرق ملتا ہے ۔ سائنسدان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حالات کا پتہ چلاکر انھیں منطقی ترتیب کے ساتھ اصل رنگ میں پیش کر دے ۔ برخلاف اس کے پروپیگنڈسٹ کے سامنے یہ مقصد رہتا ہے کہ واقعات کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ وہ قابل قبول ہوں ۔ اسے اس بات سے سروکار نہیں کہ وہ سچ ہیں یا جھوٹ ۔ تعلیم اور پروپیگنڈے میں البتہ نسبتاً قریبی تعلق ہے ۔ کیونکہ معلم بھی ایک قسم کا پروپیگنڈسٹ ہوتا ہے ۔ جو سوسائٹی کے مروجہ قوانین، اخلاقی قدروں اور اعتقادات کو طلبہ تک پہنچاتا ہے ۔ اچھا پروپیگنڈا وہ ہوتا ہے جس کے اظہار میں کمال صرف کیا گیا ہو اور جس کے اثرات زیادہ دنوں تک قائم رہ سکیں ۔ اس لحاظ سے معلم صحیح معنوں میں پروپیگنڈسٹ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس کی تبلیغ کے اثرات ساری عمر کے لئے دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے پروپیگنڈا عام طور پر حکومت کا ہتھیار ہو کر رہ گیا ہے ۔ حکومت افراد کو کسی کام کے لئے مجبور کر سکتی ہے ۔ لیکن مجبور کرنے کے بجائے اگر انھیں رضامند کرکے وہی کام کرایا جائے تو آسانی بھی ہوتی ہے اور کام بھی اچھا ہوتا ہے اس لئے حکومت افراد کو مجبور کرنے کے بجائے قائل کرنا زیادہ پسند کرتی ہے ۔ انسان دلیلوں کا عادی ہوتا ہے ۔ اگر فرد کو یہ خیال ہو جائے کہ اس کی قوت استدلال کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تو وہ پروپیگنڈے کو آسانی سے قبول نہیں کرتا ۔ برخلاف اس کے اگر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی جائے کہ اس کی قوت استدلال کو متاثر کرکے اسے قائل کیا جا رہا ہے تو پروپیگنڈا کامیاب ہوتا ہے ۔ اس سے فرد کی خودداری بھی برقرار رہتی ہے اور حکومت اس سے حسب خواہش عمل بھی کرا لیتی ہے اس لئے پروپیگنڈے کو مدلل ظاہر کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ وہ ایسا بھی نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس نوع کی دوسری خصوصیات بھی ظاہر کرنی ہوتی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ حقیقت ہے تبصرہ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ ہے ۔ استدلال کی ترتیب منطقی ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ بسبب سے اچھا پروپیگنڈسٹ وہ ہے جو حسب ضرورت کامیابی سے محقق ، سائنسدان اور معلم وغیرہ کا بھیس بدل سکے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بھیڑ چال پروپیگنڈے کو قوت بخشتی ہے ۔ لیکن یہ غلط ہے ۔ اگر افراد کو یہ خیال ہو جائے کہ انھیں بیجا دباؤ سے متاثر کرکے ان کی رائے کی رہنمائی کی جا رہی ہے تو وہ پروپیگنڈے کو قبول نہیں کرتے ۔ پروپیگنڈے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ افراد میں احساس کمتری بیدار نہ ہونے پائے ۔ جو چیز پروپیگنڈے کو صحیح معنوں میں قوت بخشتی ہے وہ بھیڑ چال نہیں بلکہ انفرادیت ہے۔

اس بحث کے بعد اب ہم پروپیگنڈے کی تعریف کی حد بندی کر سکتے ہیں ۔ پروپیگنڈا اس شعوری عمل کو کہتے ہیں جو پروپیگنڈسٹ کسی جماعت کو اپنی خواہش کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے کرتا ہے ۔ اس شعوری عمل کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں ۔ تحریر، تقریر، تصویر وغیرہ — پروپیگنڈے کی بعض اقسام ہوتی ہیں ۔ جس میں یہ بات نمایاں رہتی ہے کہ اس میں ارادے کو دخل ہے ۔ لیکن اچھا پروپیگنڈا وہ ہے جس میں ارادہ "غیر شعوریت" کے غلاف میں چھپا ہوا ہو

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پروپیگنڈا جنگ اور کشمکش کے دوران میں پروان چڑھتا ہے ۔ کشمکش کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ۔ ایک تو نظریاتی کشمکش ، یہ وہ کشمکش ہے جو مذہبوں ، اعتقادوں ، سکولوں اور نظریوں کے درمیان پیدا ہوتی ہے اسی کشمکش نے دراصل پروپیگنڈے کو جنم دیا ہے ۔ دوسری قسم اقتصادی کشمکش ہے ۔ مثلاً طبقاتی جنگ یا مختلف اقتصادی جماعتوں کے درمیان کشمکش ۔ تیسری قسم ہے جسمانی کشمکش ، یہ دو طرح کی ہو سکتی ہے ۔ ایک تو خانہ جنگی ، دوسرے قوموں کے درمیان جنگ ۔

پہلے [illegible] کسی قسم کے [illegible] ہوتے تھے۔ اب وہ نہیں سمجھتے اس لئے لوگ آسانی سے لڑنے پر تیار نہیں ہوتے اور جنگ کی وجہ جواز پوچھتے ہیں۔ اس لئے حکومت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پروپیگنڈے کے ذریعہ ملک کی رائے کو متحد کرے۔ چنانچہ جس طرح جنگ کے زمانے میں نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں، اقتصادی اور سیاسی تنظیم نو عمل میں آتی ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوتی ہے اسی طرح پروپیگنڈے کا آرٹ بھی جنگ کے زمانے ہی میں ترقی کرتا ہے۔

جنگ کے پروپیگنڈسٹ کے تین فرائض ہیں ایک تو اپنے ملک کی رائے کو متحد رکھنا۔ دوسرے غیر جانبدار ممالک کو اپنے حق میں کرنا۔ اور تیسرے دشمن ممالک کی رائے کا مقابلہ کرنا۔ پہلے مقصد کے لئے معمولی پروپیگنڈا کارآمد ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ رواج اور جذباتی اپیل پر مبنی ہوتا ہے لیکن دوسرے اور تیسرے مقاصد کی براری کے لئے لطیف اور فنکارانہ پروپیگنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"پروپیگنڈا" کا لفظ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں سب سے پہلے چودھویں ایڈیشن (سنہ ۱۹۲۹ء) میں نظر آیا۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل تیرھویں ایڈیشن (سنہ ۱۹۱۱ء) میں اس کا ذکر نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس موضوع کو پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اہمیت حاصل ہوئی۔ گزشتہ صدی میں پروپیگنڈا صرف مذہبی جماعتوں، تاجروں اور افراد کا ہتھیار تھا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں حکومت نے اسے اپنا لیا۔

غیر ممالک میں عوام کی رائے کو متاثر کرنا سب سے پہلے جرمنی نے شروع کیا۔ ایک تو غیر ملکی اخبارات کے جو نمائندے برلن میں تھے انھیں مختلف ذرائع سے اپنے حق میں کر کے ان کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا گیا۔ دوسرے جرمن فارن آفس کے پریس بیورو نے مستعدی سے جرمنی کے حق میں پروپیگنڈا کیا۔ تیسرے غیر ممالک میں مقیم جرمنوں یا جرمنی کے وظیفہ خواروں نے جرمنی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پروپیگنڈے سے سوائے تجارتی معاملات کے جرمنی کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

[illegible] کی لڑائی شروع کرنے والے ممالک کے سامنے کوئی [illegible] نہیں تھا۔ اور اس کا محرک صرف خوف تھا۔ اس لئے ہر ملک کے لئے لازم ہوا کہ وہ جنگ میں اپنی شرکت کو برحق ثابت کرے۔ خاص طور پر جمہوری ممالک میں یہ بہت ضروری تھا۔ برطانیہ میں بھرتی کے لئے جنگ کی اہمیت جتانا لازم ہو گیا۔ پہلے پہل تو بلجیم پر جرمنی کے حملے کی اہمیت کو لوگوں پر واضح کیا گیا۔ اور لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ جنگ میں برطانیہ کی شرکت بہت ضروری ہے۔ دوسری طرف جرمنی غیر جانبدار ممالک سے اپیل کر رہا تھا کہ وہ جنگ میں اس کا ساتھ دیں۔ وہ جنگ ہی میں شرکت کے اسباب اپنے رنگ میں پیش کر رہا تھا۔ اب انگریزوں کی ذمہ داریاں تگنی ہو گئیں ایک تو اپنے ملک میں جرمن پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنا۔ دوسرے غیر جانبدار ممالک میں اپنے پروپیگنڈے کو جرمن پروپیگنڈے پر حاوی کرنا۔ اور تیسرے جرمنی اور اس کے ساتھی ممالک کے استقلال کو متزلزل کرنا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں حکومت انگلستان نے باقاعدہ لارڈ نارتھ کلف کو دشمن کے ممالک میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے ڈائرکٹر مقرر کیا۔ انھوں نے اپنی مدد کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کی۔ جس میں ویلز اور اسٹیڈ جیسے جرنلسٹ شامل تھے۔ اس شعبے نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور حکومت کے دوسرے شعبوں کے ساتھ بخوبی اشتراک کیا۔ ان کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بین الاتحادی پروپیگنڈا کمیشن قائم ہو گیا۔

اسٹیڈ نے لکھا ہے کہ پروپیگنڈے میں اس بات کی اہمیت نہیں کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔ اسے کوئی نہیں سنتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دشمن کے سب سے کمزور مقام پر حملہ کیا جائے۔ اور جو کام کیا جائے اس کے متعلق بات نہ کی جائے۔ تیسرے یہ کہ جو پالیسی مقرر کی جائے اس پر ہر قیمت پر عمل درآمد ہو۔ یہ شعبہ جرمنی، آسٹریا اور ہنگری وغیرہ میں پروپیگنڈا کرتا تھا۔ یہ ہوائی جہاز کے ذریعہ دشمن کے علاقوں میں اشتہارات پھینک کر ان کو اتحادیوں کی قوت اور جرمنی کی کمزوری کے بارے میں اصل حالات سے آگاہ کرتا تھا۔ ان اشتہارات کی تیاری میں جرمنی کی نفسیات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ایک اخبار ایسا تھا جو بالکل جرمن اخبار کا ہم شکل تھا۔ اس کے اوپر قیصر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جرمنی میں چونکہ مذہب کا زور تھا اس لئے بعض اشتہارات میں مذہبی اپیل بھی [illegible]

مذکورہ بالا کام کے علاوہ وہ پوشیدہ ذرائع سے غیر جانبدار ممالک کے اخبارات کو خط بھجواتا تھا۔ یہ خطوط بظاہر جرمنی کی طرفداری میں ہوتے تھے۔ لیکن در اصل ان کے خلاف ہوتے تھے۔ جرمنی کے اخبارات اس لطیف مخالفت کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ اور چکر کھا گئے۔ چنانچہ انھوں نے ان خطوط کو اپنے اخبارات میں نقل کیا۔ یہی نہیں بلکہ ایسے پمفلٹ شائع کیے گئے جن پر جرمن اداروں بلکہ جرمنی کے پریس تک کا نام چھپا ہوتا تھا۔ پراپیگنڈے کی یہ ٹکنیک اس زمانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی چنانچہ نازی انقلاب کے دوران میں جرمنوں نے پراپیگنڈے کا وہی طریقہ اختیار کیا جس کی بنیاد لارڈ نارتھ کلف نے ڈالی تھی۔ ورنہ اس سے قبل جرمنی کا پروپیگنڈا بہت ناکامیاب تھا۔

لطیف انور

سنی سنائی

دل میں اُمید کی دُہائی تھی — درد کی دُور تک رسائی تھی
موت آئی کہ موت پائی تھی — زندگی تیری رُونمائی تھی
اے مغنی نے کیا سنائی تھی — دھن ہمیں اور ہی سمائی تھی
بندگی کس کے کام آئی تھی — کیا تمھاری یہی خدائی تھی
ہاں کبھی تجھ سے آشنائی تھی — آشنائی کہ جگ ہنسائی تھی
میں ابھی تک ہوں گوش برآواز — تیری آہٹ کہیں سے آئی تھی
صبح دم رو رہی ہے کیوں شبنم — اس نے کس کی ہنسی اُڑائی تھی
لاکھ چاہا کہ ہو بھلا دل کا — اس کی تقدیر میں بُرائی تھی
وہ ابھی تھے مرے تصوّر میں — جیسے تصویر مُسکرائی تھی
بھول بیٹھا ہوں یاد کرتا ہوں — جانے کیا بات یاد آئی تھی
میرا دم بھرتی کس لیے دنیا — میری دنیا نہیں پرائی تھی
کیوں الگ ہو گئے چمن والے — آج تک میری ہمنوائی تھی
تم نے دیکھی نہ سیر مینا نہ — کچھ وہاں اور ہی خدائی تھی
ڈوبنا تھا سو ناؤ ڈوب گئی — کیا کہیں کس کی ناخدائی تھی

قتلِ انور کا تذکرہ کیسا؟
بات یونہی سنی سنائی تھی!

واردات

اسلم کاشمیری

مری محبت تری نگاہِ کرم سے ہے بے نیاز یکسر — مجھے نہیں اس سے کوئی مطلب تو سنگدل ہے کہ مہرباں ہے
وسیلۂ سیم و زر کی دریوزہ گر نہیں ہے مری مسرت — تمام نومیدیوں کے ہوتے ہوئے مری روح شادماں ہے
گزر چکی ہے مری محبت تری پرستش کے مرحلے سے — وگرنہ سر میں جنوں وہی ہے وہی تمنائے آستاں ہے
ہیں نالہ و گل مرے ہی داغ جگر کے آئینہ دار — کلی کلی کی زباں پہ اب بھی محبتِ خستہ کی داستاں ہے

کسی دوائی کو بھی نامفید ثابت کرنے پر یکصد روپیہ انعام

سفید بال یا گنج کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ

آیوروید ہیر لوشن کی پہلی مالش ہی بوجہ نزد سفید ہو چکے بالوں کو نئی خوراک دیکر جڑ سے سیاہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی سفید بال قدرتی طور پر ہمیشہ کے لئے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گرتے بالوں کو فوراً روک کر گنجا پن سر پر خواہ ایک بال بھی نہ ہو شرطیہ دور کرتا ہے۔ قیمت مکمل کورس دس روپے نمونہ چار روپے۔

آنکھوں کا بغیر اپریشن علاج

موتیا بند، پھولا، ککرے یا کسی اور وجہ سے بینائی کم ہوتے ہوتے نظر بند ہو رہی ہو تو آپ کو "کنول کلوریم" جو کہ پھول کے تازہ رس میں بہت عرصہ تک کھرل کر کے تیار کیا جاتا ہے کا روزانہ رات کو استعمال شروع کر دیں۔ آپ حیران ہو جائیں گے کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہی کمزور اور بیمار نسوں میں پھر سے طاقت پیدا ہو کر مکمل طور پر ہمیشہ کیلئے شفا ہو جائیگی قیمت پانچ روپے۔ کنول کلوریم سپیشل جو کہ سوائے پیدائشی اندھا یا ضائع ہو چکی آنکھوں کے لئے دوبارہ پوری روشنی پیدا کرتا ہے قیمت بارہ روپے ڈاکٹر صاحبان آدھی قیمت پر منگوائیں۔ طاقت کا بےنظیر دھاتو بند ایک گولی سونے سے پہلے استعمال کی جائے تو وہ لطف آتا ہے جو کہ ساری عمر نہ دیکھا تھا نہ سنا۔ اس کے علاوہ طاقت ہمیشہ کیلئے حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے قیمت فی درجن چھ روپے نمونہ دو گولی ایک روپیہ کے ٹکٹ بھیج کر منگوائیں۔

برص یعنی پھلبہری

پھلبہری ایسا روگ جس کا علاج ہرگز نہیں ہو سکتا ہماری ولوپلیزا اور دلگو لوشن اس کیلئے اکسیر ثابت ہو چکی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سفید جگہ بھی ہفتہ کے اندر ہی شفا حاصل کر لیتی ہے۔ قیمت دس روپے [illegible] ٹرائل چار روپے بلکہ پوری گارنٹی۔

بواسیر

بھگندر — ناسور

پائلومین کے استعمال کے بعد فوراً آرام ہونا شروع ہو جاتا ہے خارش خون بند ہو کر مسّے بالکل خشک ہو جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ میں مکمل آرام ہو جاتا ہے۔ بواسیر خونی ہو یا بادی قیمت دس روپے [illegible]

ذیابیطس یعنی پیشاب میں شکر آنا

اگر آپ ذیابیطس کا علاج کرا کر تھک چکے ہیں تو آج ہی [illegible] استعمال شروع کر دیں۔ ایک ہفتے کے بعد پیشاب میں [illegible] شکر ظاہر ہونے کے جو قیمت واپس ہونے کے علاوہ سو روپیہ انعام قیمت گیارہ روپے آدھا کورس چھ روپے ہے۔

گونو کا علاج تین دن میں

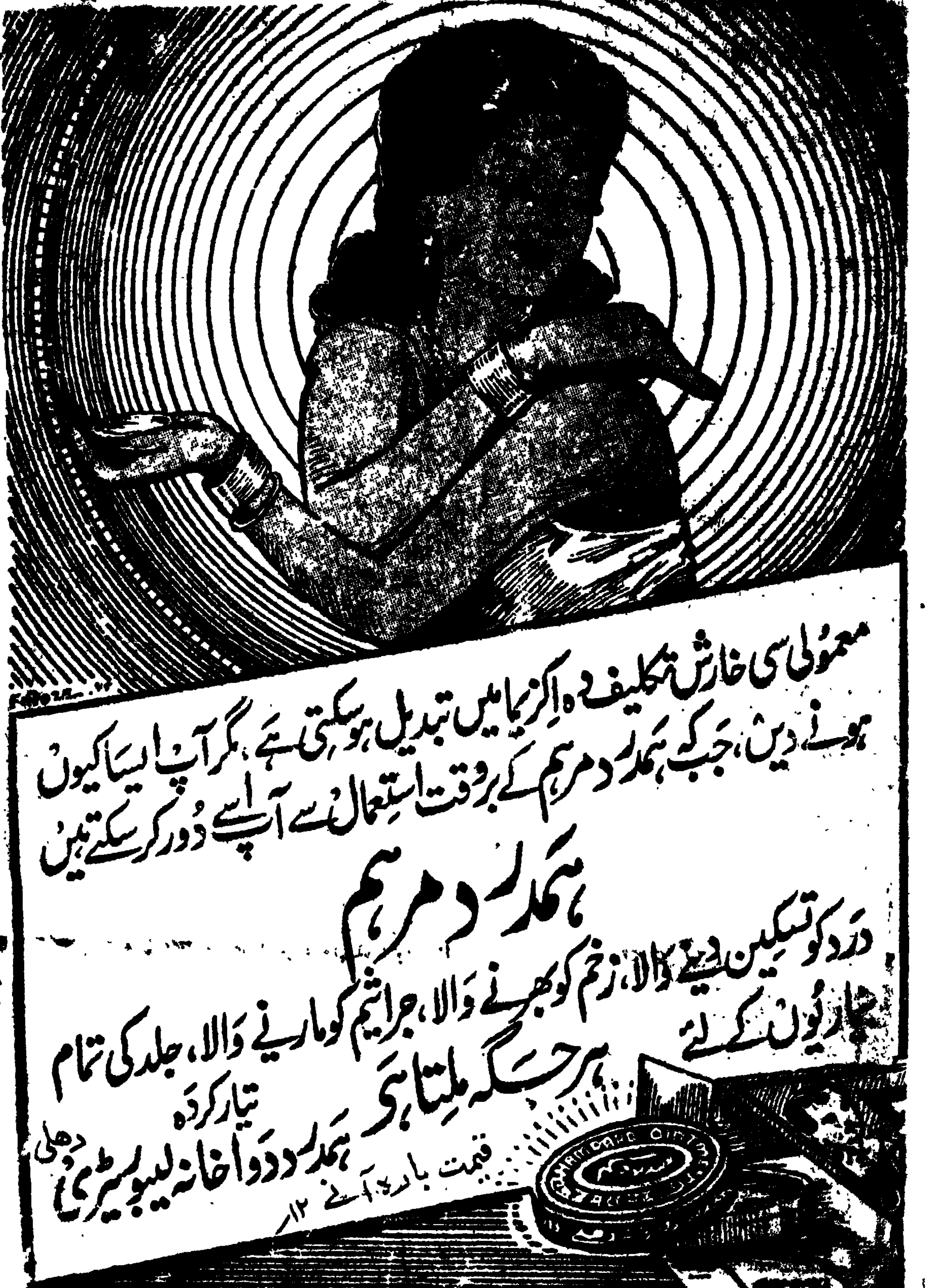
گونو لوگ۔ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ گونو لوگ کے استعمال کے ایک گھنٹہ بعد ہی جلن ٹیس اور پیپ بند ہو جاتی ہے تین دن میں صرف تین خوراک کے استعمال سے سوزاک ہمیشہ کے لئے جڑ سے جاتا رہتا ہے خواہ کتنی ہی دیر سے پرانا۔ پورے آرام کی گارنٹی قیمت سات روپے آٹھ آنے (۷/۸)

بہرہ پن

کان میں سننے کی طاقت کیوں نہ زائل ہو چکی ہو اور کسی وجہ سے بھی کمزوری پیدا ہوتی ہو ڈف ایکس کے استعمال سے تین دن کے اندر سننے کی پوری طاقت عود کر آتی ہے قیمت آٹھ روپے نمونہ ایک روپیہ کا ٹکٹ بھیج کر منگائیں۔

نوٹ:۔ کوئی دوائی بھی نامفید ثابت کرنے پر ایکصد روپیہ نقد انعام

کویراج ایل سنگھا بی۔ آر۔ وی۔ بی اے۔ ایل **گوالمنڈی لاہور**


معمولی سی خارش تکلیف دہ اکزیما میں تبدیل ہو سکتی ہے، مگر آپ ایسا کیوں
ہونے دیں، جب کہ ہمدرد مرہم کے بروقت استعمال سے آپ اسے دور کر سکتے ہیں
ہمدرد مرہم
درد کو تسکین دینے والا، زخم کو بھرنے والا، جراثیم کو مارنے والا، جلد کی تمام
جاریوں کے لئے
ہر جگہ ملتا ہے
قیمت بارہ آنے ۱۲/
تیار کردہ
ہمدرد دواخانہ لیبوریٹری دہلی



۱۹۰۴ء سے استعمال میں ہے
اگر آپ اپنے جلدی روگوں کے لئے
حکیموں اور جراحوں کے نسخوں میں شفا ڈھونڈتے ہیں
آپ کو لازم ہے
کہ ادویات کی فہرست میں مقامی دوا فروش سے
ڈی لیو ٹی طلب کریں
قیمت
ہر مشہور دوا فروش سے ملتی ہے
(ترجمہ انگریزی)

خاص نمبر ۱۹۴۶ء

عالمگیر

لاہور

Alamgir

LAHORE

SPECIAL NUMBER

1946

قیمت خاص نمبر

سالانہ چندہ

چھ روپے چار آنے

دولتِ نیم صبح



نیم صبح کے وقت کی چائے! کیسے باشد، دفتر میں کوئی کام کرنے والے صاحب ہوں یا کوئی گھر والی ہوں. مزدور ہو یا آرٹسٹ ہو! کتنی عافیت اور راحت. پیسہ کا کتنا اچھا مصرف کہ جس سے چستی. پھرتی. یکسوئی تازہ بتازہ ملتی ہے پھر بھی اُن لوگوں میں سے جو چائے جیسی نعمت سے مستفید اور بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کو پورا پورا فائدہ نہیں پہونچتا ہے محض اِس لئے کہ اچھی چائے بنانے کے لئے سہل اُصول کی پابندی وہ سب نہیں کرتے ہیں.

جب کبھی بھی آپ تھکے ماندے یا فکر مند یا تنہا ہوں تو چائے کی طرف متوجہ ہوئیے. لیکن اس بات کا خیال رکھیئے کہ آپ کی چائے اچھی طرح سے تیار ہونی چاہیئے.

اچھی چائے بنانیکا طریقہ

۱- جس کیتلی میں آپ پانی گرم کیجئے اُس میں چائے مت ڈالیئے. ایک الگ چائے پوچی اس کام کے لئے رکھیئے.

۲- چائے پوچی کو بالکل خشک کر لیجئے اور اُسکو گرم پانی سے کھنگال دیجئے تب اُس میں چائے کی پتی ڈالیئے. اس احتیاط کے برتنے سے چائے کی بو باس ٹھیک رہتی ہے.

۳- جتنی پیالیاں چائے کی بنانی ہوں اُتنا ہی چمچہ چائے کی پتی کا پہلے دے دیجئے اور اُس کے بعد ایک چمچہ فاضل بھی. مثال کے طور پر چار پیالی کیلئے پانچ چمچہ چائے کی پتی کا استعمال کیجئے.

۴- تازہ اور اُبالا ہوا پانی استعمال کیجئے. پہلے اُبالا ہوا یا حد سے زیادہ یا حد سے کم اُبالا ہوا پانی چائے کیلئے مناسب نہیں. جب پانی میں بلبلے اُٹھنا شروع ہوں تو سمجھئے کہ وہ اُبلنے لگا ہے.

۵- چائے کی پتی پانی میں ڈالنے کے بعد کم از کم اُسے پانچ منٹ تک چھوڑ دیجئے.

۶- جبتک چائے ڈھالی نہیں گئی ہو اُس وقت تک چینی اور دودھ مت ڈالیئے.



ہر وقت

چائے

چائے کا وقت

انڈین ٹی مارکٹ اکسپنشن بورڈ سے شائع

IK 247

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی اور معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

خاص نمبر ۱۹۴۶ء

جلد ۵۶ مندرجات ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۲،۱

مقالات

افسانے اور ڈرامے

(ورق الٹیے)

نظمیں اور غزلیں

ملاحظات

"دورِ حاضر اور عالمگیر کی یہ آن بان"

۱۹۴۶ء

جنگ کے بعد "عالمگیر" کا پہلا خاص نمبر ہدیۂ قارئین ہے۔ دنیا کے چہرے سے جنگ و قتال کی خونیں نقاب اتر چکی ہے۔ لیکن "تخریب" کے بعد "تعمیر" کی منزل ابھی کوسوں دور نظر آتی ہے۔ قدم قدم پر خطرات و خدشات کا ہجوم ہے۔ اور بے اعتمادی کی گھٹاؤں نے فضا کو تاریک تر بنا دیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے ایک سرکاری اعلان سے زخم خوردہ توقعات کو ایک سہارا ملا تھا۔ کہ شاید ۱۹۴۵ء کے اواخر تک پیپر کنٹرول آرڈر منسوخ ہو جائے اور کاغذ کی اجڑی ہوئی منڈیوں میں پھر سے بہار نظر آنے لگے۔ لیکن پہلے تو حکومت نے اعلان کیا کہ اخبارات ایک وقت میں صرف ایک مہینہ کا حصہ رسدی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس حکمنامے کے نتیجے میں "خاص نمبر" کو پورے ایک ماہ کے جبری التوا کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جنوری کے اواخر میں ایک اطلاع شائع ہوئی کہ ناروے کے کاغذ پر چونکہ روس قابض ہو چکا ہے اور امریکی کاغذ انگلستان کو درکار ہے اس لئے ہندوستان کو غیرملکی کاغذ کے چشمۂ فیض سے بڑی حد تک محروم رہنا پڑے گا۔ ان حالات میں حکومت ہند اخباری کوٹے میں ۵۰ فیصدی مزید تخفیف کے منصوبے باندھ رہی ہے۔ اگر یہ قیاس درست ثابت ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخبارات و رسائل کی مشکلات میں ... ختم ہونے تک ... الرسائل و جرائد ابھی تک ... خاص ...

حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ و طباعت و اشاعت کی الجھنوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ اس کے باوجود "عالمگیر" کے خاص نمبر اور سالانہ نمبر برابر شائع ہو رہے ہیں۔ اور پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کا ظاہری و معنوی معیار جنگ کے سنگین اثر سے محفوظ رہے۔ کاغذ کی کمیابی کے باوجود زیر نظر خاص نمبر کی ضخامت دو سو صفحات سے کم نہیں۔ اور سرورق اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر پر مشتمل ہے۔ آرٹ پیپر کے استعمال کی اجازت حکومت ہند سے خاص طور پر حاصل کی گئی ہے اور اس کے لئے ہم انڈسٹریز اینڈ سول سپلائز ڈیپارٹمنٹ کے سپاس گزار ہیں۔

۱۹۴۵ء دم توڑ چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جنگ کی نبضیں بھی ساکت ہو چکی ہیں جنگ کا زمانہ اردو ادب کیلئے بہت زیادہ تشویشناک اور ہیجان خیز ثابت ہوا۔ اس عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ "ترقی پسند" کے پُرفریب نام سے ایک تحریک شروع ہوئی۔ جو ابتدا میں طوفان کی طرح اٹھی۔ اور بگولے کی طرح پیچ و تاب کھاتی رہی۔ لیکن بنیاد چونکہ مستحکم نہ تھی اس لئے انجام کار اسے جھاگ کی طرح بیٹھنا پڑا۔ جہاں تک ترقی پسندی کے اصول کا تعلق ہے اس سے کسی صاحب ذوق کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے علمبرداروں میں بعض ایسے لکھنے والے بھی شامل ہو گئے جو

عالمگیر

افسانہ نمبر ۱۹۴۶ء

خاص نمبر کے معاً بعد ایک اور نمبر کا اعلان اسراف سے کم نہیں لیکن مشکلات کے ہجوم میں ابھی عالمگیر کا جذبۂ خدمت زد و چوٹ کھا کھا کر ابھرتا ہے۔ اس لئے ادارہ یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے کہ اپریل کی اشاعت "افسانہ نمبر" کے نام سے موسوم ہو گی اور اس میں حسب معمول دلکش اور دلچسپ تازہ ترین کہانیاں شامل کی جائینگی۔ ضخامت ایک سو صفحات قیمت ایک روپیہ۔ تفصیلی اعلان آئندہ اشاعت میں کیا جائے گا۔ افسانہ نگار حضرات سے التماس ہے کہ وہ اپنے منظوم و غیر منظوم افسانے جلد سے جلد دفتر میں بھجوا دیں تاکہ ان کی کتابت و طباعت کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ وقت تھوڑا ہے لیکن امید ہے کہ اہلِ ذوق ادارہ سے پورا تعاون کریں گے۔ (مدیر عالمگیر)

اپنی خوراک مغربی ممالک سے حاصل کر رہے تھے - اور جن کو مشرقی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا - مثلاً ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہندوستان کو "فاشزم" کی رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے "کمیونزم" کے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے - لیکن ایسا کہنے والوں نے یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اگر فاشزم کی قوتیں رجعت پسند ہیں تو "اتحادی امپیریلزم" کی قوتیں کہاں کی ترقی پسند ہیں؟ کیا ترقی پسندی اسی طرز عمل کا نام ہے جو فلسطین، ایران اور ہندوستان میں اختیار کیا جا رہا ہے؟ لیکن اشتراکی ادیبوں کو معاملہ فہمی، حقائق بینی اور ژرف نگاہی سے کیا واسطہ؟ وہ برابر یہی رٹ لگاتے رہے کہ موجودہ جنگ "عوام کی جنگ" ہے - اس لئے تمام ادیبوں اور شاعروں کو درانتی اور ہتھوڑا ہاتھ میں لے کر "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" کا نعرہ بلند کرنا چاہئے - ہم نے اس وقت بھی لکھا تھا کہ جو ادیب اس نعرے کے طفیل کیپٹن، میجر اور کرنل بن چکے ہیں - ان کی زبان سے تو خیر یہ گیت بڑی حد تک زیب بھی دیتا ہے - لیکن عام ادیبوں کو بھلا ہنگامی سیاست کے میدان میں کودنے سے کیا حاصل؟ آخر واقعات نے عوام کی جنگ کا پول خود ہی کھول دیا اور ایک طرف روس کی جارحانہ پیش قدمی اور دوسری طرف ہندوستانی کمیونسٹوں کی عیاری و فریب کاری نے ثابت کر دیا کہ ترقی پسندی کی تحریک کھوکھلے بدراہانہ "بنیاد" کے اصول پر قائم تھی - ورنہ اسے عوام کی بھلائی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا - چنانچہ ایک طرف کانگرس نے کمیونسٹوں کو اپنے گروہ سے خارج کر کے ان کے طرز عمل سے بیزاری کا اظہار کیا تو دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی کے صدر دفتر کی آتش گیری بھی ثابت کر رہی ہے کہ یہ پارٹی عوام میں مقبول نہیں رہی - لہذا اب اگر ترقی پسند تحریک کے اشتراکی پہلو کو ایک طویل مدت تک ختم سمجھ لیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ بیجا نہ ہوگا -

ترقی پسند ادیبوں کی ایک اور ٹولی عریاں نویسی اور فحش نگاری ہی کو "آزادی ادب" قرار دینے پر مُصر تھی - اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے بعض نقاد بھی "جنسیات" کو "ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ" قرار دے رہے تھے - گویا مسٹر گاندھی، مسٹر محمد علی جناح اور بابو سبھاش چندر بوس کی عقلوں پر پردہ پڑ گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے صحیح مرض کی تشخیص نہ کر سکے - اور خواہ مخواہ "سیاسی آزادی" کی رٹ لگاتے رہے - ورنہ اس بدبخت ملک کی نباضی میں اگر کوئی کامیاب ہوا تو یہی ترقی پسند نقاد - ! جن کے نزدیک پشاور سے راس کماری تک تمام باشندے اس ذہنی بخار میں مبتلا تھے جس کی ماہیت آئے دن ترقی پسند کہلانے والے جرائد کے مضامین اور افسانوں میں بتائی جاتی ہے - انا للہ وانا الیہ راجعون - ذرا خیال تو کیجئے جنگ کا زمانہ ہمارے ادب کے لئے کس درجہ ہیجان خیز اور پُرآشوب تھا - ایک طرف سبھاش چندر بوس برما میں آخری تاجدار ہند کے مزار پر کھڑے ہو کر "جے ہند" کا نعرہ لگاتے ہیں اور اس کے جواب میں شاہنواز، ڈھلوں اور سہگل ہزاروں نوجوانوں کے ہمراہ سربکف میدان میں نکل آتے ہیں - تو دوسری طرف ہمارے جوانمرد ادیب گھر بیٹھے "جنسی ناہمواریوں" کے ہارمونی گیت گا رہے ہیں - ایک طرف ڈاکٹر لکشمی سوامی ناتھن "رانی جھانسی رجمنٹ" تیار کرتی ہے - تو دوسری طرف ہمارے ایک معزز گھرانے کی چشم و چراغ بقول کسے "ان سرسراتے ہوئے رازوں" کی کھوج میں مصروف ہے جو لحاف کے اندر کلبلا رہے ہیں؟ کیا یہ مر جانے کا مقام نہیں؟ کیا یہ زندہ قوموں کے کارنامے ہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ حکومت نے بروقت توجہ کی اور اس فحاشی کے ادیبوں کے منہ میں جگالی نے کی خاردار لگام ڈال کر ترقی پسند تحریک کے اس پہلو کو بھی ختم کیا - ورنہ خدا جانے ہماری ادبی سرگرمیوں کا مآل کیا ہوتا؟

"قارئین جانتے ہیں کہ جنگ کے اضطرابی دور میں بھی عالمگیر نے میانہ روی اور اعتدال کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا - اور وہ حتی الامکان ایسے ادبا و شعرا کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں سے کام لے کر صحیح و صالح ادب کی تخلیق کرتے ہیں - اس مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئے لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت ایسی تیار ہو چکی ہے - جس کے ہاتھ میں اردو ادب کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے - اس جماعت کے اکثر افراد "خاص نمبر" میں شریک ہیں - جی چاہتا ہے کہ ان کی نگارشات پر ایک بھرپور نظر ڈالی جائے - لیکن تنگی داماں ہمارا آڑا روک رہی ہے - اس لئے مجبوراً چند لفظوں پر اکتفا کیا جاتا ہے -

خاص نمبر میں کم و بیش دس مضامین، پندرہ افسانے اور چالیس غزلیں و نظمیں شامل ہیں اور ان میں سے اکثر [illegible] شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں - آیئے پہلے مقالات [illegible] خاموش نہیں رہ سکتا" [illegible]

ایک [illegible] اس سلسلہ کی یہ آخری کڑی ہے۔ [illegible] نے [illegible] کے کارناموں کا جائزہ خود ہی لیا ہے۔ اس لئے ادارہ کی طرف سے کسی اضافہ و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد قارئین کو ان کے زورِ بیان، ندرتِ استدلال اور صحتِ فکر کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا۔

"بہاء الدین عاملی کی عربی شاعری" مولانا اختر علی تلہری اردو کے علاوہ فارسی و عربی ادب پر بھی محققانہ نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے سولھویں صدی کے ایک فاضل اجل کی عربی شاعری سے تعارف کرایا ہے۔ امید ہے قارئین اس ادبی شراب سے بہت زیادہ محظوظ ہونگے۔

"اسپین میں اسلامی حکومت کا آغاز و انجام" اسپین میں مسلمانوں کا عروج و زوال ایک ڈرامائی حیثیت رکھتا ہے۔ چودھری ممتاز حسین بسمل نے تاریخ کے ایک دریا کو مضمون کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔

"فوق کی شاعری" مولانا محمد دین فوق کی تاریخ دانی اور اخبار نویسی کا علم تو اکثر قارئین کو ہے۔ لیکن ان کے شاعرانہ مقام سے بہت کم لوگ آگاہ ہونگے قریشی محمد عبداللہ صاحب کو حضرت فوق کی مجالس میں برسوں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لئے مرحوم کی شاعری پر روشنی ڈالنے کا اہل قریشی صاحب سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ دلچسپ اور معلومات افزا مضمون لکھ کر نہ صرف فوق مرحوم کی زندگی کے ایک غیر متعارف پہلو کی نقاب کشائی کی ہے بلکہ اردو کے تذکرۂ شعرا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ "ترقی پسندی اور تنقید نگاری" ماہر القادری صاحب ان اولیں مجاہدوں میں سے [illegible] کی دور رس نگاہوں نے ترقی پسند تحریک کے

کے مغربی رجحانات کو شروع ہی سے جانچ [illegible] نے ایک بھیگی ہوئی رات کو "باب الہند" کے قریب کھڑے ہو کر ایک تنبیہی آواز بلند کی۔ جس کو ایک صاحب نے "بوڑھے کی کراہ" سے تعبیر کیا۔ لیکن لوگوں نے دیکھ لیا کہ یہی آواز صورِ اسرافیل بن کر فضائے ہند پر چھا گئی۔ اور آج خود ترقی پسندوں کے بقول: "اس تحریک کے چند سانس اور باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اکھڑے اکھڑے"۔ (ساقی، جنوری ۱۹۴۶ء) ہمیں ماہر صاحب کے استدلال سے اکثر جگہ اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ ترقی پسند ادب کے بعض پہلو یقیناً قابلِ اعتراض ہیں لیکن اس کی ہر چیز بری نہیں ہے تاہم مضمون کا عام لہجہ فکر انگیز ہے۔ "اردو شاعری میں منظر نگاری" ہمکنر ملیح آبادی ایک ہونہار شاعر اور سمجھدار ادیب ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے فطری مناظر کو یکجا کر کے ایک دلفریب ادبی چمن آراستہ کیا ہے "نگاہِ فقر میں شانِ قلندری کیا ہے"۔ پیر غلام دستگیر نامی ایک وسیع المطالعہ اور سلجھے ہوئے دماغ کے بزرگ محقق اور مورخ ہیں۔ انھوں نے "اخبار الاخیار" کے حوالے سے اہل اللہ کے استغنا کے ثبوت میں بعض دلچسپ واقعات پیش کئے ہیں۔ وہ خود بھی طبعاً فقر و استغنا کی طرف مائل ہیں۔ اس لئے مضمون میں ایک خاص تاثیر اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ "ادب اور اخلاق" کچھ عرصہ ہوا بعض ترقی پسند کہلانے والوں نے فحش نویسی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا۔ جب مفکرین نے ان کی بے راہروی پر کڑے اعتراضات کئے تو انھوں نے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑانا چاہا کہ اخلاق ایک نسبتی اور اضافی حیثیت رکھتا ہے (باقی برصفحہ ۱۹۹)

قطعاتِ تاریخ رحلت حضرت جلیل

جانشین حضرت امیر مینائی مرحوم

فضا کوثری

جلیل القدر شاعر اٹھ گیا آہ | بنی ماتم کدہ بزم سخنداں
فضا کہہ دو اجل کا سر اڑا کر | "ہوئی اُف رحلت استاد سلطاں"

۱۳۶۵ھ

طرفہ قریشی

حیدرآباد ان دنوں ہے سوگوار | ہر طرف حسرت ہی حسرت دیکھنا
کچھ نہیں طرفہ دکن میں دیدنی | بس "امام الفن کی تربت دیکھنا"

۱۳۶۵ھ

عبدالعزیز وفا بنگلوری

ہو گئی رحلت جناب جلیل | کیوں نہ بزم سخن ہو بزمِ عزا
مجمع میں لکھو وفا تاریخ | "بادشاہِ سخن جلیل اٹھا"

۱۳۶۵ھ

شمیم وانمباڑی

راہی جنت ہوئے حضرت جلیل | ملک سخن کے تھے وہ فرماں روا
صنعتِ منقوط میں کہہ دو شمیم | "خسرو اقلیم سخن جل لبا"

۱۳۶۵ھ

اخبار و افکار

فصاحت جنگ جلیل اور مولانا آسی لکھنوی کی وفات

ابھی اہلِ اردو کے دل میں نواب سائل دہلوی، منشی محمد دین فوق اور اختر نگینوی کی وفات کا غم تازہ تھا کہ قدرت نے ایک اور چرکہ لگایا ہے۔ نئے سال کے طلوع ہوتے ہی بزمِ شاعری کے دو اور جھلملاتے ہوئے چراغ گل ہوگئے اور علم و ادب کی محفلوں کو ویران کر گئے ۔۔۔۔۔!

اُردو شاعری ایک نازک دور سے گزر رہی ہے۔ ہندوستان کے دروازے پر ایک ہولناک انقلاب دستک دے رہا ہے۔ نئی اور پرانی قدروں میں ایک محیر العقول کشمکش جاری ہے۔ عہدِ حاضر کا نوجوان تذبذب اور کشمکش و پیچ کی حالت میں ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ان حالات میں صحیح و صالح رہنمائی کی جس درجہ ضرورت محسوس ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن قدرت کی ان بوجھی مصلحتوں کے ماتحت کہنہ مشق اساتذہ اور ماہرینِ فن ایک ایک کرکے بزمِ شعر و سخن سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور اردو شاعری کو روز بروز اپنی پریشاں حالی کس مپرسی اور یتیمی کا احساس ہو رہا ہے۔ فصاحت جنگ جلیل اور مولانا آسی لکھنوی کی وفات نے اس احساس کو شدید تر بنا دیا ہے۔

امام الفن حضرت فصاحت جنگ بہادر نواب حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری استاد حضور نظام حضرت امیر مینائی رحمۃ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اور صحیح معنی میں ان کے جانشین ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے فانوسِ سخن میں اس شمع کو روشن رکھا جو حضرت داغ دہلوی اور حضرت امیر مینائی نے اپنے ہاتھ سے جلائی تھی۔ ان کے اُستادانہ طرزِ کلام نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں جو گرانقدر حصہ لیا ہے اُسے تاریخ ادبیات فراموش نہیں کرسکتی ۔۔ ان کی ایک ایک غزل فصاحت و بلاغت کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اور ان کے ایک ایک شعر میں وجدانی کیفیات کا دریا موجزن ہے۔ وہ اتنے صاف و سادہ اور جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے شعر کہتے تھے کہ ایک ایک مصرع دل میں اُتر جاتا تھا۔ ان کی زبان کی شیرینی اور گھلاوٹ کا مقابلہ آج تک کسی شاعر سے نہیں ہوسکا۔ مرحوم نے تقریباً ۹۲ سال کے انقلابات زمانہ اور حوادث روزگار کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا۔ لیکن کبر سنی کے باوجود ان کے عزائم ہمیشہ جوان رہے اور ان کو آخری سانس تک شعر و سخن کی مشاطگی میں مصروف دیکھا گیا۔

"عالمگیر" پر مرحوم کا دستِ شفقت ہمیشہ رہا ہے۔ اور گزشتہ بائیس برس میں غالباً ایک بھی خاص یا سالانہ نمبر ایسا شائع نہیں ہوا جس کے پہلے صفحہ کو حضرت جلیل کے تازہ ارشادات سے مزین نہ کیا گیا ہو۔ لہذا ہمیں آپ کی وفات پر اس لئے بھی بہت زیادہ افسوس ہے کہ "عالمگیر" ایک واجب الاحترام اور قدرشناس قلمی معاون کی اعانت سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے اقربا و تلامذہ کو صبر کی توفیق ارزانی فرمائے۔

حضرت جلیل کی وفات کا صدمہ یقیناً ناقابلِ تلافی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ان کے دو فرزند عزیز احمد اور علی احمد ان کی عین حیات ہی میں شعر و ادب کے میدان میں اپنا سکہ بٹھا چکے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ وہ اس باغ کو لہلہاتا رکھیں گے جو حضرت امیر اور حضرت جلیل نے حیدرآباد میں اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

مولانا عبدالباری آسی شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ ایک وسیع النظر نقاد اور محقق بھی تھے۔ انھوں نے جہاں لیلائے شعر و سخن کو نئے نئے میدانوں سے روشناس کیا وہاں دیوانِ غالب کی شرح لکھ کر اہلِ ذوق کو غور و فکر کی دعوت بھی دی۔ ان کا نام اور کام تاریخ شعر و ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور آئندہ آنے والے فن کاران کی تحقیق و جستجو سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ ہم ان کے اعزہ و اقربا سے اس صدمہ جانکاہ میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی مغفرت کے لئے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں ۔۔۔۔!

مرسلہ عبدالعلیم شیرکوٹی

میر حسن دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام

(میر حسن دہلوی کو اس جہانِ فانی سے کوچ کئے ہوئے ڈیڑھ سو سال سے زائد ہو گئے۔ لیکن یہ اُردو زبان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایسے قادر الکلام شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ اب تک عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ میں اس سے پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں کہ جو قلمی نسخہ کلیات میر حسن کا میرے پاس ہے وہ نامکمل ہے۔ جو کچھ ہے اس کو ضرور منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ حضرات ایسے ہیں جن کے پاس ان کا پورا کلام موجود ہے۔ کاش وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔ اگر وہ خود کسی وجہ سے یہ زحمت گوارا نہ کر سکتے ہوں تو خاکسار ہی کو اشاعت کے سلسلے میں ضروری امداد بہم پہنچائیں۔ اردو پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ — عبدالعلیم)

گئی آرزو تھی جو اس طرح لئے ساتھ غیروں کو آ گئے
بھلے چنگے دل کو جلا گئے نئے سر سے آگ لگا گئے

اُنھیں کس نے دیکھا نظر اٹھا کبھی چپکے چپکے جو نکلے آ
تو اِدھر اُدھر سے نظر بچا مری جان و دل میں سما گئے

کبھی سیدھی آنکھیں جو پاتے ہیں تو جگر کے داغ دکھاتے ہیں
سو وہ اور ناک چڑھاتے ہیں کہ یہ ا تو لالی پہ آ گئے

کئی دن سے مجھ سے وہ تھے رُکے خفگی تھی ان سے چھپے چھپے
میں ان آنکھوں کے صدقے گیا کہ وہ مجھے آپ آ کے منا گئے

ادھر آ کے ڈھونڈو ہو کس کا گھر یہی عاشقوں کا تو ہے نگر
اسی بستی والوں کے تھے جگر جو تمھارے ظلم اٹھا گئے

ہوئے دوست گو کہ ہزار تم کہوں کیونکہ میں کہ ہو یار تم
ہوئے آپ کشتی سے پار تم مجھے بحرِ غم میں ڈبا گئے

کسی بات کا بھی تجھے مزا نہ انھوں نے اپنی دیا ذرا
کبھی ہنستے دیکھ رُلا گئے، کبھی روتے دیکھ ہنسا گئے

نہ کسی کو زلف سے کام تھا نہ کسی کا گیسو ہی دام تھا
ہمیں تو فراغ مدام تھا مگر آپ بیچ میں آ گئے

کچھ اک اپنی ضد پہ جو اَڑ گئے تو وہ بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے
مرے ساتھ آپ بھی لڑ گئے مجھے اور دل سے بھی لڑا گئے

ترے در سے اُٹھ گئے آہ یوں کہ اٹھے ہی کوئے جہاں جوں
مجھے اعتبار ہی تھا نہ کیوں وہ جو کہتے تھے سو کھا گئے

وہی مجھ سے اور وہی طور ہے وہی ظلم ہے وہی جور ہے
انھیں کس کے حال پہ غور ہے وہ تو جی میں آیا ستا گئے

گئے نظریں اپنی اگر چھپا تو حسنؔ نہیں مجھے کچھ گلہ
کسی نے بھی دیکھا انھیں بھلا کہ کسی سے آنکھ ملا گئے

مرسلہ:۔ عبدالباری عشق

تبرکات

حضرت امیر مینائی علیہ الرحمۃ کی غیر مطبوعہ غزل

نوٹ:۔ یہ کلام مسودات کی صورت میں دستیاب ہوا ہے۔ الفاظ جا بجا پڑھے نہیں جاتے جا بجا غائب ہیں اس لئے صحت یقینی نہیں کہی جاسکتی۔ عشق

راہی سرائے دہر سے مثلِ شرر ہوں میں
ہستی میں آتے آتے ہی گرمِ سفر ہوں میں

مشتاقِ سیرِ ملکِ عدم اس قدر ہوں میں
عمرِ رواں سے چار قدم پیشتر ہوں میں

رنگِ اثر دکھائے اگر اتحادِ عشق
وہ رشکِ گل جو پھول ہے بیخبر ہوں میں

کہتا ہے گل چمن میں نہ برباد کر مجھے
رحم اے خزاں بہار کا لختِ جگر ہوں میں

آوارگی میں بھی تری آنکھوں میں ہے جگہ
مانند میلِ سرمہ یہاں دربدر ہوں میں

رکھتا مرا بھی صیّادِ گہ ناز میں خیال
اے تیرِ یار طائرِ بے بال و پر ہوں میں

زیرِ قدم ہے منزلِ مقصود مثلِ شمع
اور شوق یہ کہ شام سے گرمِ سفر ہوں میں

اس گھر کی جان ہوں میں جہاں میہمان ہوں
دل میں سرور آنکھ میں نورِ نظر ہوں میں

مژگانِ یار کہتی ہے زلفِ دراز سے
چھوٹے سے قد کے ساتھ بڑی فتنہ گر ہوں میں

گردش کسی کی آنکھ کی پیسے تو لطف ہو
ہوں خاک بھی تو ذرۂ گردِ نظر ہوں میں

آنسو بھر آئے دیکھ کے بزمِ جہاں کا رنگ
آئینے کی طرح ہمہ تن چشمِ تر ہوں میں

آگاہ دوسرا ہو حقیقت سے میری کیا
ہستی سے اپنی آپ ہی جب بیخبر ہوں میں

اللہ رے شوقِ دید دعا مانگتا ہے دل
عالم تمام آنکھ ہو اُس میں نظر ہوں میں

دیکھ اے فلک نہ دیکھ مجھے چشمِ کم سے تو
تیرِ نگاہ یار کا مدِّ نظر ہوں میں

گل ہوں نہ غنچہ اس چمن دہر میں امیر
بے برگ اک درخت ہے اس کا ثمر ہوں میں

پرواز

عشق دل پر اثر انداز آیا ۔ میرا ہمدم مراد مساز آیا
دل لگانے میں بڑا لطف سہی ۔ جائیے جائیے میں باز آیا
اب تو ہر نغمہ یہ دیتا ہے صدا ۔ سازِ ہستی نہ مجھے ساز آیا
گیسوؤں کا وہ ہوا میں اڑنا ۔ حسن لیکر پرِ پرواز آیا
عشق ہے اور غمِ رسوائی ۔ لیکے انجام کو آغاز آیا
جھومتے عمر گھٹا کو گزری ۔ میرے ساقی کا نہ انداز آیا

وہ تو کیا اُس کا تصور بھی جلیل
بصد انداز و بصد ناز آیا

جمیل مظہری ایم اے

میں اور تو

تو ہے بتوں کا حسن ہے اور ترے جمالیات   میں ہوں خدا کی شان ہے اور مرے مشاہدات
میری نظر الٹ چکی پردۂ معنیٔ و شہود   اور ہجومِ لفظ میں گم ہیں ترے تخیلات
میرے دماغ کی پہنچ قیدِ مکاں سے بھی پرے   تیری نظر کے حوصلے تا بہ حدِ تعینات
فکر مری اٹھا چکی رسمِ پرستشِ قیود   اور ترا دماغ ہے بتکدۂ مسلمات
تیرا ثباتِ ذوق ہے موت کی شکلِ معنوی   تیرے ثبات پر نہیں کیوں ہو مرے تغیرات
گوہرِ اشکِ یکساں جیبِ شعور میں ترے   ناز و نیازِ دلبراں تیری غزل کی کائنات
ناز و نیازِ حسن کیا؟ شوق کی بت تراشیاں   سوز و گدازِ عشق کیا؟ نفس کے کچھ مطالبات
میری نظر میں شاعری روح کی ایک کیفیت   تیری نظر میں شاعری لفظ کے کچھ تکلفات
میری نظر میں پست ہے عشق کا جذبۂ ذلیل   تیرے لئے حقیقتیں شوق کے کل توہمات
عالمِ شور و شر میں ہے تجھ سے سکوت موت کا   خواب گہِ جمود میں مجھ سے تلاطمِ حیات

شورشِ روح اور ہے کیفِ شباب اور ہے
میری شراب اور ہے تیری شراب اور ہے

احسان بی-اے

دُرِّ یتیم

دُودھ

معاملہ طے ہوگیا ——!

آمنہ نے اپنے لخت جگر کو حلیمہ کے حوالے کر دیا۔ اور حلیمہ اپنے خوابوں کی تعبیر سینے سے لگا کر عبدالمطلب کے مکان سے نیچے اُتر آئی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ثوبیہ حلیمہ کے ساتھ ساتھ تھی اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ثوبیہ کے سر پر ایک بڑا طباق رکھا ہوا تھا۔ اور اس میں کئی چیزیں تھیں۔ ستو بھی تھے، بکری کا سوکھا ہوا گوشت بھی۔ خشک کھجوریں بھی تھیں اور مکے کے تازہ چھوارے بھی۔ اس کے علاوہ آمنہ نے اپنے لال کی دایہ کو سونا بھی دیا تھا لیکن جہاں تک حلیمہ کے پیشے کا تعلق تھا یہ تمام چیزیں بہت تھوڑی تھیں۔ اگر مکے کا کوئی اور متمول تاجر ہوتا اور حلیمہ اس کا اپنا بچہ گود میں لیتی تو وہ حلیمہ کو مالا مال کر دیتا۔ اتنا مال دیتا انھیں کہ وہ کم از کم ایک دو سال با فراغت گزار لیتے۔ اور اس کے بعد قحط کی قیامت انگیزیاں تھم جائیں۔ جنگلوں میں ہریاول نظر آنے لگتی اور حلیمہ کی اپنی بکریاں دودھ دینے لگتیں۔

ہاں حلیمہ کی اپنی بکریاں ——!

اس کی نگاہوں کے سامنے میں آج سے تین برس پہلے کا منظر تیر گیا۔ جب سورج ڈوب جاتا اور حلیمہ شیمہ کو گود میں لئے خیمہ کے دروازے پر کھڑی ہوتی۔ دُور ریگستان کی وسعتوں میں بُھر بھرے پتھروں کے ٹیلے۔ ان سے بھی پرے نخلستانوں میں لہلہانے والی فلک رس کھجوروں کی ہری ہری چوٹیاں۔ اور ان چھتری نما چوٹیوں کو چھوتی ہوئی شفق کی سُرخیاں۔ جو بُھر بُھرے پتھروں کے ٹیلوں کو بھی اپنے نارنجی رنگوں میں رنگ دیتی تھیں اور پھر حلیمہ نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا۔ اُسے اپنی موٹی موٹی بکریاں ان نارنجی رنگوں میں رنگے ہوئے ٹیلوں پر سے کلیلیں کرتی ہوئی اترتی نظر آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے حرث ہوتا۔ کندھے پر درانتی والا مبا ... عشقیہ گیت گاتا ہوا۔ حلیمہ کو ... ان —— اُس کے حرث پر سونے کی بارشیں کر رہا ہے۔

اور پھر جب بکریاں خیمے کے قریب پہنچ جاتیں —— ہاں خیمے کے قریب۔ ان کے پیٹ حد سے زیادہ کھا لینے کی وجہ سے ان کی پسلیوں سے کہیں آگے اُبھرے ہوئے ہوتے۔ ان کے تھن مشکیزوں کی طرح بھرے ہوئے اور کسے ہوئے ہوتے۔ بکریوں کے بچے کسی غیر مرئی قوت کے اثر سے ان گرد آلود بھرے بھرے تھنوں میں لہراتے ہوئے دریاؤں کو دیکھ لیتے اور اپنی چھوٹی چھوٹی دمیں تیزی سے ہلا ہلا کر رسیاں تڑانے کیلئے زور کرنے لگتے۔ صرف یہی نہیں۔ بچوں کے اس اضطراب کو ماں کا دل بھی لاشعوری طور پر محسوس کر لیتا اور تھنوں کے مُنہ آپ ہی آپ گیلے ہونے لگتے۔ کتنی سوندھی سوندھی جاں نواز بُو ہوتی تھی۔ بچے پالنے والی ان بکریوں میں۔ حلیمہ کی ناک میں وہی بُو تیرنے لگی —— گرم گرم دودھ میں بھیگی ہوئی، میٹھی میٹھی بو، جو کسی غیر ارادی طریقے سے حلیمہ کے اپنے بچوں کے جسموں میں سرایت کر گئی تھی۔

اور حلیمہ کا دل درد و کرب کی ایک انگڑائی لیکر تڑپ اٹھا۔ وہ دن خواب ہوگئے۔ بھولا ہوا میٹھا سپنا، جس کی یاد زہرناک تھی۔ تڑپا دینے والی ——!

اور اس حسین ماضی کے مقابلے میں تاریک تر حال۔ حلیمہ سوچنا نہیں چاہتی تھی اس حال پر۔ آخر اس پر غور کرنے سے حاصل ہی کیا تھا۔ لیکن اس بیتابی خواہش کے باوجود ظالم حال اپنے جنوں کے ساتھ پوری شیطانی شدت سے اس کی کمزوری کو مشتعل کا منہ چڑاتا ہوا اس کے دماغ کے ذرّے ذرّے میں انگارے بھرتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بکریاں تھیں۔ بھوک سے سوکھی ہوئیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچ جن میں منمنانے تک کی ہمت نہ تھی۔ اور جن کے تھنوں سے دودھ کے بجائے گدلا پانی نکلتا تھا۔ اور پھر دراز گوش تھی —— وہی دراز گوش جو گزشتہ دنوں میں گوشت اور طاقت کا ٹیلہ تھی۔ آج بھوک کے ہاتھوں گھل گھل کر ایک سائے کی طرف نحیف ہوگئی تھی۔ ایسا محسوس

ہوتا تھا کہ اس کے اوپر کا جسم اپنے ہی بوجھ سے اُس کی ٹانگوں کو توڑ کر رکھ دے گا۔ اُس کی ٹانگوں کے جوڑ جوڑ ڈھیلے ہو رہے تھے۔ وہ چلتی نہیں، اپنے چوڑے چوڑے بھدے سموں پر ڈولتی تھی۔ وہ جس کی چال پہ بادیہ بنو سعد کی عورتیں رشک کھاتی تھیں — کہ — آہ! آج قبیلہ والوں سے کئی میل پیچھے رہ گئی تھی۔

اور پھر حرث کی صورت، بچوں کی شکلیں ایک ایک کر کے حلیمہ کے جلتے ہوئے تخیل کے دہکتے ہوئے خلا میں انگور کی سوکھی ہوئی بیجان بیلوں کی طرح ڈولنے لگیں۔ نہیں — اس حاویئے میں جھونک دی گئیں۔ لیکن یہ سوکھی ہوئی بیجان بیلیں خود نہیں جلیں بلکہ انہوں نے اپنی تپش سے خود حاویئے کو بھون کر رکھ دیا۔ حلیمہ کی رگ رگ میں سوئیاں دوڑنے لگیں۔ زہر جسکر پر چکر کاٹنے لگا۔

اُسے اس کائنات کے ناظم پر غصّہ آ رہا تھا۔ اس بھٹی میں جلنے کے لیے حلیمہ ہی کو منتخب کیا گیا؟ اس کے قبیلہ کی دوسری عورتیں بھی تو تھیں۔

ثوبیہ بڑے ٹھاٹ سے طباق اُٹھائے تھی اور بڑے وقار سے راہ چلتوں کو باتوں ہی باتوں میں جتائے جا رہی تھی کہ سردار عبدالمطلب نے اپنے یتیم پوتے کو اس یتیمی کے باوجود اس حق سے محروم نہیں رہنے دیا جو خاندان قریش کے ہر نرینہ فرد کو ملتا ہے۔ وہ بوڑھے سردار کی ہمت اور پوتے سے اس کی بے لوث محبت کا ڈھنڈورا پیٹتی جا رہی تھی۔ اعلانیہ کہہ رہی تھی کہ قریش والوں میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ آج تک کسی یتیم کو دایہ کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اور پھر دایہ بھی معمولی نہیں۔ عرب بھر کے بہترین قبیلہ سے تعلق رکھنے والی دایہ — بنو سعد کے خیموں کی رونق۔ جن کی زبان مشرق سے مغرب تک سند کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے — قدرتی طور پر ایسے اعلیٰ قبیلے اور افضل خاندان سے دایہ حاصل کر لینا ہر کہہ و مہ کا کام نہیں تھا۔ بڑی بڑی رقمیں خرچ ہوتی تھیں اس پر — اتنی رقمیں کہ معمولی قریشی ان کے مصارف کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ باپ والوں کو بھی یہ نعمت بڑی مشکلوں سے میسر آتی ہے۔

اور سر پر رکھا ہوا بڑا طباق اعلانیہ اس دریا دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ آنے جانے والے مرعوب ہوئے جاتے تھے ان کی آنکھوں میں عبدالمطلب کے لئے ستائش کے دریا بہ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر تحسین سے متحرک رہے تھے۔ اور ان کے دل اندر ہی اندر یہ دعائیں کر رہے تھے کہ وہ بھی اتنے ہی بوڑھے ہوں۔ ان کے بیٹا بھی اسی طرح —

اور پھر خود ہی وہ اپنے خیال کو رد کر دیتے۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں توبہ توبہ کہتے اور آگے بڑھ جاتے۔

حلیمہ یہ سب محسوس کر رہی تھی۔ جیسے یہ تمام جذبات اُس کے اردگرد تیرنے والی ہوا میں گھلے ہوئے ہوں اور ان سب کو محسوس کر کے وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ عبدالمطلب نے واقعی بڑی ہمت کی تھی۔ لیکن سردار قریش کی اس ہمت سے بادیۂ بنو سعد میں گھرتی ہوئی چکراتی ہوئی اور پیستی ہوئی بلائیں کس طرح کم ہو جائیں گی۔ یہ چھوٹا سا طباق جو ایک آزاد شدہ لونڈی کے سر پر اٹھوایا جا سکتا تھا۔ فاقوں کے ان پہاڑوں کو کس طرح روک سکتا تھا جو ساتویں آسمان سے بادیہ نشینوں کے سروں پر لڑھکائے جا سکتے تھے۔

کچھ بھی فائدہ نہیں —!

حلیمہ کا دل گونج اُٹھا۔ اور اُس نے تھکی ہوئی آنکھوں سے اپنی گود میں میٹھی نیند سونے والے معصوم کی طرف دیکھا۔

"تمہیں گود میں لینے سے بھی کیا فائدہ ہوا؟" اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ تھکی ہوئی مجبور، مایوس آنکھیں اور دفعتہً بچہ سوتے سوتے مسکرا دیا۔ اس کے ننھے ننھے سرخ ہونٹ آہستہ سے ہلے اور ایک ہلکی سی میٹھی سرور انگیز مسکراہٹ ہونٹوں کی ریشمی نرمیوں پر کانپ اُٹھی۔ حلیمہ بھی غیر ارادی طور پر مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھیں مایوسیوں اور مجبوریوں کی شعلہ زائیوں میں گھری ہوئی، تپتی ہوئی آنکھیں یکدم ایک میٹھی زندگی بخش ٹھنڈک کا احساس کرنے لگیں۔ اس کے دل میں ایک لذت آفریں پیار، ایک گدگداتی ہوئی سرور انگیز محبت کا فوارہ اُچھل پڑا اور اس نے دانت کچکچا کر بچے کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

بچہ اس ایکا ایکی دباؤ سے گھبرا کر ڈر سا گیا۔ اور اس کے ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں اُبھر کر کانپ گئے۔ حلیمہ نے سر جھکا کر پیار سے دونوں ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے لے کر اپنے حلق کے ساتھ دبا لیا۔ چھوٹے سے مُنہ کی باچھیں سکڑیں اور نچلا ہونٹ دب کر پھر اُبھر آیا۔ ننھی ننھی باچھیں دیں، سکڑیں، ہونٹ پچکا اور اُبھرا بند آنکھوں کے پپوٹوں پر نبض کی سی دھڑکن تھرکی —

اور حلیمہ کا دل جیسے کھنچ کر اس کے ہونٹ[illegible] کی طرح سمٹ کر اس کے [illegible]

[illegible] اور اس کی [illegible] کی پیچھے چھوٹ [illegible]
کیلی گیلی [illegible] ہوئی زمینوں سے چھو گئے۔

وہ لمس ——

حلیمہ کا ماضی اور مستقبل اس لمس کی تابناکیوں سے منور ہو گیا۔ وہ بھول گئی کہ اس کی بکریوں کے تھنوں میں اتنا دودھ بھی نہیں ہے جو اس بچے کے حلق کو تر کر سکے۔

اور اسی خوشگوار بھول نے اُسے وہ طویل راستہ کاٹنے میں مدد دی جو سردار عبدالمطلب کے مکان اور اس کے اپنے خیمہ کے درمیان ایک طویل خوابیدہ اژدہے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جس پہ قدم رکھتے ہوئے حلیمہ ڈرتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بچے کی محبت اس کے ذہن اور بیرونی دنیا کے درمیان دبیز پردے کی طرح تن گئی ہے۔

لیکن وہ جوں جوں خیمہ کے قریب پہنچتی گئی دبیز پردہ آہستہ آہستہ سرکتا گیا۔ وہ خیمے میں جائے گی۔ حرث اور بچیاں اُس کی راہ تک رہی ہوں گی۔ کتنی بڑی بڑی اُمیدیں باندھ رکھی ہوں گی؟ بچیوں نے۔ حرث کو تو خیر حالات کا علم تھا وہ تو شاید کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بچیاں —— وہ کیسے جان سکتی تھیں کہ ان کی ماں ایسا سودا کر رہی ہے جس میں بظاہر گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

حلیمہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے گھوم کر ثوبیہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں خود بخود غیر اختیاری طور پر پھسل کر اس کے سر پر رکھے ہوئے طباق پر جم گئیں۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔ کم از کم چند دنوں کے لئے اُن کے حالات اچھے ہو جائیں گے۔ اس خیال سے اُسے تسلی ہو جاتی تھی۔ لیکن بایں ہمہ حرث کی حسرت ناک نگاہیں۔ اس کی مایوسیاں اور دبے گھٹے مزاج کے رنگ میں بجھے ہوئے معذور و مفلوج جملے۔ یہ سب حلیمہ کو بےچین کر دیں گے۔ یہ درست تھا۔ حرث تلخی سے حلیمہ کو اس سودے پر مطعون نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی صحیح تھا کہ حلیمہ اس کے ہر طعنے کا جواب دے سکتی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوری جرأت اور سچائی کے ساتھ اُسے کہہ سکتی تھی کہ جو بھی کچھ ہوا ہے اس کے ایما سے ہوا ہے۔ حلیمہ اس کے کہنے پر سردار عبدالمطلب کے یہاں گئی تھی۔ اور اسی کے اصرار پر اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ لیکن یہ تو تب ہو گا جب حرث اپنے دل میں بھڑکتے اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے شعلوں کو الفاظ کا جامہ پہنا سکے گا۔ لیکن وہ ایسا کرے گا ہی کیوں؟ جب اُس نے خود

[illegible] چپکے چپکے آہیں بھرے گا۔ بھوکی بچیوں کو کلیجے سے لپٹا کر قسمت کو کوسے گا۔ دراز گوش کو گالیاں دے گا۔ دیوتاؤں سے بغاوت کرے گا۔ مذہبی خیالات کا منہ چڑائے گا اور ان سب میں حلیمہ کو بھی شرکت کی دعوت دے گا۔

کاش حرث حلیمہ کو گالیاں دیتا۔ حلیمہ کو پیٹتا اور اس طرح اپنے سینے میں گھرتے ہوئے دھوئیں کے لئے نکلنے کا راستہ نکالتا۔ لیکن حلیمہ کو یقین تھا۔ حرث ایسا نہیں کرے گا اور اسی یقین نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اتنی آہستگی سے اٹھنے لگے تھے اس کے قدم کہ ثوبیہ کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اور جب شام کے گھرتے ہوئے دھندلکوں میں خیمے کے پھڑپھڑاتے ہوئے پردے نظر پڑے تو حلیمہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا اُسے جانا چاہیئے تھا؟ —— ہاں اپنے خیمہ میں۔ اس خیمے میں جو ان کمبلوں سے بنا ہوا تھا۔ جس کا ایک ایک تار حلیمہ کے اپنے ہاتھوں سے بُنا ہوا تھا۔ حلیمہ کو اس خیمہ میں جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا تھا اور یہ سوال رہ رہ کر اس کے ذہن میں جاگ رہا تھا —— کیا اُسے جانا چاہیئے؟

اس کا کمزور دل بہانے ڈھونڈنے لگا۔ ٹھہر کر جائے۔ ہاں کچھ دیر اور ٹھہر جائے۔ کہیں ادھر اُدھر چھپ رہے۔ حرث دیر کا سبب پوچھے گا تو کہہ دیگی۔ سردار عبدالمطلب کی بہو نے اسے دیر تک اٹھائے رکھا ہے۔ اور پھر یہ کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ آمنہ نے اسے تمام دن اپنے یہاں مہمان رکھا۔ جہاں سارا دن بیت گیا تھا وہاں ایک دو گھنٹے اور سہی۔ لیکن ثوبیہ کو کیا جواب دے گی؟ ثوبیہ پوچھے گی کہ اس طرح چھپنا چھپانا کیا معنی رکھتا ہے تو وہ کیا کہے گی؟

حلیمہ نے آنکھ بچا کر ثوبیہ کی طرف دیکھا۔ بالکل چوروں کی طرح، اور اس کے دل میں دفعتہً ایک خیال کوند گیا۔ وہ ثوبیہ کی آنکھ بچا کر ادھر اُدھر غائب ہو جائے۔ اُس مکان کی اوٹ میں، سامنے کے درخت کے تنے کے پیچھے۔ کسی بہانے، کسی طرح، کچھ بھی کہہ کر یا محض چل دے جائے۔ ثوبیہ کو۔ چھپنے کے ہزاروں طریقے خیرہ کن برق رفتاری کے ساتھ اس کے ذہنی خلاؤں میں کوندے، گرجے، دبکے اور اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے قدم سیدھے خیمے کی طرف اٹھنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ یہ بھی درست کہ اس کے جسم میں ایک عجیب قسم کا عضوی ہیجان برپا تھا۔

اس کی نبضیں شدت کی تیزی سے دھڑک رہی تھیں۔ اور دماغ پھر تیزی سے ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ اس کی رگوں میں کپکپاہٹیں لہرا رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی قوت ارادی کا تمام بوجھ غیر ارادی طور پر خیمے کی طرف جانے پر مرکوز کئے ہوئے تھی۔ اور اسی غیر ارادی طور پر پیدا ہو جانے والی قوت ارادی نے اسے عجیب سمجھ میں نہ آنے والے قہقہوں کے شاداب نخلستانوں میں پہنچا دیا
اس کی رگیں جیسے جھنجھنا کر بیدار ہو گئیں ۔۔۔۔ یہ

کیا ہو رہا تھا ۔۔۔؟

معبود ۔۔۔!

حلیمہ دم بخود رہ گئی!

حرث ہنس رہا تھا۔ بلند بھرے بھرے حقیقی قلبی مسرت کے آسمان گیر قہقہے اس کے حلقوم میں طوفانوں کی طرح گرج رہے تھے۔ فاقے کی نقاہتیں۔ بھوک کی کمزوریاں۔ رنج روزگار کی ہمت شکن مایوسیاں یہ سب کیا ہوئیں؟ اور حقیقی تابناک، بے دھڑک ۔۔۔ قہقہے کہاں سے پھٹ پڑے؟

یہی نہیں انیسہ اور شمیہ بھی باپ کے سُر میں سُر ملا رہی تھیں، بے تحاشا ہنس رہی تھیں، ناچ رہی تھیں، تالیاں پیٹ رہی تھیں اور عبداللہ ہمک رہا تھا ۔۔۔ جیسے اس کے پیٹ میں منوں دودھ پہنچ گیا ہے۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟

حلیمہ نے ایک دفعہ پھر ثوبیہ کی طرف دیکھا۔ جیسے اپنے دل میں چلنے والے سوالات کا جواب ثوبیہ کے چہرے پر پڑھنے کی تمنائی ہو۔ لیکن ثوبیہ کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ بوجھ اٹھا کر کافی دُور چلنے کی وجہ سے پسینے کی نمی چہرے پر چمک رہی تھی۔ اور مکہ کی ہر لمحہ اُڑنے والی مٹی کے ذرات اس نمی پر چپک چپک کر ثوبیہ کے چہرے کی سُرخ رنگت کو اپنے مٹیالے رنگوں میں ڈبونے کی کوشش کر رہے تھے۔ حلیمہ نے اب محسوس کیا تھا کہ ثوبیہ کے نتھنے شاید ہانپنے کی وجہ سے پھیل گئے ہیں۔ اور اسے اب پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ آمنہ نے جو کچھ اُسے دیا تھا۔ اتنا ہی تھوڑا نہیں تھا۔ کافی وزنی تھا۔ یہ سب کچھ اتنا وزنی کہ ثوبیہ جیسی جوان، تنومند اور محنت کی عادی عورت بھی ہانپ گئی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ حلیمہ نے اونگھتے ہوئے شعور کی مدد سے محسوس کیا تھا۔ اور اس احساس کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر تیزی سے دماغ کے کسی تاریک خانے میں گھونپ دیا تھا۔ جو خیمہ اس کے ذہن کی چار دیواری میں ابلتے ہوئے لاوے کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ یہی تھا۔ میرے خاندان کو کیا ہو گیا ہے؟ اور اسی سوال کا جواب اسے نہ مل سکا۔

ثوبیہ نے صرف اکھڑی ہوئی سانسوں میں پوچھا۔

"حضور کے خیمے یہی ہیں"

حضور! اگر حلیمہ کا دماغ اتنا مصروف نہ ہوتا تو وہ اس لفظ کی زہر خندگی پر مسکرا دیتی۔ یا ناراض ہو جاتی۔ لیکن اس نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اپنے خیمہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ آگے بڑھی۔ رینگتی ہوئی سی۔ جیسے فضا کو سونگھ سونگھ کر قدم رکھ رہی ہو۔ جیسے فضا میں گھلے ہوئے قہقہے کسی تشویشناک انجام کے آغاز کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔

اور آخر وہ اوٹ سے ہٹ کر میدان میں آ گئی۔ اس کے خیمے کا دروازہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ خیمے کے دروازے پر بندھی ہوئی بکری عجیب مضحکہ خیز سنجیدگی سے کھڑی اپنی موٹی موٹی آنکھیں جھپکا جھپکا کر جگالی کر رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے قریب حرث بیٹھا تھا ۔۔۔

اور ۔۔۔ حلیمہ حیرت سے چکرا کر رہ گئی۔

حرث دودھ دوہ رہا تھا۔ سفید دودھ کی دھاریں آفاقی ترنم کے ساتھ کھلے منہ والی چھاگل میں گر رہے تھے۔

بچہ حلیمہ کے ہاتھوں میں کلبلایا۔ اس نے باہیں لہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کالی کالی چمکدار آنکھیں حلیمہ کے چہرے کو چھوتی ہوئی سی گزریں۔ اور آسمان کی لامحدود نیلاہٹوں میں کھو سی گئیں۔ حلیمہ نے اچٹتی ہوئی نظر سے بچے کو دیکھا اور پھر چھاگل کی طرف دیکھنے لگی سفید جھاگ چھاگل کے منہ سے چھلکی پڑتی تھی۔ اور بلند آواز گیت حرث کے منہ سے اُمڈا پڑتا تھا۔ وہی گیت جو حرث آج سے دو سال قبل بادیہ بنو سعد میں اس وقت گایا کرتا تھا جب وہ پھولے ہوئے پیٹوں والی بکریوں کو ہانکتا ہُوا اپنے خیمہ کی طرف لوٹا کرتا تھا۔

اور حلیمہ اس گیت کی سادہ لیکن بلند دُھن میں پَر تولنے لگی۔

دفعتہً شمیہ نے ماں کو دیکھ لیا اور چلا اٹھی ۔۔۔

"ماں ۔ دودھ ۔۔۔!"

حرث نے پلٹ کر دیکھا ۔۔۔ [illegible] اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر ہاتھ کی حرکت کی [illegible] حلیمہ بھی مسکرا دی۔ انیسہ [illegible]

قریب آگئیں۔ ایک نئی شخصیت ان کی محدود دنیا میں داخل ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا انھیں کچھ بھی خیال نہیں تھا۔ وہ صرف یہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کی بکریاں خلافِ توقع دودھ دے رہی ہیں۔ بہت سا دودھ ——— اتنا دودھ ——— جتنا انھوں نے اپنے ہوش میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

حلیمہ نے ہر طرح سے کوشش کی کہ حرث اس کی طرف مخاطب ہو اور بچے کی خوشخبری سُن لے۔ لیکن حرث کا ذہن جیسے ایک ہی خوشی سے لبالب بھر گیا تھا اور اس کے کسی گوشے میں کسی دوسری خوشخبری کی گنجائش نہ تھی۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے حلیمہ کی طرف دیکھتا رہا۔ حلیمہ کے ہر سوال اور اس کی ہر بات کے جواب میں ایک شریر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی۔ اس کا سر دودھ کی دھاروں کے پُرلطف ترنم کی گتوں پر زور زور سے ہلتا رہا۔ اور اس کے ہونٹ بلند آواز میں پرانا صحرائی گیت گاتے رہے۔ یہاں تک کہ حلیمہ تنگ آکر خیمے میں چلی گئی۔

ثوبیہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

حلیمہ نے بچے کو گود سے اُتار کر فرش پر لٹا دیا۔ اور بچہ فرش کو چھوتے ہی سو گیا۔ حلیمہ نے طباق اترِوایا اور ثوبیہ کو رخصت کر دیا۔

ثوبیہ نے قدم خیمے سے باہر رکھا ہی تھا۔ کہ شمیمہ اور انیسہ اندر لپک پڑیں۔ طباق کا کپڑا بجلی کی سی تیزی سے ہٹا دیا گیا۔ حلیمہ ایک کونے میں کھڑی مُنہ دھو رہی تھی۔ ابھی اس نے پیٹھ بھی نہیں پھیری تھی کہ شمیمہ اور انیسہ نے ہر چیز کے حصے بخرے کر لیئے۔ اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے ان میں سے کسی ایک چیز کو ہاتھوں سے چھُوا تک نہ تھا۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے آخری فیصلہ کر لیا تھا کہ کون سی چیز کون لے گا۔ باپ کا حصہ اور ماں کا حصہ دونوں نے آپس کے سمجھوتے سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اور باقی کی ہر چیز پر خیالی تصرف جما لیا تھا۔

حلیمہ مُنہ دھو کر پلٹی تو حرث گاتا ہوا اندر آیا۔ دودھ سے بھری ہوئی چھاگل ایک کونے میں رکھی۔ خالی چھاگل اٹھائی اور طباق کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے کہا ——— سردار عبدالمطلب نے تمھیں بُلایا ہے۔"

لیکن حرث [illegible] چاہی۔ گردن جھکا کر آنکھوں کے [illegible] دیکھا۔ مسکرایا۔ اور طباق میں سے ایک چھوارا اُٹھا کر مُنہ میں رکھ کر پھر گانے لگا۔

"میری بات تو سنو۔" حلیمہ نے سنجیدہ ہونے کے لاکھ جتن کیئے لیکن مسکراہٹ کھیل ہی گئی ہونٹوں پر ——— "بچے کو دیکھا تم نے۔ اتنا پیارا ہے کہ کیا کہوں تم سے؟"

حرث کی آواز اور بلند ہو گئی۔ اس نے شریر آنکھوں سے معصوم بچے کی طرف دیکھا۔ اور جھک کر جھپٹ سے اس کا بوسہ لیا بچے نے ڈر کر دونوں ہاتھ اوپر پھیلا دیئے۔ اور حرث نے اپنا چوڑا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر لوری کا ایک مصرع اسی لے میں گا دیا جس میں وہ اپنا صحرائی گیت گا رہا تھا ——— اور پھر فوراً ہی اپنا گیت شروع کر دیا۔

"توبہ ——— کیا ہو گیا ہے تمھیں ——— میری تو سنو۔" حلیمہ نے ذرا بلند آواز سے کہا۔

حرث نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں اپنے گیت کی لے میں گاتے ہوئے کہا۔ "میری بکریاں مجھے بلا رہی ہیں کہ حرث بھیا آ کر اور دودھ دوہ لو ———"

اور بچوں کی طرح اچھلتا، کلیلیں کرتا باہر چلا گیا۔

دودھ کی دھاروں کی آواز میں حرث کا بلند آہنگ گیت گھُل رہا تھا۔ اور یہ نشہ بیز آواز خیمے کی فضاؤں میں لہرا رہی تھی۔ حلیمہ نے سوتے ہوئے عبداللہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے کلوٹے ہوئے چہرے کو چوم لیا۔

عبداللہ کی عمر اس وقت چار مہینے کی تھی۔ لیکن اس عرصہ میں حلیمہ کو عبداللہ پر کبھی اتنا شدید پیار نہیں آیا تھا۔ آج تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس کا دل اچھل اچھل کر باہر نکلا پڑتا ہے۔ اور عبداللہ سے لپٹ جانا چاہتا ہے۔

لیکن عبداللہ اب بھی ہمک رہا تھا۔ بکریوں کا دودھ اب بھی اس کی باچھوں میں چمکتا نظر آتا تھا۔ وہ ابھی سویا تھا۔ تھک کر۔ پیٹ بھر کے ——— اس لیئے حلیمہ اسے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

سردار عبدالمطلب کا یتیم پوتا قریب ہی سو رہا تھا۔ بھولا۔ معصوم ——— لیکن انتہا درجہ کا خوبصورت ——— حلیمہ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چھوٹا سا چہرہ، پتلی پتلی نامعلوم پلکیں۔ چہرے کے سُرخ رنگ میں تحلیل ہو گئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلکیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ آنکھوں کے چھوٹے چھوٹے پپوٹے

ننھی ننھی ہتھیلیاں سیپی کے کسی بند ڈبے کی طرح بند تھے۔ اور ان چھوٹے چھوٹے
پھولوں پر پتلی پتلی سرخ رگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ملتے کی دو ستوں
پر بھورے بھورے چھوٹے چھوٹے کچے رونگٹے میٹھی نیند سو رہے
تھے۔ ستواں ناک کی ننھی سی اٹھان پر سرخ رگیں چل رہی تھیں۔
باریک ہونٹ اندر کی طرف جھک گئے تھے۔ اور ننھی سی ٹھوڑی
مخمل کی طرح نرم محسوس ہوتی تھی۔ چہرے کی ہر سطر میں سنجاف کی
نرمیاں لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں —— وہ نرمیاں جن کا احساس
شعور کو نہیں، دماغ کی کسی انجانی محرابوں میں رینگتا محسوس ہوتا
تھا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر عجیب چیز جو حلیمہ کو محسوس ہوئی
وہ چراغ کی لَو ایسی سُرخی کی پتلی سی لکیر تھی جو دونوں بھنوؤں کے
درمیان ماتھے کے عین مرکز میں قائم تھی۔ حلیمہ دیر تک اس
جگمگاتی لَو کو دیکھتی رہی۔ بچے کے خدوخال پر غور کرتی رہی۔ چہرے
کے ایک ایک نقش کو انفرادی طور پر اپنے ذہن میں جذب کرتی رہی
لیکن اس کے باوجود وہ سمجھ نہ سکی۔ یہ خدوخال کچھ ایسے غیر معمولی
نہ تھے —— عام بچوں کے چہروں پر ایسی ہی مخملیں نرمیاں ہوتی
ہیں۔ ستواں ناک ایک نہیں ہزاروں کی ہوگی، بلند اور کشادہ
پیشانی، سیاہ چمکدار آنکھیں، کھلا ہوا سُرخ رنگ، چہرے کی
ہر کروٹ میں سوتے ہوئے ننھے ننھے زردی مائل رونگٹے۔ یہ سب
چیزیں اتنی عام ہیں کہ محض انہی کے امتزاج سے ہر بچہ اتنا خوبصورت
اور کشش انگیز نہیں ہو جاتا۔ وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے آمنہ
کے اس یتیم لال میں قیامت کی کشش پیدا ہو گئی تھی؟ یہ کیوں
اتنا خوبصورت نظر آتا تھا؟ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی کشش
اور جاذبیت ان ننھے ننھے اعضا میں سمو دی گئی ہے۔

اور باہر حرث کے بلند گیت گونجتے رہے۔ اور پھر دفعتہً اُس
کی بلند آواز سنائی دی۔ جیسے وہ کسی سے مخاطب ہو۔

"میری بکریوں نے آج اتنا دودھ دیا ہے کہ بارش کے موسم
میں بھی نہیں دیا تھا۔"

"کھلایا کیا تھا آج انہیں؟" سوال ہُوا۔

"کچھ بھی نہیں، وہی روز والے پتے اور ڈنٹھل۔"

"تعجب ہے۔" دوسری آواز سنائی دی۔ "حلیمہ آگئی کیا؟"

"ہاں —— اندر ہے۔ مل لو جاکے —— قریش کے سردار عبدالمطلب
کا پوتا لائی ہے —— سمجھیں ——"

اور اس کے بعد حرث نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگا کر پھر
گیت شروع کر دیا۔

حلیمہ تیار ہو گئی۔ کوئی مہمان خیمے میں آیا چاہتا تھا۔ چند
لمحوں کے بعد دروازے پر پڑا ہوا کمبل اٹھا اور ان کے قبیلے کی
ایک عورت ظاہر ہوئی۔

"اندر چلی آؤ ——" حلیمہ نے کہا۔

عورت اندر آگئی۔ اور بچے کو فرش پر سوتا دیکھ کر بولی۔

"بڑا خوبصورت بچہ ہے۔"

حلیمہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"اتنے بڑے سردار کا پوتا لائی ہو۔ خوب ہاتھ رنگے ہوں گے
آج تو تم نے۔" عورت نے ڈھکے ہوئے طباق کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

حلیمہ اپنی مایوسیوں کا اظہار کیا ہی چاہتی تھی۔ کہ بچہ یتیم ہے
اس لئے اس کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ایک ہلکی سی آہ
لفظوں میں تحلیل ہو کر اس کے ہونٹوں سے نکلا ہی چاہتی تھی کہ دروازے
کا کمبل یکدم اٹھا اور حرث دودھ سے لبالب بھری ہوئی چھاگل
لئے اندر آگیا۔

حلیمہ نے چھاگل سے چھلکتی ہوئی گاڑھی جھاگ کو دیکھا اور
غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں بچے کی طرف کھنچ گئیں —— بچے
کی آمد اور سوکھی سڑی فاقہ زدہ بکریوں کے تھنوں سے دودھ
کا سیلاب —— یہ دونوں چیزیں غیر شعوری طور پر حلیمہ کے
ذہن میں منسلک ہو گئیں۔ جیسے علت اور معلول ایک زنجیر کی
دو کڑیاں —— "آہ" اور "نہ" دونوں ہونٹوں ہی میں دم توڑ کر
رہ گئے۔ اور ان کی جگہ ایک تابناک مسکراہٹ نے لے لی۔

حلیمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جی —— کیوں نہ ہو۔ قریشیوں کے سردار تھے آخر ——
پہلے انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ لیکن میرے بچوں کا باپ تو تم جانتی
ہی ہو۔ مانا نہیں۔ کہنے لگا۔ بچہ یتیم ہے۔ کیا مل جائے گا ایسا۔"

"ہمارے ایسے خاوند بڑی قسمت والیوں کو ملتے ہیں جو جھٹ
ہر بات مان جائیں —— کیا سمجھیں —— لو دودھ پیو!"

"نہیں نہیں —— تمہارے بچے ——"

"اونہہ —— کیا کہہ رہی ہو بہن —— آج تو اتنا دودھ ہے
کہ بچے نہا بھی لیں تب بھی کم نہ ہو۔ وہ دیکھو چھاگل اور بھری پڑی
ہے —— چار بکریوں نے اتنا دودھ دیا …

"کمال ہے" ہمسائی نے کہا اور گرم گرم میٹھے دودھ کا کٹورہ [illegible] غٹ غٹ پی گئی۔

"کیوں آیا مزا، ہے نہیں شہد گھلی ہوئی میری بکریوں کے دودھ [illegible]" حرث نے ہنس کر کہا۔

"واقعی بڑا میٹھا ہے۔ شہد نہیں ڈالی تھی تم نے؟"

"اونہوں" حرث نے کہا۔ "آج تو میں نے شگونوں کے مٹکے شہد کے [illegible] پلائے ہیں بکریوں کو کہ دودھ دیں ہی میٹھا"

اور حرث نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ایسا بلند قہقہہ کہ آمنہ کا ننھا فرزند باچھیں سکیڑ کر اور نچلا ہونٹ باہر ابھار کر آہستہ آہستہ اُوں اوں کرنے لگا۔

"ہے ہے" حلیمہ نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں آج — ڈرا دیا بچارے کو — بس بس میرے لال"

"اپنا حصہ لینے کے لئے اُٹھا ہے۔ سمجھا بھی کرو کچھ"

حرث نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور حلیمہ نے مسکرا کر بچہ حرث کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

حرث کے روئیں روئیں میں ایک عجیب طرح کا سُرور دوڑ گیا۔ اس نے بچے کو سینے سے لپٹ لیا اور کہا۔

"نہ — نہ — تمہاری قسمت کا بہت کچھ ہے چھوٹے حضور پہلے تم ہی چکھو —"

اور یہ کہہ کر اس نے انگلی دودھ میں ڈبو کر بچے کے چھوٹے سے مُنہ کے قریب کر دی۔ مُنہ آہستہ آہستہ کھول دیا گیا اور دودھ سے لتھڑی ہوئی انگلی چوس لی گئی۔

"اب اس دودھ پہ ہم سب کا حق ہو گیا ہے۔ جس کے لئے یہ بھیجا گیا تھا اس نے قبول کر لیا" حرث نے سنجیدہ ظرافت سے کہا۔

"لیکن سب سے پہلے تو میں نے پیا تھا دودھ" ہمسائی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مہمان تھیں" — چھوٹے حضور مہمانوں کے حقوق کو خوب سمجھتے ہیں"

حرث جو کچھ کہہ رہا تھا محض خوش طبعی کی بناپر کہہ رہا تھا — اپنی طرف سے وہ مذاق کر رہا تھا — اور شاید اسے اس چیز کا احساس تک نہ تھا کہ اُس کا ہر ہر لفظ سچا ہے —!

ماہر القادری

قندِ مکرّر

صبحِ چمن ہے انجمن آرا قفس قفس — ہے موجزن شمیمِ تمنّا نفس نفس

اس بدگمان دہر کی تہمت طرازیاں — رُسوا ہُوا ہے ذوقِ تماشا ہَوس ہَوس

رہبر بھی خود پسند ہیں رہرو بھی سُست گام — خود منزلیں ہیں گوش بر آوازِ جرس جرس

اب بھی وہی ہیں حسن کی دیوانہ سازیاں — جوشِ جنوں ہے بادیہ پیما فرس فرس

ہنگامۂ نشاط ہمارے ہی دم سے تھا
فصلِ بہار آئے گی تنہا برس برس

دل شاہجہانپوری

رازِ دل

کس جانِ تمنّا کے تصوّر کا اثر ہے
بیمارِ محبّت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

یہ جوشِ تمنّا ہے کہ جلوؤں کا اثر ہے
حیرت زدہ ہر دیکھنے والے کی نظر ہے

وہ خواب کا عالم تھا کہ فردوسِ تجلّی
اب آنکھ کھُلی ہے تو پریشان نظر ہے

کب تک رہے تاریک تمنّاؤں کی دُنیا
کیا جانے وہ خورشیدِ جہانتاب کدھر ہے

اللہ رے بیتابیٔ مشتاقِ شہادت
یہ جوشِ تمنّا ہے کہ خنجر تہِ سر ہے

جو وجہِ خلش ہو وہ بنے دل کی تسلّی
تیری نگہِ ناز عجب سحر اثر ہے

ہر وادیٔ پُرخار دلِ قیس کی راحت
تسکین جہاں ہو وہی منظورِ نظر ہے

محدود نہیں عالمِ انوارِ تجلّی
ذرّوں میں ہے اک حُسن اگر حُسنِ نظر ہے

للہ بتا دیجئے از راہِ ترحّم
اے حضرتِ واعظ درِ میخانہ کدھر ہے

تم آنکھ ملا کر ابھی دیکھو یہ کرشمہ
آہوں میں اثر ہے کہ نگاہوں میں اثر ہے

معمورِ تجلّی ہے مرا ظاہر و باطن
دل میں وہی پنہاں ہے وہی پیشِ نظر ہے

پستی میں بھی اک عالمِ رفعت ہے نمایاں
عصیاں سے خجل ہوں مری رحمت پہ نظر ہے

یہ تیرگیٔ بخت یہ ظلمتِ شبِ غم کی
اے دل کسے اس حال میں اُمیدِ سحر ہے

ظہور الحسن ڈار

میں خاموش نہیں رہ سکتا

تقریباً ایک سال پیشتر جب میں نے اس عنوان سے پہلا مضمون لکھا تو مجھے اس کی مقبولیت کے متعلق کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی، میں جانتا تھا کہ جن لوگوں کے متعلق میں لکھ رہا ہوں، انہیں اپنی بات کہنے کے لئے بہتر وسایل میسر ہیں۔ اور ان کی موجودگی میں لوگوں کا میری معروضات کی طرف توجہ ہونا کافی مشکل ہے، مگر آج، پورے ایک سال گزرنے کے بعد جب میں اپنی تحریر کے نتائج پر غور کرتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ کہ اردو ادب میں بے راہ روی کی جو تحریک آج سے چھ سال پیشتر پیدا ہوئی تھی، اسے رد کرنے میں کسی حد تک میرا بھی حصہ ہے۔ مجھے اعتراف ہے، کہ میں نے اس تحریک کے متعلق ابھی تک مفصل تبصرہ نہیں کیا، آج تک مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت میں نے جس قدر بھی مضامین لکھے ہیں وہ صرف اشارے ہیں۔ اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ اشارے بھی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جو ذہین ہیں۔ اور کسی بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، اگر آپ ان مضامین کو یکجا کر کے پڑھیں۔ تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ ان کی بے ترتیبی میں بھی ایک خاص قسم کی ترتیب ہے جس میں میں نے نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، بلکہ ان لوگوں کو بھی سوچنے کی دعوت دی ہے، جو ترقی پسند تحریک کو اردو ادب میں ایک مقدس انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند ادیب جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ ہر حالت میں ادب، ملک اور قوم کے لئے بہتر ہے۔ اگرچہ آج یہ تحریک بڑی حد تک رد ہو چکی ہے۔ مگر اب بھی اس کا اثر بہت کچھ باقی ہے۔ سات سال کی مکمل بے راہ روی کے بعد سنبھلنے کے لئے بھی وقت چاہیئے۔ پھر جس تیزی سے اس کج روی کا اثر مٹ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے رہے سہے اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔ وہ اچھا مرچنٹ اور اچھے لکھنے والوں کی وہ جماعت جو اس دور میں برابر لکھ رہی ہے۔ سلجھے ہوئے اور صحت مند ادب کی تخلیق میں پیش پیش نظر آئے گی۔

ترقی پسند تحریک بذات خود کوئی بری چیز نہیں، زندگی میں ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے، کہ وہ جس مقام پر کھڑا ہے اس سے اور آگے بڑھے۔ حیات کی ارتقائی قوت کا مظاہرہ کرے۔ اور اپنی نشوونما کا ثبوت دے۔ اسے عام معنوں میں ترقی کہا جاتا ہے، ہر وہ شخص جو زندگی میں اس نظریئے کو پسند کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ خواہ خود اپنے متعلق کچھ کہے یا نہ کہے ہم اسے ترقی پسند ہی کہیں گے۔ ادب میں بھی ترقی پسند تحریک انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ادب اور زندگی چونکہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے ترقی پسندی کے اس مفہوم کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کو بھی ہم ترقی پسند اسی صورت میں کہیں گے۔ جب وہ زندگی کی ارتقائی قوت کا مظاہرہ کرے گا۔

انسان کی موجودہ سماجی اور تمدنی زندگی کی ساری خرابیاں دور کرنے میں حصہ لے گا۔ اور اپنے فنی حسن کے ساتھ زندگی پر ایسی تنقید کرے گا۔ جو انصاف کے تمام اصولوں پر پوری اترتی ہو، اگر ادب ایسا نہیں کرتا تو وہ لازمی طور پر ترقی پسند نہیں، اور ایسا کہنا یا تو کہنے والے کی کم نظری کی دلیل ہے یا وہ اس اصطلاح کو کسی خاص غرض کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی باقاعدہ تنظیم اور اس کے اعلان ناموں سے قطع نظر اگر اردو ادب کو مجموعی حیثیت سے دیکھئے تو اس تحریک کے بے ترتیب اثرات ۵۷ء کے غدر کے ساتھ ہی ملنے شروع ہو جائیں گے۔ اس سے پیشتر ملتے ہوئے

مغلیہ دورِ حکومت کے شاعر اور ادیب یا تو عیش پسندی اور نفس پرستی کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ یا پھر دنیا سے بیگانہ ہو کر تنہا پسندی کے مرض میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس دور کا اردو ادب مجموعی طور پر رجعت پرور خیالات سے لبریز تھا۔ زندگی سے بیزاری، یاسیت، حیات کے تمام امٹ جذبوں سے لاتعلقی۔ اس زمانے کے ادیب اور شاعر ماحول کے تلوّن سے متاثر ہو کر انہی خیالات کی پرورش کر رہے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ان خیالات کا اصلی منبع ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے۔ مغل سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ اور تین سو سال سے جس قوت نے اپنے ہاتھوں سے بابر کے جھنڈے کو ہندوستان کے دل میں گاڑ رکھا تھا۔ وہ اب اس قدر کمزور ہو چکے تھے۔ کہ ان میں اس جھنڈے کو سنبھالنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ مغل پرچم اپنے سارے شکوہ اور رعب و اقتدار کے ساتھ گر رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کی جگہ بدیسی سامراج کے پاؤں مضبوط ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی دوسری قومیں اس سے پیشتر ہی کچھ خانہ جنگی کی شکار ہو کر اور کچھ مغل طاقت کے ہاتھوں برباد ہو چکی تھیں، اس لئے بدیسی سامراج کو اس ملک میں قدم جمانے کا اچھا موقع مل گیا۔ اس سیاسی ابتری کا لوگوں کی اجتماعی زندگی پر براہِ راست اثر پڑا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تو حالات بالکل ہی بدل گئے۔ رہی سہی مغل طاقت نے بھی دم توڑ دیا، سامنتی تمدن غدر کے اس خوفناک جھٹکے سے پارہ پارہ ہو گیا۔ اور اس کی جگہ بدیسی سامراج کی ذہنی مشینوں میں ڈھلا ہوا تمدن آہستہ آہستہ اس ملک میں نقب لگانے میں مشغول ہو گیا۔ مغربی تمدن کی آمد کے ساتھ ہی سامنتی تمدن کے رہے سہے اثرات بھی ختم ہونے لگے۔ اور زندگی کی مادی ضرورتوں کے پیش نظر مغربی تمدن لوگوں میں مقبول ہونے لگا۔ اور مقبولیت اپنے ساتھ بنئے نئے سیاسی اور اقتصادی نظریئے بھی لے آئی ___

ان بدلتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی حالات نے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک سامنتی تمدن کی آغوش سے چمٹے رہے تو وہ دن دور نہیں جب تاریخ انہیں اس طرح نظر انداز کر دے گی۔ کہ مستقبل میں کوئی ان کے متعلق سوچ بھی نہ سکے گا۔ چنانچہ اس احساس سے وہ سنبھلے اور انہوں نے زندگی کی تمام ابھرتی اور پھیلتی ہوئی قوت کا ساتھ دیا۔ یہ ہمارے دیس کی اجتماعی زندگی کے دورِ جدید کا آغاز تھا۔ جوں جوں اس عمل میں وسعت پیدا ہوتی گئی لوگ پرانے شاعروں کے نظریات سے بیزار ہونے لگے۔ اور نتیجے کے طور پر نئے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ایسی جماعت میدان میں آ گئی، جن میں سے سرسید، حالی اور شبلی کو آج ہم اردو ادب کے دورِ جدید کے پیشرو کہتے ہیں۔

دراصل اردو ادب میں ترقی پسندی کی بنیاد انہی لوگوں نے رکھی۔ یہ لوگ اس لئے ترقی پسند تھے۔ کہ انہوں نے ادب میں رجعت پرور خیالات کی بیخ کنی کی اور مرتے ہوئے سامنتی تمدن کی بجائے اس تمدن کا ساتھ دیا۔ جو نئے ماحول میں نئی اقدار کے ساتھ ابھر رہا تھا۔ اور انسان کی اجتماعی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتا تھا۔ اس عمل میں انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ لوگ بھی زندگی کی ارتقائی قوت کے مظہر تھے۔ اس لئے انہوں نے ہر حملے کا جم کر مقابلہ کیا۔ اور اپنی تحریر سے قدیم شاعری قدیم نظریات کے خلاف پوری قوت سے جہاد کیا۔ اور تنہا پسندی، بوالہوسی اور صوفیانہ رجحانات کو جو ایک کاہلانہ زندگی کی پیداوار تھے۔ اس قدر شدید طریقے پر مجروح کیا کہ ان میں دوبارہ اٹھنے کی ہمت ہی نہ رہی۔

اس دور سے لے کر موجودہ ترقی پسند تحریک کی باقاعدہ تنظیم کے درمیانہ وقفے میں ٹیگور، اقبال اور نذر الاسلام باقاعدہ طور پر اردو ادب میں ترقی پسند فکری اور فنی رجحانات کے علمبردار رہے۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کی باقاعدہ طور پر تنظیم ہوئی۔ اور اس تنظیم کے ساتھ ہی دو مخصوص رجحان جو اس سے پیشتر غیر منظم تھے۔ ترتیب کے زیور سے آراستہ ہو گئے۔ اردو ادب جو اس سے پیشتر زیادہ تر رومان اور قوم پرستی کے جذبات سے معمور تھا۔ اب دو مختلف حصوں میں بٹ گیا۔ اور اگرچہ بظاہر دونوں رجحانات کے علمبردار ہمارے ہندوستانی ادیب ہی تھے۔ مگر وہ دانستہ طور پر مغرب کے دو فلسفیوں مارکس اور فرائیڈ کی پیروی کر رہے تھے، تھوڑے ہی عرصے میں یہ دونوں رجحان اس قدر

مقبول ہوئے کہ ان کے سوا کوئی تیسرا جہان نظر ہی نہ آتا تھا۔ مارکس کے عقیدت مندوں نے اس شدت سے انقلاب اور مزدور زندہ باد کے نعرے بلند کئے کہ ان کا ادب فن سے بے نیاز ہو کر پمفلٹ نگاری تک محدود ہو گیا اور فرائیڈ کے عقیدت مندوں نے اس خلوص کے ساتھ جنسی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی کہ وہ خود بھی ان کی پیچیدگی میں الجھ کر رہ گئے، جب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہو تو نئے اور کم تعلیم یافتہ لکھنے والوں کا کہنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غدر کے بعد اردو ادب کی ترقی کے جو روشن امکانات نظر آنے لگے تھے۔ وہ مغربی ادب اور فلسفے کی اندھا دھند پیروی میں اس قدر ماند پڑ گئے کہ مستقبل میں بھی ان کے دوبارہ روشن ہونے کا کوئی امکان نہ رہا۔ یہ رائے دقتِ نظر اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ہر پڑھا لکھا آدمی اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے سرسری مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچے گا۔ مگر ترقی پسند ادیب اسے اپنے آپ پر بہتان سمجھتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے۔ کہ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ عام طور پر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوستانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جسے تجزیہ، تحلیل اور تجزیہ میں احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش نہ کی ہو تا مذہب، تاریخ، کلچر، روایت، سیاست، تعلیم، اوہام غرضیکہ سماجی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے ہم نے صحیح تاریخی قدروں سے نہ پرکھا ہو۔ اس لئے ہمیں یہ الزام دینا کہ ہم صرف اشتراکیت اور جنسی پیچیدگیوں کے متعلق ہی لکھتے ہیں بے انصافی ہے، ان سطور کو ایک دفعہ پھر پڑھیے۔ اور اگر آپ نے ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں نہیں پڑھیں۔ تو یقیناً آپ ان سے مرعوب [illegible] متاثر ہوں گے۔ مگر جو لوگ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہیں ان کے لئے ان سطور میں کوئی کشش نہیں۔ بلکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور رہیں۔ کہ اگر یہ الزام بے انصافی نہیں تو پھر انصاف کیا ہے۔ لینن اور روس کے قصیدے لکھ کر ہندوستان کی سماجی زندگی کی ترجمانی کا دعوےٰ انصاف ہے؟ ایک مخصوص [illegible] کی جنسی بھوک کے گھناؤنے قصے لکھ کر مذہب تا[illegible]ت تعلیم اوہام کو صحیح تاریخی قدروں سے پرکھنے کا دعوےٰ انصاف ہے؟ اشتراکیت سے دلچسپی نہ رکھنے والے تمام ادیبوں کو رجعت پسند قرار دینا انصاف ہے؟ اور ایسے تمام ادیبوں کے ادب کو ترقی پسند ادب نہ سمجھنا انصاف ہے؟ آخر انصاف کیا ہے، اور اگر ترقی پسند ادیب اسی قسم کا انصاف کرنے کے عادی ہیں تو پھر وہ اپنے متعلق بے انصافی کی رٹ کیوں لگاتے ہیں۔ یہ عجیب استدلال ہے۔ کہ وہ خود تو انصاف کی قدروں سے کوسوں دور ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کے پاس نہ پھٹکیں۔ حال کا نقاد جب ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں دیکھتا ہے تو اسے ان میں اس ژرف نگاہی اور حکیمانہ حقیقت نگاری کی جھلک تک نہیں ملتی جس کے متعلق شب و روز بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس ژرف نگاہی اور حکیمانہ حقیقت نگاری کا مفہوم کیا ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی نقاب کشائی اگر ژرف نگاہی اور حکیمانہ حقیقت نگاری ہے یا ایک کارخانے کا مزدور اپنے سیٹھ کو دو گالیاں دے کر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ تو ژرف نگاہی اور حکیمانہ حقیقت نگاری کا خدا حافظ — پھر کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادب سے پہلے کا ادب بھی تو مرد اور عورت کے جنسی تعلقات سے بھرپور تھا۔ پھر ترقی پسند ہی اس سلسلے میں مطعون کیوں ہیں۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے۔ جس کا جواب بھی کوئی ترقی پسند ہی دے سکتا ہے کہنے والے نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کہ اگر آپ کو بزرگوں کی پیروی ہی کرنا تھی اور در حقیقت آپ سامنتی تمدن کی لاش ہی سے چمٹے رہنا پسند کرتے تھے۔ تو آخر آپ نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کو صحیح تاریخی قدروں سے پرکھنے کا دعوےٰ ہی کیوں کیا تھا، اور اگر آپ کا دعوےٰ صحیح ہے تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ کون کون سے ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس آدرش کو پورا کیا۔ اگر ہم اس دعوےٰ کی روشنی میں مشہور ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں کا جائزہ لیں۔ تو ہمیں اُن سے بہت زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس ملک کی سماجی زندگی کے صرف

دو ہی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں جنسی پیچیدگی بہت زیادہ ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ اور جب بھی موقعہ ملتا ہے جنسی بھوک مٹانے کی فکر کرتے ہیں۔ کہیں جب عورت کو ایسا موقعہ نہیں مل سکتا تو اسے ہسٹیریا ہو جاتا ہے یا وہ لحاف اوڑھ کر کچھ اور کرتی ہے اسی طرح جب مرد کو موقعہ نہیں ملتا۔ تو وہ طوائف کی چوکھٹ پر جھک [illegible] پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی سماجی زندگی کا دوسرا پہلو یہاں کے مزدور ہیں۔ جو دن رات انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اور موقع [illegible] تو مل مالک کو دو چار گالیاں دے دیتے ہیں۔ یہ ہمارے ہندوستانی ادب میں ترقی پسند رجحانات کے دو بڑے [illegible] آپ کو ترقی نگاہی یا حقیقت نگاری [illegible] تجزیہ نفس کا صحیح پتہ [illegible] سکتا ہے۔

دراصل ان رجحانات کے ذمہ دار وہ ادیب ہیں جو براہ راست کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو وہ مارکس کے فلسفے سے اس قدر متاثر تھے۔ کہ انہیں ہندوستان کی ہر قدیم چیز سے نفرت تھی۔ وہ ماضی کے سارے ادب کو جو بذاتِ خود اپنے دَور کا نمائندہ تھا۔ لغو اور بیہودہ خیال کرتے تھے۔ اور حال کے ادب کے متعلق بھی اسی انداز سے سوچتے تھے۔ ہر پرانی چیز کو توڑ دو اور اس کے مقابلے میں نئی چیز کو ایجاد کرو۔ یہ ان کا پہلا اور آخری نعرہ تھا۔ مگر جن تاریخی قوتوں کو سمجھنے کا انہیں دعوے تھا۔ ان سے دراصل وہ اتنے ہی واقف تھے جس قدر کہ اُن کے پیشرو محض تاریخ، کلچر، تسلسل اور اجتماعی زندگی کے نعرے بلند کر کے کسی خاص فعل کی تکمیل ممکن نہیں۔ نعرے ہمیشہ کھوکھلے ہوتے ہیں۔ مگر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اپنے آرٹ کو صرف اشتراکی نعروں کے لئے وقف کر دیا ہر پرانی چیز کو توڑ کر جن نئی چیزوں کو بنانے کا انہوں نے دعوےٰ کیا تھا۔ وہ زیادہ نہیں بلکہ صرف ایک ہی تھی۔ اشتراکیت ضرور جنت نگاہ اور فردوس گوش ہو گی۔ مگر ادیب سیاستدان نہیں بلکہ صرف ادیب ہے۔ اس کے لئے مزدوروں کا لیڈر بننا اتنا ہی ناممکن ہے۔ جتنا کہ ایک سیاسی لیڈر کا ادیب بننا۔ اس لئے جن ادیبوں کو اشتراکیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آخر وہ رجعت پسند کس طرح ہو گئے۔ لیکن اشتراکی ادیب اس استدلال کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہی ادیب ترقی پسند ہے۔ جو ہر پرانی چیز کو فنا کر دینے کا منصوبہ باندھتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا اگر ممبر نہیں تو اسے چندہ ضرور دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی قومی جنگ اور نیا ادب کے لئے بھی فسطائیت کے خلاف اور اشتراکیت کی حمایت میں افسانے یا نظمیں لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ادیب خواہ وہ فن خیالات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اشتراکی ادیبوں سے کتنا ہی اعلےٰ درجے کا فنکار کیوں نہ ہو۔ اسے ضرور رجعت پسند کہا جائے گا۔ یہاں ایک مسئلے کے متعلق مجھے خاص طور پر کچھ کہنا ہے۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول چونکہ انقلاب ہے۔ اس لئے اس دیس کے اشتراکی ادیب بھی اردو ادب میں انقلاب چاہتے ہیں ایک مکمل انقلاب جو ان کے قول کے مطابق ہمارے ادب کو زندگی بخش ادب کی صف میں لا کھڑا کرے۔ ہر انصاف پسند ادیب یہی چاہتا ہے۔ کہ اس کا ادب ایسا ہی ہو سکن اگر اس میں شعور کا ذرّہ بھر بھی مادہ ہے۔ تو وہ ایک ناسمجھ انقلابی کی طرح ماضی کے سارے ادب کو فنا کرنے کا منصوبہ کبھی نہیں باندھ سکتا۔ آخر ایسا کیوں ہو کیا ماضی کا ادب اپنے ماحول کا نمائندہ نہیں تھا۔ کیا وہ ہمیں اپنے دَور کی اجتماعی زندگی کی پستی کی تصویریں نہیں دکھاتا۔ کیا ہمیں اس میں سامنتی تمدن کی وحشیانہ عیش پرستی اور بوالہوسی کے مناظر نہیں دکھائی دیتے۔ کیا ہمیں اس میں تنہا پسند شاعروں کی آدم بیزاری کے مرقعے نہیں ملتے اگر ایسا ہے تو کیا اس ادب کو محض اس لئے قابلِ نفرت سمجھا جائے۔ کہ ان میں رجائیت نہیں۔ امید، امنگ اور ابھار نہیں۔ یہ چیزیں تو آج کی ہیں۔ آج ہم زندگی کا علم اٹھائے ہوئے ایک نئی قوت سے انسانیت کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آج ہمارے دلوں میں عزم ہے۔ امنگ ہے ابھار ہے۔ آج ہمیں اس اجتماعی زندگی او[illegible] اجتماعی مسرت کا احساس ہے۔ [illegible] ہماری

زندگی کا نمائندہ ہے۔ رجائیت ہے، امید ہے، اور آگے بڑھنے کی امنگ ہے۔ مگر قدیم ادب میں جب انفرادیت کا دور دورہ تھا۔ لوگ اجتماعی زندگی اور اجتماعی انسانی مسرتوں سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ اور تنہا پسندی کی کال کوٹھڑی میں بند تھے۔ برطرف یاسیت اور قنوطیت کا راج تھا۔ اس وقت کا ادب بھی ان کیفیات کا نمائندہ تھا۔ [illegible] ہے۔ حالانکہ اس کا [illegible] وہ اس لئے بے حد مفید ہے کہ ہمیں اس میں تاریخ اور وقت کے تصادم کے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مٹتے ہوئے تمدن اور ایک پیدا ہوتے ہوئے تمدن کے آثار ملتے ہیں۔ [illegible] ایک جنم لیتی ہوئی نئی زندگی کے نشان ملتے ہیں۔ [illegible] فکری تسلسل میں کڑیوں کا کام نہیں دیتیں۔ [illegible] مستقبل کی گہر آلود وادی میں [illegible] نہیں ملتی۔ کیا ہم ماضی کے [illegible] کو خوش آئند نہیں بنا سکتے۔ اگر ایسا ہے۔ تو ہر پرانی چیز کو [illegible] کیوں کیا جائے۔ اور پھر سوال یہ ہے۔ کہ اگر انہیں مٹا دیا جائے تو پھر اس خلا کو کیونکر پُر کیا جا سکے گا۔ یہ تو ہو [illegible] رہا کہ آپ میر، درد یا انشاء کی جگہ جوش، مجاز، مخدوم کو رکھ دیں۔ کیونکہ ان کے کلام میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا کہ ان کے احول میں۔ دراصل ہندوستان کے اشتراکی ادیبوں کا مطالعہ بھی بدقسمتی سے کچھ اتنا زیادہ نہیں۔ [illegible] وہ اپنے ہی ایک کامریڈ نقاد رلیف فاکس سے ہم نوا ہو کر کہتے کہ ماضی کی ہر چیز بیکار نہیں ہمیں اس میں سے ہر وہ چیز [illegible] چاہیئے جو مستقبل میں ہماری راہنمائی کرے۔ اور ہمیں بتلائے کہ ہم پہ تاریخ اور وقت کے تصادم کا صحیح اندازہ کر رہے ہیں یا نہیں۔ [illegible]

اشتراکی ادیبوں کی ایک بہت بڑی کمزوری [illegible] کی زندگی کے ہر شعبے پہ اثر انداز ہے۔ وہ ان کی فنی اور علمی ناسکاری ہے۔ انقلاب زندہ باد، مزدور پائندہ باد کے نعرے لگا کر اور لینن اور اسٹالین کی شان میں قصیدے لکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کی پیروی کی ہے اسی طرح جو ادیب ایسا نہیں کرتے انہیں وہ غدار، رجعت پسند اور اسی طرح کے اور خطاب عطا کرتے ہیں۔ یہ ان کی علمی ناسکاری [illegible] ان کے ادب پر نظر ڈالئے۔ اس سے قطع نظر کر [illegible] یہ دیکھئے۔ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کس انداز سے کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے اشتراکی دوستوں کو یہ جملہ ناگوار گذرے۔ مگر میں حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں۔ کہ جہاں تک فنی حسن کا تعلق ہے۔ وہ ان کے ادب میں مفقود ہے۔ مجموعی طور پر ان کا ادب دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے۔ جیسے بہت سے چھوٹے ذہن مصروف عمل ہیں۔ ان کی تحریریں جا بجا ایسی ناہموار لغزشیں رکھتی ہیں جنہوں نے ان کے ادب کو فنی حسن۔ سلاست اور سنجیدگی سے محروم کر دیا ہے۔

ادب میں [illegible] مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا ذکر معیوب نہیں۔ مگر [illegible] ضرورت ہے کہ لکھنے والا زندگی [illegible] اسی مسئلے پر خامہ [illegible] تو نقص ہے۔ کہ پڑھنے والے [illegible] تعلق مجموعی طور پہ ادیب یا شاعر [illegible] ایسی حالت میں صرف ایک ہی چیز [illegible] اس کا فن جو لطافت حسن اور رعنائی کی تمام [illegible] پھر [illegible] اور ناظر کے ذہن پر اس طرح [illegible] کہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکے۔ اگر طوائفوں کے متعلق [illegible] جنسی تعلقات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں میں کوئی [illegible] ادیب ہوتا۔ جس کے ادب میں جملہ فنی خوبیاں [illegible] ہوتیں۔ تو یقیناً میں اس کا ذکر بڑے فخر سے کرتا۔ [illegible] جو لوگ پیش پیش ہیں ان میں شاید منٹو کو سب سے اچھا لکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ منٹو اپنے موضوع کے ساتھ مخلص نہیں۔ اس کا مقصد ادب نہیں (حالانکہ وہ اسی کا دعوےٰ کرتا ہے) بلکہ شہرت ہے۔ وہ اسے گالیاں دے کر ملے۔ گالیاں کھا کر ملے۔ طوائف کے ہاں جا کر ملے یا طوائفوں کا ذکر کر کے ملے۔ وہ اچھی ہو یا بری ہو۔ بہرحال اسے شہرت چاہیئے۔ اس لئے اس کا ادب ادب نہیں بلکہ پراپیگنڈا ہے۔ ذاتی پراپیگنڈا اور اشتراکی ادیبوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ کہ اس اشتہاری ادب کو بھی ترقی پسند ادب میں شمار کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کی شروع کی ہوئی اس تحریک میں سب سے زیادہ انتشار دوسری جنگ عظیم میں پھیلا۔ وہ جنگ جو صاف طور پر سامراج اور فسطائیت کے درمیان

تھی۔ روس کے میدانِ جنگ میں آنے کے بعد اشتراکیت اور فسطائیت کے محاذوں میں بدل گئی۔ اشتراکی ادیبوں نے روس کی تقلید میں اسے "عوامی جنگ" قرار دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے سرکردہ ترقی پسند ادیب سامراج شاہی کی ملازمت اختیار کرکے حکومت کے گن گانے لگے۔ معلوم نہیں زمانہ جنگ میں سامراج کس طرح اشتراکی اصولوں کو اپنانے پر مجبور ہوگیا۔ بہرحال فوج میں بھرتی ہو کر ریڈیو پر گیت گا کر اور اپنے افسانوں اور نظموں میں فسطائیوں کو گالیاں دے کر ترقی پسند ادیبوں نے اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا کہ موقع شناسی کس قدر اہم حقیقت ہے۔ اور وقت آنے پر زندگی کے بنیادی اصولوں کو کس طرح برباد کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ جنگ میں اپنی گومگو پالیسی کی وجہ سے جہاں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اس دیس کی سیاست میں بدنام ہوئی۔ اسی طرح اشتراکی ادیب بھی۔ اور آج جبکہ جنگ ختم ہوچکی ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ سامراج بدستور ملک اور قوم کی گردن پر پنجہ جمائے بیٹھا ہے۔ ترقی پسند ادیب پھر سے عوام میں مقبول ہونے کی فکر میں ہیں۔ جنگ کے چھ سال انہوں نے حکومت کے روپے پر جس عیش سے گذارے اب وہ ہوہان روح ثابت ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں جب اس ملک کے کروڑوں آدمی بھوک سے مر رہے تھے۔ لوگ گندم اور چاول کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ انہیں ہر چیز میسر تھی۔ گندم چاول شراب۔ عورت — اور آج ان کا گنہگار ضمیر سوچ رہا ہے۔ کہ چھ سال پہلے کی مقبولیت کے دن کس طرح لوٹائے جاسکتے ہیں۔ اب وہی عوام ہیں۔ جو چھ سال پہلے ان کے ارادے اور عزم کے معترف تھے۔ اور ان کی بے شمار خامیوں کو جو ہر تحریک کی ابتدا میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ نظرانداز کرکے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ مگر جنگ کے چھ سالہ تجربے نے اب ان کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب ترقی پسند ادیبوں کے لئے ان کے دل میں نفرت ہے۔ ایسی نفرت جو زہر کی طرح تلخ اور پراسرار ہے۔ اب ترقی پسند زہر کا تریاق ڈھونڈنے کی فکر میں ہیں اب وہ پھر اجتماعی زندگی اور اجتماعی مسرت انسانی کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ مگر اب لوگوں کو چراغ کی لو نہیں دکھائی دیتی۔ بلکہ ان کی نگاہ اس دھوئیں پر ہے۔ جو لو کے اوپر دم بدم گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور وقت قریب ہے کہ یہ دھواں اس چراغ کو بھی نگل جائے گا۔

اس تحریک کے علمبرداروں کی بدقسمتی سے اب ملک میں ایسے ادیبوں کی جماعت بھی پیدا ہو رہی ہے۔ جو اپنے ادب، خیالات اور فن کے لحاظ سے ترقی پسند ادیبوں سے کہیں زیادہ صحت مند اور مخلص ہے۔ اس جماعت کے فن کار عوام میں تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں اس انقلاب کا اثر براہ راست ادیبوں کی اس جماعت پر بھی پڑ رہا ہے جو اپنی عمر کے لحاظ سے ترقی پسند ادیبوں کی ہمعصر تھی۔ مگر جسے انہوں نے رجعت پسند کا ٹولی لگا کر عوام کی نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس جماعت کے ادیب جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ترقی پسند ادیبوں سے کہیں زیادہ بہتر ادب کے خالق ہیں۔ اور چونکہ ان کے ادب کا مقصد اشتہار بازی، پمفلٹ نگاری یا وعظ نہیں۔ اس لئے انہوں نے دانستہ طور پر ترقی پسند ادیبوں کے کسی بھی حملے کا جواب نہیں دیا۔ اور اب حال کا نقاد دیکھ رہا ہے کہ تاریخ نے ایسے ادیبوں کو اپنے جھاڑو سے سمیٹ کر گمنامی کے خلاؤں میں نہیں پھینکا۔ بلکہ ایسے ادیبوں کا صفایا ضرور کیا ہے۔ جو ادب کو پراپیگنڈا سمجھتے ہیں۔ اور پروپیگنڈے کو ادب خیال کرتے ہیں۔ ایسا سمجھنا فقط غلطی اور کم نگاہی کا ثبوت ہے اور جیسا کہ حالات ظاہر کر رہے ہیں۔ ایسے ادیب کبھی زندگیٔ دوام حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے جن اغراض و مقاصد کے ماتحت کام شروع کیا تھا۔ وہ صرف کاغذ پر سیاہی کا لبادہ اوڑھنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکے۔ اس انجمن کا ایک سیاسی پارٹی کے ہاتھوں میں آنا ایک ایسا حادثہ تھا جس کا انجام سوائے ایک المیہ کے اور کچھ نہ ہوا۔ ناتجربہ کار ہاتھوں نے ان واضح اور روشن اغراض و مقاصد کا جو حشر کیا وہ ہندوستانی ضمیر کی عبرت ناک شکست تھی۔ مقام مسرت ہے کہ اس شکست میں بھی ایک نئی فتح کے آثار نظر آ رہے ہیں بذاتِ خود کچھ سمجھ دار ترقی پسند ادیب بھی اپنے ساتھیوں سے نالاں ہیں۔ اور عوام میں ایسے ادیبوں کی عزت بڑھ رہی ہے۔ جن کا ادب کھوکھلے نعروں سے مبرا اور ہندوستانی زندگی کا صحیح ترجمان بھی ہے اور ناقد بھی — ان ادیبوں کی تحریریں کھوکھلے نعرے نہیں کسی خاص سیاسی تحریک کا ذکر نہیں۔ کوئی وعظ نہیں۔ بلکہ صرف ادب ہے۔ ایسا ادب جو انسان کے غموں کا ہمدرد ہے اور اسے اس کی گم گشتہ مسرت [illegible] روشناس کراتا ہے جس کے لئے اس کی روح [illegible]

آلم مظفرنگری

میخانوں کے پاس

شامِ غم کیوں موت آتی ہے گراں جانوں کے پاس
کون آتا ہے مصیبت میں پریشانوں کے پاس

منزلِ فانوس بھی دم بھر میں طے ہو جائے گی،
ہے ابھی تو ہمّتِ پروانہ پروانوں کے پاس

ناخدا اے چل اُدھر کشتی خدا کے واسطے
مجھکو اک ساحل نظر آتا ہے طوفانوں کے پاس

اللہ اللہ میکدے میں اہتمامِ مے کشی
خم ہیں شیشوں کے قریں شیشے ہیں پیمانوں کے پاس

حشر برپا ہو نہ جائے کون سمجھائے انھیں
زلف بکھرائے ہوئے بیٹھے ہیں دیوانوں کے پاس

قوّتِ دستِ جنوں کے خود وہ ہو گئے معترف
چاک داماں کے پہنچیں تو گریبانوں کے پاس

چند قطرے آنسوؤں کے چند موجیں خون کی -
اور کیا اس کے سوا ہے اُن کے دیوانوں کے پاس

گر رہیں گی حقِّ مے نوشی پہ بھی پابندیاں
آئے گا پھر کون ساقی تیرے میخانوں کے پاس

شمع کیا ہر شے کو محفل کی جلا دے مثلِ طور
ایک چنگاری تو ایسی بھی ہے پروانوں کے پاس

گر نہیں ان کا تصرّف صحنِ گلشن پر نہ ہو
ہیں بیابانوں کی جاگیریں تو دیوانوں کے پاس

یاد آ جاتے ہیں جب عہدِ اسیری کے مزے
بیٹھ آتا ہوں میں تھوڑی دیر زندانوں کے پاس

ڈالتے ہیں چند ذرّے دل کے بنیادِ چمن
اس حقیقت کو سمجھ کر آ بیابانوں کے پاس

ڈھونڈ پھولوں میں انھیں اور دیکھ تاروں میں انھیں
وہ چھپے بیٹھے ہیں ان خاموش افسانوں کے پاس

تھا گراں جس کا تصوّر بھی زمین و چرخ پر
تھی کبھی ایسی بھی کوئی چیز انسانوں کے پاس

کون کہتا ہے آلم نے بُت پرستی چھوڑ دی
ہم نے جب دیکھا اُسے دیکھا صنم خانوں کے پاس

جان سٹین بک

ترجمہ:- ممتاز شیریں بی۔ اے

چھاپہ

جب وہ پنج کار سے اترے اور ایک مغرورانہ چال سے گاہاں سے ہٹ کر نے لگے۔ تو کیلیفورنیا کے اُس چھوٹے سے شہر میں تاریکی چھا رہی تھی۔ فضا میں پکے ہوئے پھلوں کی میٹھی میٹھی خوشبو بس رہی تھی۔ ہر نکڑ پر نیلی لالٹینیں اوپر ہوا میں جھوم رہی تھیں جن سے برقی تاروں کے سائے ہل رہے تھے۔ پرانی چوبی عمارتیں خاموش کھڑی تھیں۔ ان کی کھڑکیوں کے گرد آلود شیشے ایک اُداسی سے گلی کی نیلی روشنیوں کو منعکس کر رہے تھے۔ . . .

دونوں ایک سے ہی قد کے تھے۔ گو ان میں اُن میں سے ایک دوسرے سے بہت بڑا تھا۔ انہوں نے بال کٹوا رکھے تھے اور وہ نیلی پتلونیں پہنے ہوئے تھے۔ بڑے نے ہلکی سبز جاکٹ پہن رکھی تھی۔ اور چھوٹے نے آسمانی رنگ کا اونی سویٹر۔ جونہی وہ تاریک گلی میں تیزی سے مڑے۔ اُن کے قدموں کی آواز چوبی عمارتوں میں گونجی۔ نوجوان سیٹی بجانے لگا۔ اس طرز پر (COME to IYE MY MELONCHOLY BABY)

پھر اچانک اُس نے سیٹی بند کر دی۔ "اف یہ طرز کیوں میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے۔ آج سارا دن یاد آتی رہی ہے۔ اور یہ ہے بھی کتنی پرانی طرز"

اس کا ساتھی اس کی طرف مڑا۔ "تم ڈر گئے ہو روٹ۔ چھپاؤ مت۔ تم ڈر سے مرے جا رہے ہو" وہ نیلی لالٹین کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ روٹ نے اپنے چہرے پر سختی پیدا کر لی۔ اُس کی آنکھ بھینگی ہو گئی۔ اور منہ تلخی سے ٹیڑھا ہو گیا۔

"نہیں میں خوف زدہ نہیں ہوں" اب وہ روشنی سے گذر گئے۔ اس کا چہرہ اصلی حالت پر آ گیا۔ "کاش میں یہ باتیں بہتر جانتا۔ تم نے پہلے بھی ایسے کاموں میں حصہ لیا ہے، ڈک! تمہیں معلوم ہے ایسے مقع[illegible] کیا ہو گا۔ مگر میں کبھی ماہر نہیں گیا ہوں"

"عمل کرنا ہی سیکھنے کا طریقہ ہے" ڈک نے کہا "تم کتابوں سے خاک سیکھ سکتے ہو"

وہ ریل کی پٹڑیوں پر سے گذرے۔ لائن پر کہیں دُور ایک اونچے برج میں سبز روشنیاں ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھیں "اُف! کتنا اندھیرا ہے" روٹ نے کہا "شاید کچھ دیر بعد چاند نکل آئے۔ اکثر رات ایسی تاریک ہو تو چاند نکل آتا ہے۔ کیا پہلے تم تقریر کرو گے، ڈک؟"

"نہیں تم بولو پہلے، مجھے تم سے زیادہ تجربہ ہے۔ جب تم بول رہے ہو گے۔ میں انہیں دیکھتا رہوں گا کہ وہ تم سے کہاں نپٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں انہیں دندان شکن جواب دے سکوں گا۔ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہو گے؟"

"یقیناً! سب میرے دماغ میں محفوظ ہے، ہر ایک لفظ۔ میں نے تقریر لکھ کر حفظ کر لی ہے۔ کتنے ہی لڑکے کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں سوجھتا ہی نہیں تھا کہ کیا کہیں پھر یکایک وہ اس طرح بولنے لگے۔ جیسے وہ نہیں کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ اور الفاظ ایسی آسانی سے بہنے لگے جیسے نل سے پانی۔ مائک شین کہتا ہے کہ اس پر سے یوں ہی گذرتا ہے۔ جب وہ بولنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو الفاظ دھواں دھار چلے آتے ہیں لیکن مجھے بھروسہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے پوری تقریر لکھ ڈالی"

ریل گاڑی کی اُداس سمناک پکار سنائی دی۔ اور ایک لمحہ میں ٹرین اپنی تیز روشنی راستہ پر پھینکتی ہوئی مڑی۔ ڈبے ایک کے بعد دوسرا گھڑ گھڑ کرتے ہوئے ان کے پاس سے گذر گئے۔ ڈک مڑ کر ٹرین کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا "اس ٹرین پر زیادہ آدمی نہیں ہیں"۔ اس نے مطمئن ہو کر کہا "تم نے کہا تھا تا کہ تمہارا بوڑھا باپ ریل روڈ پر کام کرتا ہے"

روٹ اپنی آواز سے تلخی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "ہاں وہ سر دڑ پہ کام کرتا ہے۔ کاٹنے والا ہے۔ اُس نے مجھے لات مار کر باہر نکال دیا جب اُسے معلوم ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اسے خوف ہوا کہ وہ اپنی نوکری کھو بیٹھے گا۔ وہ ہمارے مقصد کو سمجھ نہ سکا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ان نکتوں کو سمجھ نہ سکا۔ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا"

روٹ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کا دل کمزور ہو رہا ہے۔ اُسے اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔

"یہی تو مشکل ہے ان کو سمجھانے میں" اس نے پھر کہ خفگی سے کہنا شروع کیا "اپنی نوکری سے پرے ان کی نظر جا ہی نہیں سکتی۔ وہ نہیں دیکھتے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ اپنی غلامی کی زنجیروں کو تھامے لٹک رہے ہیں"

"ارے اسے بحال رکھو" ڈک بولا "یہ بڑا اچھا نکتہ ہے کیا یہ تمہاری تقریر کا ایک حصہ ہے؟"

"نہیں لیکن اگر تمہیں پسند ہے تو اپنی تقریر میں شامل کر لوں گا"

اب گلیوں میں لالٹینیں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور راستہ پر دورویہ درختوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ کیونکہ اب شہر کا آخری حصہ تھا اور وہاں سے دیہات شروع ہوتے تھے۔ البتہ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔

"یسوع! کس غضب کا اندھیرا ہے" روٹ نے پھر کہا "خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو؟ اگر کچھ ہو جائے تو یہ رات اچھی ہے۔ بھاگ نکلنے کے لئے" ڈک نے حقارت سے حلق سے ایک قسم کی آواز نکالی۔

کچھ دیر تک وہ خاموش چلتے رہے۔

"تم بھاگ نکلنے کی کوشش کرو گے ڈک؟" روٹ نے پوچھا

"بخدا نہیں یہ احکام کے خلاف ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے ہمیں ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ تم ابھی بچے ہو۔ اگر میں تمہیں جانے دوں، تو میرا خیال ہے تم ضرور بھاگ جاؤ گے"

"تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ صرف اس لئے کہ دو ایک بار ایسے موقعوں پر حاضر رہے ہو" روٹ چیخ اٹھا "تم بہت بنتے ہو۔ تمہاری باتیں سن کر تو کوئی سمجھ بیٹھے کہ تم بہت بڑے سورما ہو"

روٹ سر نیچا کئے چلتا رہا "ڈک تمہیں یقین ہے تم نہیں بھاگو گے؟ تمہیں یقین ہے تم وہیں کھڑے رہ کر مصیبت اپنے سر لو گے؟"

"ہاں ضرور، مجھے یقین ہے میں اس سے پہلے بھی ثابت قدم رہا ہوں۔ یہ احکام ہیں۔ پھر یہ پبلسٹی کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے" اس نے تاریکی کو چیرتے ہوئے روٹ کی طرف دیکھا "تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو بچے؟ تمہیں خوف ہے کہ تم بھاگ جاؤ گے۔ اگر تم ڈر رہے ہو تو یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے"

روٹ کا بیان "سنو تو ڈک! تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ تم دوسروں سے تو نہیں کہہ دوگے۔ جو کچھ میں نے کہا۔ اس سے پہلے میں کبھی آزمایا نہیں گیا ہوں۔ اگر کوئی بھاری گرز سے میرے پر وار کرے تو میں کیسے جان سکتا ہوں۔ کہ اس وقت میں کیا کروں گا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کرے گا۔ میرا خیال ہے میں نہیں بھاگوں گا۔ ہاں میں نہ بھاگنے کی کوشش کروں گا"

"بہت اچھا لڑکے۔ اب چپ رہو۔ مگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی، تو تمہارا نام نکال دوں گا۔ ہماری جماعت میں ایسے بیکار حرامیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھو بچے!"

"اب چھوڑ دو بھی۔ مجھے بچہ بچہ کیا پکار رہے ہو۔ بچہ کہہ کے مجھے تم بزدل بنا رہے ہو"

درخت اب نزدیک نزدیک لگے ہوئے تھے۔ ہوا پتیوں میں سرسرا رہی تھی۔ کہیں سے ایک کتا بھونکا۔ جب وہ قریب سے گذرے ہوا میں ایک ہلکا کہرا اٹھا۔ اور تارے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تم نے ہر چیز تیار رکھی ہے؟" ڈک نے پوچھا "لیمپ ہیں؟ اور لٹریچر؟ میں نے یہ سب کام تم پر چھوڑ دیا تھا"

"ہاں میں نے دوپہری کو سب انتظام کر لیا" روٹ نے جواب دیا "میں نے ابھی پوسٹر نہیں لگائے ہیں۔ لیکن وہیں ایک بکس میں رکھ چھوڑے ہیں"

"لیمپوں میں تیل ہے؟"

"بہت سا تیل تھا۔ لیکن اب نہ ڈک! میرا گمان ہے کسی حرامزادے نے نکال نہ لیا ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک۔ کوئی نہ کوئی ہمیشہ چُرا لے جاتا ہے۔"

"اچھا تو تم نے کوئی دھاوے چھاپے کے متعلق بھی کچھ سُنا ہے ڈک؟"

"بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں روٹ! کیا تم سمجھتے ہو وہ خود مجھ سے آکر کہیں گے کہ وہ میرا سر پھوڑنے والے ہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھالو تو روٹ! ڈر سے تو تمہاری پتلون گری جا رہی ہے۔ تم یوں ڈرنا نہ چھوڑو گے۔ تو مجھے بھی بزدل بنا دو گے۔"

(۲)

وہ ایک بیٹھی ہوئی چھت کی چوکور عمارت کے قریب پہنچے جو تاریکی میں سیاہ اور بھاری دکھائی دے رہی تھی۔

"ابھی تک کوئی نہیں آیا" ڈک بولا "آؤ ہم اسے کھولیں کچھ روشنی تو ہو جائے۔"

وہ ایک پُرانے سٹور میں آ پہنچے۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک پر "لکی سٹرائک" LUCKY STRIKE کا پوسٹر چپکا ہوا تھا۔ دوسرے میں عورت کی ایک بڑی تصویر بھوت کی طرح کھڑی تھی۔ ڈک نے کواڑ کھول دیئے اور اندر آ گیا۔ پھر اس نے دیا سلائی جلائی اور بتی سلگا کر لیمپ کو ایک اوندھے کئے ہوئے سیبوں کے بکس پر رکھا۔

"آؤ روٹ ہمیں سب چیزیں تیار کرنی چاہئیں۔"

دیواروں کا چونا جگہ جگہ جھڑا ہوا تھا۔ دھول سے اَٹے ہوئے اخباروں کا انبار کونے میں پڑا تھا۔ نیچے کے دونوں ریک پر مکڑیوں نے جالے تن دیئے تھے۔ سوائے سیب کے تین خالی ڈبوں کے اس اسٹور میں اور کچھ نہیں تھا۔

روٹ نے ایک ڈبے سے بڑا سا پوسٹر نکالا جس پر گہرے سرخ اور سیاہ رنگوں میں کھینچی ہوئی ایک مرد کی تصویر تھی۔ اس نے تصویر کو دیوار پر لیمپ کے پیچھے لگا دیا۔ اس کے بازو ایک اور پوسٹر لگایا جس پر ایک بڑا سا سُرخ نشان تھا۔ اخیر میں اس نے ایک اور سیب کا ڈبہ اوندھا کیا۔ اور اس پر کاغذات اور چھوٹی چھوٹی کتابیں رکھیں۔ چوبی فرش پر اس کے قدم زور سے پڑ رہے تھے۔

"دوسرا لیمپ بھی جلاؤ ڈک، اُف یہاں کتنا اندھیرا ہے"

"ہونہہ۔ تم اندھیرے سے بھی ڈر رہے ہو روٹ؟"

"نہیں۔ اب جلد ہی دوسرے آ جائیں گے۔ جب وہ آئیں تو ہمیں زیادہ روشنی کی ضرورت ہوگی۔ کیا وقت ہے اب؟"

ڈک نے اپنی گھڑی دیکھی "پونے آٹھ۔ چند تو ابھی آ جائیں گے" وہ دونوں ہاتھ اپنی دھانی جاکٹ کے جیبوں میں ڈالے پمفلٹوں کے ڈبے کے پاس کھڑا رہا۔ بیٹھنے کے لئے وہاں کچھ نہیں تھا۔ دیوار پر وہ سُرخ و سیاہ تصویر سختی سے گھور رہی تھی۔ روٹ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

ایک لیمپ کی روشنی دھیمی ہو گئی۔ اور لو آہستہ سے ڈوب گئی۔ ڈک اُس کے پاس گیا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ اس میں بہت سا تیل ہے۔ اس میں تو تیل نام کو نہیں۔"

"میں نے سمجھا تھا کہ بہت ہوگا۔ دیکھو وہ دوسری بوتل ہے۔ اس میں سے تھوڑا سا تیل اس لیمپ میں انڈیل لیں گے"

"نہیں یہ کیسے ہو سکے گا۔ تیل انڈیلنے کے لئے دونوں لیمپوں کو بجھا دینا پڑے گا۔ تمہارے پاس دیا سلائیاں ہیں؟"

روٹ نے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا "صرف دو"

"اب تم ہی دیکھو۔ ہمیں صرف ایک لیمپ سے کام چلانا ہوگا۔ میں خود ان چیزوں کو دیکھ لیتا۔ گو میں شہر میں بہت مصروف تھا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ ان باتوں کو تم پر چھوڑ سکوں گا۔"

"شاید ہم ایسا کر سکیں۔ جلدی سے ایک ڈبے میں تھوڑا سا تیل انڈیل کر پھر اس لیمپ میں ڈال لیں۔"

"ہونہہ! پھر دونوں کو آگ لگا دیں۔ تم تو بڑے ہی اچھے ہاتھ بٹانے والے ہو۔"

روٹ پھر دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ "کاش وہ جلد آ جاتیں۔ اب کیا وقت ہے ڈک؟"

"آٹھ بجکر پانچ منٹ۔"

"آخر نہیں کس بات نے روک رکھا ہے؟ وہ کس کے انتظار میں ہیں؟ کیا تم نے انہیں ٹھیک آٹھ بجے کا وقت بتایا تھا؟"

"اوہ۔ چپ بھی رہو بچے۔ تم تو پاگل کر دو گے مجھے۔ نہیں معلوم انہیں کس نے روک رکھا ہے۔ شاید وہ سہم گئے ہوں۔ اب کچھ دیر کے لئے خاموش بھی رہو گے؟" اس نے پھر اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹٹول لئے۔ "سگریٹ ہے روٹ تمہارے پاس؟"

"نہیں۔"

مکمل سکوت تھا۔ شہر کے وسط میں موٹریں اور لاریاں گھوم رہی تھیں۔ ان کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی ہارن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قریب کے کسی گھر میں کتا بھونک رہا تھا۔ تیز ہوا کے چلنے سے درختوں سے وژ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"سنو ڈک! مجھے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے میرا خیال ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔" انہوں نے مڑ کر غور سے سننے کی کوشش کی۔

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ صرف تمہارا وہم ہے۔"

روٹ دریچہ کے پاس گیا۔ اور گرد آلود کھڑکی سے اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے پمفلٹوں کے ڈھیر کے پاس کچھ دیر کھڑے ہو کر انہیں قرینہ سے رکھا۔

"اب کیا وقت ہے ڈک؟"

"خاموش بھی رہو گے؟ کیوں میرا مغز چاٹ رہے ہو۔ ایسے کاموں کیلئے ہمت ہونی چاہئیے۔ خدا کے لئے کچھ جرأت تو دکھاؤ روٹ!"

"میں اس سے پہلے کبھی ایسے کاموں میں نہیں گیا ہوں ڈک"

"ہونہہ! کیا تم خیال کرتے ہو کہ یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ تو کھلی بات ہے۔ پھر بار بار کہنے سے تمہارا مطلب؟"

ہوا بہت زور سے چل رہی تھی۔ سامنے کے دروازے کھڑکھڑائے۔ اور ایک کواڑ آہستہ سے کھلا۔ ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا۔ گرد آلود۔ اخبار کونے میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ اور پوسٹر پردوں کی طرح اڑنے لگے۔

"وہ دروازہ بند کر دو روٹ۔ نہیں کھلا رہنے دو۔ جب وہ آئیں تو اُن کے قدموں کی چاپ ہم اچھی طرح سن سکیں گے"

اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تقریباً ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ آئیں گے؟ آخر ہم کب تک انتظار کریں۔ اگر وہ نہ آئیں تو؟" ڈک کی نظر دروازے پر لگی تھی۔

"ہم کم از کم ساڑھے نو بجے تک یہاں سے نہیں جائیں گے ہمیں یہ میٹنگ آج کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اب رات کی صدائیں کھلے دروازے سے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سڑک پر سوکھے پتوں کا ناچ اور کسی کتے کا آہستہ آہستہ بھونکنا۔ دیوار پر سرخ و سیاہ تصویر دھیمی روشنی میں ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ وہ پھر ہوا میں اڑی۔ ڈک نے مڑ کر تصویر کی طرف دیکھا "سنو بچے"۔ اس نے پُرسکون لہجہ میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ڈر گئے ہو۔ جب کبھی تمہیں خوف محسوس ہو تو اس کی طرف دیکھ لیا کرو" ڈک نے انگوٹھے سے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ کبھی نہیں ڈرا"

"یاد کرو اس نے کیا کیا" لڑکے نے تصویر کی طرف غور سے دیکھا "تم یاد کرتے ہو کہ وہ کبھی نہیں ڈرا؟"

ڈک نے تیزی سے ڈانٹتے ہوئے کہا "اگر وہ کبھی خوفزدہ ہوا تھا بھی تو یہ کسی کو معلوم نہ ہوا۔ تم اس سے سبق سیکھو۔ اور سب کے سامنے یہ نہ ظاہر کرتے پھرو کہ تم کیسے محسوس کر رہے ہو"

"تم کتنے اچھے ہو ڈک! اگر مجھے اکیلا بھیج دیا جائے تو نہ جانے میں کیا کروں گا"

"تم ٹھیک رہو گے لڑکے! تم میں ہمت ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ تمہیں کبھی تجربہ نہیں ہوا ہے"

روٹ نے جلدی سے دروازے کی طرف دیکھا "ذرا سنو۔ تمہیں کسی کے آنے کی آواز آ رہی ہے؟"

"ہونہہ اب چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ جب وہ یہاں آئیں گے تو آئیں گے ہی"

"دروازہ بند کر دیں گے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ سنو۔ کوئی آ رہا ہے"

راستہ پر کسی کے جلدی جلدی چلنے کی آواز آئی پھر بھاگنے کی ایک آدمی لبادہ اور نقاش کی ٹوپی پہنے کمرے میں دوڑا ہوا داخل ہوا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

"بہتر ہوگا اگر تم یہاں سے بھاگ نکلو۔ ریڈنگ پارٹی (RAIDING PARTY) آ رہی ہے۔ لڑکوں میں سے ایک بھی میٹنگ میں نہ آئے گا۔ وہ سب تمہیں تمہاری حالت پر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ مگر مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ آؤ جلدی سے اپنی چیزیں جمع کر کے نکلو۔ پارٹی راستہ میں آ رہی ہے۔"

روٹ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُس نے ڈر کے ڈراتے ڈک کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹٹولنے لئے۔ اور کندھوں کو جھکاتے ہوئے کہا "شکریہ! ہمیں یہ بتانے کا شکریہ صاحب تم

بھاگ جاؤ۔ ہم یہاں ٹھیک ہی رہیں گے۔" "دوسرے تمہیں مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہتے تھے" لوواندر بولا۔

ڈک نے سر ہلایا "یقیناً وہ نہیں دیکھ سکتے۔ کہ کیا ہونے والا ہے وہ اپنی ناک کے پرے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ہاں تم جلد بھاگ جاؤ۔ ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گے۔"

"تو تم لوگ نہیں آؤ گے؟۔ میں تمہاری چیزیں اٹھا لے جانے میں مدد دوں گا۔"

"ہم یہیں رہیں گے" ڈک نے بے توجہی سے کہا "ہم کو یہاں رہنے کا حکم ہے۔ جو کچھ بھی ہوگا ہم اُسے سہ لیں گے لیکن رہ کر اس خطرہ کا سامنا کرنا ہوگا" وہ آدمی دروازے کی طرف جانے لگا۔ پھر وہ مڑا "تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ٹھہروں؟"

"نہیں تم اچھے لڑکے ہو۔ اس وقت تمہاری ضرورت نہیں شاید پھر کبھی تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"اچھا بھئی جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ میں نے کیا۔"

(۳)

ڈک اور روٹ نے اُسے تاریکی میں گم ہوتے دیکھا۔ وہی رات کی پہلی آوازیں آنے لگیں۔ خشک پتے زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے۔ اور شہر کے وسط سے موٹروں کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ روٹ نے ڈک کی طرف دیکھا۔ جیبوں میں اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ چہرے کی نسیں تن گئی تھیں۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پوسٹر دیوار پر سے اڑ جاتے پھر اپنی جگہ پر آ جاتے۔

"ڈر گئے بچے؟"

روٹ نے جلدی سے انکار کرنا چاہا۔ پھر اس نے اقرار کر لیا "ہاں مجھے خوف ہو رہا ہے۔ شاید میں ان کاموں کے لئے موزوں نہیں۔"

"ہمت سے کام لو لڑکے" ڈک نے سختی سے کہا "ہمت سے کام لو" پھر ڈک نے یہ مقولے دہرائے "کم ہمت آدمیوں کے سامنے ہمیں ثابت قدمی کی مثال پیش کرنی چاہیئے تاکہ عوام کو نا انصافی کا احساس ہو۔ یہ ہیں روٹ ہمارے فرمان" پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اب کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔

"میرا خیال ہے وہی لوگ ہیں" روٹ بولا "تو کیا وہ ہمیں مار ڈالیں گے؟"

"نہیں، بہت کر کے وہ کسی کی جان تو نہیں لیتے۔"

"مگر وہ ماریں گے اور جوتوں سے ٹھوکریں لگائیں گے نا؟ ڈنڈوں سے چہرہ پر وار کریں گے۔ ہماری ناک توڑ دیں گے وہ گرانڈیل مائک۔ انہوں نے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے توڑ دیا تھا۔"

"ہمت سے کام لو بچے ہمت سے کام لو۔ اور سنو۔ اگر کوئی تم پر وار کرے تو یوں سمجھو کہ تم پر کوئی آدمی نہیں وار کر رہا ہے بلکہ رواج آئین۔ اور وہ تم پر نہیں وار کر رہا ہے بلکہ اصول کو توڑ رہا ہے۔ تم اتنا یاد رکھو!"

"میں بھاگنا نہیں چاہتا، ڈک! ایمان سے کہتا ہوں نہیں اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو تم مجھے پکڑ لو۔ پکڑ لوگے نا؟"

ڈک نے قریب جا کر اس کے کندھے کو چھوا "تم ٹھیک ہو مجھے یہ پہچان ہے کہ ایسے موقعوں پر کون ثابت قدم رہیگا۔"

"اچھا تو ہم یہ کتابیں اور کاغذات چھپا دیں تو بہتر ہوگا، مبادا سب جلا دیئے جائیں۔"

"نہیں رہنے دو۔ شاید کوئی ان میں سے ایک کتاب اٹھا کر جیب میں رکھ لے اور بعد میں پڑھے۔ اس سے کچھ فائدہ تو ہوگا۔"

"کتابیں وہیں رکھ چھوڑ دو۔ اور اب زبان بند کرو باتیں کرتے رہنے سے معاملہ بد سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

کتا پھر آہستہ دبی دبی آواز میں بھونکنے لگا تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے بہت سے سوکھے پتوں کو دروازے پر لا ڈالا۔ تصویر والا پوسٹر زور سے اڑا۔ اور ایک گوشے سے لٹکنے لگا۔ روٹ نے پھر اُسے چپکایا۔ شہر میں کہیں ایک موٹر کے کھڑے ہونے کی آواز آئی۔

"تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے ڈک؟ ان کے آنے کی آواز سن رہے ہو؟"

"نہیں"

"سنو ڈک، گرانڈیل مائک اپنا ٹوٹا ہوا جبڑا لئے دو دن پڑا رہا۔ دو دن تک کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔"

ڈک غصّہ سے اس کی طرف مڑا۔ بھنچی ہوئی مٹھی جیب سے باہر نکل آئی۔ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں۔ اس نے لڑکے

کی طرف دیکھا اور نزدیک جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "میری بات اچھی طرح سنو بچے! میں بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ مگر اس سے پہلے بھی میں ان حملوں سے گذرا ہوں میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اگر وہ تمہیں ماریں بھی تو درد کا احساس نہ ہو گا۔ میں نہیں جانتا کیوں۔ لیکن احساس ہو گا نہیں۔ وہ ہمیں جان سے بھی مار ڈالیں تب بھی"

اس نے کندھے پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور سامنے کے دروازے کی طرف گیا۔ باہر دونوں طرف دیکھا۔ اور غور سے کان لگا کر آوازیں سننے کی کوشش کی۔ پھر وہ کمرے میں واپس آ گیا۔

"کچھ سنائی دے رہا ہے؟"

"نہیں کچھ بھی نہیں"

"آخر انہیں کس چیز نے روک رکھا ہے؟"

"میں کیا جانوں؟" روٹ کے حلق میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نگلتے ہوئے بولا "شاید وہ آئیں گے ہی نہیں کون جانے اس آدمی نے جھوٹ بولا ہو گا۔ یا صرف مذاق کیا ہو گا"

"شاید"

"اچھا تو کیا ہم ساری رات اس کا انتظار کرتے رہیں گے کہ وہ آئیں اور ہمارا سر پھوڑ دیں"

یکدم ہوا بہت زور سے چلی۔ پھر رک گئی۔ کتے نے بھونکنا بند کر دیا۔ ایک ٹرین چیخی اور تیزی سے گذر گئی۔ رات کو پہلے سے زیادہ خاموش کرتی ہوئی، قریب کے کسی گھر میں گھڑی نے الارم بجایا۔ "کوئی اتنی سویرے کام کو جا رہا ہے" ڈک بولا "شاید چوکیدار ہو گا" اس کی آواز اس خاموشی میں بہت بلند معلوم ہوئی۔ سامنے کا دروازہ کھڑکھڑایا۔ اور آہستہ سے بند ہو گیا۔

"اب کیا وقت ہے ڈک؟"

"سوا تین"

"اف میرے خدا اتنا ہی؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ صبح ہو رہی ہے۔ کاش وہ جلد آ جائیں۔ اور سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائے۔ ڈک سنو ڈک مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے آوازیں سنی ہیں"

دونوں تن کر کھڑے ہو گئے۔ سننے کی کوشش کرتے ہوئے۔ ان کے سر سامنے جھکے ہوئے تھے۔ "تمہیں آوازیں سنائی دے رہی ہیں ڈک؟"

"ہاں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ آہستہ آہستہ دبی آوازیں باتیں کر رہے ہوں" کتا پھر بھونکا اور اس مرتبہ بڑے زور سے بھونکا۔ دبی دبی آوازیں آنے لگیں۔ "دیکھو ڈک میں نے ایک شخص کو پیچھے کے دریچے میں دیکھا" ڈک زیر لب ہنسا "اگر ایسا ہے تو ہم نہیں نکل بھاگ سکتے۔ انہوں نے اس جگہ کو گھیر لیا ہے۔ ہمت کر دیکھے! وہ آ رہے ہیں۔ تم ان آدمیوں سے نہیں ان سے مقابلہ کر رہے ہو"

قدموں کی چاپ زور سے سنائی دی۔ جیسے بہت سے آدمی دوڑے آ رہے ہوں۔ پھر دروازہ پٹ سے کھل گیا۔ آدمیوں کا گروہ اندر گھس آیا۔ موٹے ڈھالے کپڑے اور کالی کالی ٹوپیاں پہنے ہوئے آدمی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھریاں سنبھال رکھی تھیں۔ ڈک اور روٹ سیدھے تن کر کھڑے رہے۔ ان کی ٹھوڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور آنکھیں جھکی ہوئی۔

اندر آنے کے بعد حملہ آوروں میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ ان دونوں کے گرد نصف دائرہ بنا کر کھڑے رہے۔ تیوری پر بل ڈالے۔ اس انتظار میں کہ ان میں سے کوئی پہلے بھی تو وار کریں۔

نوجوان روٹ نے کنکھیوں سے ڈک کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف سرد مہر روکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا امتحان لے رہا ہو۔ روٹ نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ جیب میں ٹھونس لئے۔ اور بڑی دقت سے آگے بڑھا ڈر کے مارے اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی "کامریڈس" وہ چیخ کر بولا "تم بھی ہم جیسے آدمی ہو۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں"

ایک لاٹھی چھڑی سن سے اٹھی اور روٹ کی کنپٹی پر جم گئی روٹ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ پھر اس نے ہاتھوں کا سہارا لے لیا۔

لوگ خاموش اس کی طرف گھورتے ہوئے کھڑے رہے۔

روٹ آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی گردن پر پھٹے ہوئے کان سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کا گال

نیلا اور سوجا ہوا تھا۔ وہ پھر سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ جوش سے خون ابل رہا تھا اب اس کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے۔ اور آواز پُر زور تھی آنکھیں جذبہ کی شدت سے انگاروں کی طرح گرم اور سرخ ہو گئی تھیں۔

"کیا تم نہیں دیکھ سکتے؟" وہ چلّایا "کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے ہم سب کچھ تمہارے لئے کر رہے ہیں۔ ہاں سب کچھ تم خود نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو"

"مار ڈالو ان سرخ پچوہوں کو" کوئی ہنسنے لگا جیسے اسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ پھر ایک چھڑی گھومی۔ چھڑ بار بار تڑاتڑ برسنے لگیں۔ گرنے سے پہلے روٹ کو ڈِک کا چہرہ نظر آیا۔ مسکراتا ہوا۔ ایک سخت، روکھی مسکراہٹ۔

(۴)

کئی بار اس کی بے ہوشی دُور ہوتی معلوم ہوتی۔ مگر پورے طور سے ہوش نہیں آیا۔ آخر اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو اسے سب پتہ لگا۔ اس کے چہرے اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سوجے ہوئے پپوٹوں سے روشنی کی صرف ایک لکیر دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ چپکا پڑا رہا گذرے ہوئے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ پھر قریب ہی سے اس کو ڈِک کی آواز سنائی دی "تم جاگ رہے ہو بچے؟"

"میرا خیال ہے"۔ روٹ نے جواب دیتے ہوئے محسوس کیا۔ کہ اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔

"انہوں نے تمہارے سر پر خوب چوٹ لگائی۔ میں تو سمجھا تم چل بسے۔ ناک ٹوٹنے کے بارے میں تمہارا اندیشہ ٹھیک نکلا۔ اب تو بڑی خوبصورت نظر آئے گی تمہاری ناک!"

"تم پر کیا گذری۔ ڈِک؟"

"اوہ! انہوں نے میرا ایک ہاتھ اور چند پسلی کی ہڈیاں توڑ دیں۔ تمہیں یہ سیکھنا چاہیئے کہ چہرے کو جلدی سے زمین کی طرف پھیر لیں۔ اس سے تمہاری آنکھیں بچی رہیں گی" اس نے احتیاط سے ہولے ہولے سانس کھینچی۔ "پسلی ٹوٹنے سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے نصیب اچھے تھے۔ کاپس (COPS) والے ہمیں جلدی اٹھا کے یہاں لے آئے"۔

"کیا ہم جیل خانہ میں ہیں ڈِک؟"

"نہیں ہسپتال میں"

"انہوں نے کیا رپورٹ لکھی ہے؟"

اس نے ڈِک کو ہنسنے کی کوشش کرتے سنا۔ مگر ہنسنے سے اسے تکلیف نہ ہوئی۔ اور وہ درد سے کراہا "لڑائی بلوہ کی ترغیب۔ میرا خیال ہے ہمیں چھ ماہ کی سزا ہو گی۔ ہمارا لٹریچران کے ہاتھ لگا"

"تم انہیں یہ نہ بتا دو گے" ڈِک "کہ میں کم سن (UNDER-AGE) ہوں"

"نہیں میں نہیں کہوں گا۔ مگر تم خاموش رہو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ تمہیں آرام کرنا چاہیئے۔ دیکھو تو تمہاری آواز کیسی بیٹھی ہوئی ہے"

روٹ ہلکے درد کے بوجھ تلے دبا ہوا خاموش لیٹا رہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے بات کی "مجھے درد محسوس نہیں ہوا ڈِک! میرے دل میں جذبات بھرے ہوئے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا"

"تم نے اپنے فرض کو خوب نبھایا بچّے! واقعی تم نے خوب سنبھالا۔ میں تمہیں کمیٹی میں لے لوں گا"

روٹ نے کوشش کی کہ وہ اپنے خیالات کو ٹھیک طرح بیان کرے "جب وہ مجھے مار رہے تھے تو میں نے ان سے کہنا چاہا کہ مجھے کچھ پروا نہیں"

"ٹھیک لڑکے؟ یہی تو میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ ان آدمیوں کا قصور نہ تھا۔ بلکہ آئین کا۔ ہمیں ان سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ بے چارے کیا جانتے ہیں؟" روٹ نے غنودگی میں کہا۔ درد کی شدت سے اس پر نیند سی طاری تھی۔

"انجیل میں ایسا کچھ لکھا ہوا ہے نا ڈِک تمہیں یاد ہے؟ انہیں معاف کر دو کیونکہ وہ خود نہیں جانتے وہ کیا کر رہے ہیں"

ڈِک نے درشتی سے جواب دیا "ان مذہبی باتوں کو چھوڑ دو بچے! مذہب عوام کے لئے افیون ہے"

"ہاں مجھے معلوم ہے" روٹ نے کہا "مگر اس میں مذہب کو کچھ دخل نہیں تھا۔ وہ صرف ... میں نے یونہی ... میں نے یونہی کچھ کہنا چاہا۔ میں نے ایسا ہی محسوس کیا"

عزیز الحسن عزیزؔ ستھراوی

چالیس

کہیں خود بدل نہ جائیں مری زندگی بدل کر
وہ فریب کھا رہے ہیں مرے ساتھ چال چل کر

مجھے کیا کرے گی دُنیا مری رَو میں ساتھ چل کر
میں قدم قدم پہ رکھوں جو قدم سنبھل سنبھل کر

مری چشمِ نم سے آنسو جو گرا کوئی مچل کر
وہیں رہ گئی محبت مرے غم میں ہاتھ مل کر

نہیں ملتی کوئی منزل جہاں صبح و شام چل کر
وہ مقام آگیا ہے غمِ زندگی سنبھل کر

وہ بچائیں اپنا دامن کہ ہے احتیاط لازم
وہ مرا غبار اُٹھا مری خاک مُنہ سے مل کر

وہی منزلِ فنا ہے جو مقام ہے بقا کا
یہ معاملہ ہے نازک نہ شکایتِ اجل کر

مرا حالِ بے نوائی بطریقِ آشنائی
تجھے دیکھنا پڑے گا مگر اپنا رُخ بدل کر

مرا آخری قدم ہے مری زندگی کی لغزش
مجھے کون دے سہارا کہ گرا ہوں میں سنبھل کر

غمِ جاں گسل نہیں کب غمِ گرمئ محبت
یہ ثبوت دے دیا ہے مجھے شمع نے پگھل کر

مری گرمئ سخن پر نہ ہو تبصرۂ برقِ ایمن
تجھے جو بھی کہہ دیا ہے مرے سوزِ غم نے جل کر

مرے دل سے اُن کو دُوری یہ نظر کا شعبدہ ہے
مری حدِ عاشقی سے جو نہ جا سکے نکل کر

ہوئی غم کے تجربہ سے یہ نصیب سُرخروئی
مرا خون رنگ لایا مری آنکھ میں اُبل کر

ترے کفرِ یاس ہی نے تجھے مضمحل کیا ہے
جو ہے اختیار باقی بطریقِ نَو عمل کر

ابھی جبر سے فزوں ہے مرا اختیار لیکن
مجھے کر دیا ہے بے بس تری یاد نے مچل کر

کسی نکتہ رس سے کہہ دو کہ عزیزؔ[۱] ہے عطیہ[۲]
بحسابِ زُبر[۳] پیدا کوئی صورتِ جمل[۴] کر

۱ عزیز کے عدد ۹۴ ہوتے ہیں ۲ عطیہ کے عدد بھی ۹۴ ہوتے ہیں ۳ حساب زُبر مورخین کی اصطلاح میں اس حساب کو کہتے ہیں جس میں بحساب ابجد جس حرف کے واسطے جو عدد مقرر ہے لیا جائے ۴ جمل میں مندرجہ بالا حساب کا نام ہے جس کی تین قسمیں ہیں۔ جمل صغیر، جمل وسیط، جمل کبیر۔ مقطع میں جمل صغیر کی مدد سے ادبی نکتہ پیدا کیا گیا ہے۔

سید اختر علی تلہری

بہاء الدین عاملیؒ کی عربی شاعری

آسمان علم وفضل کے اس مہر درخشاں کا طلوع شہر بعلبک میں بروز چہارشنبہ ۱۷ محرم ۹۵۳ھ کو ہوا تھا۔ بنا بر مشہور زندگی کی مختصر ایام دیکھ کر ۱۰۳۱ھ میں عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ آپ کے لائق شاگرد جناب محمد تقی مجلسی کا بیان ہے کہ آپ نے بیاسی برس کی عمر میں انتقال فرمایا ہے۔ اصفہان میں آپ کا انتقال ہوا تھا لیکن وہاں سے آپ کی نعش مشہد رضوی میں منتقل کر دی گئی اور آپ وہیں روضہ مقدسہ کے پہلو میں دفن ہیں۔ جناب امام رضاؑ کے زائرین آپ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے ہیں۔

آپ نے تعلیم اپنے پدر بزرگوار جناب شیخ حسن سے جو خود بھی بلند پایہ فاضل تھے حاصل کی ہے اور علامہ عبداللہ یزدی محقق ملا علی کے نامور شاگرد کے حلقۂ درس میں بھی بیٹھے ہیں۔ بحر العلوم باقر داماد مصنف افق المبین اور جناب مقدس اردبیلی آپ کے معاصرین میں تھے۔ شاہ عباس صفوی کی بارگاہ میں آپ کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

علوم متداولہ کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں آپ کو پوری دسترس حاصل نہ ہو۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث اور کلام میں آپ امتیازی مہارت رکھتے تھے۔ ان تمام علوم وفنون میں آپ کے فضل وکمال کے قلمی آثار موجود ہیں۔

اصول فقہ میں آپ کا مشہور متن "زبدہ" ہے جو اپنی متانت اور دقت کی وجہ سے شیعہ عربی مدارس کے نصاب میں اب تک داخل ہے۔ شیعی فقہ میں مشرق الشمین اور جامع عباسی وغیرہ کتابیں موجود ہیں۔ "تشریح الافلاک" علم ہیئت میں آپ کی کتاب ہے "خلاصۃ الحساب" علم حساب میں آپ کی مشہور کتاب ہے۔ "تہذیب" نحو میں آپ کی تصنیف ہے۔ علم وراثت میں رسالہ "فرائض" اور علم عربیت میں "فواید صمدیہ" آپ نے تحریر کی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے رسائل وحواشی۔ تفسیر وہیئت وغیرہ کے متعلق عروۃ الوثقیٰ۔ عین الحیات۔ حبل المتین۔ مفتاح الفلاح رسالہ ہلالیہ۔ رسالہ اسطرلابیہ۔ حواشی تفسیر کشاف، حواشی بیضاوی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ کشکول و مخلاۃ آپ کی وہ شہرۂ آفاق تصنیفیں ہیں جن میں گوناگوں معلومات، دلچسپ لطائف اور دلآویز علمی نکات کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اس طولانی فہرست پر نظر ڈالنے سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ کسی نہ کسی قدر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان میں سے دو ایک کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو آپ کی دقت نظر اور بالغ نظری فکر کا ثبوت قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ آپ نے جس فن کی طرف توجہ فرمائی ہے اس میں اعلیٰ اجتہادی ذوق کی مستقل یادگاریں چھوڑی ہیں۔

خیال ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص جس کے غور وفکر کی قوتیں حکمت وفلسفہ کے دقیق مسائل کی گرہ کشائی میں مصروف رہتی ہوں جو فقہ واصول فقہ، تفسیر وحدیث کے مباحث میں بحث ونظر کا عادی ہو اسے بیچارے شاعری کی زلفیں سنوارنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے حقیقت یہی ہے علامہ بہاء الدین عاملی اگر ایک طرف زبردست حکیم وفقیہ تھے تو دوسری طرف ایک باکمال شاعر اور ادیب بھی۔ اگر ایک طرف آپ کا دامان طبع ادبی بدلہ سنجیوں سے مالا مال تھا تو دوسری طرف حکیمانہ ژرف نگاہیوں سے بھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی ہمہ گیر طبع وقار نے شعر کی اس دنیا کو جس میں "اکذب اوست احسن اوست" کا بیشتر سکہ رواں رہتا تھا حقائق کی دنیا بنا لیا۔

علامہ بہائیؒ کو عربی وفارسی دونوں زبانوں کی شاعری پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ ان کا عربی کا کلام جس قدر نغز ودل پسند ہوتا تھا اسی قدر فارسی[1] کا کلام بھی۔ ان کے اشعار میں شوخی بھی ہے جوش بھی۔ زبان میں شیرینی بھی ہے نمکینی بھی۔ ان کے اسلوب فکر میں متانت بھی ہے اور لطافت بھی۔ اور پھر صرف یہ نہیں کہ ان کا کلام

---

[1] علامہ کی فارسی شاعری کا تذکرہ خیام لاہور کے تازہ سالنامہ میں کیا گیا ہے۔

کسی خاص صنف سخن سے مخصوص ہو۔ ان کا اشہب طبع ہر میدان میں دوڑا ہے اور کہیں اس کی خوش خرامی میں فرق نہیں آیا ہے۔ عربی میں انھوں نے قصائد مدحیہ بھی لکھے ہیں اور مراثی بھی۔ مثنویاں بھی نظم کی ہیں اور قطعات بھی۔ البتہ فارسی میں ان کی دو مثنویاں ملتی ہیں۔ مثنوی [illegible] وحلوی" اور مثنوی "شیر و شکر"۔ اس مقالے میں صرف ان کی عربی شاعری پر تبصرہ کیا جائے گی۔

علامہ کی عربی شاعری میں سلاست و روانی عام طور سے پائی جاتی ہے۔ ان کا انداز بیان [illegible] اور پیچیدگی سے بالکل پاک ہے۔ [illegible] الفاظ [illegible] بھی دکھائی نہیں دیتی [illegible] جن سے کام [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] میں رفعت ہے۔ ندرت ہے۔ تازگی ہے [illegible] اور لطف یہ ہے کہ حقیقتوں کا [illegible]

[illegible] خاص طور سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے [illegible] انداز میں [illegible] تشبیب میں آپ نے [illegible] اور مجازی محبت کے [illegible] میں بڑھائی ہے۔ بلکہ زیادہ تر [illegible] فرمایا ہے اور زمانہ کی بے التفاتیوں اور [illegible] کا شکوہ کیا ہے اور اس عنوان سے کہا ہے کہ [illegible] نہیں [illegible] ہوتی بلکہ پیش آنے والی حقیقتوں [illegible] ہے۔

اس سلسلے میں [illegible] خیالات [illegible] کمال خوش سلیقگی سے [illegible] بڑے بڑے شعرا اور بھی دکانوں میں [illegible] حقیقت [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے [illegible] زبان عربی پر کس قدر دسترس رکھتے تھے۔ اور ان کا شاعرانہ مذاق کس قدر [illegible] اور ستھرا تھا۔ [illegible] سلاست و روانی [illegible] کے ساتھ شاعرانہ [illegible] یوں [illegible] ان کی بات [illegible] میں [illegible] اعلیٰ شعری ذوق کی ضرورت [illegible] نادر [illegible] میں آتا ہے۔ فی الحقیقت قصائد میں تشبیب کی منزل نہایت نازک اور اہم ہوتی ہے۔ قصیدۂ صاحبیہ میں

جس حسن کے ساتھ اسے طے کیا گیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے ہوگا۔ ملاحظہ ہو ؂

سری البرق من نجد فجدد تذکاری
عہودًا بحزوی والعذیب وذی قار
وہیج من اشواقنا کل کامنٍ
وأجج فی احشائنا لاعج النار
الا یا لیثیلات الغدیر وحاجر
سُقیت بہامٍ من بنی المزن مدرار
ویا جیرۃً بالمازمین خیامہم
علیکم سلام اللہ من نازح الدار
خلیلی ما لی والزمان کانما
یُطالبنی فی کل وقتٍ باوتار
فابعد احبابی واخلیٰ مرابعی
وابدلنی من کل صفوٍ باکدار
وعادل ابی من کان اقصی مرامہ
من المجد ان یسمو الی عشر معشاری
الم یدر انی لا ازال نخطبہ
وان سامنی بخسًا وارخص اسعاری
[illegible] امری الفرقدین فما الذی
یوثرہ مسعاہ فی خفض مقداری
وانی امرؤ لا یدرک الدہر غایتی
ولا تصل الایدی الی سر اغواری
اخالط ابناء الزمان بمقتضی
عقولہم کی لا یفوہوا بانکار
واظہر انی مثلہم تستفزنی
صروف اللیالی باحتلاء وامرار

وانی صادی القلب مستوفز الحشیٰ
اسیر شجیٍ واملٌ باعسارِ
ویعجزنی الخطب المهول لقاءهٗ
ویُطربنی الشادی بعود ومزمار
ویضنی فوادی ناهدا الثدی کاعبٌ
باسمر خطار واحور سحارِ
وما علموا انی امرءٌ لا یروعنی
توالی الرزایا فی عشی وابکار
اذا دکّ طور الصبر من وقع حادثٍ
فطود اصطباری شامخٌ غیر منهار

ترجمہ:- نجد کی سمت سے بجلی چمکی اور مجھے وہ صحبتیں نئے سرے سے یاد آگئیں جو مقامات حذوی وعذیب وذی قار میں احباب سے کبھی گرم رہی تھیں۔ اس چمکنے والی بجلی سے ہماری ان خواہشوں کو جنہیں دنیا والوں سے چھپائے ہوئے تھے پھر سے ابھار دیا۔ اور ہمارے دلوں میں جلا دینے والی آگ کے شعلے اچھی طرح بھڑکا دیئے۔ اے وہ مختصر رات جو مقام غدیر وحائر میں احباب کے ساتھ پرلطف طریقے سے کٹی ہیں خدا کرے تم برسنے والے بادلوں سے سیراب کی جاؤ۔ اور اے میرے وہ دوستو جو کبھی مقام فاز میں میرے ہروقت کے ساتھی تھے۔ اور جن کے ہجر و فراق کے صدمے مجھے اب اٹھانا پڑ رہے ہیں تم تک ایک دُور افتادہ بچھڑے ہوئے کا سلام پہنچے۔ اے میرے دوستو۔ مجھے بتاؤ کہ آخر زمانے کو مجھ سے کیوں دشمنی ہے۔ کہ ہر وقت وہ مصیبتیں لئے ہوئے مجھے تلاش کرتا ہے۔ جیسے میں نے اس کا کوئی جرم کیا ہے۔ اور وہ اس کا عوض مجھ سے لینا چاہتا ہے۔ (اس بے رحم زمانے نے) میرے دوست مجھ سے جدا کر دیئے۔ میرے مکانات ویران کر دیئے اور نعمتوں کے بدلے کلفتیں میرے حق میں رکھدیں۔ اس ناہنجار زمانے نے میری توہین وتذلیل میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان اشخاص کو جن کا انتہائی مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میری بزرگیوں اور فضیلتوں کے دسویں حصہ تک پہنچ سکیں میرے برابر کر دیا گیا [illegible] ہے کہ وہ مصایب وحوادث میں گرفتار کرکے میری توہین [illegible] میرے فضل وکمال کے [illegible] اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میری [illegible] کہ فرقدین (دو مشہور ستارے ہیں) [illegible] میں کوئی شے میری عزت کو [illegible] قریب ہوں۔ ابنائے زمانہ [illegible] وکمالات کی [illegible] پہنچ سکتے۔ ان کی [illegible] کا انداز [illegible] میں دنیا والوں سے ان کی عقلوں کے مطابق خطاب کرتا ہوں۔ جتنی ان کی فہم ہے اسی [illegible] بات چیت کرتا ہوں۔ وہ نکتے جن کو [illegible] ان کی عقلیں [illegible] اُسے بیان نہیں کرتا۔ اس لئے کہ انہیں ان کا سمجھنا محال ہوگا۔ میں اپنی زمانہ پر یہ امر ظاہر کرتا ہوں کہ [illegible] حوادث مجھے مغموم ومحزون [illegible] ہم آغوش ہوکر انہیں کی طرح [illegible] ہوتا ہوں اور یہ کہ میرا [illegible] بالکل [illegible] مصایب کے نزول کے وقت میری عقل صحیح [illegible] اٹھتا ہوں [illegible] مشتعل [illegible] کی بہار پر آئی ہوئی [illegible] طرح سے کی طرح سے چمکتا [illegible] جن میں جادو بھر [illegible] ایسا شخص ہوں [illegible] نہیں بنا سکتیں۔ میرے [illegible] پائے صبر مصیبتوں کے نزول سے متزلزل ہو جائے تو ہو جائے مگر میرے قدم استقامت میں جنبش نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر [illegible] انسانی فطرت کی کمزوری کا تذکرہ کیا ہے اور اس [illegible] انفرادیت کے نقش ونگار جس نوعیت سے واضح کئے ہیں اس سے یہ [illegible] شاعرانہ حقیقت نگاری کا آئینہ بن گئی ہے۔

قصاید [illegible] مقام [illegible] سے نظر کے قابل ہوتا ہے۔ گریز میں [illegible] لطافت ہوتی ہے اسی قدر قصیدے کی عظمت [illegible] قصیدہ زیر بحث کا عنوان گریز بھی اپنی لطافت کے [illegible] ہے۔

أأجزع للبلوی واغضی علی القذی
وارضی ما یرضی بہ کل مخوار
وافرح من دھری بلذۃ ساعۃ
واقنع من عیشی بقرص واطمار
اذاً لا ورتنی زندی ولا عز جانبی
ولا بزغت فی قمۃ المجد اقماری
ولا بزکفی یا السماح ولا سرت
بطیب احادیثی الرکب واخبار
ولا انتشرت فی الخافقین فضائلی
ولا کان فی مھدی رایق اشعار

ترجمہ:۔ مصائب اور آزمائشیں مجھے کسی موقع پر ذلیل نہیں کرسکتیں اور نہ میں اپنے نفس کو ایسے امور کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہوں جو میری عزت و آبرو کو برباد کرنے والی چیزیں ہوں۔ میں ان امور پر کبھی راضی ہوتا ہوں جن پر کمزور عقل والے راضی ہوجاتے ہیں۔ مجھے کبھی دنیا کی فانی لذتوں سے جو موسم بہار کی طرح گزر جانے والی ہوں مسرت نہیں ہوتی۔ میں اگر غیر پسندیدہ امور کے ارتکاب میں مسامحہ کرنے والا ہوتا یا کمزور عقلوں والوں کی غیر عاقبت بینی مجھ میں ہوتی اور دنیا کے عمدہ مطاعم و مشارب و ملابس کا والہ و شیدا ہوتا تو نہ میں کبھی اپنے مقصود تک پہنچ سکتا اور نہ کبھی مجھے عزت ملتی اور نہ میرے فضایل و کمالات کی روشنیاں بزرگی کی بلندی پر چمکتیں اور نہ میں جود و کرم کی صفتوں سے کبھی متصف ہوسکتا۔ اور نہ سواریاں میرے محاسن اخلاق دیار بہ دیار لے جاتیں۔ اور نہ میرے صفات حمیدہ کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہوتا اور نہ جناب امام مہدی کے متعلق اتنے اچھے دل پسند اشعار کہہ سکتا۔ ایک عصمت پناہ و رہنما ہستی کی مدح میں عمدہ اشعار کہہ سکنے کے لئے شرایط بالا لگانا اسی شخص سے ممکن ہوسکتا تھا جو ان روحانی پیشروں اور معصوم ہستیوں کا رتبہ شناس ہونے کے ساتھ شاعرانہ بلند خیالیوں کا بھی مالک ہو۔

مدح کی شان ملاحظہ ہو ؎

خلیفۃ رب العالمین وظلہ
علی ساکنی الغبراء من کل دیار
ھو العروۃ الوثقی الذی من بذیلہ
تمسک لا یخشی عظایم اوزار

ترجمہ:۔ جناب امام مہدی وہ سلطان اعظم و عادل ہیں جو تمام دنیا پر احکام ایزدی نافذ کرنے میں خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ فی الارض ہیں۔ یہ ممدوح ایسے مستحکم جائے پناہ ہیں کہ جو شخص ان کے دامن عزت سے وابستہ ہوجاتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے اسے بڑے بڑے گناہوں کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ امام برحق ہیں۔ ان کی سچی پیروی کرنے سے گناہوں کے ارتکاب کا اس کے لئے کوئی موقع نہیں رہے گا۔

جناب صاحب الامرؑ کی مدح فرماتے ہوئے جناب بہائی نے چند شعر ایسے لکھ دیئے ہیں جن کی رفعت خیال کی نظیر نہیں ملتی۔ شاعرانہ بلند پروازی کے ساتھ واقعیت کے حدود کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ تخیل کی اسی خصوصیت نے ان اشعار میں وہ معجزانہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ذوق ان کے سامنے بے اختیار سربسجود ہوجاتا ہے۔ اگرچہ ترجمہ ان لطافتوں کی ترجمانی نہیں کرسکتا جو ان عربی اشعار کی جان ہیں تاہم اس کا اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ علامہ بہاؤالدین کی شاعرانہ فکر رفعت تخیل میں اس جگہ کس قدر عرش نشان بن گئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

علوم الوری فی جنب البحر علمہ
کغرفۃ کف او کغمسۃ منقار
فلو زار افلاطون اعتاب قدسہ
ولم یعشہ عنہا سواطع انوار
رأی حکمۃ قدسیۃ لا تشوبہا
شوایب انظار وادناس افکار

ترجمہ:۔ تمام دنیا کے علوم اگر ان کے علم کے ذخّار دریا کے مقابلہ میں رکھے جائیں تو ان کی حقیقت چلو بھر پانی یا طایر کے منقار کی ایک ڈوب سے زیادہ نہ ہوگی۔ اگر افلاطون (جو حکمائے اشراقیہ کا میر کارواں سمجھا جاتا ہے) آپ کے آستانۂ قدس کی زیارت کرے اور وہاں کی چکاچوند پیدا کرنے والی روشنیاں اُس

کی بصارت زایل نہ کر دیں تو وہ حکمت قدسیہ کے ان انوار کو دیکھے گا جن میں نظر و فکر کے گرد و غبار کا ذرّہ بھر نشان نہیں ہے"۔

ممکن ہے عوام کی نگاہ ان اشعار میں مبالغہ کی جھلک دیکھے لیکن اگر اس پر نظر رکھی جائے کہ شاعر کے عقیدے میں ممدوح معصوم ہے اور روحانی جلالتوں کا مالک تو ان اشعار میں مبالغے کا شائبہ بھی نہیں رہتا۔ شاعر کے مذہبی اعتقاد کی رُو سے جناب مہدیؑ کے تمام علوم الہامی ہیں اور وہبی، خطا سے پاک و صاف۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں افلاطون کے علوم کو اس بارگاہ قدس کے علوم سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ مانا کہ افلاطون حکمائے اشراقیین کا قافلہ سالار ہے۔ اس کی نگاہیں دوسرے عالم کے جلوے دیکھتی ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک خاطی انسان ہے۔ اس کے فکر و نظر کی قوتیں گرد و غبار میں آلودہ۔ وہ اس طاہر و مطہر حکمت قدسیہ کے اسرار و حکم کا ادا شناس نہیں ہو سکتا جس کے جلوے امامت کے اس نورانی "سلسلۃ الذہب" میں نظر آتے ہیں۔ شاعر کے ایمان کی نظر میں فکر و نظر کے گرد و غبار سے پاک و صاف علوم کے انوار اسی معصوم خانوادے کی بارگاہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

علامہ بہائی نے بلدۂ ہرات کی مدح میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جس میں ہرات کی مختلف چیزوں کی تعریف کی ہے۔ اس مثنوی کی شان نزول یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ شہر قزوین میں قیام فرما تھے وہاں آپ کو آشوب چشم کی شکایت ہو گئی۔ ایسی صورت میں علمی مطالعہ کا کوئی محل نہ تھا۔ فضول باتوں میں آپ سے وقت نہیں گزارا جاتا تھا۔ اسی کرب و اضطراب کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے آپ نے یہ مثنوی لکھی ——— چنانچہ تمہید میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

عربی شاعری کا اصل لباس قصاید ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے اس عجمی پوشاک میں بھی یہ "سامی جوہر" کس قدر ضو دے رہا ہے فرماتے ہیں

بُلیتُ فی قزوین وقتاً برمد
مقرحٍ للقلب من فرط الکمد
یمنع من صرف النہار فیما
یرضی اللبیب الحاذق الفہیما
من بحث او تلاوۃٍ او فکرٍ
او درس او عبارۃٍ او ذکر
حتی سئمت من لزوم منزلی
والنفس عن اشغالہا بمعزل
ولم تکن من عادتی البطالۃ
لانہا من شیم الجہالۃ
ثم جنحت لنظم الاشعار
وليس نظم الشعر من شعاری

ترجمہ:- قزوین میں ایک مرتبہ مجھے آشوب چشم کی شکایت ہو گئی تھی۔ تکلیف کی شدت سے دل مجروح ہو رہا تھا۔ ہوشیار اور فہمیدہ انسان جن مشاغل میں اپنے اوقات صرف کرتا ہے ان کا آشوب چشم کی وجہ سے کوئی محل نہ تھا۔ یہاں تک کہ میں مکان میں پڑے رہنے سے تھک گیا۔ کیونکہ میرے جو محبوب مشغلے تھے اُن سے محروم تھا۔ یہ میری عادت نہیں ہے کہ بے کار باتوں میں وقت ضائع کروں کیونکہ یہ جہالت کی خصلت ہے۔ ایسی حالت میں شعر گوئی سے زیادہ عمدہ مشغلہ اور کوئی نظر نہ آیا۔ اگرچہ شعر کہنا میرا عام شیوہ نہیں ہے۔

اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب علامہ کو مختلف چیزوں کے بیان کرنے کا ادیبانہ انداز میں کتنا اچھا سلیقہ تھا ———

اصل تو یہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ بہت جلد اشعار نظم فرماتے تھے۔ شہر کی تعریف بیان فرمانے کے بعد اس کی آب و ہوا۔ اس کے پھولوں اور اس کی عورتوں کی توصیف نہایت لطف سے کی گئی ہے۔ جستہ جستہ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

ہواؤہا من الوبا جُنّۃ
کانہ من نفحات الجنّۃ
یبسط الروح وینفی الکرب
ویشرح الصدر ویشفی القلب
فمن رماہ الدہرُ بالافلاس
حتی اعن المسکن واللباس

فلا یصاحب بلدۃ سواھا
لانہ یکفیہ فی [illegible] ہا

ترجمہ: ہرات کی ہوا وبائی امراض سے بچانے میں سپر کا کام کرتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جھونکے بہشتی ہیں ہرات کی ہوا رنج کو فرحت بخشتی ہے [illegible] گرد دور کرتی ہے - سینوں میں انشراح پیدا کرتی ہے - اور فلسفہ کو شفا دیتی ہے - جس شخص کو زمانہ افلاس کی مصیبتوں میں مبتلا کر دے [illegible] کہ نہ تو اس کے پاس لباس باقی رہے اور نہ رہنے کی جگہ تو پھر اُسے ہرات کے سوا کہیں اور قیام نہ کرنا چاہیے - اس لئے کہ یہاں کی ہوا تمام باتوں کی تلافی کر دے گی -

لو قیل ان الماء فی الہراۃ
یعدل ماء النیل والفرات
لم یک ذاک القول بالعجیب
وکم علی ذاک من شہید
تری [illegible] فی الانہار زرقا صافیا
کانہ [illegible] لاصداف

ترجمہ: اگر ہرات کے پانی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ نیل اور فرات کے پانی کی مانند ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس کی شہادت دینے والے بہت ہیں - اس کا پانی نہروں میں بہتا ہوا اتنا صاف معلوم ہوتا ہے جیسے سیپیوں کے موتی ہوں - اس کا پانی گہرائی میں اگرچہ دو منزلوں کے فاصلہ پر ہو لیکن صفائی کی وجہ سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ دو بالشت کے فاصلہ پر ہے -

نساءہا مثل الظباء النافرہ
ذوات الحاظ مراض ساحرۃ
من کل حور عذبۃ الالفاظ
تقتل من تشاء بالالحاظ
ترنو بطرف ناعس فتاک
یفسد دین الزاہد النساک

والجسم فی رقتہ کالماء
والقلب مثل الصخرۃ الصماء
وقدہا ونہدہا والخد
غصن ورمان طری وورد
والشعر والرضاب والاجفان
صوارم صدامۃ ثعبان

ترجمہ: ہرات کی عورتیں آہوان وحشی ہیں - ان کی چشمہائے بیمار سحر و ساحری میں مشاق ہیں - وہ نازک اندام ہیں - شیریں بیان ہیں نگاہوں سے جس کو چاہتی ہیں قتل کر دیتی ہیں - ان خواب آلود اور قاتل آنکھوں سے دیکھتی ہیں جو زاہد متقی کے دین پر ڈاکہ ڈالتی ہیں ان کا جسم لطافت میں شفاف پانی کی طرح ہے اور قلب سخت پتھر کی طرح - ان کے قد - ابھرے ہوئے سینے اور رخسارے سچکدار شاخیں ترو تازہ انار اور خوشرنگ گلاب ہیں - ان کے بال - ان کا آب دہن اور اُن کی پلکیں شمشیر ہائے برندہ ہیں ـــ شراب اور سانپ ہیں -

غرض کہ اسی عنوان سے پوری مثنوی تمام ہوئی ہے - الفاظ میں عذوبت ہے - بیان میں سلاست ہے - خیالات میں ندرت ہے معنی میں جزالت ہے - تشبیہوں اور استعاروں میں ملاحت ہے کہیں کہیں صنائع معنوی و لفظی بھی ہیں مگر لطف کے ساتھ - چنانچہ آخری دو شعروں میں صنعت لف و نشر مرتب ہیں -

جناب بہائی نے بہت سے قطعات بھی لکھے ہیں جن میں سے بعض میں انھوں نے حسن وجمال کی شوخیاں دکھائی ہیں اور بعض میں دنیائے ناپائدار کے زوال کا راگ سنایا ہے -

ان ہذا الموت یکرہہ
کل من یمشی علی الغبراء
وبعین العقل لو نظروا
لراٰہ الراحۃ الکبریٰ

تمام زمین پر چلنے والے موت سے کراہت کرتے ہیں لیکن اگر عقل کی نگاہوں سے دیکھیں تو موت انھیں عظیم الشان راحت معلوم ہو -

اس میں شک نہیں کہ زندگی سے بددل کرنے والی تعلیم انسان کے مزاج میں قنوطی رجحان پیدا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ حوصلے پژمردہ یا شکستہ ہو جاتے ہیں اور زندگی کی ناؤ بیچ منجدھار میں ڈوب جاتی ہے۔ تاہم اگر موت کو مابعد الطبیعیاتی فلسفی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو موت راحت ہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے انسان تمام دنیوی مخمصوں سے نجات پا جاتا ہے اور اسے "اصل" سے اتصال نصیب ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر افلاطونی مسلک میں اور کیا راحت ہو سکتی ہے؟

الغی یدیہ علی صدری فقلت لہ
بردت حر فؤادی انت موجعہ
فقال لا تعجلن عینای قد رمتا
سہماً فما احببتُ ادری این موضعہ

معشوق نے میرے سینے پر ہاتھ رکھے۔ میں نے اس سے کہا تو نے اس دل کی حرارت کو ٹھنڈا کر دیا جس کو تو درد میں مبتلا کیا کرتا ہے اس نے شوخی سے جواب دیا تعجیل نہ کر۔ میری آنکھوں نے تیر سے تیر مارا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ معلوم کر لوں کہ اس تیر کا مقام کہاں رہا ہے۔"

یا بردہا لی بوصل [illegible]
اذا اروکم [illegible]
باللہ علیک [illegible]
لا اقتلی [illegible]

[illegible] ستارگی [illegible] وصل [illegible] زندگی [illegible] سینے [illegible] تو مجھے [illegible] قدرت [illegible] میرے خون بہانے [illegible] رکھیں۔ [illegible] ہیں ہے۔ [illegible] اشعار [illegible] غزل میں کیسے کیسے لطیف اور شوخ مضامین پیدا کر سکتے تھے علم و ادب کے [illegible] سلف [illegible] جنہوں نے سچی اسلامی ثقافت و شائستگی کے چراغ دنیا کی محفلوں میں جلائے ہیں اور اسلامی تمدن کا نام ہمیشہ روشن رکھا ہے۔

آج دنیائے اسلام میں جاہلیت کے یہ درخشاں نمونے مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

سید تنویر نقوی

راوی کے کنارے

بیٹھا ہوں تری یاد میں راوی کے کنارے
یہ رات یہ بکھرے ہوئے مدہوش نظارے

سانسیں ہیں کہ سینے میں مرے چلتے ہیں آرے
آنسو ہیں کہ پلکوں پہ ہیں ٹھہرے ہوئے پارے

اُف رے ترے ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسم
رقصاں ہیں تصور کی نگاہوں میں نظارے

انجام محبت مجھے معلوم ہے لیکن
جیتا ہوں ترے غم میں امیدوں کے سہارے

روتے ہوئے منہ پھیر کے ہونٹوں کو چبانا
اب تک مجھے سب یاد ہیں انداز تمہارے

لو ختم کئے دیتا ہوں رودادِ محبت
کیوں بھیگ رہے ہیں تری آنکھوں کے کنارے

لطیف انور گورداسپوری

کلامِ انور

نہ مرگِ پروانہ کام آئی، نہ شمعِ محفل کا دل پسیجا
اسے دلیلِ فغاں نہ سمجھو، اگر کہیں سے دھواں اٹھا ہو

شکستِ دل سے بلند تر ہو گیا ہے آوازۂ محبت
خدا کرے اس طرح تغافل کسی کا ہو اور با رہا ہو

نہ کیوں مرے ذوقِ آشیاں کا ہو تذکرہ فصلِ گل سے پہلے
اگر نہ میرا خیال اہلِ چمن کے دل میں کھٹک رہا ہو

نظر سے اوجھل ہوا کنارا کہاں مقدر نے لا کے مارا
خدا کو سونپے گا ناخدا اب کسی کا جی لاکھ ڈوبتا ہو

نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل نہ کوئی رہبر، نہ کوئی رہزن
قدم قدم پر ہزار خدشے، نہ جانے کیا ہے، نہ جانے کیا ہو

نہ پوچھ اس سے مآل اس کا، ابھی ہے ناگفتہ حال اس کا
وہ ایک مجبور زندگانی جو ہنس سکا ہو نہ رو سکا ہو

مجھے گوارا غمِ زمانہ، تو پرسشِ حال کیوں روا ہو
ترے کرم کا نہ آسرا تھا، نہ آسرا ہے، نہ آسرا ہو

مجھے زمانے سے کیا غرض ہے بدل رہا ہو بدل چکا ہو
تمہی تو جب میرا مدعا تھے، تمہی تو اب میرا مدعا ہو

قفس کا کھٹکا نہ دام کا ہو، نہ برق و باراں کا ماجرا ہو
نہ خوفِ صیاد و باغباں ہو، بس ایک آزاد سی فضا ہو

یہاں بھی بجلی، وہاں بھی بجلی، ادھر بھی بجلی، ادھر بھی بجلی
مرے نشیمن کا حال یہ ہے، تو کیا نشیمن کا آسرا ہو

جسے عروجِ جبیں سمجھ لوں، جسے ثباتِ قدم سمجھ لوں
وہ ایک سجدہ، وہ ایک لغزش کبھی روا ہو کہیں روا ہو

ابھی نظامِ حیات میں کچھ خلل سا محسوس کر رہا ہوں
ابھی نہ کیوں مرگِ بیکسی کا خیال تقدیر آزما ہو

میں شکوہ سنجِ وفا نہیں ہوں، میں اپنے دل سے خفا نہیں ہوں
زمانے والوں کو کب پکارا، زمانہ کیوں میرا ہمنوا ہو

ابھی ہے ذوقِ طلب میں خامی، ابھی ہے احساسِ تلخ کامی
ابھی ہوں میں اور لا مقامی، ابھی مقدر کا کیا گلا ہو

نہ میری فطرت بدل سکے گی، نہ تیری حسرت بدل سکے گی
مری خطا کیا کہ بے خطا ہوں ترا نشانہ اگر خطا ہو

نہ کوئی ساغر، نہ کوئی مینا، نہ کوئی مرنا، نہ کوئی جینا
پکاروں پیرِ میکدہ کو، اگر مجھے جرأتِ صدا ہو

مری خموشی سے بدگمانی، مری فغاں سے مزاج برہم
نہ یہ مناسب، نہ وہ مناسب، نہ اس کو چاہو نہ اُس کو چاہو

ہمیں دکھاؤ، ہمیں سناؤ کلامِ انور کے ہم ہیں شیدا
جہانِ شعر و سخن میں ایسا اگر کسی نے کہا سنا ہو

شبلی بی کام

راہبہ

جب ایسٹر نزدیک آئی تو وہ سمجھ گئی کہ مَوْن برت کھولنے کا وقت پہنچا ہے۔ تین ہفتے سے اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تھا۔ خدا نے اسے دنیا سے کچھ کہنے کی توفیق ہی نہ دی تھی۔ وہ اس دوران میں خدا سے دعا کرتی رہی۔ کیونکہ دعا سے اس کا غم غلط ہوتا تھا۔ لیکن اس کا خداوند ایک بے صدا دیکھے اور بے آواز پرندے کی طرح بہت دور ہو کر ننھا سا رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود "مبداء انوار" اور اس کے "نورانی فرزند" کی طرح نو نصرت کے ایام میں اس نے اپنے خداوند کے قدموں کی چاپ سُنی تھی۔ عید الفصح کو پیر کے دن وہ اپنی نشست گاہ سے اٹھی اور آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھ کر پہلی دفعہ زبان کھولتے ہوئے بولی۔

"تو یہ تم ہو۔ مس بیکر؟" اس نے اپنے عکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بال کتنے سنہرے اور خوبصورت ہیں"

وہ عکس کو غور سے دیکھتی رہی اور امید مندانہ نگاہوں سے اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انتظار کرتی رہی کہ شاید کوئی معجزہ ظہور میں آ جائے لیکن اس کے ہونٹوں میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

"اوہ۔ بچاری!" آخر اس نے اپنے عکس سے کہا۔ "پکڑی گئی نا؟" اور اس کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی لیکن ایک کونے میں عیاری کی ایک ہلکی سی سلوٹ بھی پڑی ہوئی تھی۔ اس موقع پر عین ممکن تھا کہ وہ مایوسی کے طوفان میں بہ جاتی۔ اور اس نے غصہ میں آ کر اپنا نقرئی برش اٹھایا بھی تاکہ آئینے کو دے مارے اور اسے ایک ہانپتے ہوئے ستارے میں تبدیل کر کے رکھ دے۔ لیکن غیب کی ایک پُر اسرار سرگوشی نے اسے روک دیا۔

یہ آواز اتنی مدھم تھی کہ ممکن ہے وہ ایک لحظہ کے لئے دھوکا بھی کھا گئی ہو۔ آواز نے کہا۔ "جا اور دنیا کی سیر کر ـــــ" اور بس وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی لیکن جب کچھ اور سنائی نہ دیا تو وہ سمجھ گئی۔

اس نے ہاتھ مُنہ دھوئے اور سنہرے بالوں میں کنگھی کر کے اُن کو کانوں کے اوپر سرکا لیا۔ تاکہ اگر آواز دوبارہ آئے تو سننے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ اس کے بعد اپنے تقدس کے مطابق سفید براق پوشاک پہنی اور آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مس بیکر! واقعی بڑا احسان کیا ہے"۔ اس نے گویا معذرت کے پیرایہ میں شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے پورے خلوص کے ساتھ سفید لمبی آستین والے بازو اوپر اٹھائے۔ اور پیچھے کی طرف جھک کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ گویا وہ مجسم صلیب بن گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ صلیب نما حالت سے ... ہوئی تو شیاطین بھاگ چکے تھے۔ اس نے چوڑے چھجے والا جاپانی کا ایک سفید ٹوپ پہن لیا۔ اور طرّے میں ڈیزی کے سفید پھول اُڑس لئے پھر چھتری ہاتھ میں لی اور یہ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ گیس کا بٹن بند ہے، چابی اس کے تھیلے میں پڑی ہے، اور تمام کھڑکیوں میں چٹخنی لگی ہے، وہ باہر نکلی، لیکن یہ دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا کہ شام ہو چکی ہے، اور سیڑھیوں میں کافی اندھیرا ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے چھ زینوں کو عبور کیا۔ اور سیڑھیوں سے اترتی اُترتی وہ نیچے کھلی دنیا میں پہنچ گئی۔ بازار میں گاڑیوں اور لوگوں کی آمدورفت سے جو شور پیدا ہو رہا تھا وہ اس کے نزدیک آتا گیا۔ دنیا کی آوازیں اس کے قدموں کی چاپ سن کر پرندوں کے غول کی طرح چونک چونک جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس نے سڑک کی پٹڑی پر قدم رکھا تو شور و غوغا کے طوفان نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

لیکن سفید براق لباس میں ایک بھوت کی مانند وہ گرد و پیش سے بے نیاز آگے بڑھتی گئی۔ نہ کسی چیز نے اُسے چھوا، نہ کسی مخلوق کے لمس سے وہ متاثر ہوئی۔ رات بہت سرد تھی۔ اور لوگ گرم لبادوں میں لپٹے ہوئے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کی سانس کہر بن کر اُڑ رہی تھی۔ "دنیا" میں ایک عجیب و غریب خوشبو پھیلی

ہوئی تھی۔ یہ خوشبو بھنے ہوئے گوشت، شراب، سبزی ترکاری، موٹر کاروں کے تیل اور دھوبی خانے کی بھاپ سے مل جل کر پیدا ہو رہی تھی۔ "دنیا" میں شور برپا تھا۔ فرش پر بوٹوں کے گھسٹنے۔ گاڑیوں کے پہیوں کی رگڑ۔ اور ہیومپٹی کے نرسنگھوں کی گونج کی آوازوں میں ایک عجیب زیر و بم پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ڈھولنے والے باجے اور سنگیت گھروں کی موسیقی کے سیلاب میں سے گزرتی گئی۔ لیکن جن آوازوں کو اس کے کان سن رہے تھے اس کے دماغ نے ان میں سے کسی پر دھیان نہ دیا۔ آخر جب وہ ایک جگہ آکر ٹھہر گئی۔ اور اُس نے کان لگائے تو وہ اپنے رہبر کی آواز سن رہی تھی۔

ان لمحات میں وہ نہایت عجز سے دعائیں مانگتی رہی۔ وہ اتنی گستاخ تو نہ تھی کہ ان کے قبول ہونے کی توقع رکھتی۔ لیکن جب اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کے اطمینان و مسرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مکانوں کی "آنکھیں" روشن تھیں۔ اور پچھلے پہر کی تاریکی میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اردگرد بہت سے شریف اور نیک سرشت بوڑھے عینک لگائے بیٹھے ہیں اور پائپ کا کش لگا رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ ایک بازار سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوئی۔ اور نہ جانے اس طرح کتنے گلی کوچوں کی خاک اس نے چھان ماری۔ لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اور ان پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کے اندر کی روشنی بڑھ رہی تھی اس کی آنکھوں کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی اپنا مقدس نور لے کر گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کے مصائب و آلام کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود غالباً وہ اتنی پرہیزگار نہیں تھی۔ کیونکہ اب غیب کی آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ اُسے سننے کے لئے بیقرار تھی۔ آخر آواز کیوں نہیں آتی؟ شاید ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ یا ممکن ہے دو تین گھنٹے گزر چکے ہوں۔ لوگ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے دعا مانگنے کے بعد اپنی آنکھیں کھولیں تو اُسے سڑک کے پار ایک چمکتا ہوا پانی کا حوض دکھائی دیا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ـــ "آواز تو مجھے آتی نہیں۔ لیکن شاید خداوند نے مجھے "خاموش پانیوں" کے پاس پہنچا دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پانی گدلا ہے۔ وہ منہ لٹکائے اور ناک بھوں چڑھائے موٹروں اور تانگوں کے گزر جانے کا انتظار دیکھتی رہی۔ اس کے بعد سڑک کو عبور کر کے وہ دوسری طرف پہنچی۔ اسے پٹری پر ایک سوکھی ہوئی جگہ نظر آئی۔ اس نے رومال نکالا اور جھاڑ پونچھ کر اسی جگہ بیٹھ گئی۔

"آرام تو یہاں بھی نہیں ہے" وہ دانستہ بلند آواز سے بولی۔ "تاکہ لوگ اسے بیوقوف خیال نہ کریں۔" "تاہم گزارا ہو جائے گا۔" اس نے نہایت سلیقہ سے اپنا لبادہ کھینچ کر گھٹنوں پر ڈال لیا۔ اور آہ بھر کر آنکھیں موند لیں۔ لیکن دعاؤں سے وہ اکتا چکی تھی۔ اتنے میں ایک قاصد لڑکا ادھر سے گزرا۔ اور دیر تک اُسے پیچھے مڑ مڑ کر حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک بڑھیا گزری۔ جس کے ساتھ تین چھوٹے بڑے بچے تھے۔ وہ بھی پیچھے مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک نوجوان آیا جس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے جیب سے پائپ نکال کر سلگایا اور راہبہ کو رہگذر میں بیٹھے دیکھ کر تقریباً ٹھٹھکا ہو گیا۔ آخر وہ آگے بڑھا اور ہمدردی کے لہجہ میں بولا۔

"معاف کیجئے محترمہ! ۔ آپ کی نبض دیکھ سکتا ہوں؟ آپ بیمار معلوم ہوتی ہیں۔"

وہ اُسے افسردہ اور ملول لیکن حسین نظر آتی تھی کیونکہ اس کے اپنے چہرے پر صحت و قوت کی سرخیاں دوڑ رہی تھیں۔

"نہیں۔ میں تو یونہی آرام کر رہی تھی۔ آپ کا شکریہ!" راہبہ نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک سرخی مائل زرد مونچھوں والا موٹا سا نجار آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا تھیلا تھا۔ اس نے آتے ہی نوجوان کو کہنی مارتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا ہے یہاں؟ ٹکر تو نہیں ہو گئی؟"

"پتہ نہیں" نوجوان نے جواب دیا۔ "کہتی ہے کہ میں یونہی آرام کر رہی ہوں۔"

کاش وہ پانچ منٹ کے لئے آرام کر سکتی۔ کیا خدا اسے پانچ منٹ کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ سڑک کی پٹری میں سے بیزاری نکل نکل کر اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ اور بازار اس طرح سے سانس لے رہا تھا جیسے کوئی ہیبت ناک طوفان تھم گیا ہو۔ تین لڑکیاں ایک کارخانے سے نکل کر آپس میں خوش گپیاں اڑاتی جا رہی تھیں۔ وہ بھی اس کے پاس آکر ٹھٹھک گئیں اور اسے گھورنے لگیں۔ ان میں سے دو تو راہبہ کے معمہ کو حل نہ کر سکیں۔ اس شخصیت

کو مٹانے کے لئے بار بار ہنسنے لگیں۔ لیکن تیسری جس کا رنگ سانولا تھا اور نرم دل نظر آتی تھی۔ دوزانو ہو کر مس بیکر کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ پوچھنے لگی۔

"بات کچھ بھی نہیں ہے۔" لڑکی سے پہلے خود راہبہ بول اُٹھی۔ "میں تو کسی کا انتظار دیکھ رہی ہوں۔ تم مہربانی کر کے جاؤ۔" اُس نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا۔ لوگ اس کی آواز سُن کر حیران ہو گئے کیونکہ وہ اچھی بھلی عورتوں کی طرح بول رہی تھی۔ انھوں نے اپنے قدم اُٹھائے۔ بے رونق بازار میں ادھر اُدھر دیکھا۔ جیسے کوئی خطرہ درپیش ہو۔ لیکن دُور لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھ کر ان کی جرأت عود کر آئی۔ اور وہ دوبارہ راہبہ کے اردگرد آ کر جمع ہو گئے۔

"تم رہتی کہاں ہو؟" دوزانو لڑکی نے استفسار کیا۔ "چلو میں تمھیں گھر پہنچا آؤں۔"

"کہاں رہتی ہے؟" نجار نے پوچھا۔

"وہ کہتی ہے میں کسی کا انتظار دیکھ رہی ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"ہاں۔ کسی کا۔" مس بیکر نے "کسی" پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ اور تھوڑے سے شرمندہ بھی ہوئے۔

وہ لوگوں کے پاؤں کی طرف دیکھتی رہی۔ اور سوچنے لگی کہ یہ لوگ دوسروں کو پریشان کرنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس لے تماشائیوں کو ایسی نگاہ سے دیکھا کہ وہ توجہ ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ ہجوم اب بہت بڑھ گیا تھا۔ اندر کے حلقے میں نجار' نوجوان' دوزانو لڑکی اور دو تین اور شامل تھے۔ یہ لوگ سب سے زیادہ مضطرب نظر آتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا حلقہ' پھر تیسرا حلقہ تھا تیسرے حلقے کے لوگ ایک عجیب مخمصے میں مبتلا تھے۔ باہر کے لوگ اُن سے آ کر دریافت کرتے کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ دوسرے حلقے کے لوگوں سے پوچھتے۔ لیکن تسلی بخش جواب نہ مل سکتا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

الغرض لوگ گائے بھینسوں کی طرح ایک جگہ جم کر کھڑے تھے۔ ان کے پائپوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ان کی سانس بھاپ بن کر اُڑ رہی تھی۔ مس بیکر نے محسوس کیا کہ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں کیڑے کوڑوں کی طرح اس کے بدن پر رینگ رہی ہیں۔

"کوئی لڑکی ہے!" نجار نے اپنی چھاتی پھلا کر کہا۔

آخر بیرونی حلقے ... دستی کامیابی حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ ۔

"یہ لو پیپہ۔" اخیر میں کھڑے ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

اتنے میں لوگ پولیس مین کو رستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گئے اور جب وہ گزر گیا۔ تو دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے پولیس مین بالکل جوان تھا۔ اس کے رخسار کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ اس کا بھاری بھر کم جسم ہر قدم پر ڈول رہا تھا۔ وہ موٹا تازہ اور مُتین نظر آ رہا تھا۔ لیکن ہجوم دیکھ کر اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"ہٹ جاؤ پیچھے۔" اُس نے بلند آواز سے کہا۔ تاکہ دم لینے کے لئے اسے بھی کافی جگہ مل سکے۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور راہبہ کے سامنے جھک گیا۔

"افسر جی!" وہ بولی۔ "لوگوں سے کہو کہ یہاں سے چلے جائیں۔"

"ہٹ جاؤ پیچھے۔" پولیس مین نے اپنی پریشانی کو چھپانے کے لئے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"اگر تمھیں کچھ نہیں ہوا تو خاتون! یہاں سے چلی جاؤ۔" اس نے ڈھیلے یقین کے ساتھ کہا۔ "تم نے رستہ روک رکھا ہے۔"

"میں نے رستہ نہیں روکا۔" راہبہ نے تیزی سے کہا۔ اور اپنے سفید لمبے دستانے کو کھینچ کر انگلیوں پر کس لیا۔

"رستہ روکنا، یا کوئی ایسی حرکت کرنا جس سے رستہ میں بھیڑ ہو جائے۔" پولیس مین نے گویا قانون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "یا رستہ میں لوگوں کو جمع کرنا۔"

"میں نے رستہ نہیں روکا۔ یہ لوگ رستہ روک رہے ہیں۔" راہبہ نے تحکمانہ وضاحت کے ساتھ کہا۔ "افسر جی! ان سے کہئے کہ یہاں سے چلے جائیں۔"

پولیس مین نے جیسے ... کی بات پر یقین کر لیا۔ اور وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اسے اپنی پشت بوجھل معلوم ہو رہی تھی۔ اور یہی حال اس کی منطق کا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ مجمع کی طرف بڑھا اور اپنے بازو ہلاتے ہوئے بولا۔

"چلو۔ چلو۔ اب یہاں سے جاؤ۔ سنتے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا۔ اور راہبہ بھی جلدی سے اٹھی اور نہایت ہوشیاری اور خاموشی سے مخالف سمت کو چل دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہانپتا ہوا مجمع اُسے اب بھی

گھور رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے اپنے کندھوں کو جھٹکایا تاکہ بدتمیزوں کی نگاہیں اس کی پشت پر سے ہٹ جائیں۔ وہ بیس یا تیس قدم چلی ہوگی کہ مجمع میں سے دو تین آدمی نکل کر اس کے تعاقب میں دوڑنے اور اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ بعض نے ان کی تقلید کی۔ لیکن ڈر کے مارے اس کے آس پاس ہی رہے۔ تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو جائے۔ باقی آدمی اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر تمسخر اڑاتے رہے پولیس مین سڑک کی پٹڑی کے عین درمیان کھڑا رہا۔ اگر اس کے عمود میں تسمہ نہ ہوتا تو شاید اس کا سر جھکا کر نیچے گر پڑتا۔

راہبہ اندھا دھند آگے بڑھتی گئی۔ اسے اب بھی محسوس ہو رہا تھا کہ تماشائیوں کے منہ پھنکارتے ہوئے سانپوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے ان کو مار بھگانے کے لئے اپنی چھتری گھمائی لیکن خونخوار منہ بدستور بھاگے چلے آرہے تھے۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ تاکہ کسی طرح ان کی پہنچ سے بلبلہ ہو جائے۔ کاش! وہ اُن سے چند قدم ہی آگے نکل کر کسی گوشۂ تنہائی میں پہنچ جاتی۔ اور اُسے عبادت کے سیمیں دائرے میں پناہ لینے کا موقع مل جاتا۔ ! کاش وہ چند لمحوں کے لئے ٹھہر کر غیب کی آواز سن سکتی! کاش آواز اسے سنائی دے جاتی!

لیکن اب نادیدہ سانپوں نے اسے آ دبوچا تھا۔ اور وہ اُس کے دماغ میں گھس گئے تھے۔ اور اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات پیدا کر رہے تھے۔ اس نے پوری قوت سے ان کا مقابلہ کیا۔ اور یہی کشمکش تھی جس نے اس کی نس نس میں آتش غضب بھڑکا دی آخر وہ مغلوب ہوگئے اور مس بیکر آزاد ہوگئی۔ "سانپ کے غلاموں" کو "آزاد" پر قابو پانے کا حق ہی کیا تھا۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔ اسے اپنے حق بجانب ہونے کا یقین ہوگیا۔ وہ پٹڑی پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

وہ بیٹھ گئی۔ اور آزادی کا احساس اُس کی روح کے گوشے گوشے پر مسلط ہوگیا۔ سڑک کی پٹڑی پر اسے اتنا ہی حق حاصل تھا جتنا کسی اور کو۔ وہ قانوناً حق بجانب تھی۔ اس کے رخسار پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور مدافعت کی گرمی اس کے ہاتھوں میں، اس کی چھاتی میں اور اس کے حلق میں سرایت کر گئی۔ اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو ذاتی ادعا اور حق طلبی کے محدود دائرے میں مجتمع کر لیا۔ اور اپنی شان اتنی بڑھائی کہ غیب کی آواز کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی۔ اور دنیا کا شور و شغب اس کے کانوں سے ٹکرانے لگا۔ اس نے اپنی سفید ٹوپی پیچھے کی طرف سرکائی۔ سنہرے بال اس کے چہرے پر لہراتے لگے۔ اس نے اپنے ناخن چھتری میں گاڑ دیئے۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔ اس کا جسم کانپنے لگے۔ وہ گناہوں کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اس کے قریب ہی روحانی بیماریوں سے شفا پانے کے لئے کوئی حوض بھی نہیں تھا۔ البتہ ایک بدروبہہ رہی تھی جس کے منہ پر لگی ہوئی سلاخوں میں سے جہنم کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ اور جن کو کفر و الحاد کی انگلیوں نے جکڑ رکھا تھا۔ اسے کوئی چیز تحت الثریٰ کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ آخر جب پولیس مین اس کے پاس دوبارہ پہنچا تو وہ ناقابل بیان شکریے کے بعد جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ تھانے کے دروازے میں داخل بھی ہوگئی۔ لیکن ہجوم آئے بدستور گھورتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت کی کئی نسلیں پیدا ہوئی ہیں اور چیونٹیوں کی طرح آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تھانے میں ایک بنچ پر بیٹھی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کی توجہ دو ہلتے ہوئے اور اس کے قریب آتے ہوئے ہونٹوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ دو ہونٹ اس سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے سامنے ایک آدمی بیٹھا دیکھا۔ جس کے کالر پر نمبر لگا ہوا تھا۔ وہ اپنا سر کھجا رہا تھا اور اپنی تحریر پر نظریں گاڑے دیکھ رہا تھا۔ دو تین دفعہ اس نے ٹیلیفون اٹھا کر باتیں بھی کیں اسے محسوس ہوا کہ تھانے کے لوگ اس سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ جب اس نے اپنا ہینڈ بیگ پیش کیا تو انہوں نے واپس کر دیا۔ لیکن نکھرے ہوئے رخساروں والے پولیس مین نے جو اسے ہمراہ لایا تھا اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی۔ جب اسے اپنا ہینڈ بیگ واپس ملا تو اس نے اسے کھولا اور آئینہ نکال کر اپنا منہ دیکھنے لگی۔

"مس بیکر!" میں تمہاری بیحد ممنون ہوں کہ تم میرے ساتھ چلی آئیں۔" وہ مکارانہ انداز میں ادھر ادھر جھانک کر کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "اگر تم آتیں تو میرا کیا حشر ہوتا؟ مس بیکر تم اور میں تھانے میں؟"

اس نے ہاتھوں سے اپنے بال سنوارے۔ لیکن ابھی وہ اس کام سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ جس آدمی کے کالر پر نمبر تھا اس نے اپنا چشمہ اتارا اور رادیچی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آہستہ

آہستہ مس بیکر کی طرف بڑھا اور اس سے دوبارہ سوال کرنے لگا۔ آخر بڑی مشکل سے اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس کا نام جاننا چاہتا ہے۔ جس طرح وہ غایب کی آواز سنا کرتی تھی اسی طرح اس نے اپنے حلق میں سے ایک اور آواز نکلتی ہوئی سنی۔ "لیجئین" آواز نے جواب دیا اور حیرت زدہ افسر نے اس کی ہجے کرتے ہوئے کہا۔ "ل - ی - ج - ی - ن "

" اور اڈریس کیا ہے ؟"

لیکن آواز گودام کے حلقے نظر آگئے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا البتہ وہ مس بیکر کی روح میں ایک شعلہ کی طرح قہقہے لگاتی رہی۔

تھانے کے لوگ اسے اندر لے گئے اور اسے چائے پلائی۔ اس نے سپاہیوں کو دوبارہ ٹیلیفون پر باتیں کرتے سنا۔ ان کی آوازیں دور اس عمارت پر اُترتی اور جھپٹتی رہیں جہاں گھنٹیوں کی ٹن ٹن ہوتی تھی۔ اس کا ذہن باغوں، پارکوں اور چشموں میں گھومتا رہا۔ اور اس سے اس کے اندر کا شعلہ کسی حد تک فرو ہو گیا۔ اب اسے کمرے میں سکون نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی طبیعت بھی سنبھل رہی تھی۔ اس کے بعد دور ٹیلیفون کرتی ہوئی آوازوں کے درمیان اسے ایک تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جس طرح غیب کی آواز سنتے وقت اسے محسوس ہوتی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی نظریں اُٹھائیں تو اسے کمرے میں ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ مطمئن ہے۔ وہ اس کے قریب ہی ایک بنچ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم موٹاپے کی ایک بڑی سی سکراتی ہوئی گٹھری کی طرح بنچ پر پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بھورے رنگ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور گیس کی روشنی میں ہالے کی طرح چمک رہے تھے۔ لیکن اس کے خدوخال بے ڈھنگے، ظالمانہ اور کثرت مینوشی کے باعث وحشیانہ ہو گئے تھے۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ نیچے کی طرف ڈھلک آئے تھے اس کے سامنے کے دانتوں کے کنارے جھڑ چکے تھے۔ اور نیم خوابیدہ حالت میں وہ سور کی طرح خرخرا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں پلکوں کے پردوں کی اوٹ سے تقریباً اندھی ہو کر جھانک رہی تھیں۔ ایک یا دو دفعہ اس نے کتے کی دُم کی طرح سر ہلایا اور مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑایا بھی۔ لیکن روانے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے دانت نکوسنے کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ اس آدمی کو دیکھ کر مسکرائی۔ اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ لیکن اس کی طرف مائل نہ ہوئی۔ بلکہ اس نے جسمانی ارادے کو حملہ آور ہونے سے باز رکھا۔ گویا صرف نگاہ اسے دیکھ رہی تھی۔ نہ کہ وہ خود ——! اسے مرد خوابیدہ کی حالت پر رحم آ گیا۔ اس کے دل میں محبت اور شفقت کا جذبہ اُمنڈ آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس سوئے ہوئے انسان کے اندر سے غائب کی آواز سنائی دے سکتی ہے۔ جب اس نے یہ عرفان حاصل کر لیا تو وہ اپنے آپ کو، اور ذاتی حقوق کو بھول گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس کے سامنے ایک میخوار سویا پڑا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ "انسان" نہیں خود "خداوند" ہے۔ اب غیب کی آواز اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ دُور ایک اُڑتے ہوئے پرندے کی طرح آواز کو زمین پر اُترتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ آواز قریب آتی گئی۔ حتیٰ کہ دُور ایک بگل کی پاکیزہ گونج کی طرح وہ اس کے جسم میں آکر پیوست ہو گئی۔ اور اس کے خون سے مخاطب ہو کر بولی——

" مجھ سے کلام کرو——"

" اُس 'سے کلام کروں؟ وہ تو خود "اس" کا کلام سنا کرتی تھی۔ اب "وہ" اسے کلام کرنے کو کہہ رہا ہے ؟

وہ بلا تامل اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے مینوش کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن کانپ کر پھر بند ہو گئیں اس نے میخوار کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں اب کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور وہ حیران نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے غلیظ دانت نکوس لیے۔ اور ایک طویل رینگتی ہوئی ہنسی اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔

" یہ پے نیٹل ہے "۔ راہبہ نے کہا: " نام بتانے کی جگہ۔ تمھارا نام کیا ہے ؟" اس نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

وہ حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ سکڑتا سکڑتا تاریک ہو گیا۔ اور چہرے کی جلد پر مسکراہٹ کے کئی بل نمودار ہو گئے۔ اس کے نچلے ہونٹ کے ایک کونے میں نمی کا ایک قطرہ جھلملانے لگا۔

" اپنا نام بتاؤ "۔ اس نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔ اس نے متذبذب ہو کر راہبہ کی طرف دیکھا۔ اور آخر اپنی سوئی ہوئی آواز میں بولا۔ "گڈریا"

راہبہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی گردن کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اس کا حلق سوکھ گیا۔ اس نے میخوار کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بیخود ہو کر بولی۔ "تو پھر میں تمھاری میمنا ہوں "

"کیا کہا؟" میوزار ٹپڑبڑایا۔ اور جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ گویا راہبہ کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر اس کا مطلب پڑھکر وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"بڑی تیز معلوم ہوتی ہو تم جنسیات کے معاملہ میں!" اور یہ کہہ کر اسے پرے دھکیل دیا۔ لیکن وہ کھڑی ہوگئی۔ اور اپنی اندرونی آواز کی فریب کاریوں پر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے اپنے سفید آستین والے کانپتے ہوئے بازو اوپر اٹھائے اور گردن سیدھی کرکے بلند آواز میں بولی۔

"میں نے اپنے خداوند کو پالیا۔ مس بیسکر۔ میری جان مجھے اپنا خدا مل گیا۔"

(وی۔ ایس۔ پرٹ۔ چیٹ)

اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

بہارِ انقلاب

گل فشاں گل فشاں، ارغواں ارغواں، گلستاں گلستاں، شادماں شادماں
دل ستاں دل ستاں، مہرباں مہرباں، نیم جاں نیم جاں، کامراں کامراں
نازنیں نازنیں، یاسمن یاسمن، دل نشیں دل نشیں، نسترن نسترن
لالہ و ارغواں انجمن انجمن، سنبل و نارون کارواں کارواں
بانوئے مہ جبیں ساتگیں ساتگیں، بادۂ آتشیں سحر گیں سحر گیں،
اختلاج و تعب بے نشاں بے نشاں، انبساط و طرب جاوداں جاوداں
ساقیٔ ماہرو مطربِ خوش گلو، سیکش پاک خوغرقِ جام و سبو
محشرِ رنگ و بُو جوشِ نشو و نمو، شرحِ یک آرزو داستاں داستاں
جادۂ ذوق آفریں، ذرّہ ذرّہ حسیں، روح پرور زمیں رشکِ خلدِ بریں،
سیل ناز و ادا کارواں کارواں، خوش نوا خوش نوا ساریاں ساریاں
عقل خلوت گزیں بخت بیدار تر، عشق معشوق بیں حسن عاشق نگر،
بے وفا ہم زباں، پُر جفا ہم عناں، حق نظر دادگر، آسماں آسماں
آپ بحرِ رواں میں کنارہ نشیں، آپ ناز آفریں میں نیاز آفریں
حسن آئینہ گر، عشق صورت نگر، پردۂ ظاہری درمیاں درمیاں
کیا سماں ہر طرف ہے نظیر آج کل کھل گیا یک بیک پھر دل کا کنول
ماہ در آستیں نازنیں نازنیں، نازنیں در بغل نوجواں نوجواں

شہزادی سلطان جہاں بیگم رعنا

رعنائیاں

دیارِ حسن میں شمعیں جلا کے آئی ہوں
ترے حضور جوانی جگا کے آئی ہوں

نظر نظر میں لئے میکدے مری سرکار
قدم قدم پہ محبت لٹا کے آئی ہوں

زبانِ زہد پہ ہے آج بھی مرا چرچا
حریم قدس میں محشر اٹھا کے آئی ہوں

ہزار تجھ سے مخالف ہوا زمانہ مگر
حریم شوق میں دنیا لٹا کے آئی ہوں

وہیں جہاں پہ خدا ہے نہ بندگی کا سوال
وہاں بھی بارہا سجدے لٹا کے آئی ہوں

قمر سے پوچھ ستاروں سے پوچھ لے جا کر
شبِ فراق میں آنسو بہا کے آئی ہوں

حریفِ مہر سمجھنا نہ مجھ کو اے رعنا
میں موتیوں کے خزانے لٹا کے آئی ہوں

عبدالعلیم شیرکوٹی

حادثۂ نظر

محوِ گلگشت نظر آئی کل اک غنچہ دہن
ماہ رخ، شوخ نظر، ہوش ربا، صبر شکن

چشمِ خیرہ کیلئے ایک حسیں خواب تھی وہ
بختِ تیرہ کیلئے اخترِ شب تاب تھی وہ

اُس کی آنکھیں تھیں مچلتے ہوئے سیارے تھے
اُس کے رخسار دہکتے ہوئے انگارے تھے

اُس کی زلفوں میں تھی پوشیدہ سیاہی شب کی
اُس کی پیشانیِ سیمیں پہ دمک کوکب کی

اُس کی ہر بات سے نغمات کا سیلاب رواں
اُس کے ہونٹوں پہ جوانی کا لہو لالہ فشاں

دل نے گو ضبط و تحمل سے بہت کام لیا
جلوۂ شوخ نے دامانِ نظر تھام لیا

آ گیا خرمنِ دل سوزِ دروں کی حد میں
دامنِ ہوش و خرد دستِ جنوں کی زد میں

ایک عرصے ہی گو سامنے وہ سروِ سہی
چشمِ پُر شوق مگر تشنۂ نظارہ رہی

اب فقط نقشِ تصور ہی کہ ہے دل میں نہاں
جس طرح رات کے دامن پہ ستاروں کے نشاں



آپ کو معلوم نہیں کہ آپ ایک خطرناک فیصلہ کر رہے ہیں!
اگر آپ اپنے جلدی روگوں کے لئے
سرجنوں اور جراحوں کے نشتر میں شفا ڈھونڈتے ہیں
سرخ سپید نیلے اور سبز مرہموں میں تسکین ڈھونڈتے ہیں
آپ کو لازم ہے
کہ اپنی اولین فرصت میں مقامی دوا فروش سے
ولروز طلب کریں
کیونکہ ولروز بغیر اپریشن ڈریسنگ اور نہانے
کی ممانعت کے تمام جلدی امراض سے
نجات دلاتی ہے
قیمت
ہر مشہور دوا فروش سے ملتی ہے
۱۹۰۴ء سے استعمال میں ہے
آنریبل ڈاکٹر سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب کے سی ایس آئی۔
ولروز کے متعلق تحریر فرماتے ہیں
میرے بائیں بازو کا پھوڑا ہمیشہ سے مجھ کو دکھ دیتا تھا پچھلے دو سال سے تکلیف دے رہا تھا میں نے اس پر کئی ایک دوائیں برتیں مگر سب بے فائدہ۔ میں ممنون ہوں کہ ولروز کی دو چھوٹی شیشیوں نے اس کو بالکل اچھا کر دیا جس کے لئے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔
(ترجمہ انگریزی)

ممتاز حسین بسمل بی۔اے

اسپین میں اسلامی حکومت کا آغاز و انجام

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں عربوں نے مصر فتح کیا۔ اُس کے بعد عہدِ عثمانی میں شمالی افریقہ پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ جب بنو اُمیہ نے اسلامی خلافت کو شخصی خلافت میں بدلا تو عربی ممالک میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح امیر معاویہؓ اور اُن کے جانشینوں کی غلط روی سے اسلامی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب رُک گیا۔ دشمنوں کے دل قوی ہو گئے اور شمالی افریقہ کے وسیع علاقے دوبارہ خود مختار ہو گئے۔

آخرکار عبدالملک کے زمانہ میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک کر ٹھنڈی ہو گئی اور حکومت کی تمام طاقتوں نے اسلامی قیصریت کو عوام سے منوا لیا۔

عبدالملک نے زہیر بن قیس کو بارقہ کی حکومت سپرد کی مگر وہ دشمنوں کے نرغے میں گھر گیا اور شہادت کی دولت حاصل کی۔ اس کے بعد خلیفہ کے حکم سے حسین بن نعمان چالیس ہزار مجاہدین کے ہمراہ قرطاجنہ گیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یونانیوں اور رومیوں نے لڑائی میں جان لڑا دی مگر اسلامی لشکر فتح یاب ہوا۔ جنگی قیدیوں میں بے شمار حسین نصرانی عورتیں تھیں جن کے حسنِ عالم سوز نے مسلمانوں کو فکرِ فردا سے غافل کر دیا۔ قیصرِ روم نے سسلی اور سپین کے بادشاہوں کی مدد سے قرطاجنہ پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ قرطاجنہ پر چڑھائی کی اور ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی شکست کے بعد مقامی باشندوں نے ایک پُراسرار عورت کی سرکردگی میں اسلامی لشکر کا زبردست مقابلہ کیا اور حسین بن نعمان مجبور ہو کر مصر کی طرف لوٹ آیا۔ دمشق سے کمک حاصل کرنے کے بعد دوبارہ شمالی افریقہ پر حملہ آور ہوا اور دشمنوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بزورِ شمشیر کچل ڈالا۔ حسین کی وفات کے بعد عبدالعزیز بن مروان والیٔ مصر نے موسیٰ بن نصیر کو شمالی افریقہ کی حکومت عطا کی۔ موسیٰ نے تونس اور الجیریا کو فتح کیا، پھر مجاہدینِ اسلام آگے بڑھ کر کوہستانِ اطلس تک جا پہنچے۔ وہاں ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں موسیٰ کے بیٹے مروان کی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مراکش کو فتح کرنے کے بعد اسلامی لشکر دشمنوں کو مارتا ہٹاتا بحرِ اوقیانوس تک جا پہنچا۔ ساحل پر پہنچ کر موسیٰ نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا گویا زمین اپنی وسعت کے باوجود مسلمانوں کی ترکتازیوں کیلئے تنگ ہو چکی تھی۔ حضرت اقبال نے اس واقعہ کے متعلق فرمایا ہے ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

شمالی افریقہ پر تسلط قائم کرنے کے بعد موسیٰ نے بحیرۂ روم کے جزائر کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن جہازوں کا اسلامی بیڑہ تباہ ہوا اور بحیرۂ روم کے بیشتر جزائر [illegible] سسلی پہنچا۔ ایک آدھ لڑائی ہوئی اور سسلی کا جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کارسیکا اور سارڈینیا کے جزائر پر بھی اسلام پرچم لہرانے لگا۔

[illegible] کے بعد اسلامی لشکر نے [illegible] کے علاقہ پر حملہ کیا۔ یہ شاداب اور بارآور علاقہ سپین کے بادشاہ روڈرک کے ماتحت تھا اور کونٹ جولین اس کی جانب سے وہاں کا حکمران تھا۔ طارق بن زیاد نے موسیٰ کے حکم سے کونٹ جولین کو قلعہ میں گھیر لیا۔ محاصرہ کئی مہینے جاری رہا مگر محصورین کے دم خم میں فرق نہ آیا۔ ایک روز کونٹ جولین اچانک بلا اطلاع اسلامی لشکر میں چلا آیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ معلوم ہوا کہ کونٹ مذکور کے اہل و عیال سپین میں تھے۔ ان ایام میں روڈرک تاجدارِ سپین نے کونٹ جولین کی مہ پارہ لڑکی فلورنڈا کو دیکھ پایا اور اس کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ بادشاہ پر ہوس کا بھوت سوار تھا۔ اختیاراتِ شاہی حاصل تھے۔ اس لیے نتائج سے بے خبر ہو کر اس نے فلورنڈا کو خراب کیا۔ جب بلند ہمت اور غیور کونٹ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ مسلمانوں سے مل گیا اور موسیٰ سے امداد کا طالب ہوا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خلیفہ ولید کی اجازت حاصل کرنے کے بعد طارق بن زیاد موسیٰ کے حکم سے پندرہ ہزار مجاہدین کے ہمراہ سپین کی بندرگاہ طارتھا میں لنگر انداز ہوا اور اپنے جہازوں کو نذرِ آتش کر دیا تاکہ مجاہدین ناکام لوٹنے کے تصور سے ناآشنا رہیں۔ شہر میں کافی فوج تھی اور سپین کے بہادر سپاہی اپنے تاجدار کے وقار کی خاطر جان سے ہاتھ دھو کر میدان میں اُترے۔ شہر کے نزدیک خونریز معرکہ ہوا چونکہ عیسائی چاروں طرف سے اُمنڈے چلے آتے تھے اس لیے مسلمانوں کو شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ مجاہدین نے سروں سے کفن باندھ لیے۔

تلواریں نکالے میان توڑ کر پھینک دیئے اور سخت معرکہ آرائی کے بعد فتح حاصل کی، بعد میں طارق مع دیگر کمک کے انتظار میں ایک پہاڑ کے دامن میں خیمہ زن ہوا جسے آج تک اُس کے نام پر جبل الطارق (جبرالٹر) کہتے ہیں۔

جب افریقہ سے مدد آگئی تو سپین کی راجدھانی طالیطلہ کی طرف پیشقدمی شروع کر دی زیریں کے میدان میں روڈرک نے مقابلہ کیا۔ شاہ سپین سونے کی ایک خوبصورت پالکی میں بیٹھا ہوا تھا جو ہاتھی دانت کی گاڑی پر رکھی ہوئی تھی۔ لڑائی شروع کرنے سے پہلے شاہ سپین نے اپنی فوج کو جوش دلانے کیلئے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں اُس نے اُنہیں بتایا کہ جاہل اور وحشی عرب اُنہیں غلام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کی عزت خطرہ میں ہے اس لئے جان پر کھیل جاؤ اور عربوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلاؤ۔

سپین کا لشکر تعداد میں ریت کے ذروں اور آسمان کے تاروں سے زیادہ تھا وہ سب کے سب مہیب نعرے لگاتے ہوئے عربوں پر ٹوٹ پڑے مجاہدین نے سینہ سپر ہو کر اس سیلاب کو روکا، سارا دن پیاسی زمین پر خون کا چھڑکاؤ ہوتا رہا۔ دونوں جانب سے ہزاروں بہادر میدان جنگ کے رنگین بستر پر ابدی نیند سو گئے مگر لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو طارق نے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر کا ایک چکر کاٹا اور پھر اپنے ساتھیوں کے روبرو ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ اُس زندۂ جاوید مجاہد نے کہا:۔

"ہم ایک ایسی سرزمین میں کھڑے ہیں جس میں ہم مسافرانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ شجاعانِ اسلام کیا تم بدر و حنین کے واقعات بھول گئے۔ کیا تم فاتحِ عالم نہیں ہو؟ کیا روم اور ایران کی عظیم الشان سلطنتوں نے تمہارے قدموں پر دم نہیں توڑا؟ تم وہ ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اے بہادرانِ اسلام تمہارے عقب میں سمندر کی خوفناک لہریں ہیں، میں جانتا ہوں آگے بڑھنے میں خطرہ ہے مگر پیچھے قدم ہٹانا گویا کافر ہو کر موت مرنا ہے۔ پس اے مجاہدینِ اسلام آگے بڑھو تمہاری تلواریں تیز ہیں، تمہارے برچھے دشمنوں کا لہو پینے کے لئے بیتاب ہیں۔ آگے بڑھو اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ و مددگار ہو۔"

یہ کہہ کر طارق نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سپین کے لشکر پر بجلی کی مانند گرا۔ یہ دیکھ کر عربوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور موت و حیات کے امتیاز سے بے خبر ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، تھوڑی دیر کے بعد میدان صاف تھا اس ایک لڑائی نے سپین کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ روڈرک طارق کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور مسلمانوں نے آگے بڑھ کر سپین کی راجدھانی پر قبضہ کر لیا۔

موسیٰ کے بعد اس کا بیٹا عبدالعزیز [illegible] دو سال بعد ایک عرب کے ہاتھوں مارا گیا بعد میں عبدالرحمٰن غافقی والی بنا۔ اس کے عہد میں اسلامی فتوحات کا سیلاب پیرینیز کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ شمالی اور جنوبی اطالیہ اور کوہستانِ سوئٹزرلینڈ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد عربوں کی پرانی رقابتیں جاگ اٹھیں آپس میں لڑائی چھڑ گئی جس کی وجہ سے فرانس اور اطالیہ کے علاقے اُن کے قبضہ سے نکل گئے۔

بنو امیہ کے زوال کے بعد عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک عباسیوں سے بچ کر سپین پہنچا اور وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی، اس طرح سپین مرکزِ اسلامی کے تسلط سے آزاد ہو گیا اور وہاں کی حکومت کو پھولنے پھلنے کا خاطر خواہ موقع ملا۔

ابو عبداللہ سپین میں آخری مسلمان حکمران تھا وہ اپنے باپ ابوالحسن کے تخت سے علیحدہ ہونے پر تخت نشین ہوا۔ ابو عبداللہ کا حقیقی چچا الزاجل بڑا بہادر اور لائق تھا اُسکی شجاعت اور ہر دلعزیزی ابو عبداللہ کو ناگوار گزری اس لئے اُس نے اپنے غیور شجاع اور مدبر چچا کو ٹھکانے لگانے کے لئے دشمنوں سے مدد مانگی سپین کے مسلمان محبتِ الٰہی، عشقِ رسول کو بھلا کر حُسنِ نسوانی کے بندھن میں گرفتار تھے۔ ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اندر سے کھوکھلے تھے اور اُن کی عیش پسندی، غفلت اور خانہ جنگی کی وجہ سے سپین کے بیشتر حصوں پر عیسائیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، ابو عبداللہ کے عہد میں علاقہ کیسٹل کا حکمران فرڈیننڈ تھا اور ریاست اراگون کی ملکہ ازبلا تھی، اُن دونوں کی باہمی شادی نے فرڈیننڈ کو سپین کے عیسائی حکمرانوں میں سب سے طاقتور بنا دیا ۱۴۸۲ء میں فرڈیننڈ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی۔ الزاجل شیر کی طرح انگڑائی لیکر اٹھا اور اُس کے مقابلہ میں ڈٹ گیا ابو عبداللہ غرناطہ کا حکمران تھا۔ الزاجل اسکی حکومت کو دشمن کے چنگل سے بچانے کیلئے سینہ سپر تھا مگر ابو عبداللہ فتح کا خواہاں نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ الزاجل شکست کھا کر ذلیل ہو اس لئے دلاور الزاجل اپنی غیر معمولی شجاعت کے باوجود کامیابی حاصل نہ کر سکا اور فرڈیننڈ نے سلطنتِ غرناطہ کا مغربی حصہ فتح کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد فرڈیننڈ نے ملاغہ کی سرحدی قلعہ بندیوں اور فوجی چوکیوں پر حملہ بول دیا، اس ناگہانی یلغار کی وجہ سے غرناطہ کے باشندے گھبرا گئے کیونکہ ملاغہ کی تسخیر کے بعد غرناطہ کی فتح بالکل آسان تھی۔ الزاجل اور اس کے بہادر ساتھیوں کی تلواریں میانوں میں تڑپنے لگیں اور وہ سب دیوانہ وار دشمن کے مقابلہ میں جا ڈٹے۔ فرڈیننڈ بڑا چالاک تھا اس کے علاوہ

اس کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔ دوسری جانب ابوعبداللہ مسلمانوں کو شکست دلانے پر تلا ہوا تھا اس لئے الزاجل دشمن کی پیشقدمی کو روک نہ سکا۔ اس کی ناکامی کو ابوعبداللہ نے بہانہ بنایا اور شہر کے دروازے اس پر بند کر دیئے گئے۔ الزاجل مایوس ہو کر گاڈکس چلا گیا اور وہاں اپنی آزاد و خود مختار حکومت قائم کر لی۔ فرڈیننڈ نے سرحدی چوکیوں کو تباہ کر کے ملاغہ کو گھیر لیا اور سینکڑوں توپوں نے یکبارگی ملاغہ میں آتشیں گولے پھینکنے شروع کئے تمام فضا دھواں دھار ہو گئی اور اندھیرے کی آڑ میں عیسائی سیڑھیاں لگا کر شہر پناہ پر چڑھ گئے مگر محافظ دستہ نے مل کر انہیں پسپا کر دیا۔ اس کے بعد محاصرین نے بارود کی سرنگیں بچھا کر ملاغہ کی ایک دیوار اُڑا دی مگر اس کے باوجود مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری۔ الزاجل نے جب یہ کیفیت سُنی تو گاڈکس سے ایک لشکرِ جرار لیکر فرڈیننڈ سے لڑنے آیا مگر ابوعبداللہ نے اُسے رستہ میں گھیر لیا۔ الزاجل نے مجبور ہو کر تلواریں میان سے کھینچ لیں مگر تاجدارِ غرناطہ کے مقابلہ میں اس کی طاقت کم تھی اس لئے شکست کھائی جب یہ خبر ملاغہ میں پہنچی تو مسلمان سناٹے میں آ گئے اور مجبور ہو کر فرڈیننڈ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس نے ملاغہ کے تمام باشندوں کو غلام بنا لیا اور ان کا تمام سامان سرکاری ملک قرار پایا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے اپنے گھروں کا اثاثہ سروں پر اٹھائیں اور ملاغہ سے کسٹیل تک لے جائیں۔ مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک جانب دشمن کی سنگینیں ان کا لہو پینے کے لئے بیتاب تھیں اور دوسری جانب اپنے پیارے وطن سے جدائی، آزادی اور حکمرانی کے عوض غلامی اور محکومی کی ذلت کی وجہ سے دل چاک چاک کئے لبوں پہ آہیں تھیں۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے مگر مجبور تھے، زمین پر لوٹتے تھے سینہ کوٹتے تھے اور کہتے تھے "اے ملاغہ مضبوط ملاغہ تیری مضبوطی کہاں گئی تیری مضبوط فصیلیں، تیرے عالیشان برج تیری اولاد کی حفاظت کے کیا کام آئے۔ اے خوبصورت ملاغہ کیا تجھے ہم نے اسی دن کے لئے آراستہ پیراستہ کیا تھا کہ اس طرح یاس و حسرت سے دشمن کے حوالہ کر دیں" اس شکست کے بعد پندرہ ہزار مسلمان غلام بنا لئے گئے اور انسانی زندگی بھیڑ بکریوں سے بدتر ہو گئی۔ ملاغہ پر دشمن نے قبضہ کر لیا مگر ابوعبداللہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے فرڈیننڈ کو لکھا کہ اس عیسائی الزاجل کو شکست دیکر اس کے ملک پر قبضہ کر لیں تو میں غرناطہ کا شہر بخوشی دے دوں گا۔

مسلمانوں کی خانہ جنگی فرڈیننڈ کے لئے کامیابی کی فال تھی اس نے فوراً گاڈکس پر چڑھائی کر دی مگر دلاور الزاجل نے اُسے شکست فاش دی۔ اگلے سال فرڈیننڈ نے اپنے تمام حلیفوں سے مدد مانگی اور بدلہ لینے کے لئے بیشمار لشکر لے کر اس پر چڑھ آیا۔ الزاجل نے متعدد بار مقابلہ کیا، خوب دادِ شجاعت دی۔ بیس ہزار مسلمان تلوار کی دھار پر چل کر سرخروئی سے آقا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آخر الزاجل دشمن کی یلغار کو روک نہ سکا اور سپین چھوڑ کر مراکش چلا گیا۔ سلطان مراکش نے ابوعبداللہ کے اشارے سے اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس بہادر مجاہد کی زندگی کے آخری ایام بڑے تلخ تھے اُسکی پھٹی پرانی عبا پر لکھا تھا۔

"میں سپین کا بدنصیب بادشاہ ہوں مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔"

جب ابوعبداللہ کو الزاجل کی شکست کا حال معلوم ہوا تو خوشی سے اُس کا چہرہ کھل گیا اور وہ درباریوں سے کہنے لگا۔

"آج سے مجھے بدبخت نہ کہنا۔ میں خوش نصیب ہوں، میرا دشمن جلا وطن ہو گیا۔"

کچھ عرصہ کے بعد فرڈیننڈ نے حسبِ وعدہ غرناطہ کا مطالبہ کیا۔ یہ پیغام سُن کر ابوعبداللہ کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اس میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی سکت کہاں تھی مگر شہر کے لوگ مرنے مارنے کیلئے تیار ہو گئے انہوں نے ایک شیر دل آدمی موسیٰ نامی کو اپنا سالار مقرر کیا، دوسرے کفن باندھ کر میدان میں اُتر آئے۔ فرڈیننڈ کے ہمراہ پچیس ہزار سپاہی تھے مگر موسیٰ کی جانبازیوں نے مسلمانوں کی لاج رکھ لی اور عیسائی لشکر کو شکست ہوئی، مگر فرڈیننڈ دبنے والی اسامی نہیں تھا وہ ۱۴۹۱ء میں پچاس ہزار سپاہی لیکر غرناطہ پر چڑھ آیا۔ ابوعبداللہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ تھا مگر موسیٰ نے اُسے شرمندہ کیا اور کہا۔

"جب تک ہماری رگوں میں عربی خون موجزن ہے ہم ہتھیار نہیں رکھیں گے۔"

غرناطہ میں طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی۔ شہر کے تمام جنگ آزما نوجوان موسیٰ کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور مردانہ وار حملہ کر کے فرڈیننڈ کے لشکر کے ایک بڑے حصہ کو تباہ کر دیا۔ آخر دشمن نے شدت سے شہر کا محاصرہ کر لیا جس سے غلہ ختم ہو گیا اور فاقہ کشی تک نوبت پہنچی۔

آخر کار ابوعبداللہ نے ہتھیار ڈالنے کی کوشش کی مگر موسیٰ نے غلام بننا گوارا نہ کیا وہ پورے ہتھیار سج کر شہر سے باہر نکل گیا۔ وہاں ہزاروں دشمنوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا مگر وہ سب سے برابر مقابلہ کرتا رہا اور سینکڑوں کو مار گرایا۔ جب خون زیادہ بہ جانے سے کھڑا رہنا ممکن نہ رہا تو وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر لڑتا رہا۔ اس طرح لڑتا بھڑتا دریائے شنگیس تک جا پہنچا اور اس میں جا گرا۔ پانی میں

ایک گونج پیدا ہوئی اندھیں کا نامور فرزند لہروں میں روپوش ہو گیا۔

اس کے بعد ابو عبداللہ نے صُلح کی درخواست کی۔ شہر کے دروازے کھول دیئے گئے۔ عیسائی لشکر طوفان کی طرح دندناتا ہوا غرناطہ میں گھس آیا اور الحمرا پر صلیب کا جھنڈا گاڑ دیا۔ مسلمان خون کے آنسو بہا رہے تھے اور عیسائیوں کا باجا قومی گیت گا رہا تھا۔ جب فرڈیننڈ کی سواری آئی تو ابو عبداللہ نے ہاتھ بڑھا کر غرناطہ کی کنجیاں اس کے حوالہ کیں اور اس طرح آٹھ سو برس کی اسلامی حکومت ایک آخری ہچکی لے کر ختم ہو گئی۔ ابو عبداللہ شہر سے نکل کر کوہستان کی طرف چلا گیا اور وہاں ایک پہاڑی پر بیٹھ کر غرناطہ پر حسرت کی نظر ڈالی۔ اس کے اونچے اونچے محلات، بے مثال الحمرا، پرشکوہ مساجد اور جنت نما باغات دیکھ کر دل بھر آیا اور زار زار رونے لگا۔ اس کی ماں نے ڈانٹا اور کہا۔

"جس شہر کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکے اب اس پر عورتوں کی طرح کیوں روتے ہو"۔

ابو عبداللہ سپین سے مراکش چلا گیا اور اس نے اپنی زندگی کے بقایا ایام گلیوں میں بھیک مانگ کر گزارے۔ غرناطہ کی فتح کے بعد سپین میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ لاکھوں کو پکڑ کر جبراً عیسائی بنایا گیا۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اسلام کی یاد تازہ ہو۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ عربی زبان کو بھلا دیں سپین کی زبان سیکھیں اور بولیں۔ بیچاروں کو باپ دادا کی پوشاک پہننے سے روک دیا۔ عورتوں کے نقاب اُتار دیئے گئے۔ حماموں میں نہانا بند کر دیا گیا اور اگر کسی بدبخت نے کوئی حکم ماننے سے انکار کیا تو اس کی معمولی سزا یہ تھی کہ اُسے آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔

۱۵۶۸ء میں مسلمانوں نے تنگ آ کر بغاوت کر دی اور ۱۵۷۱ء تک بے سروسامانی کے باوجود برابر سرفروشی اور جانبازی میں مصروف رہے۔

۱۵۸۸ء میں سپین کا مشہور بحری بیڑہ آرمیڈا جو انگلستان پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا تباہ و برباد ہو گیا۔ پادریوں نے فلپ کو لکھا کہ ہماری ناکامی کی وجہ بدعقیدہ عیسائی (عرب) ہیں۔ جبتک ان کا وجود باقی رہیگا ہم اپنے مقاصد خاطر خواہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

آخر ۱۶۱۰ء میں فلپ سوم کے حکم سے دس لاکھ عرب زور جنگلی جانوروں کی طرح ہلاک کئے گئے، لوٹے گئے۔ جہازوں میں بھر کر سمندر میں غرق کئے گئے۔ اس کے بعد پادریوں کو چین آیا۔ کیونکہ اب کوہستانِ پیریز سے لیکر جبل الطارق تک کوئی بدعقیدہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اختر رضوانی

طوفانِ جذبات

بہار آئی نغمہ فشانی کریں گے
گھٹاؤں کو نذرِ جوانی کریں گے

نہ آیا جنہیں احترامِ محبت
وہ کیا احترامِ جوانی کریں گے

مرا تذکرہ سُن کے پیرانِ زاہد
جوانی، جوانی، جوانی کریں گے

نہیں ہوں گا لیکن مرا نقش بن کر
یہ ذرے مری ترجمانی کریں گے

رہے بعد میرے لئے دوست دشمن — لہو روئیں گے نوحہ خوانی کریں گے

نہیں جن کو مہلت غمِ آرزو سے
کہاں ماتمِ زندگانی کریں گے

مسرت کے دُھندلے سے خوابوں کو اختر
فدائے غمِ جاودانی کریں گے

نورالحسن ڈار

ایک لمحۂ تنہائی!

میں حسب معمول تنہا تھا۔ مگر آج کی تنہائی میں ایک پراسرار گہرائی تھی۔ جو مجھے اپنے آپ سے بے خبر کر رہی تھی۔ جس کھڑکی کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا، اس کے ارد گرد شام کا دھواں جم رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے یہ دھواں ایک ملائم اور لطیف دھند لکے کی صورت باغ کے افسردہ پھولوں پر چھا رہا تھا، مگر اب اس کی شفافت ہر پل تاریک اور بوجھل ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ دھواں میری طرف بڑھنے لگا! اور آخر کار میرے گرد تاریکی کے ایک وسیع ... کی طرح جم گیا۔ کچھ دیر تک میں اس میں دھوئیں کی ایک لطیف لہر کی طرح معلق رہا۔ پھر یکایک تاریکی کے اس بیکراں پھیلاؤ میں ہلچل پیدا ہوئی، اور کچھ چیزیں ایک دوسرے سے کھنچی ہوئی میری طرف بڑھیں، ایک لمحے کے لئے گہرے اندھیرے میں شفاف ... کی طرح چمکیں، اور پھر وہی تاریکی چھا گئی۔

تنہائی کے عالم میں کبھی کبھی میں اپنے آپ کو ... کے بہاؤ پر چھوڑ دیا کرتا ہوں، اس وقت میں نے ... سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے کیا محسوس کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ صرف یہ سوچتا ہوں کہ مجھے کیا محسوس ہو رہا ہے، میرا شعور اس وقت اس حد تک بیدار ہوتا ہے کہ میرے محسوسات پر نگاہ رکھے۔ تنہائی کا وہ لمحہ بھی ... کیفیت کا ایک حصہ تھا، مگر اس ایک لمحہ میں خود اتنی بھرپور کیفیت موجود تھی کہ کچھ دیر تک میں یہ اندازہ کرنے میں ناکام رہا کہ میرے دل پر کون سا جذبہ طاری ہے۔ دراصل اس لمحہ جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ میرے ہی چند محسوسات کی سنگینی تھی، کبھی میں نے انھیں بڑی شدت سے محسوس کیا ہوگا۔ اور ان احساسات کی وجہ سے جذبوں نے مجھے اپنے جھولے میں جھلایا ہوگا۔ مگر اس ایک لمحے میں مختلف محسوسات بیک وقت مجھ پر طاری ہوگئے اور انھوں نے مجھ پر ایسا اثر چھوڑا کہ جسے میں کوشش کے باوجود کسی ایک جذبے سے متعلق نہ کر سکا۔ یہ محسوسات سنگین، میں نے ان کی پتھریلی سلوٹوں کو محسوس کیا۔ مگر یہ احساس منفرد نہیں تھا، کیونکہ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ان پتھریلی سلوٹوں میں ابدیت نہیں، یہ ہمیشہ اس طرح نہیں رہ سکیں، کبھی نہ کبھی ان میں ایسی لچک پیدا ہوگی جو ان کی ماہیت اور قیمت کو بدل دے گی'۔ یہ محسوسات ایک لمحہ کے لئے اس قدر شدید ہو گئے تھے کہ مجھے تاریکی میں ان کا وجود تک نظر آ گیا۔ اس وقت میں خود ایک ایسے بے حس وجود کی طرح تھا جس کی رگوں میں کانپتی ہوئی خفیف سے خفیف تھرکن بھی جامد ہو گئی ہو، صرف میری آنکھیں زندہ تھیں اور میری آنکھوں اور میرے منجمد محسوسات کے درمیان کچھ نہ حائل ہونے کے باوجود بہت کچھ حائل تھا۔ میرے سامنے تاریکی کے پردے پر کچھ چاندنی کی طرح شفاف مجسمے ایک خاص ترتیب کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان مجسموں کے درمیان موسیقی ملائم دھوئیں کی طرح بل کھاتی ہوئی اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ جہاں سے یہ دھواں شروع ہوتا تھا۔ اس کے نیچے ایک شعلہ سلگ رہا تھا، اور جہاں پہنچ کر دھواں تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ وہاں دو پتھرائی ہوئی آنکھیں مجسموں کو گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں سے ملتی جلتی تھیں۔ شاید یہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے نظارے کو دیکھ کر پتھرا گئی تھیں یا سنگین مجسموں کے نظارے کے لئے ایسی ہی سنگین نگاہوں کی ضرورت تھی، بہرحال ان میں وہ چمک نہیں تھی جو میری آنکھوں میں موجود ہے۔ مجسموں کی اس قطار میں پہلا مجسمہ نامکمل تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے اور چہرہ اس قدر خوفناک تھا کہ نگاہ کے ساتھ ہی جسم میں ایک خوفناک تھرتھری پیدا ہو جاتی تھی اس مجسمے پر بڑے عیب اور گہرے نشان کھنچے ہوئے تھے۔ کچھ نشان دھندلے بھی پڑ چکے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں مختلف ہاتھوں نے بنایا ہے اور ہر نئے ہاتھ کی یہی کوشش رہی ہے کہ پہلا نشان مٹا کر اس سے کہیں زیادہ گہرا اور بھیانک نشان بنایا جائے۔ ان کوششوں نے مجسمے کی صورت مسخ کر دی تھی۔ اس مجسمے کے آگے موسیقی کا دھواں چکراتا ہوا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔

یہ چکر بے ترتیب تھے۔ اور ان کے حلقوں میں ایک سیمابی کیفیت موجود تھی جو ان کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی چلی جاتی تھی۔ تاریکی اور دھوئیں کے پراسرار اور مہیب حلقے، اور ان حلقوں میں ایسے گیت تھرتھرا رہے تھے جو پوجا کے وقت مندروں میں بلند ہوتے ہیں، کبھی کبھی ان میں ایک بلند اور ڈوبتی ہوئی اور ابھرتی صدا سنائی دیتی ـــ پھر مہیب آوازیں، اور پھر رقص و سرود اور جھنکے ـــ جو دھوئیں کی ابھرتی، سمٹتی، پھیلتی اور بپھرتی ہوئی لہروں کو زیادہ بیقرار کرتے چلے جا رہے تھے، جہاں یہ دھواں ختم ہوتا تھا اس کے ساتھ ہی ایک عورت کے مجسمے کے ہاتھ تاریکی میں ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے، ان ہاتھوں میں ایک بچے کا مجسمہ تھا، جو اپنی بے نور آنکھوں سے پہلے نامکمل مجسمے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں مجسموں کے انداز اس قدر عجیب تھے کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ عورت بچے کو نامکمل مجسمے کی طرف بڑھا رہی ہے یا اس مجسمے نے بچے کو عورت کے ہاتھوں میں دیا ہے۔ مگر نامکمل مجسمے کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے اور عورت کے اعضا درست تھے۔ اس مجسمے کے قریب موسیقی کا دھواں لرزاں تھا اور اس میں ایسی آوازیں کانپ رہی تھیں جن میں فریادوں اور نوحوں کا شور ملا ہوا تھا۔ اس کے آگے تاریکی پتھرا گئی تھی۔ مہیب چٹانوں کی طرح منجمد ہو گئی تھی۔ اور سب سے اونچی چٹان پر ایک صحت مند مرد کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی سلوٹوں میں شباب کی بھرپور کیفیت جھلک رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ کسی شے کو چھونے کے لئے آگے کو پھیلے ہوئے تھے۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی انجانی طاقت نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا ہے۔ اس کے بازوؤں کے ابھار میں آگے کو بڑھنے اور آگے نہ بڑھ سکنے کی کشمکش کے اثرات نمایاں تھے۔ تاریکی کی چٹانوں کے پیچ و خم میں موسیقی کا دھواں سر ٹکرا رہا تھا۔ اور اس کی سرمئی دھاریاں پھیلتی ہوئی کبھی کبھی اتنی بلند ہو جاتی تھیں کہ مجسمے کی آنکھوں میں جمے ہوئے آنسوؤں کو چھو لیتی تھیں ان میں دردناک ساز بلند ہو رہے تھے۔ جیسے کسی ایسے پر نوحہ کناں ہوں۔ اس مجسمے کے آگے کچھ نہیں تھا۔ فقط تاریکی کی کیچڑ تھی۔ جس میں ایک سنگ مرمر کا رتھ پڑا ہوا تھا۔ اس رتھ کے پہیئے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تاریکی کی کیچڑ سے موسیقی کا دھواں ابھر رہا تھا۔ اور رتھ کے ارد گرد منڈلا رہا تھا، کبھی کبھی یہ دھواں ایک ایسے انداز سے کانپ کانپ کر اوپر کو اٹھتا کہ رتھ ہلنے لگتا ہوں سے غائب ہو جاتا، مگر پھر اچانک اس کے ٹوٹے ہوئے پہیئے کیچڑ میں ابھر آتے، یہ مجسمے تنہائی کی ایک لمحے کی پیداوار تھے، یہ میرے محسوسات کی ٹھوس شکلیں تھیں، جو تاریکی کے پردے سے چمک کر پھر اندھیرے میں ڈوب گئیں، مگر ڈوبنے سے پیشتر ان میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ جب وہ مجسمے تاریکی میں تحلیل ہو رہے تھے تو یکایک موسیقی کا دھواں زیادہ گہرا ہو گیا اور اس کی انتہا گہرائی سے ایک خوفناک قہقہہ ابھرا اور اتنی شدت سے گونجا کہ تاریکی کی چٹانیں تک پگھل گئیں۔ یہ ایک عجیب قہقہہ تھا، مجھے اس میں بیک وقت طنز، غرور اور نفرت کی کیفیت محسوس ہوئی۔ جب یہ قہقہہ بھی اندھیرے میں گھل رہا تھا تو مجھے وہ پتھرائی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں، مگر اب ان میں سنگینی کی بجائے زندگی کی چمک تھی، وہی چمک جسے میں اپنی آنکھوں میں ہمیشہ محسوس کیا کرتا ہوں اور ان چمکتی ہوئی آنکھوں کے پیچھے وہ سلگتا ہوا شعر جل اٹھا۔

WE ARE THE MUSIC MAKERS
WE ARE THE DREAMERS OF DREAMS.

ہم نغمہ ساز ہیں ـــ ہم بہترین خواب دیکھنے والے ہیں۔

وہ دردناک موسیقی جو میرے پتھرائے ہوئے محسوسات کے درمیان گونج رہی تھی، اور وہ پتھرائے ہوئے محسوسات! وہ نامکمل مجسمہ، بچے والی عورت، چٹان پر منجمد مرد، اور کیچڑ میں دھنسا ہوا سنگ مرمر کا رتھ ـــ یہ سب کہاں سے آئے۔ اور کدھر کو چلے گئے۔ ان میں خواب کی سی نرمی اور حقیقت کی سی سختی موجود تھی۔ یہ نرمی اور سختی میری روح میں گھل مل رہی تھی۔ اور وہ پراسرار گہرائی کے حلق میں گونجتا ہوا اور دھوئیں کے مرغولوں میں بل کھاتا ہوا خوفناک قہقہہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اس قہقہے میں جہنم کی آگ اور جنت کی خنکی ہے۔ اس قہقہے کے گرد دھوئیں کی لہریں ان گنت قوسیں بنا رہی ہیں۔ سرمئی قوسیں، تاریکی، دھواں، اور ان میں ایک شعر جل رہا ہے جسے دو چمکتی ہوئی آنکھیں کمال وارفتگی سے دیکھ رہی ہیں ـــ دیکھے جا رہی ہیں۔

ہم نغمہ ساز ہیں، ہم بہترین خواب دیکھنے والے ہیں، ـــ شعر جل رہا ہے، اور میری آنکھیں کمال وارفتگی سے اسے دیکھ رہی ہیں یہ شعر مجھ پر ایک انوکھا خواب طاری کر رہا ہے، جو اس کے الفاظ کی طرح میٹھا ہے۔ اس میٹھاس میں شعریت ہے ـــ اور شعریت میں ایک خواب آور ترنم ـــ یہ ترنم خواب کی روح ہے۔

اس مفہوم کی روشنی میں مجھے کائنات ہمیشہ ایک خواب نظر آتی ہے۔ مگر یہ خواب اس قدر سحرکار ہے کہ اس کا ہر جزو اپنے آپ کو حقیقت سمجھ رہا ہے' انسان بھی اپنے آپ کو حقیقت سمجھتا ہے' یہ بھی ایک خواب ہے' مگر یہ خواب بڑا بے رنگ ہے۔ میں بھی ایک خواب ہوں' مگر یہ خواب بے رنگ نہیں' اس میں بہترین خوابوں کی رنگارنگی شامل ہے' جو اسے دلچسپ بنائے ہوئے ہے۔ جب یہ دلچسپی ختم ہو جائے گی تو خواب بھی مٹ جائے گا' ہمیشہ کے لئے فنا کی گود میں سو جائے گا۔ جب میں کوئی بہترین خواب دیکھتا ہوں' تو اس کی شعریت کے ترنم کی مدد سے میں ایک بہترین نغمے کی تخلیق کرتا ہوں' یہ نغمہ جب ہوا کی لہروں پر ناچتا ہے تو اس کا خواب آور ترنم پھر مجھے ایک بہترین خواب کی آغوش میں سونپ دیتا ہے۔ میرے خوابوں کا سلسلہ لامتناہی ہے' یہ کائنات بھی ایک خواب ہے اور میری زندگی بھی' میری تنہائی بھی ایک خواب ہے' اور اس کا ہر لمحہ بھی' ان لمحوں کا ہر احساس بھی خواب ہی ہے' وہ جیسے بھی خواب تھے' ان کے قہقہے بھی' ان کی سہمی ہوئی ہنسی بھی' ان کی طویل ہم آغوشی اور والہانہ بوسہ بھی —— مگر وہ سلگتا ہوا شعر ان میں سے بہترین خواب تھا' ہم نغمہ ساز ہیں۔ ہماری آنکھوں میں بہترین خوابوں کا رس ہے۔ نغمے اور خواب' خواب اور نغمے' اور جب تک یہ نغمے زندہ رہیں گے —— میں بہترین خواب دیکھتا رہوں گا' میں بہترین نغمے تخلیق کرتا رہوں گا —— یہ نغمے ہوا کی لہروں پر ناچتے رہیں گے۔

اور آنے والے خواب انہی نغموں سے اپنی بے رنگی میں رنگارنگی پیدا کیا کریں گے —— !

تاباںؔ جھالنوی

وہ مسکرانا بھی چاہتے ہیں

مری محبت میں غمزدہ ہیں' مجھے بھلانا بھی چاہتے ہیں
اُنہی سے ہستی بنی تھی لیکن وہی مٹانا بھی چاہتے ہیں

جبیں پہ بکھرے ہوئے ہیں گیسو' پلک پہ ٹھہرے ہوئے ہیں آنسو
مگر کوئی اُن کی سمت دیکھے وہ مسکرانا بھی چاہتے ہیں

ذرا گلستاں کے رہنے والوں کو احتیاطاً خموش کر دو
سُنا ہے پھولوں کی آڑ لے کر وہ گنگنانا بھی چاہتے ہیں

غمِ محبت میں مرنے والے' ترے تبسم کے منتظر ہیں
قریبِ دَورِ اجل سے پہلے ترا بہانا بھی چاہتے ہیں

یہ پہلی پہلی اُمنگ اُن کی' یہ نَو بہ نَو احتیاط اُن کی
نظر ملانے کی کوششوں میں نظر بچانا بھی چاہتے ہیں

ترے پرستار تابہ کے خود فریبیٔ دل سے کام لیں گے
جبیں کی خاطر برائے سجدہ اک آستانا بھی چاہتے ہیں

اُفق کے اُس پار اُن کی نظریں خود اپنا نظارہ کر رہی ہیں
وہ خود کو کھو کر جہاں میں شاید کسی کو پانا بھی چاہتے ہیں

ہماری فطرت کا اقتضا جو رنگ ہے وہ نہ پوچھ تاباںؔ
اُنھیں ہنسانے کے بعد شاید اُنھیں رلانا بھی چاہتے ہیں

ناطق گلاوٹھوی

کہ یوں

چارہ گروں میں بحث تھی کیجئے یوں دوا کہ یوں
میں نے بھی آج کھا کے زہر ان کو بتا دیا کہ یوں

شانِ ورودِ اہلِ ناز گرمیٔ بزم یعنی کیا
برق گری کہ اس طرح شعلہ بھڑک اٹھا کہ یوں

سعیٔ طلب کو ناز تھا کیوں نہ ملے گا مدعا
عاشقِ نامراد سے روٹھ گیا خدا کہ یوں

ہائے وہ منزلِ حیات جوشِ شباب ہمسفر
شوق کی ضد کہ اس طرف شرم کی التجا کہ یوں

میں نے کہا کہ جانتے ہیں کارِ جہاں سے کس طرح
رہگذرِ نفس سے دور چلنے لگی ہوا کہ یوں

ہنس کے نہیں رو کے بھی عمر گزر ہی جائے گی
آج سے خیر یوں سہی مجھ کو خیال تھا کہ یوں

صبر و قارِ اہلِ شوق ننگ خیالِ التجا
یوں تو ملے ہی مدعا یہ نہیں مدعا کہ یوں

اہلِ نمود بنتے ہیں ننگ وجود کس طرح
بزمِ ہوس میں غیر کو چھوڑ گئی حیا کہ یوں

زیست برائے نام ہے اور خدا کا نام ہے
ناطقؔ و اہلِ نطق کا نام ہی رہ گیا کہ یوں

ثاقب کانپوری

حشرِ جذبات

ابتدائے عشق میں یوں انتہا ہو جائے گی
دور کی میرے لئے تیری صدا ہو جائے گی

اک نظر جب حاصلِ صد التجا ہو جائے گی
میری مجبوری ہی جانِ مدعا ہو جائے گی

خود سراپا حسن بن جائے گا میرا ہر نفس
روح میری جب تجلی آشنا ہو جائے گی

کیا خبر تھی جس سے رازِ دل چھپایا عمر بھر
وہ نگہ بھی آشنائے مدعا ہو جائے گی

کیوں تمنا میں کروں مایوسیوں میں تو کی
نامرادی میری خود موجِ فنا ہو جائے گی

اور بڑھنے دے تو اپنے اضطرابِ شوق کو
کاہشِ دردِ جگر ہی پھر دوا ہو جائے گی

کس لئے میں آرزوئے رہبرِ منزل کروں
میری لغزش عشق میں خود رہنما ہو جائے گی

زندگیٔ عشق ہو جائے گی بے کیف و نشاط
تیری فطرت جب ستم ناآشنا ہو جائے گی

کیا خبر تھی مجھ کو ثاقبؔ اس پیامِ ناز کی
ہر تجلی جلوہ رنگیں ادا ہو جائے گی

عالمگیر بکڈپو کی مطبوعات

انگریزی کا مشہور ناول [illegible]
[illegible] لائبریری [illegible]

حقائق و معارف مولانا ظفر علی خاں [illegible] امور [illegible] کے مباحث شامل ہیں [illegible] [illegible] دیکھئے [illegible] [illegible]

سیر ظلمات مولانا ظفر علی خاں [illegible] [illegible] چار [illegible] قیمت [illegible]

ترنگ شکایت شبلی [illegible] کتابوں کا ایک [illegible] خواہ [illegible] کتاب [illegible] الف لیلے [illegible] ضخامت [illegible]

نئی منزلیں اردو کے چالیس [illegible] منظوم شاہکار [illegible] رنگ [illegible] رکھتے ہیں ضخامت [illegible] قیمت [illegible]

جنگل میں منگل مولانا ظفر علی خاں [illegible] کپلنگ کے شہرۂ آفاق ناول جنگل بک [illegible] کا ترجمہ۔ یہ کتاب عرصے سے ناپید تھی۔ اب [illegible] معیار کے مطابق شائع کی گئی ہے۔ ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت [illegible]

نازلی بیگم مولانا ظفر علی خاں۔ چار معرکہ آرا طویل افسانے [illegible] میری عینک۔ نازلی بیگم۔ تولہ بھر ریڈیم۔ ہر افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔ ضخامت دو سو صفحات قیمت ۲/-/-

[illegible] [illegible] ناول [illegible] [illegible] ۲/- [illegible] [illegible] قیمت ۳/۸ [illegible] ایشیے دیکھ کر کہا [illegible] کا۔ افسانوں کا [illegible] طویل افسانے [illegible]

جہانگیر [illegible] قابل [illegible] عنوان [illegible] چنگیز خاں، خواجہ محمود گاواں [illegible] لاہوری، شاہزادہ [illegible] شیر شاہ سوری، محمود غلجی [illegible] قیمت ۳/-/-

چنگیز خاں [illegible] خونخوار تاتاری بادشاہ کی داستان [illegible] زندگی پر ایک محققانہ نظر [illegible]

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل
اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک دو رہنما اور سیاست آموز کتاب جس میں تمام اسلامی ممالک کی تاریخ کا جائزہ [illegible] انقلابی حوادث کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ ہر صحیح الخیال اور علم دوست [illegible] کو یہ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ مولانا [illegible] امرتسری کا شاہکار [illegible]

نادر شاہ اور ستارہ
نادر شاہ افشار کی بیدائت [illegible] کوئی واقعہ نہیں [illegible] تاریخی ناول میں [illegible] ایک [illegible] شہرہ ستارہ [illegible] تاریخ و رومان کا امتزاج [illegible] بہتر آپ کو کہیں [illegible] تیلی [illegible] تمام [illegible]

ربیعہ
تاریخی [illegible] خالدہ خانم [illegible] ناول جس کا پلاٹ [illegible] معاشرے کے [illegible] جس میں [illegible] خراسے بھی [illegible] دکھائی [illegible]

تاریخی [illegible] ان
[illegible]

زرتشت اعظم
[illegible] رومان اور [illegible] میں دکھایا گیا ہے [illegible] میں بھی اپنے اخلاق [illegible] ضخامت ... صفحات قیمت [illegible]

تاریخی افسانے
تین بہترین [illegible] تاریخی ناول [illegible] کی [illegible] افسانے کے جام میں دیکھنا چاہتے ہیں [illegible] مجموعہ [illegible] از مولانا [illegible] ضخامت ... صفحات قیمت [illegible]

خونیں تحریکیں
بغاوت کے اٹھتے ہوئے طوفان [illegible] سے بھڑکتے ہوئے شعلے۔ شہنشاہی کی [illegible] غلامی کی تاریخ میں آزادی کی عالم افسروز روشنی کے [illegible] دیکھنا ہو تو خونیں تحریکیں ملاحظہ فرمائیے اتنی دلچسپ کہ ایک [illegible] سے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ از مولانا [illegible] امرتسری [illegible] صفحات [illegible] ۱/۱۴/-

تسبیح لطافت
ملا رموزی کی مزاح نگاری کا بہار آفریں نمونہ جس میں مختلف واقعات کو لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ۲/-

رسپوٹین کی سیہ کاریاں
مفکر اعظم رسپوٹین کی حیرت انگیز رنگین اور ہیجان خیز آپ بیتی۔ گناہ و معصیت اور عشق و رومان کی وادی میں بھٹکنے والے فلاسفر کی داستان حیات کا ایک ایک [illegible] ورق آپ کے دل میں اتر جائے گا۔ قیمت ۱/-/-

[illegible] تقدیر
علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ جس میں قضا و قدر کے مسئلہ پر عقلی و نقلی [illegible] سے [illegible] صفحات قیمت ۲/۸/-

مونٹ لیل کا [illegible] حسینہ
مصر کے شہرۂ آفاق ناول نویس جرجی زیدان کے زبردست تاریخی ناول فتحۃ الاندلس کا اردو ترجمہ [illegible] ایڈیشن۔ قیمت ۱/۱۴/-

[illegible] افسانے کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ [illegible] سے انسانی جذبات کی آوازیں سنائی دیں اور [illegible] تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے تو کوثر چاند پوری [illegible] قیمت مجلد ۱/۱۴/-

[illegible] اور [illegible]
جس میں مصر و شام و روم کے باشندوں کے عادات و اطوار طرز معاشرت [illegible] معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیحد دلچسپ [illegible] کتاب ہے از حافظ عبد الرحمن امرتسری قیمت [illegible]

تاریخ شاہی حسن کے قدموں میں
شاہان یورپ کے عشق و عاشقی کی [illegible] اور [illegible] داستانیں۔ ہر افسانہ تاریخی حقائق سے لبریز اور [illegible] ڈوبا ہوا ہے۔ قیمت ۱/۸/-

[illegible] سیزان
علامہ جرجی زیدان کا رومان پسند [illegible] شاہکار جس میں قیروان [illegible] کی [illegible] داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۱/۴/-

شادی
ملا رموزی کی تقریب شادی پران کی خود نوشت تصنیف ستر دلکش اور دلچسپ مضامین کا مجموعہ قیمت ۲/-

مجنوں کی ڈائری
قاضی عبد الغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط کا دوسرا شاندار کارنامہ قیمت ۱/۴/-

راہی
[illegible] کا آتشیں ناول راہی ایک [illegible] کی داستان جس کو قدرت نے غریب و امیر کی تفریق مٹانے والا دل عطا فرمایا تھا۔ آپ اس ناول کے قصے کو خود [illegible] کی زبانی سے سنئے۔ قیمت مجلد ۱/۴/-

آفتابِ تازہ احسان بی اے۔ تاریخِ اسلام کے دورِ روحانیت افروز اور ایمان پرور [illegible]

رزم و بزم میر نفیس کے تاریخی، رومانی اور [illegible] افسانوں کا مجموعہ۔ دو سو صفحات قیمت ۱/۸/

جھلکیاں مرتبہ شفیق بی کام [illegible] خواتین کے لکھے ہوئے افسانے [illegible] ہندوستان کی معاشرتی [illegible] ضخامت تین سو صفحات قیمت [illegible]

شعاعیں مرتبہ شفیق بی کام۔ ہندوستان کی تمام [illegible] لکھنے والے ۱۵ مرد افسانہ نویسوں کے افسانوں کا مجموعہ۔ اپنی قسم کا واحد مجموعہ [illegible]

تنو بطرس کی ایک رات انگریزی کے [illegible] افسانوں کا ترجمہ [illegible] حسن اور بیان کی دلکشی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ [illegible] آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے [illegible] تنو بطرس کی ایک رات۔ رات کی بات۔ ساحرہ کی آخری [illegible] حدیدی۔ بابک کا خواب۔ ۲۰۰ صفحات [illegible] مترجم شفیق بی کام [illegible]

کھیل محترمہ خدیجہ مستور کے قلم سے نکلے ہوئے [illegible] کھیل مشق کھلاڑیوں کے نام گیارہ [illegible] جو ہلکی پھلکی رنگ پر لکھے گئے ہیں پڑھیے اور لطف اٹھائیے [illegible]

چھینٹے محترمہ حجاب [illegible] کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ نئے رومان [illegible] پلاٹ اور چٹکے پوشیدہ ہیں مجلد کتاب قیمت ۱/۸/

سلسلے ان افسانوں [illegible] کی راہیں [illegible] محبت کی [illegible] فطری جذبہ ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ محبت [illegible] ہوتی ہے اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں [illegible] تو قمر اجنالوی کا مطالعہ فرمائیں۔ قیمت ۲/۸/

باندی سماج کے ظلم و ستم کے خلاف ایک [illegible] افسانہ نویس [illegible] ناول [illegible] میں پیش کیا ہے۔ پڑھیں اور لطف اٹھائیں [illegible]

دیوانِ جگر جگر کے مشہور کلام کا مجموعہ ۱/۸/

دنیا کے تین بہترین ناول [illegible] ناول [illegible] جو دنیا بھر میں شہرہ [illegible] انگریزی [illegible] ایک جلد [illegible] انسانی [illegible] ۳/-

[illegible] کام [illegible] مجموعہ [illegible] ۱/-

نئی فضائیں [illegible] افسانہ [illegible] مجموعہ [illegible] ترقی پسند [illegible] کی طرح جگمگا [illegible] جلد قیمت ۱/۸/

پیالہ [illegible] ناک کی [illegible] کر رو نکلے [illegible] داستان جو دیا [illegible] [illegible]

نئی کلیاں [illegible] شاہکار افسانوں کا مجموعہ [illegible] ۲/۸/

پہلا انعام [illegible] ترجمہ ۱/۴/

تھکن [illegible] افسانے جن میں حقیقت [illegible] مجموعہ اٹھیں گے [illegible] اردو ادب میں [illegible] صفحات مجلد قیمت ۲/۸/

داستانِ الم [illegible] افسانہ نگاری [illegible] محبوب بن چکی ہے اب [illegible] پسند کیا جا رہا ہے اس [illegible] سدوم کی تباہی [illegible] افسانے تاریخی ہونے کی حیثیت [illegible] قیمت ۲/۸/

جامِ شکستہ [illegible] کو پیش کرتے ہیں اور یاس و حرمان کے [illegible] ایک اچھوتی کتاب رنگین کی شکل میں [illegible] کے گیارہ افسانوں کا تازہ [illegible] قیمت ۳/-

مغرب کے بہترین افسانے قیمت ۲/۸/

خط کا جواب
[illegible] آپ نے دل میں گہرے زخم ڈالے ہیں
[illegible] خط کا جواب آیا
حضرت ایم اسلم [illegible] قیمت ۲/۸/-

رین نظارے
[illegible] قسمت [illegible]
[illegible] حقیقت اور نازک
ہونٹوں کی [illegible]
[illegible] گردپوش ۲/۴/-

قاتل
حضرت ایم [illegible]
آپ [illegible]
کی دنیا میں حرکت [illegible] ۲/۸/-

دام گل
[illegible] حضرت [illegible]
[illegible]
[illegible] ۲/-/-

یادوں کا نگار
حضرت ایم اسلم [illegible]
[illegible]
کیا گیا ہے [illegible]
پوش چار رنگا [illegible] قیمت ۲/۱۲/-

روپ سنگار
ڈاکٹر اعظم کریوی [illegible]
[illegible] جاتے [illegible]
چودہ منتخب اور بے حد دلچسپ افسانوں کا [illegible]
مجلد رنگین گردپوش قیمت ۲/-/-

اشک و شرر
[illegible] پرسوز [illegible] افسانوں
کو [illegible] مجموعہ رنگین [illegible] ۲/-/-

رقص بہار
[illegible] حضرت ایم اسلم [illegible]
بے حد دلچسپ رومان [illegible]
اسلامی معاشرت تہذیب و تمدن کا مقابلہ مغربی تعلیم و [illegible]
مستعن تعلقات کیا ہے۔ اس طرح ناول [illegible]
دنوں میں ایک بار بہار نہ آجائے تو پھر کتاب کا نام رقص بہار نہیں ۲/۸/-

حسن سوگوار
از ایم اسلم اس شاندار ناول میں ایک [illegible]
چینی محبوبہ کے دلچسپ اور پاکیزہ رومان کے ساتھ
ساتھ چین اور جاپان کی موجودہ آویزش کی خونچکاں داستاں اور چینی
جانبازوں کی سرفروشانہ جدوجہد کے حیرت انگیز سچے واقعات درج ہیں
ٹائیٹل سہ رنگا۔ مجلد قیمت ۳/-/-

شمسہ
حضرت ایم اسلم نے مغربی تمدن اور تہذیب فرنگ [illegible]
ایک فریب خوردہ حسینہ کی بے حد دلچسپ اور [illegible]
بیتی دلکش انداز میں لکھی ہے۔ [illegible]
ناول ہے [illegible] اصلاحی ناول کا دوسرا ایڈیشن
[illegible] شائع ہوا ہے مجلد قیمت [illegible]

بیتی باتیں
[illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] چار رنگا مجلد قیمت ۱/۸/-

شام ہونے والی
[illegible]
[illegible]
[illegible] دلچسپ [illegible]
[illegible] دنیا میں جینا ہے تو کیا [illegible]
[illegible]
[illegible] ۱/-/-

شام و سحر
از ایم اسلم [illegible]
[illegible]
کی [illegible] اور [illegible] کا خوفناک انجام [illegible]
[illegible] ایک زندہ دل [illegible] کی طرح محبت و کشش
[illegible] ناول گزشتہ ۲ برس [illegible]
[illegible] گردپوش باصرہ نواز قیمت ۱/-/-

ہیر رانجھا
سرزمین پنجاب کی زندہ جاوید رنگین داستان عشق
جس کا ہر پنجابی زن و مرد والہ و شیدا ہے
[illegible] کلام آزاد [illegible] ملتی ہے [illegible]
[illegible] مجلد قیمت ۲/-/-

طلسم سامری
از ایم اسلم اس دلچسپ جاسوسی ناول [illegible]
زار روس کے خونچکاں مظالم [illegible]
[illegible] دلکش انداز میں لکھی گئی ہے مجلد قیمت ۱/۱۲/-

صبح نشاط
خان اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کا گزشتہ [illegible]
سال کا مجموعہ کلام۔ جس میں عشق [illegible]
نعتیں۔ معرکہ آرا اور ولولہ انگیز قومی و اسلامی نظمیں اور [illegible]
عشقیہ غزلیں شامل ہیں۔ یہ کتاب ممالک محروسہ سرکار عالی [illegible]
آصفیہ کے فوقانی مدارس اور لائبریریوں کے لئے منظور ہو چکی ہے
سائز چار سو سے زائد صفحات قیمت ۱/۴/-

محمد عبداللہ قریشی

فوق کی شاعری

منشی محمد الدین فوق۔ مدیر اخبار کشمیری لاہور پنجاب کے ایک کامیاب اخبار نویس۔ ایک مایہ ناز مورخ اور ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ آپ کی ساری زندگی اخبار نویسی۔ تصنیف و تالیف اور کشمیری قوم کی اصلاح و تنظیم میں صرف ہوئی۔ صبح شباب سے لے کر شام پیری تک آپ کا کوئی لمحہ اس شغل سے خالی نہیں گیا۔ آپ کا شمار فن اخبار نویسی کے ان اساتذہ میں ہوتا تھا جنہیں پنجاب میں اولیت کا شرف و اعزاز حاصل ہے۔ کوہ نور پنجاب کا سب سے پہلا اخبار تھا جو ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا۔ اس کے آخری دور میں آپ ہی اس کے ایڈیٹر تھے اور اس لحاظ سے پنجاب کی پرانی علمی و صحافی محفلوں کے آخری چراغ تھے۔

آپ کی مورخانہ قابلیت کا یہ حال تھا کہ تاریخ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپ تحقیق کی مشعل لے کر نہ پہنچے ہوں۔ ۶۹ برس کی عمر میں بھی آپ کے عزائم جوانوں سے زیادہ بلند تھے۔ آپ نے اپنی عمر کے برابر ہی کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جو کام پوری ایک جماعت انجام نہ دے سکتی تھی وہ آپ تن تنہا انجام دیتے تھے۔ آپ سے پہلے کشمیر کا شاندار ماضی بالکل معدوم تھا۔ آپ نے کشمیر کی ہر جہتی تاریخ لکھ کر ارض کشمیر پر نہ صرف احسان کیا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ تاریخ کشمیر۔ مشاہیر کشمیر۔ خواتین کشمیر۔ رہنمائے کشمیر۔ شباب کشمیر۔ تاریخ اقوام کشمیر اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ کتابوں نے کشمیر کے متعلق عام دلچسپی پیدا کی۔ یہاں تک کہ تاریخ بڈشاہی کی تصنیف پر ہز ہائینس مہاراجہ بہادر جموں و کشمیر نے ایک ہزار روپیہ نقد عطا کر کے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ تاریخ حریت اسلام۔ تاریخ کا روشن پہلو۔ شالامار باغ۔ تاریخ سیالکوٹ اور اس قسم کی دوسری تصانیف بھی اپنی افادی خوبیوں کی وجہ سے مقبول و محبوب ہیں اور آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

آپ محض تخلص ہی کے گنہگار نہ تھے بلکہ ایک پیدائشی شاعر تھے اور بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ چونکہ آپ کی شاعری پر دوسرے کمالات کا پردہ پڑا ہوا ہے اس لئے میں اس مضمون میں آپ کی زندگی کے فقط اسی پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ آپ جی میں کہیں گے تو سہی کہ

فوق صاحب ہیں خدا جانے کہاں کے شاعر
ہم نے تو آپ کا دیوان نہ دیکھا نہ سُنا

اور یہ کچھ آپ ہی پر منحصر نہیں۔ کئی دوسرے بزرگ بھی جو آپ کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف ہیں آپ کے شاعرانہ کمالات سے اکثر لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں

فوق ولبا ہی سہی جیسا سمجھتے ہو اسے
بار بار ایسے بھی دنیا میں نہیں آتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ فوق صاحب نے مہد سے لے کر لحد تک گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں حصہ لیا اور اپنے ہمعصروں سے کسی طرح کم کام نہیں کیا۔ لیکن ان کے زندگی افروز کلام کی معجز نمائیوں سے کشمیر کے باہر کی دنیا چنداں واقف نہیں ہو سکی۔ آپ اگر چاہتے تو کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے محدود دائرہ عمل کو وسعت دے سکتے اور ہندوستان کے بہترین شاعروں، اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف اوّل میں جگہ پا سکتے تھے۔ لیکن اس صورت میں کشمیر کی اصلاح و بیداری کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا اور یہ آپ کی دیانت فکر اور پابندی وضع کو گوارا نہ ہوا۔ کیونکہ اس دائرے میں بھی آپ کا نعم البدل دستیاب ہونا بےحد دشوار تھا۔ آج اتنی ترقی کے باوجود میں لاکھ باشندگان ریاست میں کوئی آپ کے کام۔ آپ کے منصب اور آپ کے وظائف حیات کا بار اٹھانے کا اہل نہیں۔ یہ آپ کی جلالت مرتبت کی ایک روشن دلیل ہے۔

منشی صاحب فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنراین میں پیدا ہوئے جو سیالکوٹ سے جنوب کی جانب دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ جہاں اب بھی موضع

ہرد وکشیوہ (ڈنگہ) میں کچھ اراضی آپ کی ملکیت ہے۔ آپ کے جد امجد میاں حسن محمد ار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں کشمیر سے نکل کر پنجاب آئے اور موضع گھڑتل ضلع سیالکوٹ میں آباد ہوئے آپ کے دادا منشی رجب علی سکھوں کی فوج کے میر منشی کی حیثیت سے اس جنگ میں شامل تھے جو سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ۱۸۴۹ء میں بمقام چلیانوالہ (ضلع گجرات) ہوئی۔ آپ کے والد مولوی لدھا خاں ریاست پونچھ (کشمیر) میں سررشتہ داری کے عہدہ پر فائز تھے۔

آپ کی شاعری کی ابتدا جیہ جاکے (ضلع سیالکوٹ) سے ہوئی۔ جہاں آپ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۴ء تک مڈل سکول میں پڑھتے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ وہاں اگرچہ کوئی علمی سوسائٹی یا شعر وسخن کی مجلس نہ تھی جو اس قسم کا شوق پیدا کرنے میں محرک ہوتی۔ لیکن ایک مرتبہ جب امتحان میں حضرت نظیر اکبر آبادی کی مسدس ع

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اُردو سے فارسی میں ترجمہ کرنے کو ملی تو آپ نے فن شعر سے مطلق ناآشنا ہونے کے باوجود اس کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا۔ جس سے آپ کا چرچا سارے سکول میں ہو گیا۔ اور یہی معمولی سا واقعہ آپ کی حیات شعری کی تمہید بن گیا۔ چنانچہ ایک غزل کے مطلع میں آپ جاکے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

پھر دل رو رہا ہوں کلیجہ تھام کے
یاد جب آیا ہے مجھ کو جاکے

اس سے پہلے موضع گھڑتل کے پرائمری سکول میں بھی آپ کا یہ حال تھا کہ جو شعر ایک دفعہ سن لیتے تھے اسے لکھ کر یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سے بھی آپ کے فطری رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

جاکے سے آپ پہلے خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں اور اس کے بعد انجمن مڈل سکول لاہور میں چلے آئے۔ یہ سکول ان دنوں موری دروازہ کے باہر پیسہ اخبار کی بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا۔ اب وہاں دوسری عمارتیں بن گئی ہیں۔ حاجی مولوی محبوب عالم صاحب مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کے بھائی منشی عبدالکریم صاحب اور منشی عبدالرحیم صاحب مرحوم بھی اسی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے توسط سے پیسہ اخبار کے دفتر میں آنا جانا ہو گیا۔ طبیعت میں شاعری کا مذاق تو پہلے ہی سے تھا جس کی بنا پر اپنا بہت سا قیمتی وقت شغل شاعری میں صرف کیا کرتے تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر میں اٹھنے بیٹھنے سے اخبار بینی اور ناول خوانی کا چسکہ بھی پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد سیالکوٹ میں جا کر ٹھیکیداری کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ اور پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رُخ کیا۔ سیالکوٹ میں منشی رحیم بخش صاحب رمزؔ اور منشی محمد اسمٰعیل صاحب ساغرؔ (بعد میں بلیغؔ) اس شغل کے ساتھی رہے۔ جموں میں میاں فیروز الدین صاحب گورنر ریاست پونچھ سے ملاقات ہوئی جو ایک نہایت ہی بامذاق انسان تھے۔ چنانچہ کچھ تو ان کی پرلطف صحبت میسر آ جانے سے اور کچھ قاضی فقیر علی صاحب عاقلؔ اور منشی نور الدین صاحب عنبرؔ کی حوصلہ افزائی سے جموں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔

اس زمانے میں رسالہ "پیام یار لکھنؤ" اور "ارمغان شاہجہانپور" اور "انتخاب" لکھنؤ بھی دیکھنے میں آتے رہے۔ جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور آپ نے جرات کر کے اپنی ایک غزل "پیام یار" میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ یہ غزل اسی رسالہ کی تجویز کردہ طرح پر تھی ع

نجد آباد ہے لیلیٰ ترے دیوانے سے

یہ آپ کی سب سے پہلی غزل ہے جو کسی رسالے میں چھپی ہے۔ اس وقت آپ شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اور ابوالاعجاز حضرت احسانؔ شاہجہانپوری سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن جب آپ کی دوسری غزل رسالہ انتخاب لکھنؤ میں اشاعت کے لئے گئی تو اس کے مدیر نے صرف اس بنا پر چھاپنے سے انکار کر دیا کہ ان کے دوست مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوقؔ نیموی عظیم آبادی کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شوقؔ کی غزل اس رسالہ میں جگہ نہیں پا سکتی اس کے ساتھ ہی انھوں نے آپ کے لئے فوقؔ تخلص تجویز کر دیا۔ جسے منشی صاحب نے قبول کیا اور اپنا پہلا تخلص بدل دیا۔ چنانچہ ایک جگہ اس پر فخر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

اے فوقؔ یہ تخلص کیا خوب ہے ہمارا
اس سے ہے واضح ہم کو ہم آسمان پہ ہیں!

جموں سے آپ ۱۳ر جنوری ۱۸۹۶ء کو پھر لاہور چلے آئے اور بیکاری کے دن اپنے بڑے بھائی رحیم بخش صاحب رشیدا کے پاس گزارنے لگے۔ لاہور میں ان دنوں مشاعروں کا بڑا زور تھا۔ ایک ہفتہ وار مشاعرہ انجمن اتحاد کے نام سے بھاٹی دروازہ کے

نذر ہوتے تھے۔ اس مجلس مشاعرہ کی بنیاد حکیم شجاع الدین محمد نے ۱۸۹۰ء میں رکھی تھی۔ پہلے اس کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان میں ہوتے تھے۔ مگر ۱۸۹۶ء میں حکیم شجاع الدین محمد کا انتقال ہو گیا۔ تو یہ مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی (خلف نواب شیخ امام الدین گورنر کشمیر) کی سرپرستی میں ان کی حویلی میں ہونے لگے۔ خان احمد حسین خان مدیر شباب اردو لاہور اس مجلس کی روح و رواں تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی بھی خاص اس مشاعرے میں شرکت کی غرض سے فیروزپور سے آیا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد بھی کثیر تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ شاعرانہ چشمک کی بنا پر اس انجمن کا ایک بازو کٹ کر علیٰحدہ ہو گیا تھا جس نے بزم قیصری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس بزم کے مشاعرے حضوری باغ میں ہوتے تھے۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی مالک اخبار نظم الہند لاہور اس کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کے شاگردوں اور دوستوں کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ خان احمد حسین خاں کی طرف سے "شور محشر" اور ناظم صاحب کی طرف سے "سخن" کے نام سے طرحی غزلوں کے دو رسالے بھی شایع ہوتے تھے۔ غرض دونوں انجمنیں اردو علم ادب کی خدمت کرنے اور لوگوں میں شعر کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں ایک دوسری سے بڑھ جانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان مجالس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں ہر فرقہ و ہر خیال کے شاعر اور سخن فہم بلا تمیز مذہب و ملت شامل ہوتے تھے۔ شیخ محمد اقبال جو بعد میں ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کہلائے اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پاتے اور نواب صاحب کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرحی غزلیں پڑھتے تھے۔ اسی انجمن کے ایک مشاعرے میں جس کے لئے یہ طرح دی گئی تھی ع

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

اور جس میں حضرت اقبال نے وہ غزل پڑھی تھی جس کا مقطع یہ ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

فوق صاحب بھی شریک ہوئے اور آپ نے یہ چند شعر پڑھے ؎

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا
نہ چھوڑا تار کوئی دست وحشت نے گریباں کا
حیائے آنکھ نے شرم گنہ سے اس قدر آنسو
کہ ہر اشک ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
کلیجہ بھی ہے زخمی دل بھی ہے مجروح سینے میں
مزہ ہم نے اٹھایا ہے تمہارے تیر و پیکاں کا
فلک کی سرد مہری کی کوئی پروا نہیں ہم کو
جلا دے گا اسے شعلہ ہماری آہ سوزاں کا
خدا نے رنگ تھرا اے فوق اس بت کو بنایا ہے
مقابل ہو رخ روشن کے کیا منہ ماہ تاباں کا

اس کے بعد فروری ۱۸۹۸ء کے کسی مشاعرے میں جس کے لئے یہ طرح تجویز کی گئی تھی ع

گھونگھٹ پری رخوں کا ہے ٹٹی شکار کی

آپ نے دو غزلیں پڑھیں جن میں سے ایک کا مقطع یہ تھا ؎

اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
صورت نکال جا کے کہیں روزگار کی

سامعین نے داد دی۔ بعض شعر دوبارہ سہ بارہ سنے گئے۔ اس سے حوصلہ بڑھ گیا اور آپ ہر مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے دوسرے ہی تیسرے روز پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت بھی مل گئی جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مشق کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ آپ نے حضرت نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کر لی اور ۱۹۰۵ء تک اپنی اکثر غزلیں انہیں کو دکھائیں۔ حضرت داغ کا پہلا خط جو آپ کے نام آیا یہ تھا۔

" ایک غزل نمونے کے لئے بھیج دو تاکہ تمہاری طبیعت کا اندازہ لگایا جائے۔ مگر بیمار ہوں اس واسطے جواب میں دیر ہوئی۔ ابھی تک صحت کامل نہیں "

فصیح الملک داغ دہلوی
۲۰ ستمبر ۱۸۹۸ء حیدرآباد دکن

فوق صاحب نے چند غزلیں بھیجیں جن کو دیکھ کر مرزا داغ نے ان الفاظ میں حوصلہ افزائی کی۔

" فوق صاحب! میں تمہاری طبیعت سے بہت خوش ہوا اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمہارا نام شاگردوں کی فہرست میں درج کر لیا گیا ہے۔ نیاز دلا دینا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ

---

(۱) منشی امیر حسن خاں نسیم بھرتپوری اور تشنہ بلند شہری فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ۔ حافظ شیرازی علیہ الرحمہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ ۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمہ حضرت شاہ نصیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت استاد ذوق کے نام کی "

جس غزل کی مرزا داغ نے بہت تعریف کی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے صبا تجھ سے کھلے گی نہ مرے دل کی کلی
میں ہوں اس گل پہ تصدق جو گلستاں میں نہیں

تجھ پہ عالم ہے فدا اُس پہ زلیخا عاشق
بات جو تجھ میں ہے وہ یوسف کنعاں میں نہیں

خود ہی منظور نہیں آپ کا ملنا ورنہ
کون سی بات ہے جو آپ کے امکاں میں نہیں

یہ شعر بھی انہی دنوں کی یادگار ہے ؎

داغ کا فیض اگر یونہی رہے گا اے ذوق
مان جائیں گے سخنور بھی فصاحت میری

چنانچہ یہی ہوا اور اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ذوقی صاحب نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے اپنا اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو حضرت داغ نے یہ قطعہ تاریخ لکھ کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

ہُوا ہے پنجہ فولاد جاری — خریدارو نیا اخبار دیکھو
جناب ذوقی کی گلکاریوں سے — ہوا اخبار یہ گلزار دیکھو
نئی خبریں بہت سچی ملیں گی — جو ہو کر طالب دیدار دیکھو
نظر چڑھ جائے گر اہل نظر کی — پھر اس کی گرمی بازار دیکھو
یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو — نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو
اٹھا اُر کھ کے سو سو بار اس کو — اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سنا دو مصرع تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو

۱۳۱۹ھ

میرزا داغ ان دنوں اکثر علیل رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے انتقال کی جھوٹی خبریں اخباروں میں شائع ہو گئیں اور قطعات تاریخ وفات بھی چھپنے لگے۔ جس کی تردید خود مرزا صاحب نے کی اور بعض شاگردوں کو بھی لکھا۔ اسی سلسلے میں یہ خط بھی ہے جو یکم نومبر سنہ ۱۹۰۱ء کے پنجہ فولاد میں میرزا داغ کے تذکرے کے ساتھ شائع ہوا۔

" دشمنوں نے میری بد خبر اڑائی ہے۔ اور حال یہ ہے کہ اب فضل الٰہی سے میں بخوبی صحیح و تندرست ہوں۔ بیماری جاتی رہی ہیں باقی رہ گیا۔ دشمن داغ کا دل جلانا چاہتے ہیں۔ ان کو داغ دل نصیب ہو "

فصیح الملک داغ دہلوی
محبوب گنج ۔ حیدرآباد دکن

اخبار پنجۂ فولاد کا اٹھان حسینوں کی نوخیز جوانی کی طرح دلکش تھا۔ مضامین میں شباب کی شوخی رقص کرتی تھی۔ خبروں کے انتخاب میں عام دلچسپی کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نوٹ، بید مفید اور کارآمد ہوتے تھے۔ بعض عنوان مثلاً بزم ذوق ۔ مذاق سخن ۔ علمی نظارہ ۔ ضامن صحت ۔ لطائف ۔ مراسلات ۔ مشاہیر ہند اور دنیا بھر کی خبریں مستقل تھے۔ ہر کالم منہ سے بولتا تھا کہ مجھے دست ذوق سے لکھے جانے کا شرف حاصل ہے۔ طبیعت میں شاعری کا جوش موجزن تھا۔ ایک ایک سطر بہار کی پیامی بن کر رنگین و شاداب پھول برساتی تھی۔ خبروں کے عنوان عام طور پر مصرعے ہوتے تھے جو نہایت موزونی سے تجویز کیے جاتے تھے۔ مضمون کے خاتمے پر بھی کوئی نہ کوئی باموقع شعر ضرور ہوتا تھا جو اثر کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ہر چیز میں خود بخود شعریت پیدا ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر امیر عبدالرحمٰن خاں والی افغانستان کی وفات کا ذکر آیا تو عنوان کے نیچے یہ شعر درج کیا ؎

رہنے کیا دنیا میں آئے تھے امیر
سیر کر لی اور اپنے گھر چلے

پھر جب آپ کی جگہ امیر حبیب اللہ خاں مسند حکومت پر بیٹھے اور لارڈ کرزن نے مبارکباد پیش کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو معلوم ہوا کہ امیر افغانستان نے برٹش سفارت کی خوب خاطر مدارات کی ہے اور حکومت انگلشیہ کی نسبت کچھ نیک خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اس پر انگریزوں کی حریف روسی گورنمنٹ پیچ و تاب کھا رہی ہے اور اپنی سفارت بھیجنے کے حیلے بہانے تلاش کر رہی ہے اس خبر کا عنوان یہ قائم کیا۔ ع

"یہ روسیہ کس خیال میں ہے"۔

اور اس کے نیچے یہ شعر درج کیا ؎

رقیب روسیہ کیوں سر چڑھا ہے
اسے صدقے کرو تم داغ پر سے

پھر خاتمے پر یہ شعر لکھا ؎

وائے تقدیر تم اٹھ اٹھ کے ملو غیروں سے — بیٹھنے کو نہ ملے گوشۂ محفل مجھکو

بزمِ ذوق کے کالم میں خریداروں کے بعض استفسارات اور ان کے جواب ہوتے تھے مگر اس کا یہ شعر آج تک لوگوں کو زبانی یاد ہے ؎

کس طرح کے لوگ ہیں کیا بات ہے
ذوق کی محفل تو دیکھا چاہئے

ابوالاعجاز حضرت احسان شاہجہاں پوری نے انہی چیزوں سے متاثر ہو کر کہا تھا ؎

ذوق کی مضموں نگاری میں کشش ہے حسن کی
خود فدا ہونے کو آئی ہے خبر اخبار پر

اس کے بعد ذوق صاحب نے غزلیں، نظمیں، قصیدے، مرثیے، رباعیاں اور تاریخی قطعے سب ہی کچھ کہے اور موزونیٔ طبع نے آپ کا ہر وقت ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء میں آپ لاہور کے شاعروں پر چھا گئے۔ خان احمد حسین خاں صاحب منصف ہو کر لاہور سے چلے گئے نواب غلام محبوب سبحانی صاحب انتقال کر گئے۔ کئی دوسرے شاعر بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور مشاعروں کا مرکز بھاٹی دروازہ کے بجائے دہلی دروازہ بن گیا۔ کیونکہ ع

دہلی دروازے رہا کرتا تھا ذوقِ خستہ جاں

چنانچہ انجمن سخن کے نام سے جو مشاعرے دفتر صدائے ہند میں ہوتے تھے ان میں ذوق صاحب اور منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی ہی کا زیادہ عمل دخل ہوتا تھا۔ میر بشارت علی صاحب جاذب دہلوی۔ میر نثار علی صاحب شہرت دہلوی۔ منشی نور خاں صاحب ساغر اکبر آبادی۔ گوہر دہلوی مرحوم۔ تارا چند تارا۔ للتا پرشاد شاد میرٹھی۔ منشی اللہ یار جوگی مرحوم۔ پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی۔ اور منشی دین محمد مرحوم مالک اخبار صدائے ہند (میونسپل گزٹ) وغیرہ اس انجمن سخن کی رونق کا باعث ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کا ذکر کلام ذوق میں جا بجا موجود ہے۔ ذوق صاحب خود بھی ان دنوں بھاٹی دروازے کی رہائش چھوڑ کر دہلی دروازے کے اندر کسی گلی میں آ گئے تھے۔ منشی وجاہت حسین صاحب نے اسی مناسبت سے ایک مشاعرے کے لئے یہ طرح تجویز کی تھی۔ ع

ذوق صاحب گلی میں رہتے ہیں

؎ دہلی دروازے رہا کرتا ہے ذوقِ خستہ جاں
جستجو میں کس لئے پھرا ہے احبابِ حیراں ہے تو

چنانچہ یہ مصرع بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا اور ذوق صاحب کا نام دور دور پہنچ گیا۔ جون ۱۹۰۹ء میں لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" میں ایک نظم اردو علم و ادب کے عنوان سے چھپی۔ جس میں شعرائے دہلی کے تذکرے کے بعد لاہور کے ان شعرا کا بھی ذکر کیا گیا جو انجمن مشاعرہ کی روح و رواں بن کر اردو کی خدمت کر رہے تھے۔

ایک شعر تھا ؎

ذوق بھی ہیں نظم کو تیری بگاڑنے کے لئے
انجمن قائم ہوئی تجھکو بگاڑنے کے لئے

یہ نظم سید احمد حسین صاحب شوق گیلانی لاہوری نے بخارا سے مخزن میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔ جہاں وہ ان دنوں مقیم تھے۔

اخبار پنجۂ فولاد ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ انہی دنوں کا ایک شعر ہے۔

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں ناز میں
اے ذوق اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

مگر ۱۹۰۶ء میں آپ نے کشمیری میگزین کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کر دیا جو ۱۹۱۲ء میں ترقی کرتے کرتے ہفتہ وار اخبار کی شکل اختیار کر گیا۔ اور تیس سال تک آپ کے قلمی و ذہنی کمالات کی نمائش کرتا اور آپ کے پاکیزہ افکار و خیالات کی ترجمانی کا حق ادا کرتا رہا۔ یہ اخبار ۱۹۳۴ء میں بند ہو گیا۔ لیکن اس کے لگائے ہوئے پودے آج خوب برگ و بار دے رہے ہیں۔

آشیاں کے اب بیاد آشیاں باقی تو ہے
گو نہیں ہے گل زمینِ گلستاں باقی تو ہے

اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ ؎

جینے والوں سے وہ بعد موت بھی ممتاز ہے
ساز میں ہر دل کے اس کی گرمیٔ آواز ہے
(سیماب)

اس اخبار کی وجہ سے کشمیر اور اہل کشمیر سے خاص دلچسپی اور گہری وابستگی سی پیدا ہو گئی۔ اور آپ کی تمام سرگرمیاں کشمیر کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں۔ آپ سال کے چھ مہینے لاہور میں اور چھ مہینے کشمیر میں رہتے تھے۔ جس کی فضا یکسر معمور حسن اور تمام تر لبریز محبت ہے اور جس میں سالنس لینا گویا شعر کی دنیا میں رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وادیٔ شعرستان کے بیش

جمیل مناظر، موسموں کے تغیر و تبدل۔ سورج چاند کی گردشیں۔ صبح و شام کے رنگ برنگے قوس قزحی نظارے۔ برف سے لدے ہوئے سبز پوش اونچے نیچے پہاڑ۔ اناج کے سرسبز و شاداب کھیت رنگین ولذیذ پھلوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے درخت، چاول کی خوشبو دار فصلیں۔ مختلف قسم کے خوش رنگ و خوش آواز پرند۔ گھنے جنگل صاف و شفاف جھیلیں، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے قدرتی چشمے پہاڑی ندی نالے، پھولوں کی آباد بستیاں، شگوفوں کی نکہت بیزیاں۔ آبشاروں کی ترنم ریزیاں، باد و باراں کی حشر خیزیاں انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں۔ حکام کی چیرہ دستیاں۔ مفلوک الحال اور مظلوم لوگوں کی آہ و زاریاں۔ گندم نما جو فروشیاں۔ صداقت کے لئے قربانیاں، اقتصادی بلندیاں اور پستیاں۔ سماجی خوبیاں اور برائیاں اور سیاسی مد و جزر آپ کی شاعری کا خاص موضوع ہیں اور آپ فطرت کے نت نئے روپ کو تخیلی پیکر دیتے اور اپنے جذبات و تاثرات کے عکس کو دوسروں کے دلوں پر نقش کرتے ہیں۔ ایک نظم نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ یہ نظم کدُ اور نبوت ضلع اودھم پور ریاست جموں کے سرسبز و شاداب جنگل میں ۲۶ اگست ۱۹۵۸ء کو لکھی گئی تھی ؎

۱۔ دامن قرار دل کے سب تار تار دیکھے
جب تیری وادیوں کے کچھ آبشار دیکھے

۲۔ جس نے تری خزاں کے ایسے نکھار دیکھے
گلزار خلد کی پھر وہ کیا بہار دیکھے

۴۔ ہر صبح کی جھلک میں ہر شام کی شفق میں
سو سو طرح کے ہم نے نقش و نگار دیکھے

۵۔ بادل کا گھر کے آنا کدُ کی پہاڑیوں پر
اے کاش وہ نظارہ پھر چشم زار دیکھے

۶۔ اک پردہ پوش عالم کو بے نقاب دیکھا
جب سبز پوش تیرے یہ کوہسار دیکھے

۷۔ کچھ زرد زرد چہرے کچھ سرد سرد آہیں
محو آفریں مناظر یہ بے شمار دیکھے

۳۔ گو ریز سرزمیں میں وہ دلفریبیاں ہیں
جو ایک بار دیکھے وہ بار بار دیکھے

۸۔ جو اقربا ہیں اپنے عقرب مثال ہیں وہ
جو یار ہم نے دیکھے وہ یار مار دیکھے

بچ بچ کے جن سے اب تک طے کر رہے تھے راہیں
وہ تیر آج ہم نے سینے کے پار دیکھے
ڈاروں میں فوقؔ ہی اک چمکا ہے سیف بن کر
کشمیر میں ہزاروں گو ہم نے ڈار دیکھے

کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے بھی کشمیر اور اہل کشمیر کی محبت فوقؔ صاحب کی رگ رگ میں سما چکی اور ان کے جذبات و خیالات پر چھا گئی تھی ؎

والہانہ عشق ہے کشمیر سے
روح زخمی ہے وطن کے تیر سے

اس لئے بعض ایسی غزلوں اور نظموں میں بھی جن کا تعلق کشمیر سے نہیں ہوتا تھا بیساختہ کہیں نہ کہیں کشمیر کا ذکر آ جاتا تھا اور یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ جیسا کہ اس غزل سے معلوم ہو سکتا ہے ؎

مصروف ہر نفس ہے پیام و سلام میں
ہے زندگی ضرور کسی اہتمام میں
طے کس طرح کریں گے وہ راہِ دراز عشق
جو تھک کے چور ہو گئے دو چار گام میں
تیغ نگاہِ ناز تری بے نیام ہے
مارے نہ جائیں ہم کہیں اس قتلِ عام میں
آئے تھے ہم بھی سیرِ امرناتھ کے لئے
دل تھام ہی کے رہ گئے پھر پہلگام میں

۱؎ فوقؔ صاحب کشمیر کی ڈار فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔

۲؎ ملک سیف ڈار ایک نامور شخص گزرا ہے جو سلطان فتح شاہ بادشاہ کشمیر کا وزیر اعظم تھا۔ سرینگر میں آج جہاں شیر گڑھی آباد ہے وہاں ملک سیف کا احداث کردہ ایک عالی شان باغ ہوتا تھا جو ڈارہ باغ کہلاتا تھا۔ عہد افاغنہ میں امیر خاں جوان شیر نے جس کے نام سے دریائے جہلم کا مشہور پل امیرا کدل اب تک موجود ہے یہاں اپنے قلعہ نما محلات تعمیر کرا کے اس کا نام شیر گڑھی رکھا یہ ۱۷۷۱ء کا واقعہ ہے۔ اب انھیں محلوں میں سرکاری دفتر آ گئے ہیں۔ ؎

بن گئے ہیں دفتروں کی جگہ اب شاہی محل
اور دفتر بن گئے شاہی محل کشمیر میں

۳؎ امرناتھ کشمیر کے برفانی پہاڑوں میں ہندوؤں کا ایک متبرک تیرتھ ہے۔

اس طرح کبھی تو وہ اپنے وطن والوں کو ان کے پر شکوہ ماضی سے آگاہ کر کے یہ بتاتے تھے ؎

اپنے مستقبل کو تو ماضی کے آئینے میں دیکھ
شکر خالق کر کہ اب تک کچھ نشاں باقی تو ہے

اور کبھی "حال" کی بے حالی اور بیکسی کا نقشہ کھینچ کر کہتے تھے ؎

اب بھی تو چاہے تو روشن نام ہو اسلاف کا
مشعلِ رہ نقش پائے رہرواں باقی تو ہے

کبھی کبھی اس طرح بھی ان کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھ کر غیرت دلاتے تھے ؎

انقلاب اس عالم ایجاد کی تقدیر ہے
خواب ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے
ایک حالت پر کبھی رہتی نہیں بزم جہاں
اب خراب آباد ہے وہ کل جو تھا اک گلستاں
شکر کر ہے تیری جنت کی ابھی باقی بہار
ایک داغ سینۂ عالم ہے تیرا لالہ زار
دشت و گلشن کی ہوائے مشکبو بھی ہے وہی
نہر اور دریا کی قائم آبرو بھی ہے وہی
زندگی کی آگ سے اب تک فروزاں ہے چنار
ہے نمو کے جوش سے ہر فصل میں فصل بہار
کس جگہ برپا یہاں طوفان رنگ و بو نہیں
ہے وہی فیضان فطرت کا مگر وہ تو نہیں

تجھ میں غیرت ہو تو غالب تجھ پہ آسکتا ہے کون
تجھ میں جرات ہو تو پھر آنکھیں دکھا سکتا ہے کون
ایک مرکز پر ترا عزم و عمل قائم نہیں
نام کا ہے تو مسلماں کام کا مسلم نہیں
ہاں مگر اک وقت آنے کو ہے بعد انقلاب
فطرت باری کا ہوگا پھر ارادہ کامیاب
ذرہ ہائے خاک سے چمکیں گے پھر سورج نئے
ہونگے پھر انوار کے معدن نئے مخرج نئے
ان خرابوں سے کھنچے گی پھر یہاں تازہ شراب
آئے گا پھر اس خزاں آلودہ گلشن پر شباب
ہاں نہ گھبرا رحمت حق مہرباں ہو جائے گی
جنت کشمیر اک دن پھر جواں ہو جائے گی

—— کبھی یہ کہہ کر ان کو جوش دلاتے تھے ؎

اُٹھو کہ ہیں صدیوں کے اب سوئے ہوئے بیدار سب
جن کو ہم مجبور کہتے تھے وہ ہیں مختار سب
نشۂ صہبائے دردِ قوم کے سرشار سب
اب بدل دینے کو ہیں عالم کے کاروبار سب
تو بھی آ اور اس تگ و دو میں ذرا شامل تو ہو
تو ہی خضر راہ ہے پر عازم منزل تو ہو

—— پھر کبھی ان کی فوجی سپرٹ کو ابھارتے تھے ؎

نا قابل افواج ہیں اس قوم کے فرزند
جس قوم سے محمود کا بھاگا تھا رسالا
وہ قوم بھی کیا خون رگوں میں نہیں رکھتی
جس قوم کے چہرے سے پشیمان ہو لالا
پرچم کبھی لہرایا ہے پنجاب میں اپنا
ڈیرا کبھی افواج نے لنکا پہ ہے ڈالا
برسوں ہی رہا تبت و تندھار پہ قبضہ
تاریخ کو پڑھ کر تجھے لینا ہو حوالا
جو خوبیاں اپنی ہیں نظر آئیں گی تجھکو
جب دور کبھی ہوگا تری آنکھ کا جالا
کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے
جاگے گا تو مشکل سے وہ جائے گا سنبھالا
جس دم وہ دہاڑے گا تو گونج اٹھے گی دنیا
لرزے گی زمیں ہوں گے سمندر تہ و بالا
ہم فوق ہیں اور فوق رہے گا ہمیں سب پر
کچھ غم نہیں گردش نے جو چکر میں ہے ڈالا

—— کبھی تعلیم کا شوق دلانے کے لئے کہتے تھے ؎

دل توڑ کے بیٹھے ہو یہ اچھا نہیں کرتے
ہمت کے دھنی جو ہیں وہ ایسا نہیں کرتے
ہمت ہی سے مٹی میں ہے بجلی کی چمک بھی
جو کرنے پہ آجائیں وہ کیا کیا نہیں کرتے
تعلیم اگر عام ہو بیگار کہاں ہو
افسوس تم اس نکتے کو سوچا نہیں کرتے

تعلیم ہی اک چلتا ہوا جادو ہے ایسا
جس جادو پہ عامل کبھی ٹونا نہیں کرتے

— وہ اہل وطن کو ان کے درخشندہ مستقبل سے بھی غافل نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ کہہ کر ان کی ہمت بندھاتے تھے ؎

سینچو لہو کے چھینٹوں سے بستان ملک و قوم
لینا اگر ہے جھولیاں بھر کر ثمر تمہیں
چھوڑو نہ عزم منزلِ آزادیٔ وطن
ہر چند راہ آئے نظر پر خطر تمہیں

تم اپنے پاؤں کے چھالوں کو رو رو کر نہ یوں دیکھو
کسی دن پھول برسیں گے انہی تلوؤں کے چھالوں سے

حب وطن اور خدمت وطن کا نام سن کر اکثر قوم پرست بھڑک اٹھتے ہیں اور ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں ع

مُسلم ہے اگر تُو تو وطن سے کیا کام

اور کچھ شک نہیں کہ بقول ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ علیہ الرحمہ اسلام ایک ایسا واحد نظام ہے جو ملکوں اور قوموں کی چار دیواریوں میں محدود نہیں ہے۔ لیکن کیا قومیں وطنوں سے اور وطن قوموں سے منسوب نہیں ہوتے۔ کیا بلوچستان کے بلوچی، سندھ کے سندھی، مہاراشٹر کے مرہٹے، گجرات کے گجراتی۔ پنجاب کے پنجابی۔ مدراس کے مدراسی۔ بنگال کے بنگالی کشمیر کے کشمیری اور بالآخر ہندوستان کے ہندوستانی نہیں بھلا اس جغرافیائی اصطلاح سے اسلام کس طرح متصادم ہو سکتا ہے؟ اس لئے ڈاکٹر سر اقبالؔ نے خود ہی فرما دیا ہے۔

"ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے"

فوقؔ صاحب وطن کو بُت سمجھتے تھے نہ دیوتا۔ وہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان اور ہندوستان میں رہنے کے لحاظ سے ہندوستانی تھے۔ اس لئے انھیں مذہب کے ساتھ اپنے وطن سے بھی محبت تھی۔ اور یہی تقاضائے محبت کبھی کبھی نالۂ موزوں بن کر ظاہر ہو جاتا تھا ؎

ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ
حُبِّ وطن ہی کامل ایمان ہے ہمارا

عبدالکریم ثمرؔ

جہد و عمل

مزاجِ عشق میں جب اعتدال ہوتا ہے
تو پھر جواب سے پیدا سوال ہوتا ہے

تجھے تو مصرعِ اوّل کی ہے تلاش ہنوز
غزل میں مصرعِ ثانی محال ہوتا ہے

عمل، یقین، وجسارت یہاں تلاش نہ کر
غلام قوموں میں قحط الرجال ہوتا ہے

عمل کے زور سے پایا ہے ملتوں نے عروج
یہاں جمال سراپا جلال ہوتا ہے

یہ سلطنت یہ شکوہ و جلال بے معنی
کلید خلد تو رزقِ حلال ہوتا ہے

کسی کی کٹتی ہیں برقِ نظر سے زنجیریں
کسی کو وجہِ کرم انفعال ہوتا ہے

کبھی نگاہ میں ہوتی ہے اک لطیف خلش
کبھی خیال میں کیفِ جمال ہوتا ہے

جمالِ جلوۂ معنی ہے ارتقائے نظر
یہاں ہر اک کا پہنچنا محال ہوتا ہے

معاقبات سے مومن ہے بے نیاز ثمرؔ
مجاہدات سے عالی خصال ہوتا ہے

مغیث الدین فریدی

حیاتِ ابدی

عشق:۔ آج تم اپنی جفاؤں پہ پشیماں کیوں ہو
یہ نمی آنکھوں میں کیسی ہے پریشاں کیوں ہو
خیر ہے تم کو تو دعوائے شکیبائی تھا
اپنے بیمار سے پھر طالبِ درماں کیوں ہو
چھین لیں کس نے تبسم کی ادائیں تم سے
مسکراؤ تو سہی اشک بداماں کیوں ہو

حسن:۔ آج ہوتی ہے مری زلفِ مسلسل برہم
آج کرتی ہوں میں امیدِ سکوں کا ماتم
آج گل ہونے کو ہے شمعِ شبستانِ وفا
مستقل یاس ہوا جاتا ہے شوقِ پیہم
اب ہمیشہ کیلئے تم سے جدا ہوتی ہوں
اب ہمیشہ ہی رہیں گی مری آنکھیں پُرنم

عشق:۔ زلفِ تاباں کو خدا کیلئے برہم نہ کرو
نہ کرو آرزوئے دید کا ماتم نہ کرو
مسکراؤ کہ خوش انجام ہے الفت اپنی
عشق کی تم کو قسم آنکھ کو پُرنم نہ کرو
انتہائے غمِ دل رازِ بقائے دل ہے
شکوۂ غم نہ کرو شانِ وفا کم نہ کرو
غم جہاں حد سے گزرتا ہے خوشی ملتی ہے
عشق کو آج حیاتِ ابدی ملتی ہے

عزیز احمد بی۔ اے (عثمانیہ) ۶

بدلی ہوئی فضا

شام و سحر جو یاد انھیں آرہا ہوں میں
کتنی بلندیوں پہ اڑا جا رہا ہوں میں
وہ کیا گئے بہار گئی، زندگی گئی
یہ جانتے ہوئے بھی جئے جا رہا ہوں میں
ہر بات منہ سے نکلی ہوئی بن رہی ہے پھول
اپنی زباں پہ نام ترا لا رہا ہوں میں
وہ ہیں، بہار، ساغر و بادہ ہے اور میں
لہروں میں آرزو کی بہا جا رہا ہوں میں
قربِ حبیب تو نہیں اندیشۂ زوال
پروانہ وار آپ چلا جا رہا ہوں میں
دے دیجئے التفاتِ محبت کا واسطہ
اب کیوں ہجومِ یاس سے گھبرا رہا ہوں میں
کس کو نصیب تیری نگاہِ کرم نواز
اب تو تمام درد ہوا جا رہا ہوں میں
دل، بے قرار، ہوش پراگندہ، حال تباہ
کس جرمِ ناروا کی سزا پا رہا ہوں میں
مینا بدوش حسن ہے ساغر بکف نظر
اے زندگی سنبھال گرا جا رہا ہوں میں
جب سے کسی نے یاد کیا ہے مجھے عزیزؔ
بدلی ہوئی جہاں کی فضا پا رہا ہوں میں

ڈاکٹر محمد نصیرالدین

ہزار برس بعد

دنیائے شعور تاریک تھی۔ اس پر بلا کی خود فراموشی طاری تھی احساسات ہنوز بادلوں کی طرح فضائے بسیط میں پر پھیلائے اڑتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے یہ روئی کے گالے ہوں یا برف کے ذرّے۔ دماغ کسی آہنی کوٹھری میں بند تھا۔ اور خیالات نہ جانے کہاں گم تھے . . . . .

کامل جیسی تاریکی میں، دور، بہت دور، کوئی روشن دائرہ گھومتا، چکر کھاتا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ کہاں؟ آنکھوں میں؟ . . . دماغ میں؟ . . . خیال میں؟ . . . . پتہ نہیں کہاں! مگر یہ روشن دائرہ ضرور تھا۔ جو بجلی سے کھنچے یا چلتی ہوئی گراری کے چکلے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اپنی ضخامت اور قربت میں بڑھ رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک سیاہ افق کا یہ روشن نقطہ گھومتا رہا۔ یک لخت اس کا چکر بند ہو گیا۔ اور اس سے لہراتی اور بل کھاتی ہوئی روشن لکیریں بجلی کی تھرتھراتی ہوئی لمبی لمبی چنگاریوں کی طرح نکل کر فضا میں پھیلنے لگیں۔ اور سیاہ ابر کے ٹکڑے ان چنگاریوں سے مس ہو کر تار تار ہونے لگے اب ساری فضا ان چنگاریوں اور سیاہ بادل کی دھجیوں سے اٹ گئی۔ اور ان دھجیوں کے تاریک کونوں سے روشن دھواں نکلنے لگا . . . .

یہ لہراتی ہوئی چنگاریاں بل کھاتی ہوئی آگے بڑھیں۔ اور ایک ایک کر کے نہ جانیں کہاں گرنے لگیں کہ دماغ، وہی جو آہنی کوٹھڑی کی فلک بوس دیواروں کے اندر بند تھا تھرا اٹھا۔ اس میں شدید درد و کرب کی لہریں دوڑنے لگیں۔ یہ درد تھا یا کیا؟ مگر یہ تھا بڑا تکلیف دہ اور تڑپا دینے والا جیسے کوئی دماغ پر آرہ چلائے۔ اور حد درجہ حساس دماغ اس آرہ کے نیچے آہستہ آہستہ دو حصوں میں تقسیم ہو۔

خلائے بسیط و تاریک میں، دور بہت دور، شاید افق سے اس پار کوئی درد اور تکلیف کے تیر چلا رہا تھا۔ یہ تیر بڑے نوکدار اور زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ اس خلائے لامتناہی میں درد اور تکلیف کے خلاف احتجاج کی چیخ بلند ہوئی۔ درد جتنا شدید اور ناقابلِ برداشت تھا اتنی ہی چیخ زوردار اور بلند تھی۔ درد تڑپانے اور مار ڈالنے والا درد چیخ، فلک شگاف چیخ . . . . . روشنی کی یہ کرنیں اور تیز ہو کر اپنی بل کھاتی ہوئی چنگاریوں سے احساس درد کے مراکز پر جیسے جلتے ہوئے تیزاب کا پھاہا رکھ رہی تھیں۔ الحفیظ! الاماں! کوئی احساس میں جلتا ہوا لوہا سلگا رہا تھا۔ اور احساس جل کر دھواں دے رہے تھے۔

روشنی کی یہ لکیریں اب اور قریب ہو کر دمکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ شعلے سفید تھے۔ بالکل سفید۔ اتنے سفید کہ یہ کبھی سیاہ نظر آتے تھے اور کبھی سرخ۔ یہ باری باری سے سیاہ، سرخ اور سفید ہوتے ہوئے شعلے کبھی دہک اٹھتے تھے۔ اور کبھی سکڑ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے تھے۔ ان شعلوں میں وہ درد و کرب کا احساس بڑی بے رحمی سے کیا جا رہا تھا۔ گرمی۔ اف بلا کی گرمی تھی جو کبھی بھڑک کر جینے کے احساس میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ اور کبھی یہ جلنے کا احساس اتنا بڑھ جاتا تھا۔ کہ یہ تمام درد و کرب دھواں بن کر تاریک فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ درد و کرب کا جل بجھ کر لطیف سلسلہ میں تبدیل ہو جانا خود اس کے لئے باعث تسکین تھا۔ چیخ، فلک شگاف چیخ اب تک محض عالم خیال میں تھی اور یہ احساسِ تسکین ہنوز فضائے بسیط کا ایک خوش پہلو تھا۔

سرخ، سبز اور زرد شعلوں میں ساری فضا جلنے لگی۔ درد و تکلیف اپنی انتہا پر پہنچ کر سکون کے لطیف وقفہ میں تبدیل

ے تھے۔ سکون؟ ہاں سکون مگر تلاطم سے بدتر جس کو نہ صبر و قرار اور جس کی نہ شکل و صورت۔ ان لپکتے ہوئے شعلوں میں احساس نے ایک نیا روپ دھارن کیا۔ جیسے خلائے بسیط میں غیر محدود فضا بن کر ان جلتے ہوئے شعلوں کو اپنے اندر لیے احساس درد داب کروٹیں بدل بدل کر زیادہ محدود ہونے لگا تھا۔ اور دماغ کی آہنی مگر لامحدود کوٹھڑی اب رفتہ رفتہ تنگ ہو کر دماغ کو اپنی دو دیواروں کے درمیان پیسنے لگی تھی۔ دماغ پھڑک رہا تھا۔ تلملا رہا تھا۔ اس کی بیتر تڑپ کچھ دیر بعد تاریکی سے ہٹ کر ان شعلوں میں آگئی تھی۔ یہ شعلے اب دماغ کے ساتھ مل کر تڑپ رہے تھے۔ اور احساس درد ان شعلوں سے ہٹ کر دماغ کے قریب ہونے لگا تھا۔

شعلے تحلیل ہو کر آہستہ آہستہ فضائے بسیط میں کھو گئے۔ اور ان شعلوں سے درد باہر آ کر پھڑکتے ہوئے دماغ سے چمٹ گیا۔ اب دماغ تھا اور اس سے چمٹا ہوا احساس۔ احساس دماغ میں ہتھوڑے مار رہا تھا۔ اسے لوہار کی طرح سرخ کر کے اپنے گھن پر پیٹ رہا تھا۔ اس کا کچومر نکال رہا تھا۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ عالم خیال سے نکل کر عالم وجود میں آنے کے لئے بے قرار تھی!

احساس! اُف احساس میں بیٹھا کوئی آگ لگا رہا تھا۔ اور اس آگ میں احساسات جل جل کر تحلیل ہو رہے تھے۔ فضا کی تاریکی اب عجیب قسم کے دھندلکے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جس میں احساس وجود مادہ کو محسوس کرنے لگا تھا۔ دماغ کے اندر احساس کی ریل پیل تھی۔ اور ان کے ادھم سے یہ پکے ہوئے زخم کی طرح ٹیک رہا تھا۔ اور اس میں رہ رہ کر ٹیسیں ہو رہی تھیں۔ دفعتاً دماغ شدت تکلیف سے جیسے پھٹ گیا۔ اور اس کے اندر سے احساسات بل کھاتے اور رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح نکلنے لگے یہ کلبلاتے ہوئے کیڑے تھے یا پگھلی ہوئی آگ۔ یہ پانی کی طرح بہتی ہوئی آگ جیسے ہر طرف پھیل گئی۔ اُف نہ جانے کہاں کہاں؟ مگر یہ کہاں کہاں اب کوئی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کچھ مادی شئے ہے۔ جو جل بھن کر بھسم ہو رہی ہے۔

اس مادی شئے کے تمام حصوں میں شدید درد تھا۔ اب درد نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ اس پگھلی ہوئی آگ نے ہر طرف سے سمٹ کر اپنا ایک مرکز بنایا اور یہ مرکز نہ جانے کتنے عرصے بعد دھڑکنے لگا۔ اس مرکز کی ہر دھڑکن سے اس پگھلی ہوئی آگ کا سیلاب ہر طرف دوڑ کر ہر شئے میں انتہا کی سوزش اور بے چینی پیدا کرنے لگا۔ احساسات جو ہر طرف منتشر تھے۔ اس مرکز پر آ کر جمع ہونے لگے۔ اور ان میں جہاں جلن اور سوزش تھی وہاں خنکی سی پیدا ہو گئی۔ مگر یہ خنکی اپنی خاصیت میں اتنی ہی شدید تھی جتنی سوزش۔ اس خنکی میں بھی جلن تھی جس میں احساسات ٹھٹھر کر بے ہوش ہو جاتے اور فضائے نیم تاریک ایک بار پھر خلائے تاریک میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

خنکی۔ گرمی۔ درد۔ سکون۔ عجیب و غریب قسم کے احساسات جمع ہونے لگے تھے۔ کہ ناگہاں نہ جانے کدھر سے طوفان کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس میں احساسات کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہوا میں ڈگمگاتے اڑنے لگے۔ اس کی آمد سے درد کی ایک شدید کیفیت دوڑ گئی۔ درد کے ساتھ ساتھ طوفان کا یہ جھونکا پھر آیا۔ مگر اس بار احساسات اس قدر منتشر نہ ہوئے۔ ان میں صرف پھڑک پیدا ہوئی اور احساسات نے اس طوفان کو اپنے اندر سے دبا کر باہر کر دیا۔ احساسات کی یہ حرکت صبر شکن حد تک تکلیف دہ تھی۔ مگر اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہ تھا۔ طوفان آتا۔ احساسات کی دنیا میں ہلچل مچ جاتی۔ مگر جونہی یہ باہر کر دیا جاتا سکون و تسکین کی لہر دوڑ جاتی۔ اس طوفان کی آمد و رفت اور اس دھڑکتے ہوئے مرکز میں ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ طوفان کی آمد پر مرکز کی دھڑکن ڈوب جاتی اور اس کے چلے جانے کے بعد یہ مرکز پھر دھڑکنے لگتا. . . . .

طوفان کے آنے جانے کا سلسلہ بڑا صبر شکن ثابت ہوا۔ اس کی آمد و رفت کی مشقتوں سے احساسات تھک کر چور چور ہو گئے۔ یہ آتش سیال کا دھڑکتا ہوا مرکز اس طوفان کے خنک اور تند جھونکوں کے سامنے رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگا۔ اور احساس کرب احساس سکون میں تبدیل ہونے لگا ہوا کے پے در پے جھونکوں نے آتش سیال کو سرد کرنا شروع کیا۔ احساسات جو بے ربط تھے اب مسلسل ہونے لگے وسیع فضا سے سکڑ کر اب ایک نقطہ پر جمع ہونے لگی۔ دماغ اب تک مفلوج جیسا تھا اور اس کے عدم وجود کا احساس آہستہ آہستہ اپنے وجود کی طرف مائل ہونے لگا۔ . . . دفعتاً

کہیں دھماکا ہوا جس سے سارے وجود کا احساس رنگ برنگی روشنیوں میں تبدیل ہو کر غائب ہو گیا۔

پہلی بار مستقل وجود نے ... اپنی جگہ لی۔ احساس نے خودی کی صورت اختیار کی ... [illegible] ... مگر کون ہوں۔ کیا ہوں اور کہاں ہوں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ دماغ پر ایک کوئی میلیں شوک ... تھا۔ پسلیاں سانس کی تکلیف سے پہلو میں چیخ رہی تھیں ... اور ... عجیب ... اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ دماغ میں احساسات کیلوں کی طرح چبھتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کی تکلیف ناقابل برداشت تھی اور مر جانے کو جی چاہتا تھا ... میں چیخ کر کہنا چاہتا تھا ... مرا ... مگر ... زبان کے تصادم میں کھو گیا ... پر قطرہ قطرہ اٹھا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا ... کوئی ٹھنڈی شے دل کی راہ دماغ میں اتر گئی۔ اس کی ٹھنڈک اور تازگی کے احساس نے روح حیات و انبساط کو اپنے اندر محسوس کیا۔ لطافت و سکون سے محسوسات کی دنیا میں ... لگی۔ دماغ میں کیلوں کے ٹھکنے کی آواز اور تکلیف ... آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ اور محسوس ہوا کہ خمار نیند کے روپ میں ساری کائنات پر چھانے لگا ہے ...!

خمار کا یہ عالم رفتہ رفتہ چھٹتے ہوئے بادل کی طرح صاف ہو گیا۔ دماغ ہلکا تھا مگر سوچنے کے قابل نہ تھا۔ یادداشت حرف غلط کی طرح مٹ چکی تھی۔ اس لوح سفید پر داستان ماضی کا ایک نقطہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ اپنی خودی کا احساس مفقود تھا جس کی وجہ سے اپنی ہستی کچھ نہ تھی۔ دماغ عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اور خیالات آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے کہ دفعتاً سر میں کوئی قوت ایک بار پھر گولی کی طرح پیوست ہو آ چلی گئی۔ یہ تکلیف تڑپا دینے والی تھی میں چیخ اٹھا ہائے کوئی بچاؤ۔ میں مرا۔ سارے جسم میں ... کوئی مادہ ... ہاں خوفناک تھا۔ دوڑتا محسوس ہوا۔ دماغ کی تکلیف رفتہ رفتہ ... کی طرح سمٹ سمٹ کر غائب ہو رہی تھی۔

بہت دور کہاں کسی مانوس آواز نے آشنا ... شاید ... شاید ... میں نے غور کیا۔ بہت غور کیا۔ آخر میرا خیال کھڑکی کی طرح کھل گیا۔ یہ تو انسان کے ہنسنے کی آواز تھی۔ ... ہاں، ہاں یہ انسانوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں بھی انسان ہوں۔ اور اسی طرح میں بھی بول سکتا ہوں۔ تو مجھے ہنسنا چاہیے۔ مگر کس طرح، ہاں یاد آیا منہ اور حلق سے مگر یہاں تو حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی تھی۔ اور اس گھٹن سے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں ہنس نہیں سکتا تھا! دفعتاً دماغ میں ایک خیال روشن تیر کی طرح بھولی ہوئی یاد کی لکیر کھینچتا ہوا چلا آیا ... میرا ہاتھ کہاں ہے؟ اس سے حلق کی یہ چیز نکال سکتا ہوں۔

ہاتھ، مگر یہ تھا کہاں؟ ہاں یاد آیا یہ دائیاں اور یہ بایاں مگر ادھر یہ تو اٹھنے سے مجبور تھے۔ بھولے ہوئے خیالات نے بجلی کی طرح چمک کر ایک اور یاد کو پیش کیا۔ یہ ہاتھ کیوں نہ اٹھتے تھے۔ دیکھوں! مگر کس طرح؟ ہاں، آنکھیں! مگر یہ آنکھیں کہاں تھیں؟ خیال نے آنکھوں کی تصویر پیش کی معاً اپنی مندی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ مگر یہ کیا؟ ہر ایک بند کوٹھڑی اور ہر طرف اندھیرا گھپ۔ روح اس کا جیل جیسی تاریکی سے گھبرانے لگی۔ جی چاہا چیخوں مگر چیخ بھی نہ سکا۔ مجبوراً دماغ اپنے منتشر احساسات کو ترتیب دے کر ان میں ماضی کی یاد کے پیوند لگانے لگا۔ ...

یاد آئی مگر انتہائی دھندلی سی جیسے علی الصباح کہر آلود سماں میں کوئی سفید کپڑے پہنے ہوئے دور سے نظر آئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا مگر نہ کچھ پتہ چلا اور نہ تاریکی میں کوئی کرن نمودار ہوئی۔ میں خموشی سے اپنے خیالات کو سلجھا کر ترتیب دینے کی فکر میں تھا۔ کہ پھر مانوس آوازیں سنائی دیں ان آوازوں کو سن کر اپنے انسان ہونے کا احساس دوبارہ زندہ ہوا۔ میں مجبوری سے ادھر ادھر اپنی آنکھیں گھما کر دیکھ رہا تھا۔ کہ میرے اندھیرے گھپ کمرہ میں روشنی کی دو باریک کرنیں گھس آئیں۔ اب میں ان کرنوں کو دیکھ سکتا تھا! یہ کرنیں جہاں سے آ رہی تھیں۔ وہ دو چھوٹے چھوٹے شیشہ سے بند سوراخ تھے جن کے باہر روشنی آنکھیں اندر کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔ روشنی کی یہ کرنیں میرے سارے جسم پر سر سے پاؤں تک گھوم گھوم کر پڑنے لگیں ...

...ان کرنوں کے ساتھ ... وہ انسانی آنکھیں مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ فضا، روشنی کی یہ کرنیں غائب ہو گئیں۔ اور سارا کمرہ تاریک ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں چلایا: روشنی، روشنی خدا کے لئے تھوڑی سی اور روشنی ... اندھیرے گھپ ڈبہ کے باہر انسانی آوازیں سنائی دے ... محسوس ہوا کہ میرا کمرہ کسی خاص قسم کے ... میں ... عجیب قسم کی بو تھی اور گرمی۔ اس گرمی سے میرا سارا جسم پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرا سارا وجود پانی بن کر میرے مسامات سے خارج ہو جائے گا۔ یہ کیفیت نہ جانے کب تک طاری رہی۔

جب ہوش آیا۔ تو اس دفعہ میرا احساس زیست پہلے سے ... تھا۔ سانس کی تکلیف جاتی رہی تھی۔ دماغ میں چمک اور روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ... گھٹی ہوئی چیخ حلق سے باہر نکل سکتی تھی۔ میں بول سکتا تھا۔ سن سکتا تھا۔ دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ زندگی۔ امنگوں سے بھری چلبلاتی زندگی میری رگ رگ میں پیوست ہو رہی تھی اور یادداشت کی سفید تختی پر ماضی کے دھندلے نقوش سیاہ حرفوں کی طرح آہستہ آہستہ ابھرنے لگے تھے! ......

یاد نے ایک نئی کروٹ لی۔ دماغ پر ایک حد درجہ غمگین یا ... قبضہ تک پیوست ہو گیا ...... میں ... شاید مرض الموت میں مبتلا ہو گیا تھا ...... یہی موت کے خیال سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ دماغ خوف سے ہلنے لگا اور دل آپ ہی آپ گویا بیٹھ کر خاموش ہونے لگا۔ ... تخیلات کی ... تھی۔ وہ نقشہ پیش نظر ہو گیا۔ جب میں بیمار پڑا تھا اور میرے بہی خواہ میرے پلنگ کے گرد جمع ہو کر میرے ڈوبتے ... کی تسلی کر رہے ... کمزور اور ناتواں سی کوشش کر رہے تھے۔ میری بیگم زار و قطار رو رہی تھی۔ بچے ابا ابا کہہ کر پکار رہے تھے۔ اور ... میرا یہ حال تھا کہ لمحہ بہ لمحہ روح حیات آہستہ آہستہ ... جا رہی تھی۔ ... اکھڑتی ہوئی سانس اور ڈوبتی ہوئی نبض میں رفتہ رفتہ کم ہو رہی جا رہی تھی۔ روشنی تیز اور چمکدار روشنی آہستہ آہستہ ... اور خوفناک اور دھندلے میں تبدیل ہو کر ابدی تاریکی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی ......

آغوش مادر سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات زندگی متحرک تصویروں کی طرح میری بند آنکھوں کے پردے میں ایک ایک کر کے آ اور جا رہے تھے۔ زندگی کی مسلسل کشمکش اور جنگ و جدل کا انعام عجیب قسم کے لذیذ سکون کی صورت میں پیش ہو رہا تھا۔ غم دور تھا۔ خوشی معدوم تھی۔ امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ اور حسرتوں کی کہانیاں ... رہی تھی۔ ماضی یادداشت کی سفید تختی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور مستقبل ... کر ... سحر کا ٹمٹماتا ہوا تارہ بن گیا تھا۔ جو ڈوبتی ہوئی زندگی کے افق پر ایک نئی زندگی کے طلوع کا پیغام دے رہا تھا۔ ... جو تمنائیں تھیں اور آرزوئیں جو ناتمام تکمیل تھیں سب کی سب ... دھارے کی طرح بہتی ہوئی ابدی سکون کے اتھاہ ساگر میں ملتی چلی جا رہی تھیں جہاں نہ جد و جہد کا عالم تھا اور نہ احساسات کے مد و جزر۔ میرے پر جمود ... رگ رگ میں سیاہی چھائی چلی جا رہی تھی۔ جسم کا بند بند ڈھیلے بیٹھے ... ابدی لذت سے سکون پذیر ہو کر شانت ہوا جا رہا تھا۔ حقیقت جامد اور ٹھوس حقیقت نہ جانے کیوں وہم و قیاس میں تبدیل ہوئی چلی جا رہی تھی۔ قرب بعد بن گیا تھا۔ اور احساس وسعت مفلوج ہو کر ایک دھڑکتے نقطہ پر آ گیا تھا۔ الغرض ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ بے چین زندگی ... ہر لمحہ گرفت سے باہر ہوتی جاتی ہے اور ایک لامعلوم ... کا ... اس کی جگہ لیتا جاتا ہے۔

ماضی کے واقعات کو ... دوڑتے ہوئے خیالات ... لگے ... آنکھیں ... ڈھونڈنے لگیں ... یہ مغموم احساسات فی الحقیقت خوف کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ اور اب میں ان سے کہوں۔ میں بالکل اچھا ہوں ... صحت کی خوش خبری سنانے کو دل سینہ کے اندر ... اچھل رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان سے فوراً کہوں: "میری جان، نہ روؤ، یہ دیکھو اب میں بالکل صحت مند ہوں" مگر میں اپنا خیال ظاہر کرتا تو کس سے؟ میں تو ایک تنگ و تاریک ڈبہ میں بند تھا! آخرش میں ... اکتا گیا۔ میں نے اپنی تنہائی اور بے بسی سے تنگ آ کر آواز دی "بیگم، ارے یہ تم کہاں ہو؟" میں نے اپنی آواز کو خود پہلی بار سنا اور اسے سن کر چونک پڑا جیسے ... میری آواز میں خود اجنبیت محسوس ہوتی۔ میری آواز پر روشنی کی کرنیں مجھ پر پڑنے لگیں

اور اس دفعہ ان سوراخوں سے مجھے دو ہنستی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ میں نے ان آنکھوں کو مخاطب کر کے کہا بھائی تم کون ہو؟ مجھے اس قبر سے جلد نکال لو۔ تم نے مجھے اس ڈبہ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟ ہائے میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ میں تو اس تنگ جگہ میں پڑا پڑا تختہ کی طرح اکڑا جا رہا ہوں۔ یہ کہکر میں نے اس روشنی کی کرنوں میں اپنے جسم کو دیکھنا چاہا۔ مگر سر نہ اٹھا سکنے کے سبب سے کچھ دکھائی نہ دیا۔ صرف اتنی سی جھلک دکھائی دی کہ جسم کے اوپر سفیدی مائل سبز پلاسٹر کا خول چڑھا ہے۔ [illegible] سینکڑوں موٹے پتلے رنگ برنگے تار [illegible] ہیں۔ آنکھیں اپنی قبر کے دوسری طرف پھیریں تو دیکھا کہ سینکڑوں آلوں کی بڑی چھوٹی گھڑیوں کی سوئیاں ہل رہی ہیں۔ کوئی سوئی چل رہی ہے۔ کسی سے باریک سفید اور سبز چنگاریاں نکل رہی ہیں اور کسی سے عجیب قسم کے بے رنگی روشنی کے شعلے نکل رہے ہیں۔ میں ان چیزوں کی کارستانیوں کو بڑی حیرت اور لطف سے دیکھ رہا تھا کہ [illegible] روشنی والی کرنیں یک لخت کٹ کر غائب ہو گئیں۔ اور معاً میرے سارے دل و دماغ میں روح پرور خنکی اور احساس لذت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور یہ اتنی لذیذ تھیں کہ ان کے احساس سے مجھے فوراً گہری نیند آ گئی۔

میں جب نیند سے بیدار ہو کر ہوش میں آیا تو دیکھا کہ ایک عجیب وضع کے پلنگ پر لیٹا ہوں اور یہ پلنگ شیشہ کے ایک عظیم الشان کمرہ کے وسط میں رکھا ہے۔ میرے پلنگ کے چاروں طرف مختلف قسم کے انوکھے اور غیر معمولی آلہ جات رکھے تھے۔ اور ان آلوں سے [illegible] نالیاں اور تار میرے پلنگ کے مختلف حصوں سے ملے ہوئے تھے۔ گویا میں بلند و بالا قد آور سبز [illegible] آلوں کی قطار کے درمیان پڑا تھا۔ یہ کمرہ جس میں میں پڑا تھا۔ اتنا صاف [illegible] چمکدار اور روشن تھا۔ کہ میں نے آج تک [illegible] کا صاف ستھرا اور بلند درجہ آرام دہ کمرہ آج تک نہ دیکھا تھا۔ اس کمرہ کا فرش چھت کی طرح روشن تھا۔ اور اس پر میرے پلنگ اور میرے پاس پڑے ہوئے آلوں کے عکس پڑ رہے تھے۔

تنہائی ایک بار پھر تنگ کرنے لگی۔ میں بیگم کے انتظار میں تھک کر اکتا گیا حتیٰ کہ میرے لئے اور کوئی شغل نہ رہا۔ تو میں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آلوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ ان کی خاصیت کچھ سمجھ میں آئے۔ ہر آلہ پر عجیب قسم کی اجنبی مگر مانوس زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جسے میں پڑھ لیتا تھا مگر پھر بھی کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ہر آلہ میں مختلف رنگ کی سوئی یا سوئیاں لگی ہوئی تھیں۔ جو کانپ رہی تھیں۔ اور اپنی زندگی کا اعلان کر رہی تھیں۔ ان آلوں میں ایک عجیب آلہ تھا جس نے میری مکمل توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ یہ ایک آلہ تھا جسکا ڈائل روشن تھا۔ اور اس پر کسی انسان کی دھڑکن صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس انسانی دل کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کی شریانیں اور وریدیں اس کے مختلف خانوں میں خون کی آمد و برآمد بالکل اسی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے واقعی کسی انسان کا پھڑکتا ہوا دل آنکھوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ میں اس دل کی حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہ مجھے دفعتاً محسوس ہوا جیسے یہ دل میرے دل کے ساتھ ساتھ ہم آہنگی سے دھڑک رہا ہو۔ میرے ذہن میں خیال کا آنا تھا۔ کہ میرا دل زور سے دھڑکا اور ساتھ ہی ڈائل کے دل نے بھی بالکل اسی طرح دھڑکنا شروع کیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہ اوپر جو انسانی دل کی تصویر دھڑک رہی تھی وہ حقیقت میں میرے دل کی تصویر تھی۔

اپنی دل کی دھڑکن کو اپنی آنکھوں سے دیر تک دیکھتا رہا مگر یہ شغل کب تک مجھے بہلائے رہتا۔ آخرش اس کھیل سے بھی جی اکتا گیا۔ اور بیگم اور ان کی پیاری پیاری روتی ہوئی آنکھیں پھر یاد آئیں۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ دماغ شدید غم کے ہیجان سے مفلوج سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے۔ یہاں میرے دل میں شدید غم و تکلیف کے جذبات کا تلاطم اٹھ رہا تھا۔ کہ پاس پڑے ہوئے ایک آلے میں شدید ہیجانی کیفیت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس کی سوئی تھرتھرا تھرتھرا کر گھومنے لگی۔ اس کے ڈائل سے مختلف قسم کی روشنیاں چمکنے لگیں۔ گویا اس آلے کی تمام حرکتیں ہیجانی کیفیت کا اعلان کرنے لگیں۔ ادھر یہ آلہ پر ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ادھر پاس ہی رکھے ہوئے [illegible] میں کوئی گھنٹی خود بخود بجنے لگی +

۹

الماس رامپوری

قند پارسی

رازِ عشقت بکسے جز تو رسیدن ندہم | [illegible]
تا ندانند کہ برمن چہ گزشت از عشقت | [illegible]
تا پشیمانیٔ بے صرفہ نہ بینم از تو | [illegible]
آن قدر مستیٔ ازاں چشمِ خماری دارم | [illegible] رسیدن ندہم
گر گلِ تازۂ حسنِ تو بدستم برسد | بکسے این گلِ نو خاستہ بوئیدن ندہم
داغ در سینۂ من چوں گلِ افسردہ بماند | بکسے این گلِ نو خاستہ چیدن ندہم
برنتابم کہ بآئینہ رخِ خود بینی | مردمِ عکس ترا روئے تو دیدن ندہم
بسرت پائے تصور بشکستم از رشک | کہ کسے را بحریمِ تو رسیدن ندہم

آں چناں گرم رَوِ وادیٔ عشقم [illegible]
خار را رخصتِ در پائے خلیدن ندہم

طالوت

نغماتِ نعت

قدرِ بہشت چوں کند چشمِ وفا سرشتِ ما | کوئے مدینہ بس روضۂ ما بہشتِ ما
قبلۂ ماست روئے او کعبۂ ماست کوئے او | جائے گزید [illegible] گزشتِ ما
سر بقدم نہادہ ایم جاں بوفا سپردہ ایم | بیش ازیں دو لفظ نیست حاصلِ سرگزشتِ ما
از نگاہِ گرمِ تو لرزہ بقصرِ معصیت | وے ز کلامِ نرمِ تو خلد بکف کنشتِ ما
بادِ سمومِ حادثات قطع کند رگِ حیات | گوشۂ چشمِ التفات گر نکنی بکشتِ ما

خوبیٔ تو نیاورد سر بعیارِ کائنات
گشت اگر نہ خوب تر حالِ خراب و زشتِ ما

Nature's Blood Bank

چالیس سال کے بعد آپ کو

نیا خون

درکار ہے۔ اس عمر میں اگر اپنی صحت کے متعلق آپ نے ذرا بھی غفلت کی، تو جلد ہی آپ کی کمر جھک جائے گی، بڑھاپا آپ کی زندگی کو تلخ بنا دے گا، تن درستی ہو۔ یا مریض۔ دونوں حالتوں میں آپ کو ہمدرد کے ماءاللحم کی ضرورت ہے کیونکہ

It's a Blood Bank in a Bottle

MAULLAHAM

ہمدرد کا

ماءاللحم

دوا نہیں ہے، بلکہ تازہ خون کا خزانہ ہے یہ حلق سے اترتے ہی خون بن جاتا ہے اسے تازہ پھلوں اور مقوی میووں اور



صحت بخش غذاؤں اور خاص قیمتی دواؤں کے جوہر سے دوا سازی کی جدید ترین مشینوں سے جدید اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے، دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ معالج استعمال کراتے ہیں! یہ جنرل ٹانک ہے۔ ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی بوتل پانچ روپے،

اپنے کیمسٹ یا ہمدرد دواخانہ دہلی سے طلب کیجیے

نتیش تبرالی۔ اے

۲

منزلیں

دلہن کی طرح سجی ہوئی کار خاموش سڑک پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ لہلہاتے ہوئے جوان کھیت۔ دُوں دوں کرتے ہوئے تھکے ماندے رہٹ اور جوانی کے نشے میں مخمور گیتوں کو پیچھے چھوڑتی کار نہایت سرعت سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کار میں بیٹھا ہوا سرلش آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں بادل کے دو ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف! اس کے پہلو میں ایک سُرخ سی گٹھڑی پڑی تھی ––– سرلش کی نئی نویلی دلہن!

کار کی فضا نئی نویلی دلہن کے کپڑوں پر لگی ہوئی سینٹ اور خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ سرلش کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے یہ بھینی بھینی تازہ خوشبو اس کے تمام ارمانوں کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اس نے کھڑکی سے اپنی نظر ہٹا کر اس سرخ گٹھڑی پر جما دی۔ لال لال کپڑوں میں چند بے ڈھنگے شکن۔ اُس نے فوراً منہ موڑ لیا اور اپنی نظریں پھر پھیلتے ہوئے نظاروں پر گاڑ دیں۔ وہ سوچنے لگا۔ اُسے ایک تلخ دوا پینے پر خواہ مخواہ مجبور کیا گیا تھا۔ اور یہ سب اس کی مرضی کے خلاف! اُس نے اُس پھندے سے بچنے کے لئے تمام ممکن جتن کئے تھے۔ لیکن اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ وہ تلملایا اُس نے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن سب بے سود۔ اس کے ماں باپ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اُس نے ہار کر لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن یہاں بھی اسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ پھندا نزدیک آتا گیا۔ اور آخر کار آج اس کے گلے میں پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کسی نامعلوم چیز کی طرف اشارا کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی پسند!..... بھلا اس کی کون پرواہ کرتا تھا؟ اس نے اپنی پسند بتائی۔ لیکن مانے تو کون مانے۔ سب نے سُنی ان سنی کر دی اور وہ اُس بے بس معصوم بچے کی طرح چلاتا رہ گیا جس کی ماں اُس کی چیخ پکار سن کر بھی اُسے دودھ نہ پلائے اور اس پر طرّہ یہ کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ دولہا دلہن کا جیون نہایت سکھ شانتی سے گزرے گا۔ اس کے تمام حسین خواب دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

سرلش کے دماغ میں ایسے خیالات جھنجھنا رہے تھے۔ اسے یکا یک محسوس ہوا جیسے فضا نے اُس کی شادی کے بینڈ باجوں کی جذب کی ہوئی تمام رسیلی سریں پھر سے اگل دی ہوں۔ اس کے دماغ کے پردے آپس میں ٹکرانے لگے۔ اُس کے سامنے رخصت ہونے کا منظر ایک بار پھر آ گیا۔ شہنائیوں کی پُرجوش آوازیں کوئی سُرخ سی چیز اُس کی موٹر میں دھکیل دی گئی تھی ––– بالکل ایک فالتو چیز کی طرح۔ اور اس کے بعد چند روتی ہوئی آوازیں فضا میں گونج اٹھی تھیں۔ کھڑکی کے عین سامنے اس کے والد، ساس اور سُسر کھڑے تھے۔ چند گھٹی گھٹی آوازیں۔ چند دبے دبے سے گیت اور بینڈ کی تیز آواز ––– اور پھر کار آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ چھن چھن۔ اُس کی کار پر پیسوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے چند لڑکے فضول ایک دوسرے سے پیسے چھیننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

موٹر تیزی سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ اپنے خیالات کی تیز دھارا میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے کبھی خیال تک نہ آیا تھا کہ اُسے ایک دن نینا کو بھول جانا ہوگا۔ وہ اسے اپنے سنہری سپنوں کی رانی بنا چکا تھا۔ اُس نے کئی بار تصورات کی دنیا میں اپنی شادی کا سپنا دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار نینا کو اسی طرح موٹر میں اپنے پہلو میں بیٹھے پایا تھا۔ لیکن آج یہ اُس کی جگہ....... جس وقت شہنائیوں کے رسیلے نغموں میں سرُوج کو اس کی کار میں دھکیل دیا گیا تھا تو

اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے پر برف کی ایک قاش رکھ دی ہو۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ نینا اُس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ یکدم کار سے اتر کر کسی نامعلوم سمت کو چل دے۔ اُس نے اٹھنا بھی چاہا تھا۔ لیکن کار کا دروازہ کھٹ سے بند کر دیا گیا۔ اور وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا — بالکل ایک بے بس اور لاچار بچے کی طرح جسے ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہو

آسمان پر بادل کے ٹکڑے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف اور جھاڑیوں کے سائے لمحہ بہ لمحہ لمبے ہوتے چلے جا رہے تھے ہُوا میں ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ دھوپ کی گرمی کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سورج اور زمین کے درمیان فضا میں ایک لطیف سایہ لہرا رہا ہو۔ کار کی کھڑکی میں سے دھوپ کا مستطیل دھبہ اس کی گود میں رقص کر رہا تھا۔ سورج کی یہ کرنیں ایک خوشگوار گرمی لئے اُس کے جسم میں دُور دُور تک گھُستی چلی جا رہی تھیں۔ اُسے اپنے سارے جسم میں ایک پھریری سی محسوس ہوئی۔ اور یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے یہ گرم گرم لطیف کرنیں اُس کے بجھے ہوئے دل کو پھر سے روشن کر دیں گی۔ اُس نے ایک نظر سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی سروج پر ڈالی۔ سروج سر جھکائے کھڑکی کی طرف مُنہ کئے سیٹ کے دوسرے کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں نے سر سے پاؤں تک سروج کا جائزہ لیا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے دور سیٹ کے دوسرے کونے پر نینا ہی بیٹھی ہو۔ اس کا ہاتھ اچانک آگے بڑھا اُس کے لب کچھ کہنے کے لئے کھلے۔ سیٹ کے دوسرے کونے میں ایک جنبش سی ہوئی۔ اور وہ سرخ کپڑوں میں لپٹا ہُوا مجسمہ اور پرے سرک گیا۔ اس کا ہاتھ یکا یک رُک گیا اور لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اُس کے ذہنی احساسات کو ایک زبردست دھکا پہنچا تھا۔ اُسے فوراً خیال آگیا — کہ اس کا ہاتھ نینا کی طرف نہیں بلکہ سروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ واپس اپنی جگہ پر جا گرا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر اپنے جسم کو سیٹ پر پھیلا دیا۔ اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

آج سے دو سال پہلے سریش کی ملاقات نرملا سے ہوئی تھی۔ اُسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نینا ابھی اُس کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اُسے یُوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس کی زندگی نرملا کے ساتھ محبت کے مضبوط تاروں سے باندھ دی گئی ہے جب اس نے پہلی بار نرملا کو دیکھا۔ تو اُس نے خیال کیا تھا کہ وہ حسن کو ایک کامل صورت میں دیکھ رہا ہے۔ اُس کے لئے نرمل کے حسن سے بڑھ کر کسی صورت کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ حُسن کے ہر معیار سے وہ پیکر کامل تھی۔ اُس کا بھرا ہُوا گداز جسم۔ سفید سفید نازک باہیں۔ اس کے نازک لب شرمسار محجوب سے لب جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پریشان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ۔ مرمریں انگلیوں کی پوریں — جنگلی گلاب کی طرح حسین۔ اس کی کنول کی نازک پتیوں جیسی پلکیں۔ اُس کی آنکھیں — نیلی نیلی پتلیاں کی اتھاہ گہرائیاں — وہ آنکھیں ان دو پاک و صاف جھیلوں کی مانند تھیں۔ جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں۔ اور جہاں کسی انسان کے قدم نہ پہنچے ہوں — وہ ان سب کو دیکھ کر جھوم اٹھا تھا۔

نرملا ڈرائینگ روم میں اس کی بہن آشا سے باتیں کر رہی تھی۔ اچانک سریش کو کچھ ناول لینے کے لئے ڈرائینگ روم میں جانا پڑا۔ نرملا کی پشت سریش کی طرف تھی۔ اس کی آواز گنگناتے ہوئے جھرنوں سے بھی میٹھی تھی۔ سریش دروازے میں کھڑا کئی لمحوں تک خاموش اُس کی طرف تکتا رہا۔ اچانک نرملا نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ تو وہ بات کہتے کہتے یکدم خاموش ہو گئی۔ وہ جھینپ سی گئی تھی۔ سریش کو یوں محسوس ہُوا۔ جیسے اس کی موجودگی نے بہتے ہوئے چشمے کا مُنہ بند کر دیا ہو۔ اچانک آشا نے مُڑ کر دیکھا۔

"اوہ! یہ تو بھیا ہیں نرمل! تم اس دن پوچھ رہی تھیں۔ کہ یہ ڈرائینگ روم کی تصویریں کس نے بنائیں؟ یہ سب بھیا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہیں۔ بھیا تم نرمل کو اپنی بنی ہوئی کچھ اور تصویریں دکھاؤ۔ یہ اُس دن مجھ سے کہہ رہی تھی"

"واقعی آپ کی تصویریں نہایت خوبصورت ہیں" نرملا نے نظریں نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو آرٹ سے بے حد دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ آپ خود بھی تصویریں بناتی ہوں گی؟"

"جی ہاں۔ کبھی کبھی گیسٹ ضرور لیتی ہیں" آشا نے شوخی سے کہا۔ جو غالباً کملا کر ہنس پڑی اور پھر وہ سریش کی طرف اس طرح دیکھنے لگی۔ جیسے وہ اُس کے سوال کا جواب ہاں میں دینا چاہتی ہو۔ سریش نے ڈرائینگ روم کی الماری میں سے چند تصویریں نکالیں اور انہیں لاکر میز پر رکھ دیا۔

"یہ دیکھو نرمل۔ بھیا کو اس تصویر پر لکھنؤ آرٹس ایگزیبیشن کی طرف سے انعام دیا گیا تھا!"

"جی ہاں۔ اور شاید انہوں نے انعام قبول کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھا ہوگا؟" یہ کہہ کر نرملا ہنس پڑی اور کمرہ پھر یکبار قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ بھیا انعام کو تو اس طرح جیب میں ڈال لیتے ہیں جیسے تم اور میں کسی رس گلے کو منہ میں" آشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور یہ کسی قدر انعام لینے میں خوش قسمت بھی واقع ہوئے ہیں۔ انعام تو انہیں کئی تصویروں پر ملے ہیں۔ لیکن مجھے یہ تصویر بے حد پسند ہے۔ یہ دیکھو عنوان ہے "خاموش نغمے" اس عورت کی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی نگاہیں۔ جیسے وہ دل ہی دل میں کسی نامعلوم جذبے کے ماتحت مسکرا رہی ہو۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ لیکن شدتِ خوشی سے الفاظ اُس کے لبوں پر آکر رک جاتے ہوں۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کی خوشی میں حصہ لے رہا ہے۔ درخت کی یہ بے پرواہ شاخیں جیسے یہ بھی وفورِ مسرت سے ناچ اٹھی ہوں۔"

"تم تو شاعری کرنے لگیں" نرمل نے نظریں نیچے رکھتے ہوئے مسکرا کر آشا سے کہا۔

"جی ہاں۔ مصوری اور شاعری میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے اُن کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا" آشا نے کہا۔

"پھر تو تمہارے بھیا شاعر بھی ہیں" نرمل نے سریش کی طرف دیکھ کر آنکھیں نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"دراصل شاعری اور مصوری دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں مصور تصویر کو رنگوں سے بناتا ہے۔ اور شاعر لفظوں سے، دونوں چند اڑتے ہوئے لمحوں کو مستقل طور پر مقید کر دیتے ہیں۔"

نہ جانے سریش کو کملا کا اس کی طرف دیکھ کر اور پھر نظریں نیچے رکھ کر مسکرانا کیوں دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ وہ جب تک وہاں بیٹھا رہا اس کی نگاہیں کملا کے چہرے پر گڑی رہیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کے حسن کی مے پیتا رہا۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ سب اسی طرح ایک دم ایک ابدی تصویر میں تبدیل ہو جائیں۔ اور وہ بالکل اسی طرح۔ اس طرح کمل کی طرف تکتا رہے۔ اور اس کے کان اس کی مدھری آواز اور سُریلے قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اُسے کمل کی موجودگی میں ایک نہایت خوشگوار لطیف سی گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے خود یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کمرے کی فضا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا چلا جا رہا ہو۔

پھر اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب وہ آشا۔ کملا اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ دریا کے کنارے 'مون لائٹ پکنک' کے لئے گیا تھا۔ کمل اس رات کتنی خوبصورت نظر آ رہی تھی! چودھویں رات کا چاند اپنے پورے حسن اور لطافت کے ساتھ دریا کی ننھی ننھی لہروں کی گود میں جھولا جھول رہا تھا۔ دریا نہایت خاموشی سے ایک پُراسرار ترنم ریز گیت گاتا ہے چلا جا رہا تھا پل کا سایہ ان خاموش لہروں کے سینے پر تھرتھرا رہا تھا یکایک سریش نے محسوس کیا کہ وہ کمل کے ساتھ تنہا ہے۔ باقی تمام لوگ دریا کے کنارے چاندنی رات کا لطف اٹھانے کے لئے سیر کو چل دیئے تھے۔ وہ چند لمحوں تک کمل کی طرف دیکھتا رہا کمل دریا کی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں لرزتے ہوئے کئی چاند پانی میں نہا رہے تھے۔ اور پھر سریش نے یکدم اٹھ کر گراموفون پر ریکارڈ لگا دیا۔

یہ چاند نہیں۔ چاند نہیں۔ تیری آرسی ہے۔

کملا نے اچانک اس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے منہ موڑ لیا۔ سریش کو یکایک یوں محسوس ہوا جیسے پانی کی جھلملاتی ہوئی سیمیں سطح۔ پیڑوں اور جھاڑیوں کے خاموش سائے آسمان پر پھیلے ہوئے ستارے کملا سے جھوم جھوم کر کہہ رہے ہوں۔

یہ چاند نہیں۔ چاند نہیں۔ تیری آرسی ہے۔

کملا نے پھر سریش کی طرف دیکھا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں نیچے کر کے مسکرا دی۔ اچانک سریش کے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گئے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے

اس کے جسم کو پنکھ لگ گئے ہوں۔ اور وہ بلندیوں میں اڑتا چلا جا رہا ہو۔

یکایک وہ چونک پڑا۔ اُس کا سیٹ پر پھیلا ہُوا جسم سروج کے جسم سے مس ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اپنے آپ کو سمیٹ کر اچھی طرح سے بیٹھ گیا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر کھڑکی کے پاس لگے ہوئے ہینڈل کو پکڑ لیا۔ اور اُس سے کھیلنے لگا۔ اس کی نظریں سروج پر جمی ہوئی تھیں سورج کی الوداعی کرنیں سروج کے چہرے کو جگمگا رہی تھیں۔ دفعتاً اُسے محسوس ہُوا کہ سروج بہت حسین ہے۔ اُسے شفق کی روشنی میں اُس کے چہرے کے نقوش نہایت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر سروج کے جسم پہ نگاہ ڈالی۔ سروج کے سُرخ کپڑوں میں شکن بڑھتے چلے جا رہے تھے وہ نہایت تیزی سے سانس لے رہی تھی۔ سروج کے ہاتھ بار بار نہایت بے چینی سے جسم کو سُرخ دوپٹے سے ڈھانپنے میں لگے ہوتے تھے۔ اُسے اُن سُرخ کپڑوں کے نیچے ایک اضطراب کا طوفان مچلتا ہُوا دکھائی دیا۔ دھوپ کا ایک حلقہ اس کی گود میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ بالکل سروج کے مچلتے ہوئے ارمانوں کی طرح،

کار نہایت سرعت سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ آسمان پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے بادلوں کے دو ٹکڑے نظروں سے غایب ہو چکے تھے۔ مغربی حصّے میں شفق گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آسمان سے سپنوں کے سے سرمئی سائے زمین پر آہستہ آہستہ اتر رہے تھے۔ سیاہی مائل بادل لال لال شفق کے پس منظر میں تصویروں کی طرح کھنچے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چند لمحوں تک ان حسین نظاروں کا لطف اٹھاتا رہا۔ وہ زندگی میں ہر حسین شئے سے محبّت کرتا رہا تھا۔ اُسے یہ رنگوں میں نہائے ہوئے بادل نہایت پیارے معلوم دیتے۔ اُسے یکایک یوں محسوس ہُوا جیسے وہ بلندیوں میں جا کر اِن خوبصورت بادلوں کی سیر کر رہا ہو اچانک اُسے کار کے ہارن کی آواز نے چونکا دیا۔ کار کی رفتار مدھم پڑ گئی اور اُسے یوں معلوم ہُوا۔ جیسے کسی نے اُسے بلندی سے پستی کی طرف پھینک دیا ہو۔ سڑک کے درمیان دو ایک بھولی بھٹکی بھینسیں راستہ روکے کھڑی تھیں۔ ہارن کی آواز سنتے ہی وہ بے تحاشا سڑک سے دور کھیتوں میں بھاگیں۔ اور کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

وہ زندگی میں ہمیشہ حسن کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا جب اس نے کملا کو دیکھا تھا تو اُسے خیال آیا کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن جب اُس نے نینا کو دیکھا تو اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کی منزلِ مقصود چند قدم اور آگے کھسک گئی ہو زندگی کا تمام حسن سمٹ کر نینا میں سما گیا تھا۔ اُسے نینا کے حسن کے سورج میں کملا کے حسن کی ایک شعاع نظر آئی تھی۔ اُس دن سے کملا اُس کی زندگی سے دُور ہوتی چلی گئی۔ اور نینا اس کی روح پر چھاتی چلی گئی۔ یکایک نینا کا مسکراتا ہُوا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ اس کی شیریں آواز جیسے پیانو کے کئی سُر ہم آہنگ ہو کر یکدم فضا میں گونج اٹھے ہوں اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس کی وحشی ہرن کی سی چمکتی ہوئی آنکھیں، اس کے سیاہ چمکدار بال جیسے اماوس کی سیاہ رات نے اپنی تمام تاریکی اِن بالوں میں بکھیر دی ہو۔ اُس کے موتی سے دانت جو اُس کی مسکراہٹ کو دلفریب بنا دیتے، اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ یکایک اُسے یوں محسوس ہُوا۔ جیسے پیانو کے تمام سُر فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ اور اس کے کانوں میں ایک نہایت رسیلی آواز گونج اٹھی ہو۔

"ٹھنڈ ہو رہی ہے ذرا کھڑکی بند کر دیجئے گا" اچانک سروج نے کہا۔ سریش کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی آواز نے اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ اُس نے اٹھ کر کھڑکیوں پہ شیشے چڑھا دیئے۔ لیکن اُس کے دل کے تار ابھی تک ہل رہے تھے

سروج ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی نہایت خوبصورت تھی۔ سروج کا جسم کملا اور نینا کے جسموں سے بھی زیادہ خوبصورت اور کشش انگیز تھا۔ سریش کی نظریں اُس پر جم گئیں۔ اُسے یکایک یوں محسوس ہُوا جیسے اُسے اپنی زندگی میں حُسن کے تناسب کا ایک بہترین ماڈل مل گیا ہو۔

"اگر آپ کو زیادہ سردی لگ رہی ہے۔ تو کمبل ڈال لیجئے" اور اُس نے کمبل لے کر اپنی اور سروج کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش سروج کی طرف تکتا رہا۔ اور پھر اچانک اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سروج کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اُس نے پہلے پہل کملا کے گرد ڈالا تھا!

ہادی مچھلی شہری

کیا ہوگا؟

ہو جو تری اُمید سے خالی وہ دلِ ویراں کیا ہوگا — نغمۂ شوق نہ ہو جس میں وہ تارِ رگِ جاں کیا ہوگا

بیٹھے ہیں وہ سامنے لیکن مجھکو ذرا بھی ہوش نہیں — دل جیسا حیراں ہے میرا آئینہ حیراں کیا ہوگا

کوئی نہیں ہے غم کا ساتھی کوئی شریکِ حال نہیں — تو ہی بتا اس حالت میں اے شامِ غریباں کیا ہوگا

ساری ہستی غم ہو جائے جب بھی مجھے کچھ فکر نہیں — جس کی حقیقت غم سے ہو وہ غم سے ہراساں کیا ہوگا

دل تو یہی کہتا ہے اس کو بات سنا دوں سب دل کی — ذہن میں لیکن یہ نہیں آتا اُس کا عنواں کیا ہوگا

اُس کی طبیعت نازک ہے اور دل کے تقاضے بے پایاں — اُس نے نہ سُننا چاہا تو اے شوقِ فراواں کیا ہوگا

جو نہ سمجھ میں آئے کسی کے جس کی سُوتنا ویلیں ہوں — ایسے عہد سے کیا حاصل ہے ایسا پیماں کیا ہوگا

عشق کی ہر تکلیف میں اک لذت سی پنہاں ہوتی ہے — دل کو جس میں مزا آئے اس درد کا درماں کیا ہوگا

وحشت کے انداز بُرے ہیں خود ہی نہ کیوں کر دوں ٹکڑے — جس کو صرف جنوں ہونا ہے ایسا گریباں کیا ہوگا

دل ہی سے ہستی ہے تیری دل ہی سے ہے میرا وجود — دل ہی نہ قابو میں آیا تو اے غمِ جاناں کیا ہوگا

ظاہر ہو کر بھی تو ہادیؔ حسن رہا پردے ہی میں
آنکھیں جس سے خیرہ ہوں وہ جلوۂ جاناں کیا ہوگا

وسیم مچھلی شہری

داستان

سمجھ سکا تھا نہ کل تک کوئی فغاں میری — زبانِ خلق پہ ہے آج داستاں میری

نہ راہبر کی خبر ہے نہ راستہ معلوم — نجانے منزلِ مقصود ہے کہاں میری

کہا کروں میں دلِ بیقرار کی حالت — سُنا کرے کوئی ہر وقت داستاں میری

قفس کی تیلیاں آہوں سے میری جل نہ سکیں — نہ کام آئی ذرا سوزشِ نہاں میری

کہیں یہ اشکِ مسلسل کا تار ٹوٹ نہ جائے — الٰہی ختم نہ ہو جائے داستاں میری

بھرا ہوا تھا دلِ مبتلا میں درد ایسا — کہ عرضِ حال سے قاصر رہی زباں میری

میں اپنی زیست کا حاصل یہی سمجھتا ہوں — ملا دیں خاک میں وہ خاکِ رائیگاں میری

چراغِ صبح کی صورت بھڑک کے بجھتا ہوں — بہارِ عیش دو روزہ میں ہے فغاں میری

میں لاکھ ان سے چھپاتا رہا فسانۂ غم — نگاہِ یاس نے سب کہدی داستاں میری

تلاشِ یار میں گزری تمام عمر وسیمؔ — لئے پھری مری قسمت کہاں کہاں میری

ماہر القادری

ترقی پسندی اور تنقید نگاری

اُس وقت جب کہ دُنیا "تنقید" (criticism) کی صحیح اہمیت اور افادیت سے ناآشنا تھی، اسلامی لٹریچر میں "تنقید" مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ فنِ اسماء الرجال اسلامی لٹریچر کا وہ سرمایۂ افتخار اور طرۂ امتیاز ہے جو اپنا حریف اور مقابل نہیں رکھتا اور جس کی نظیر دُنیا کے ادب میں مل نہیں سکتی۔ درایت و روایت کے اصول سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے دُنیا کو سکھائے۔ روایت کرنے والوں کی دیانت و پرہیزگاری کی چھان بین، اُن کے اقوال کی جانچ پڑتال، اُن کی قوتِ ضبط و حفظ پر رد و قدح — یہ وہ چند زریں اُصول ہیں جنہوں نے بزمِ علم و دانش میں نقد و نظر کے فانوس روشن کر دیئے۔ جرح و تعدیل کا یہ سلسلہ اگرچہ فنِ حدیث سے متعلق تھا مگر اس بحث و نظر نے نفسِ تنقید سے دُنیا کو روشناس کر دیا اور آگے چل کر لوگ تاریخ و نفسیات، معانی و بیان اور شعر و ادب پر گفتگو کرنے لگے اور اسی بحث و گفتگو کو آج ہم تنقید کے نام سے پکارتے ہیں۔

تنقید کے شور سے ہمارا ادبی ماحول گونج رہا ہے۔ افسانوں اور ناولوں سے لیکر دوہوں اور گیتوں تک پر تنقیدیں ہو رہی ہیں، کتابیں لکھی جا رہی ہیں، تنقید کے نئے نئے اُصول مدون ہو رہے ہیں، کسی کے ہاتھ میں ادب کی ترازو، کسی کی جیب میں سیاست کی کسوٹی اور کسی کی نگاہ میں معاشرت کا مد و جزر ہے۔ اِن تنقید نگاروں میں "ترقی پسندوں" کا ایک گروہ بھی ہم کو نظر آتا ہے جو دُنیا کے ہر مسئلہ اور زمانہ کی ہر تحریک کو ترقی پسندانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کا دعویدار ہے۔ یہ مدعیانِ جدت و ترقی دیکھنے میں انقلاب و آزادی کے پرجوش مبلغ نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی فکر و نظر دانشورانِ مغرب کی غلام ہے، یہ جو کچھ سوچتے ہیں مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، ان کی آنکھوں پر مغربی سرزمین کے شیشے چڑھے ہوئے ہیں، یہ اُن لوگوں کو رجعت پسند کہتے ہیں جو خود اپنی فکر کی نگاہ سے اشیا کو دیکھتے ہیں اور جن کی تخیل مستعار نہیں ذاتی ہے۔

یورپ سے آواز آئی کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے، اس آواز کا سننا تھا کہ "ترقی پسندوں" نے "لبیک" کے نعروں سے فضائے ادب کو معمور کر دیا ابھی یہ نعرے گونج ہی رہے تھے کہ یورپ نے ایک اور کروٹ لی اور "ادب برائے زندگی" کے نعرے بلند ہونے لگے، اس ساز کی پہلی گت ہی پر ہمارے ملک کے ترقی پسندوں کو وجد آنے لگا اور اب لٹریچر میں "زندگی" کی تلاش شروع ہو — زندگی وہ نہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست

ان کی نگاہ میں بازار کے نرخوں کی کمی بیشی کو تلوں کی کانوں ہڑتال اور زنانِ بازاری کے جرائم سے ہمدردی کا نام زندگی ہے یہ ادب کو وقتی حادثات اور ہنگامی مسائل کے پیمانوں سے ناپتے اور اسی ناپ تول کو وہ زندگی کے مسائل کا آخری حل سمجھتے ہیں۔ یورپ نے کہا ہر نظم اور افسانہ کا background (پس منظر) ہونا ضروری ہے "ترقی پسند" بول اٹھے "جی ہاں! ضرور ہی نہیں اشد ضروری ہے" مغرب سے society (سماج) sub-consciousness (تحت الشعور) اور values (اقدار) کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہمارے "ترقی پسندوں" کی نیازمندانہ فطرت نے انہیں فوراً جذب کر لیا۔ "ترقی پسند ادیبوں" (اس میں گنجائش استثنا بھی ہے) کے مضامین اگر آپ غور سے پڑھیں تو جگہ جگہ "سماج" "پس منظر" "تحت الشعور" اور "قدریں" جیسی مرعوب کن اصطلاحیں آپ کو ملیں گی، یہ اصطلاحیں یقیناً وزن اور معنویت رکھتی ہیں اور ان کا استعمال کرنا گناہ نہیں ہے مگر ان "ترقی پسندوں" کا "تحت الشعور" ان اصطلاحوں کو استعمال کرتے وقت یورپ کے "فوق الشعور" سے مغلوب ہوتا ہے اور یورپ کے ادیبوں، شاعروں اور تنقید نگاروں نے ان مدعیانِ انقلاب و ترقی پر جو مسمریزم کا عمل کر دیا ہے اس سے آ[گے] نہ یہ کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

ترقی پسند ناقدین اور انشاپردازوں کے مضامین میں ...

...ت کم سے کم یہ اپنے مغربی استادوں بلکہ خداوندوں کی کہی ہوئی باتیں دہراتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی قوتِ تخیل اور طرزِ فکر ...عطر ہو چکی ہے یہ پستیٔ احساس کی اس منزل میں پہنچ چکے ہیں جہاں انسان اپنی ذات سے مایوس اور متنفر ہو کر دوسروں ہی کی خوبیاں بیان کرتا ہے ۔۔۔ خود ناشناسی، احساسِ کمتری اور غلامی کی یہ انتہائی حد ہے جہاں فرد اپنی انفرادیت اور قوم اپنی خصوصیت کھو دیتی ہے اور پیر کے ناخن سے لیکر سر کے بال تک اور جسم کی کھال سے لیکر روح تک غلام بن جاتی ہے۔

"ترقی پسندوں" کی نگاہ میں صرف وہ ادب "ترقی یافتہ" کہلانے کا مستحق ہے جس میں اشتراکی رجحانات پائے جاتے ہیں جو لٹریچر اشتراکی تصورات کا حامل و ترجمان نہیں ہے چاہے کتنا ہی حسین، ہم آہنگ، متوازن اور مفید و صالح کیوں نہ ہو ان لوگوں کی نگاہ میں "رجعت پسندانہ" اور "غیر ترقی یافتہ" ہے۔ اگر دوسرے مذہب اور مسلک رکھنے والے ادیبوں کی طرف سے بھی "حیوانی ادب" کا الزام رکھ کے دعویٰ کیا جائے کہ جو ادب ہمارے مسلک کی ترجمانی کرتا ہے وہ "انسانی ادب" ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ "حیوانی ادب" یا "وحشیانہ لٹریچر" ہے تو یہ اشتراکی ترقی پسند "تلملا تلملا کر ایڑیاں رگڑنے لگیں۔

میں کہتا ہوں آؤ سب سے پہلے اس بات کا تصفیہ کر لیں کہ دنیا کے کس نظام کو ہم فطری اور صالح نظام کہہ سکتے ہیں۔ وہ کونسا قانون ہے جو ابدی اور سرمدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دنیا کے ہنگامی انقلابات بھی جس کو متاثر نہیں کر سکتے، جس نظام میں افادیت اور عوام کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت موجود ہے، جس میں انسانی فطرت کی فلاح و بہبود کے تمام صالح عناصر پائے جاتے ہیں جو انسان کا قانون نہیں جن اشخاص سے بھول چوک ہو سکتی ہے اور جو حالات و واقعات کا استقصا اور ادراک کرنے میں غلطی بھی کر سکتا ہے۔

بعض "ترقی پسند" دبی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم تو اس ادب کو "ترقی یافتہ ادب" سمجھتے ہیں جو انسانی معاشرے کے لئے مفید ہو اور ...کے تصورات کا آئینہ دار ہو اور جس میں زیادہ سے زیادہ "ادبیت" پائی جائے اگر یہ لوگ اپنی بات میں سچے ہیں تو پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار کیوں نہیں کیا جاتا جن کے مضامین نظر کی بلندی، رائے کی اصابت، خیالات کے سلجھاؤ اور انشا پردازی ...میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، کوثر میں دھلی ہوئی زبان، دلکش انداز، اثر انگیز پیرایہ، دل میں اتر جانے والے عقلی دلائل اور وہ سب کچھ جسے انشا پردازی کی روح اور ادب کی جان کہا جا سکتا ہے ۔۔۔ ترقی پسند ناقدین نے مولانا مودودی کے مضامین پر بھی کیا غلط انداز نگاہ ڈال کر نقد و نظر کی زحمت برداشت کی؟ ۔۔۔ نہیں کی اور یقیناً نہیں کی اس لئے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اشتراکیت کی بجائے "اسلام" کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسی کو دنیا کے دکھ کا مداوا سمجھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی عالمانہ بصیرت مجتہدانہ فکر اور معجز نما انشا پردازی کا کون کافرِ ادب منکر ہو سکتا ہے ان بزرگوں کے ادبی کارنامے اردو زبان کے لئے ہمیشہ باعثِ فخر و امتیاز رہیں گے مگر ترقی پسند ادیبوں کی فہرست میں ان کا نام کہیں نظر نہیں آتا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں جیسا بلند نظر اور شریف بین تنقید نگار بھی ترقی پسندوں کی انجمنِ ناز میں بار نہیں پا سکا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین بھی بارگاہِ ترقی پسندی میں حلقۂ بیرونِ در کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور تو اور مولوی عبدالحق (بی، اے) جیسا انشا پرداز بھی ترقی پسندوں کی پنچایت میں شامل نہیں ہو سکتا ۔۔۔ جس صنم کدے میں کارل مارکس اور فرائیڈ کے مجسموں کی پوجا ہوتی ہو وہاں کسی دوسری تجلی کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت کہاں مل سکتی ہے؟

بعض ترقی پسند تنقید نگار نہایت ہی سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ مواد جمع کر کے اظہارِ رائے فرماتے ہیں۔ میں زاویۂ نگاہ کے اختلاف کے باوجود ان کا احترام کرتا ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تحقیق و تجزیہ کا حق ادا کرنے کے بعد یہ حضرات مثال میں انہی ادیبوں اور شاعروں کو پیش کرتے ہیں جو شعریت و ادبیت کی یا تو صلاحیت سے محروم ہیں یا پھر وہ اپنی صلاحیت کا نہایت ہی غلط استعمال کر رہے ہیں۔

ان ترقی پسند ناقدین کی حیثیت اس جوہری کے برابر ہے جو ہیرے کے کیمیاوی عناصر پر بہترین طور پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد ہیرے کے جوف سے لیکر جرم تک کے اسرار بے نقاب کر دے جس کے اندازِ بیان میں عالمانہ شان پائی جاتی ہو گویا وہ عملی طور پر ہیرے کی ماہیت کی تحقیق کر چکا ہے مگر ان تمام انکشافات کے بعد وہ مثال میں کنکر کو پیش کرتا ہے تو اس جوہری کے بارے میں ہم یہی رائے قائم کریں گے کہ اس نے ہیرے کے خواص و عناصر پر جو عالمانہ تقریر کی ہے وہ اس نے کسی سے سن کر یاد کر لی ہے، اور وہ خود ہیرے اور کنکر میں

امتیاز نہیں کر سکتا اور اُس کی نگاہ جوہر شناس نہیں ہے۔ اس قسم کی تمام تنقیدیں گمراہ کن ہیں جو نو آموز اردو والوں کے افکار و تصورات کو غلط راستہ پر لگا رہی ہیں ——

اردو زبان میں اب سے پہلے بھی تنقید نگار ہوتے ہیں، "ہماری شاعری" کے مصنف کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں، مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مثنوی "زہرِ عشق" پر چند صفحے لکھے ہیں مگر اُن کی تقریظ کا ایک ایک لفظ تنقید نگاروں کے لئے صحیفہ ہدایت بن سکتا ہے بشرطیکہ وجدان تندرست ہو اور اُسے کوئی مرض لاحق نہ ہو گیا ہو۔

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حالی پانی پتی کی ناقدانہ عظمت کسی دلیل و تعارف کی محتاج نہیں ہے مگر یہ ترقی زدہ حضرات ان بزرگوں کو بھی رجعت پسند ہی سمجھتے ہیں۔ شبلی اور حالی کو وہ بہت سے بہت اتنا کریڈٹ ([illegible]) دیتے ہیں کہ "یہ لوگ اپنے زمانے کے ترقی پسند ادیب تھے" یعنی دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ ہمارے زمانہ کے اعتبار سے رجعت پسند ہیں، اور وہ اس لئے کہ شبلی اور حالی نے زندگی کو اُس نگاہ سے نہیں دیکھا جس نگاہ سے یہ ترقی پسند دیکھتے ہیں۔

میں تنقید کی چند مثالیں پیش کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ہمارے پچھلے تنقید نگار کتنے صائب الرائے شگفتہ بیان اور اظہار خیال پر کس قدر قادر تھے۔ اُن کی تحریروں میں نہ تو ژولیدگی ہے اور نہ ابہام! سادہ سادہ باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی ہنس بول رہا ہے، انداز میں دلنشینی اور طرزِ ادا میں بلا کی جاذبیت ہے، نثر و نظم کے جس حصہ پر تنقید کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نقد و نظر کا حق ادا کر دیا۔ شبلی نعمانی ہی کو لے لیجئے کہ وہ ایک طرف مستشرق براؤن کے ادبی کارناموں سے باخبر ہیں اور دوسری طرف مشرق کے شاعروں اور ادیبوں کے مضامین پر اُن کی نظر ہے، نہایت سلیقہ کے ساتھ فلسفیوں اور ادیبوں کے اقوال بھی وہ مثال میں پیش کرتے ہیں مگر اُن کا طائرِ فکر خود اپنی فضا میں پرواز کرتا ہے۔

"شعر العجم" کے حصہ چہارم میں مولانا شبلی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں آب و ہوا اور مناظرِ قدرت شاعری پر کسی نہ کسی حد تک ضرور اثر انداز ہوتے ہیں اس خیال کو وہ ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں :-

"یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا، سرسبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعہ سے انشا پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں یہ چیزیں اُن کی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہنچے تو اُن کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آبِ رواں، سبزہ زار، آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ زمرد بن گئی، بادِ سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزے کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے جو ایران کے سوا کہیں نظر نہیں آسکتا ——"

کہنے کو چند جملے ہیں مگر ہر جملہ انشا پردازی کا زندہ معجزہ ہے کہ آنکھوں سے پڑھئے تو آنکھیں طراوت محسوس کریں، زبان سے دہرائیے تو کام و دہن حلاوت آشنا ہو جائیں اور کسی کو پڑھ کر سنائیے تو سننے والا بے اختیار پکار اٹھے، ع

فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

مولانا شبلی اس شعر

جلے کہ مشام دیدہ کشودم بہ بوئے گل
پنداشتم کہ گردِ رہِ یار می رسد

کی شرح فرماتے ہیں :-

"یعنی پھولوں کی جو خوشبو آئی تو میں نے بجائے اس کے کہ شامہ سے کام لیتا آنکھیں کھول دیں، میں سمجھا کہ معشوق کے راستہ کی گرد ہے" لطافتِ خیال کو تو دیکھو کوچہ معشوق کی گرد لطافت کی وجہ سے بوئے گل ہے اس لئے پھولوں کی جو خوشبو آئی تو دھوکا ہوا کہ یہ یار کی گرد ہے، یہ خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تاب اظہار نہیں لا سکتے گویا حباب ہیں کہ چھونے سے ٹوٹ جاتے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کرتا ہوں اور افسوس آتا ہے کہ تمام لطافت خاک میں مل جاتی ہے۔ (شعر العجم حصہ چہارم)

شیخ سعدی کا بہت مشہور شعر ہے :-

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

شیخ سعدی حکمتِ اخلاق کے بہت بڑے معلم تھے مگر ازراہِ تفنن ہر شاعر کبھی نہ کبھی کچھ سرخوشی کی باتیں بھی کہہ جاتا ہے، شیخ سعدی بھی با ایں علم و حکمت تفنن و سرخوشی کے جذبہ کو ضبط نہ کر سکے، شبلی نعمانی کے لئے بڑی مشکل آ پڑی ہے ایک طرف حضرت سعدی کی عظمت پیش نظر ہے دوسری طرف دیانت تنقید کا تقاضا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر کے دکھانا چاہئے، لیکن یہاں تنقید و ادب کا مسئلہ ایک ہی

ہمیں تمام دشواریوں سے گزر جاتا ہے، فرماتے ہیں:—
"لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جوا ئیگا۔"
نثر کے دفتر بھی اگر لکھے جائیں تو اس لطیف طنز اور جامع تنقید کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مولانا حالی پانی پتی مرزا غالب کی نثر پر تنقید فرماتے ہیں:—
"ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی باہم بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ — محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں! میں نے پوچھا کیا ابھی نہیں جائیں گی؟ اُس نے کہا ضرور جائیں گی تیاریاں ہو رہی ہیں" — اس مطلب کو انہوں نے (مرزا غالب نے) اس طرح ادا کیا ہے:—
"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا، بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں۔ حضرت ابھی نہیں! کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔" (یادگارِ غالب)

چند لفظوں میں حالی نے مرزا غالب کے اندازِ خطوط نویسی پر تبصرہ فرما دیا اور وہ اس طرح گویا سب کچھ کہکر بھی کچھ نہیں کہا، پہلے اپنی طرف سے نثر کا نمونہ پیش کیا کہ میں یا کوئی اور کہتا تو اس طرح کہتا پھر امتیاز و فرق ظاہر کرنے کے لئے مرزا غالب کے خط کا ٹکڑا درج کر دیا — ناظرین کرام! یہ سیدھی سادی تنقید ہے اس میں آپ کو ترقی پسندوں کا "پس منظر"۔ "تحت الشعور" اور "قدریں" نہیں ملیں گی؟

مرزا غالب کی شعر خوانی کے سلسلہ میں حالی لکھتے ہیں:—
"شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا میں نے غدر سے چند سال پہلے جبکہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سُنا ہے چونکہ اُن کے پڑھنے کی باری سب سے بعد آئی تھی اس لئے صبح ہو گئی مرزا صاحب نے کہا۔ صاحبو! میں اپنی بھیرویں الاپتا ہوں یہ کہکر اُردو طرح کی غزل اور اسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت بُلند آواز سے پڑھی یہ معلوم ہوتا تھا گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے اور اس لئے غزلخوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔" (یادگار غالب)
آخری دو جملوں کی تاثیر کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے، ناممکن ہے کہ مرزا غالب سے کسی کو عقیدت ہو اور ان جملوں کو پڑھکر اُس کی آنکھیں نمناک نہ ہو جائیں، کردار نگاری کا کمال ہے کہ چند لفظوں میں غالب کی زندگی کے ایک قابل ذکر پہلو کی تصویر کھینچ دی۔

ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم وقت کے تمام تقاضوں سے باخبر تھے، شعر و ادب کے جدید رجحانات پر بھی اُن کی نظر تھی اگر ترقی کا کوئی متعین اور صحیح مفہوم ہو سکتا ہے تو ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ (دیوان غالب) ترقی یافتہ تنقید کی روشن اور زندہ مثال ہے، مغرب کے فلسفیوں، ادیبوں اور شاعروں کے ادبی کارناموں سے اُنہوں نے استفادہ کیا ہے اور "شرح دیوان غالب" میں افلاطون سے لیکر ناروے کے مشہور ادیب ہنرک ابسن (Henrik Ibsen) تک کے مناسب موضوع اقوال نقل کئے ہیں مگر اس اخذ و استفادہ کے باوجود ڈاکٹر بجنوری ذاتی فکر بھی رکھتے ہیں اُن کی تنقید میں انتہائی ربط و تسلسل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں عقیدت کے جوش نے اُن کو جذبات کی رو میں بھی بہا دیا ہے لیکن عصمتِ استدلال اور عقلیت (Rationalism) کا دامن ہاتھ سے نہیں چھٹا — شاعری اور مصوری پر اظہار خیال فرماتے ہیں:—

"کیا شاعری مصوری ہے؟ اس میں شک نہیں کہ فنِ مصوری اور فنِ شاعری ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں، دونوں کا کام غیر موجود اشیاء کو حاضر اور واقع دکھلانا ہے دونوں کی بنا ایک خوش انداز فریب پر قائم ہے، مصوری سرمہ آواز شاعری ہے اور شاعری شیریں زبان مصوری ہے۔ جہاں مصور کا موئے قلم رنگ، اور خطوط ہے، الفاظ شاعر کے رنگ ہیں اور الوان مصور کے الفاظ ہیں —"

اُردو زبان کے یہی وہ مایہ ناز تنقید نگار ہیں جن پر اُردو لٹریچر ہمیشہ فخر کریگا۔ دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے سیاسی حادثے اور معاشرتی انقلاب کے باوجود اس نوع کی تنقیدوں کا وزن کم نہیں ہو سکتا، یہ زبان و ادب اور فکر و نظر کے وہ روشن مینار ہیں جنکی ضیا پاشی کبھی مدھم نہیں ہو سکتی۔

میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ ترقی یافتہ ناقدین ایسے ادیبوں اور شاعروں کو پیش کرتے ہیں جو اُس تحسین کے مستحق نہیں ہیں جس تحسین کا اُن کو مستحق قرار دیدیا گیا ہے۔ ترقی پسندی کا رجحان

"جدت" کی طرف بہت زیادہ ہے جس بے تکی بات میں ترقی پسندوں کو کچھ بھی نظر آتا ہے بس یہ اُس کو "فکرِ جدید" اور "انقلاب" سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ خیالِ فکر کی اس بے ربطی اور اندازِ بیان کی غیر ہم آہنگی پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو ترقی پسند فرماتے ہیں کہ ہمارے اندازِ نو اور اسلوبِ جدید کی "ٹیکنک" سمجھنے کی کوشش کرو ہم پرانی لکیر کے فقیر نہیں ہیں ہم زبان و ادب میں نئی راہیں نکال رہے ہیں ــــ مگر یہ "نئی راہیں" ــــ جہاں گمراہیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا بس ان بھول بھلیوں میں ٹکریں کھائیے، ٹھوکریں برداشت کیجئے اور "جدید ٹیکنک" کو سمجھتے رہئیے ــــ!

"ترقی پسند ادب" کو میں گمراہ کن ادب سمجھتا ہوں مگر میں نے اپنے مضمونوں اور تقریروں میں کسی کی ذات سے بحث نہیں کی، البتہ ہندوستان کے مشہور انقلابی شاعر نے جب خود مجھے مخاطب فرما کر تنقید کی تو مجھے بھی نام لیکر جواب دینا پڑا، لیکن میں آخر کب تک گمراہ کن تنقیدوں کو روادارانہ طور پر نظر انداز کرتا رہوں یہ پیچ و تاب مجھے پھونکے دے رہی ہے اور ضبط کرتے کرتے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ اُردو ادب میں نقد و نظر کے اس غیر صالح اور مضر عنصر کو میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجھے خود افسوس ہے کہ ایک شخص کا نام لیکر میں تنقید کر رہا ہوں۔ اگر اس واقعیت کو خودستائی سے تعبیر نہ کیا جائے تو میں عرض کروں کہ "طرزِ نو" کی شاعری میرے لئے باعثِ ننگ و عار ہے اور جس شخص نے بھی اس طرح کی شاعری کے سبب شہرت اور نمود حاصل کی ہے وہ میرے لئے کسی عنوان بھی قابلِ رشک نہیں ہو سکتی اس لئے مضمونِ زیرِ بحث کو معاصرانہ چشمک سے بلند سمجھا جائے۔

جناب فیض احمد فیض جدید ترقی پسند شاعروں کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے ترقی زدہ شاعروں کے مقابلہ میں فیض کے یہاں نسبتاً اہمال کم پایا جاتا ہے۔ جب کبھی جدید شاعری اور بلینک ورس پر بحث ہوئی تو ہم سے یہی کہا گیا کہ فیض کی شاعری کو پڑھو اُن کے یہاں جدتِ فکر ملیگی، جدید ادبی رجحانات فیض کی شاعری میں انگڑائیاں لے رہے ہیں، ہم نے "نقشِ فریادی" کو پڑھا اور بغور پڑھا دوسروں کو فیض کے اشعار سنائے بحث و مناظرہ ہوا اُن کی شاعری کی "ٹیکنک" سمجھنے کی کوشش کی گئی مگر ہم پوری دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ "نقشِ فریادی" میں ہمیں "شوخیٔ تحریر" نظر نہیں آئی اور اس پیکرِ تصویر کے بہت سے خطوط کو ہم نے غیر متناسب پیچیدہ اور بے رنگ ہی پایا! اُن کی غزلوں اور پابند نظموں کے بعض اشعار ضرور جاذبِ توجہ ہیں ــــ!

ہندوستان میں بہت سے شاعروں کے دیوان اور کلام کے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں سے بعض مجموعے لمبی چوڑی تقریظوں اور تحسین آمیز پیش لفظوں کے باوجود کوئی ادبی مقام نہیں رکھتے اور ایسے مجموعوں پر خواہ مخواہ تنقید کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر "نقشِ فریادی" کا معاملہ اس کے برعکس ہے اُس پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں اور ترقی پسند تنقید نگاروں کی کوئی کتاب بھی "نقشِ فریادی" کے ذکر اور تحسین آمیز ذکر سے خالی نہیں ہے۔ تنقید نگاری کے اس بحران میں آوازِ حق کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہی احساس مضمون زیرِ بحث کی تخلیق کا سبب بن گیا۔

فیض کا کلام پڑھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فیض میں شاعرانہ صلاحیت موجود تھی مگر یہ صلاحیت پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکی اُن کی شاعری میں اس صلاحیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن بلینک ورس کے بھیانک اندھیرے میں یہ جھلکیاں بھی دُودِ سیاہ بن کر رہ گئی ہیں۔ شاعری غیر معمولی مشق و ممارست اور بہت زیادہ عرق ریزی اور کاوش چاہتی ہے، برسوں کی مشق اور کوشش کے بعد کلام میں پختگی اور رعنائی آتی ہے اور شاعری ہی پر کیا منحصر ہے ہر فن کمال تک پہنچنے کے لئے دشواریوں کی راہ سے گزرتا ہے۔ ترقی پسند شاعری میں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، جو خیال بھی ذہن میں آیا اُسے جس طرح چاہا ظاہر کر دیا، اس سے کوئی غرض نہیں کہ خیال پورے طور پر ادا بھی ہوا یا نہیں اشعار اور موضوعِ نظم میں آخر کوئی ربط بھی ہے؟ ابھی ابھی حسین دوشیزہ کی انگڑائیوں کی تشریح ہو رہی تھی اور بغیر مناسب تمہید اور گریز کے مرے ہوئے گدھے کی لاش اور مزدور کی بھوک جھٹ سے درمیان میں آگئی معلوم ہوتا ہے جنابِ فیض کی طبیعت شعر و ادب کی دشواریوں اور پابندیوں سے گھبرا کر آسانیوں کی طرف مائل ہو گئی اور ممکن ہے کہ اس میلانِ آسان پسندی کے ساتھ اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ طرزِ نو کی شاعری میں چونکہ نیا پن آ جاتا ہے اس لئے یہ زیادہ مقبول اور مشہور ہو سکے گی! پرانے انداز کی شاعری میں تو ایک عمر گزار دینے کے بعد کوئی مقام اور امتیاز حاصل ہو سکتا ہے اور اس میدان میں غالب اور اقبال جیسے شہسوار پہلے ہی سے موجود ہیں ــــ!

ترقی پسند جدید شاعری کی چند خصوصیات یہ ہیں:ــــ

(۱) آزاد روی ——— وزن و قافیہ سے آزادی، زبان کی خصوصیات سے بے پروائی بلکہ بغاوت جو ترقی پسند شعراء وزن و قافیہ کی پابندی گوارا کر لیتے ہیں وہ خصوصیات زبان کی پروا نہیں کرتے۔ اس قسم کے آزاد رو کو ہم "رجعت پسندوں" کی زبان میں "شتر بے مہار" کہا جاتا ہے۔

(۲) خیالات کا اُلجھاؤ، بے ربطی، عدم تسلسل۔

(۳) نغمہ اور ترنم کا فقدان، کھردرا پن، بعض جگہ بالکل سپاٹ۔

(۴) نامانوس ترکیبیں، غیر فطری تشبیہیں، ابہام اور اہمال۔

(۵) ناقص مشاہدہ اور نارسیدہ فکر۔

فیض کی شاعری میں بھی یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لئے ہم اُن کے مجموعہ کلام "نقش فریادی" کو اردو ادب کی "خاموش فریاد" ہی کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ادب اس قسم کی شاعری کو سُن کر چیخ رہا ہے

——— مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ ———

اگر ترقی پسندوں کا پروپیگنڈا کام نہ کرتا تو "نقشِ فریادی" میں اتنی کشش نہیں ہے کہ شعر فہم اور ارباب ذوق اُس کا اس شد و مد سے تذکرہ کرتے۔ میں ایسے بہت سے شاعروں کو جانتا اور اُن کے کلام سے واقف ہوں جن کی ذات زیادہ سے زیادہ تحسین و تعارف کی مستحق تھی اور جن کا مجموعہ کلام "نقشِ فریادی" کو آئینہ دکھا سکتا تھا مگر تنقید نگاروں نے اُن بیچاروں کے ساتھ ناانصافی کی ——— کتنا ظلم ہے کہ پھول سُوکھ رہے ہیں اور کانٹوں کی آبیاری ہو رہی ہے ———

اَب میں فیض کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں تاکہ میری کہی ہوئی باتوں کی صحت کا آپ کو اندازہ ہو جائے۔ میں اُن کے شعروں پر اشارہ کرتا ہوا گزر جاؤں گا آپ مزید اطمینان کے لئے پوری کتاب پڑھ کر دیکھ لیں۔

نظم کا عنوان "موضوعِ سخن" ہے اُس کے دو تمہیدی شعر ملاحظہ ہوں :—

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور ——— اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

اب تک تو ہم یہی سُنتے آئے تھے کہ "چراغ" اور "شمع" گُل ہوا کرتے ہیں مگر فیض نے "شام" کو گُل کر دیا اور وہ بھی "سلگتی ہوئی شام" کو! تو کیا اب ہمیں "جلتی ہوئی صبح" اور "بھڑکتی ہوئی دوپہر" بھی سُننا پڑے گا۔ پھر "چشمۂ مہتاب" سے رات کے دُھل کر نکلنے کی تُک سمجھ میں نہیں آئی،

دُوسرے شعر میں جس شدید جذبہ کا اظہار مقصود ہے اُس کے لئے مُناسب الفاظ شاعر نے استعمال نہیں کئے۔

فیض صاحب کی نظم "ہم لوگ" کے دو شعر ہیں :—

دل کے ایواں میں لئے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نُورِ خورشید سے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

اوّل تو یہ شعر موضوعِ نظم کا اعتبار کرتے ہوئے بے ربط سے ہیں پھر مفہوم اتنا اُلجھا ہوا ہے کہ بہت کچھ غور و فکر کے بعد بھی شاعر کا مرکزی تخیل متعین نہیں ہوتا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں نے اپنی سمجھ سے مطلب نکالنے کی ڈرتے ڈرتے کوشش کی ہے! گُل شدہ شمعوں سے شاید ناکام تمنائیں مُراد ہیں لیکن دُوسرے مصرع پر پہنچ کر پھر گاڑی رُک گئی! نورِ خورشید سے ڈرنے اور اُکتانے کا آخر کیا سبب ہے؟ ممکن ہے "ہم لوگ" سے مُراد سرمایہ دار ہوں کہ صبحِ انقلاب کو دیکھ کر وہ سہم گئے کہ اَب ہماری خواجگی ختم ہونے کا وقت آ گیا لیکن اس مفہوم کے بعد "اُکتانا" بے معنی ہوا جاتا ہے کیونکہ طبیعت اُس سے شے سے اُکتایا کرتی ہے جو پہلے بارہا مشاہدے و تجربے میں آ چکی ہو اور "صبحِ انقلاب" جس سے سرمایہ داری سہم رہی ہے شاید پہلی بار طلوع ہوئی ہے۔ اور اگر "ہم لوگ" سے "خود" ہم یا عوام مُراد ہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کونسے خورشید کا نور ہے جسے دیکھ کر ہم سہمے اور اُکتائے ہوئے ہیں۔ اور سہمنے اور اُکتانے کے اسباب کیا ہیں؟ ؏

کوئی سمجھاؤ کہ ہم سمجھائیں کیا ؟

دُوسرے شعر میں "سیّال تصوّر" سے شاید "متحرک اور فعال تصوّر" مُراد ہے جسے شاعر کی "رقتِ خیال" کا ترقی یافتہ شاہکار سمجھنا چاہئے مصرعہ موزوں کرنے کے لئے ایک لفظ کی ضرورت تھی "سیّال" ذہن میں آیا اور استعمال کر ہی تو دیا اُس پر یہ مصرعہ

اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

ایک مضحکہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ کوئی "لحاف" تھا تاریکی معلوم ہوتی ہے جسے کرنل فیض لپٹ لپٹا کر بھینچے لیٹے ہیں ——— آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :—

اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

اگر "گردِ درد" کی نامانوس ترکیب پر بھی صبر کر لیا جائے تو پھر پھر دل کے تاریک شگافوں کی آخر کیا توجیہہ کی جائیگی؟ تاریک شگافوں سے شاید سازِ دل کے پردے مُراد ہوں مگر یہ شعر "شاعرانہ اندازِ بیان" کی ضد ہے۔ شاعر اس خیال کو کسی اور دلکش پیرایہ میں ظاہر کرتا — ترقی پسند شاعری کا سب سے بڑا عیب اور کمزوری یہی ہے کہ اظہارِ خیال کے لئے مناسب الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے۔ شاید یہ لوگ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اُردو میں خیال کو ظاہر کرتے ہیں اس لئے خیال اور اظہار میں ربط اور تناسب باقی نہیں رہتا۔

فیض کی ایک نظم ہے "سامنا" — فرماتے ہیں:—

چھنتی ہے تری نظر دل سے جذبات کی دُنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنائیں
کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ نکل آئیں

شعر پڑھتے ہوئے "دُنیاؤں" پر وجدان کو ٹھوکر سی لگتی ہے اس سے بڑھکر یہ کہ نظر جو غیر مادی ہے اُس سے جذبات کی دُنیائیں چھن رہی ہیں — یہاں نظر کی جگہ "آنکھیں" ہونا چاہیئے تھا اگرچہ "جذبات کی دُنیاؤں" کا "چھننا" پھر بھی محلِ نظر رہتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شاید کتابت کی غلطی کے سبب "بے تاب تمنائیں" کی جگہ "مہتاب تمنائیں" درج ہو گیا ہے مگر یہ میرا قیاس ہے ترقی پسند شاعروں کی اُفتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں ہے کہ یہاں "مہتاب" ہی نظم کیا گیا ہو اس لئے کہ ترقی پسند شاعری میں تناسب و توازن کا فقدان ہے — "بے خوابیوں" اور "بے تاب تمناؤں" کے ساتھ "افسانے" بالکل بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں یہاں بھی اسی قسم کی کسی کیفیت کا اظہار کرنا تھا — دوسرے شعر میں ابہام ہی ابہام ہے اور بے ربطی ہی بے ربطی ہے۔ شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کا جو سامنا ہوا تو میں پورے طور پر دل کی بات بھی نہ کہہ سکا، اُلجھی ہوئی باتیں زبان پر آنے لگیں مگر یہ بہکے ہوئے نغمے" کس کے ہیں؟ شاید "محبوب" کے! لیکن شاعر کی اُلجھی ہوئی باتوں پر محبوب کے بہکے ہوئے نغمے قطعاً اٹمل بے جوڑ بات ہے — اب رہا چوتھا مصرعہ

کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

تو یہ بھی واقعیت کی ضد ہے، طب اور نفسیات کی رُو سے کسی تاثر کے بغیر آنکھوں میں آنسو آ ہی نہیں سکتے، فرض کر لیجئے کہ آنکھوں سے بے وجہ بھی آنسو چھلک جایا کرتے ہیں اور "اشکِ بے سبب" میں ایک خاص جدّت اور ندرت پائی جاتی ہے مگر شاعر جس منظر کا ذکر رہا ہے اُس کے اعتبار سے یہ "بلا وجہ آنسو" واقعیت کے خلاف ہیں یہاں تو محبوب کا سامنا ہوتا ہے گزری ہوئی باتیں یاد آ رہی ہیں، بے خواب راتوں، بے تاب تمناؤں اور کشمکشِ جدائی کے تمام افسانے دُہرائے جا رہے ہیں تو اس تمام ہنگامے کے باوجود آنکھوں میں آنسوؤں کا آنا "بے وجہ" نہیں ہو سکتا شاعر کے آنسو اپنے پیچھے اسباب و موثرات کا ایک طوفان رکھتے ہیں —

فیض کی ایک پوری کی پوری نظم یہاں درج کی جاتی ہے۔

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے!
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ بھی ہیں ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گاہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اِس نظم کا دُوسرا شعر:—

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

بہت اچھا ہے اگر ساری نظم اسی انداز پر کہی جاتی تو یہ نظم یقیناً بہت دلکش اور اثر انگیز ہوتی مگر اس نظم کے دُوسرے شعر پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ شعر اتفاقی طور پر ہو گیا ہے باقی اشعار بے ربط اور ژولیدہ ہیں اور اُن میں شعریت کی رمق بھی نہیں پائی جاتی۔ کسی کسی مصرعہ سے شاعر کا مفہوم ظاہر ہوتے ہوتے

رہ جاتا ہے مگر بعد کا شعر اس مفہوم کو گنجلک بنا دیتا ہے۔ رات سے شاید سرمایہ داری اور سوویت کے جبر و استبداد کی رات مراد ہے جس میں سیاسی لیڈر کے جکڑے ہوتے ہاتھ والے پیوستہ ہو کر گھاؤ ڈال دیتے ہیں۔۔۔یہی زخم خوردہ رات آخر میں جا کر "آہنی میت" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔۔۔خیر! خیال و فکر کی اس قلابازی کو بھی برداشت کر لیا مگر مشرق کی کیں کہ یہ دمکتا ہوا دن رات کی اس آہنی میت کے نیچے آخر کس طرح دب گیا؟ رات کے فنا ہو جانے کے بعد تو دن نکلنا چاہیئے اور شاعر غالباً "طلوعِ صبح" کی نوید دینا چاہتا ہے ـــــ ہم نے اس نظم کو سمجھنے اور معنی پہنانے کی کوشش کی مگر اس کی کوئی چول بھی سیدھی نہیں بیٹھتی ـــ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سیاسی لیڈر کے صرف "ہاتھ" ہی اس کا سرمایہ کیوں ہیں؟ کیا اس کے پائے ہمت، عزمِ محکم، نگاہِ خود دار و بلند اور حوصلہ بے باک اس کی متاع نہیں ہیں؟

تمام ترقی پسند شاعری اسی بدحواسی، انتشارِ خیال اور بے ربطیٔ فکر کا معجونِ مرکب ہے! انصاف سے بتلایئے کہ اس نوع کی شاعری میں کوئی پیام، افادیت، دلکشی اور اثر آپ پاتے ہیں؟ کیا یہ کاواک قسم کے اشعار سماج کی گتھی سلجھا رہے ہیں؟ سوسائٹی کے دکھ کا مداوا کر رہے ہیں؟ ان کو پڑھ کر دل و دماغ کوئی اثر محسوس کرتے ہیں؟ بے اثر شاعری اور بے ربط باتیں انقلاب پیدا کر سکتی ہیں؟ پھر یہ آخر "ترقی" کے نام پر کیا ہو رہا ہے؟ ترقی پسندی کے شیش محل میں رہنے والے "رجعت پسندی" کے آہنی ستونوں پر پتھر پھینکنے کی کوشش نہ کریں کہ ان کی بنیادیں آبگینہ و حباب سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔۔۔

وقت آگیا ہے کہ دیانت و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقی پسند ادب پر خوب کھل کر تنقیدیں کی جائیں۔ گمراہیاں بڑھ رہی ہیں ایسے موقع پر خاموش رہنا روا نہیں گناہ ہے میں جانتا ہوں کہ اکثریت اور جمہور "ترقی پسند ادب" کا مخالف ہے مگر بہت سے اربابِ نظر اور اہلِ قلم ترقی پسند ادب پر تنقید کر کے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ترقی پسندوں کے پاس سب ہے "آرگن" موجود ہیں اور وہ چونکہ تعداد میں قلیل ہیں اس لئے منظم بھی ہیں لیکن اگر آپ کو اردو زبان کی تباہی، ادب کی بربادی، ملک و قوم کے فکر و خیال کی گمراہی گوارا نہیں ہے تو میری طرح :۔۔

آ چکے تھے بجلیوں کی زد میں سب اہلِ چمن
میں نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

آپ کو بھی کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑے گی۔ آپ کو بھی ترقی پسندوں کی زبان سے گالیاں سننی ہوں گی ـــ یاد رکھئے ایثار و قربانی کے بغیر نہ اصلاح ممکن ہے اور نہ ترقی ـــ وقت کی نزاکت کو پہچانیئے اور اپنے دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو اصلاحِ ادب کے لئے وقف کر دیجئے۔۔۔

حیات است در آتشِ خود طپیدن
خوش آں دم کہ ایں نکتہ را باز یابی

قمر ہاشمی ٹونکی

ترے بغیر

بزمِ نشاط و نغمہ و صہبا ترے بغیر — میرے لئے گراں ہے یہ سودا ترے بغیر
جب زیست ہی نہیں ہے گوارا ترے بغیر — جینے کی اور کیا ہو تمنا ترے بغیر
ہیں چاندنی کی گرچہ بہاریں شراب ریز — بے کیف ہے مگر مری دنیا ترے بغیر
وہ دن مری حیات میں شامل نہ ہو سکے — جو دن گزر گئے کبھی تنہا ترے بغیر

سید اکبر عباس سہارنپوری

ہم

دل ہمیں بہلائیگا اور دل کو بہلائیں گے ہم
اپنی دُنیا اپنے دَم کے ساتھ لے جائیں گے ہم

بھر کے اک آہِ حزیں خاموش ہو جائیں گے ہم
سُننے والے یہ فسانہ پھر نہ دہرائیں گے ہم

آسرا تھا اُن نگاہوں کا سو وہ بھی پھر گئیں
سوچتے ہیں دل کو اب کیا کہہ کے سمجھائیں گے ہم

اک زمانے کو بھلا بیٹھے ہیں تیری یاد میں
بھولنے والے کبھی تجھکو بھی یاد آئیں گے ہم

جانتے ہیں جستجو کے اس مآلِ کار کو
تجھکو جس دن پا لیا اس روز کھو جائیں گے ہم

بیخودیٔ عشق کا اک دَور وہ بھی آئے گا
جس قدر تم بھولنا چاہو گے یاد آئیں گے ہم

زندگی میں آہ اکبر یہ کسے معلوم ہے
کون غم کھاتا ہے اپنا کس کا غم کھائیں گے ہم

سید مظفر حسین گوہر

جذبات

احساس اور ہوش سے بیگانہ کیجئے
دیوانہ کیجئے مجھے دیوانہ کیجئے

ہرگز نہ ختم عشق کا افسانہ کیجئے
اس داستاں سے بزم کو دیوانہ کیجئے

مدت سے ہوں میں تشنۂ گفتار دیکھئے
مجھکو شریکِ ذوقِ کلیمانہ کیجئے

بُت بولتے ہیں مُنہ سے نہ کھلتا ہے برہمن
کبتک یونہی پرستشِ بتخانہ کیجئے

جی چاہتا ہے دیکھ کے اس کا مذاقِ سوز
پیہم طوافِ میّتِ پروانہ کیجئے

آجائیے خیال میں بہرِ خدا کبھی
اپنے خیال کو تو نہ بیگانہ کیجئے

گوہر نگاہِ ناز کا ممنون ہوں مگر
دل ہی نہیں رہا جسے دیوانہ کیجئے

قمر اجنالوی

بازارِ عیش

"قصرِ شمع" کا ایک باب

دروازے کے مصری محافظ نے پوچھا۔
"کیا نام ہے؟"
وہ بولا۔
"حوط"
"کہاں رہتے ہو؟"
"اجنبی ہوں۔"
"سوداگر ـــ؟"
"نہیں۔"
"گھر کہاں ہے؟"
کہیں نہیں۔"

اس پر محافظ نے تعجب کا اظہار کیا اور مشکوک نگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔
"تم پیدا کہاں ہوئے؟"
"نوبیہ میں"
"معلوم ہوتا ہے بہت بڑی کر آئے ہو، خیر کہو ـــ میں خوش رہونگا۔ مسرت سے داخل ہونگا۔"
حوط نے کہا۔
"میں خوش رہونگا۔ مسرت سے داخل ہونگا ـــ کیونکہ میں خوشی اور مسرت چاہتا ہوں۔"

یہ فقرے دُہرا کر وہ "بازارِ عیش" میں داخل ہوا اور چند قدم بے پروائی سے چل کر ایک خوبصورت مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

سورج مغربی اُفق کی بلندیوں پر جھک رہا تھا اور جھومتے ہوئے درختوں کے سائے عشرت نگاہوں کی اُن کھڑکیوں پر کانپ رہے تھے جہاں سے "بازارِ عیش" کی حسین "اچھوتیاں" مہین لباس پہنے بازار کے نظاروں سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں ـــ حوط نے گردن اُٹھا کر دیکھا عشرت نگاہوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا تھا۔ نیچے لوگ چل پھر رہے تھے اور اوپر کھلی ہوئی کھڑکیوں میں مصری نازک اندام نازنینیں کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ بعض کھڑکیاں ہنوز بند تھیں بعض کھلی تھیں مگر وہاں کوئی حسین چہرہ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے ساتھ مختلف رنگوں کے ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ کہیں کہیں تازہ پھولوں کے ہار لٹکے ہوئے تھے۔ اور عطر، لوبان اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے سارا بازار مہکا ہوا تھا۔

بعض کھڑکیاں ایسی بھی تھیں جن کے ساتھ کل کے باسی ہار لٹک رہے تھے اور اُن کی سوکھی ہوئی پتیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھیں ـــ بازار کے ایک سرے سے لیکر جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی دوسرے سرے تک رنگ برنگ کے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ حسین جادوگرنیاں بن سنور کر ریشمی گدّوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ لوگ اُن کے حُسن سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ بازار میں ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ شور و غل تھا اور اسی شور و غل میں کہیں سے سارنگی کی مدھم مدھم آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

ایک لمحہ کیلئے حوط نے اپنے نتھنوں کو سکیڑ کر بازار میں بسی ہوئی خوشبو کو سونگھا اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اَن دیکھی فردوس میں داخل ہو گیا ہے اور اس وقت زندگی کی اُس ازلی و ابدی بلندی پر کھڑا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا جس کا آغاز ایک طویل عیش ہے اور انجام اُس سے بھی طویل تر ـــ ہاں زندگی کی یہی وہ حسین شاہراہ تھی جس پر گامزن ہونے کے لئے وہ بیقرار تھا۔ یہی وہ تماشا تھا جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا ـــ عورت کا جمال، اسکی نمائش، اسکی ولولہ انگیز رنگین جوانی، حُسن ـــ اور عشق ـــ ہاں وہ عشق جس کے ڈانڈے عالم کی ابدی زندگی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جو موت کی مانند زبردست ہے ـــ جسے وہ بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اُس کے دل میں ایک تکلیف دہ احساس بھی پیدا ہوا، وہی احساس جو متواتر آٹھ سال سے اُس کے اندر آہستہ آہستہ پرورش پا رہا تھا، اور آج آستین میں پالے ہوئے سانپ کی طرح عشق سے بھرپور آرزو پر آخری حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا ـــ اسکی آنکھوں کے سامنے عین الشمس کے اُس کلیسا کا تصوّر آ گیا جہاں اُس نے کتابِ مقدس کو

بالتفسیر ختم کیا تھا۔ جہاں حیات و موت کی بحث ہوتی تھی جہاں اُس نے رہبانیت کے تمام مراحل طے کر کے "قس" کا معزز خطاب لیا تھا اور جہاں گناہ و معصیت کی عبرتناک سزاؤں پر خود اُس نے کئی درس دیئے تھے ——— "گناہ" ——— اور "جہنم" یہ دونوں الفاظ حیرت انگیز طور پر لرزہ خیز اثر رکھتے تھے۔ وہ کچھ دیر کے لئے کانپ سا گیا۔ اور اُس کے ذہن کے کسی تاریک گوشہ میں سے یہ آواز آئی۔

"بیگانہ عورت کے ہونٹوں میں سے شہد ٹپکا پڑتا ہے اور اُس کا تالو تیل سے زیادہ چکنا ہے پر اُس کا انجام ناگدونا کی مانند کڑوا ہے اور دودھاری تلوار کی مانند تیز ہے اُس کے پاؤں موت ہی میں اترتے ہیں، اُس کے قدم جہنم کو پکڑے ہوتے ہیں ———"

سٹاس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ سچ مچ جہنم کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اُس کے دماغ نے ایک آن میں کئی کروٹیں بدلیں، اور کئی ایسی ہیبت ناک باتیں اس کے افقِ شعور پر طلوع ہوئیں جنہیں اُس نے ایک عرصہ سے فراموش کر دیا ہوا تھا۔ اسے وہ ابدی لعنتیں یاد آئیں جو کتاب میں ان جھٹلانے والوں پر کی گئی ہیں۔ اور اُس کے باطن کے ہر حصہ میں ایک کپکپا دینے والی لرزش پیدا ہو گئی۔ اسی کپکپاہٹ میں ایک قدم آگے بڑھ گیا اور اُس کی نگاہیں ایکدفعہ پھر اُن زہرہ شمائل نازنینوں پر پڑیں جن کے حسن برقپاش کے سامنے اوہام و وساوس کی تمام تاریکیاں کافور ہو جاتی تھیں۔ وہ کھڑا ہو کر ان کو دیکھنے لگا۔ اور اُس کے دل و دماغ اُس خوشبو سے معطر ہونے لگے جو بازار میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

ایک ثانیہ کیلئے پھر اُس کے دماغ میں "گناہ و ثواب" کی بحث ہوئی پھر اُس نے کہا:۔

"مجھے کسی بیگانہ عورت سے کیا۔ میں کسی زانیہ کے جہنمی پاؤں کیوں پکڑوں گا، کیونکہ جانتا ہوں کہ گناہ کی مزدوری موت ہے اور زنا کی سزا جہنم ——— میں تو صرف عشق کی لذت سے دوچار ہونا چاہتا ہوں۔ اپنے مُردہ جسم کو محبت کی گرمی سے زندہ کرنا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں۔ کہ میری زندگی میں کوئی حیرت انگیز انقلاب رونما ہو میں عشق کی حقیقت آزمانے کیلئے یہاں آیا ہوں یہ کوئی گناہ نہیں اگر گناہ ہوتا تو سلیمان نبی یہ گواہی کیوں دیتا کہ ———

عشق موت کی مانند زبردست ہے"

اس خیال کے ساتھ ہی اُس کا دماغ چمک اٹھا۔ اور وہ خودبخود مسکرا کر آگے بڑھا۔ ایک گلفروش لڑکی نے اُس کے سامنے پھولوں کے ہار اور گجرے پیش کئے۔ اور بولی۔

"اپنی محبوبہ کے لئے پھول نہ خریدو گے۔؟"

جوطا نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ کیونکہ اسکی کوئی محبوبہ تھی وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ لوگ اُس کی ڈھیلی سی عبا کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ "بازارِ عیش" میں جہاں زرق برق پوشاکیں جھلملایا کرتی تھیں اس قسم کی بھدی عبا یقیناً ایک عجوبہ تھی مگر وہ بالکل بے پرواہ ہو کر چلا جا رہا تھا اسکی متحیر نگاہیں کبھی اُن کھلی ہوئی کھڑکیوں پر جا پڑتیں جہاں ماہ وش دوشیزائیں بیٹھی تھیں اور کبھی بازار میں چلنے پھرنے والوں کا جائزہ لیتی تھیں۔

ایک پنیر بیچنے والے کے پاس چند آدمی جمع تھے۔ جب وہ اُن کے پاس سے گذرا تو سب کی نگاہیں اُس پر جا پڑیں ——— ایک نے کہا۔

"کوئی آرمینیا کا سوداگر معلوم ہوتا ہے"۔

دوسرا بولا۔

"نہیں۔ شکل و شباہت تو نینوہ والوں سے ملتی جلتی ہے"۔

"خوب سجیلا ہے ——— عورتوں کا چھیلا"۔

"لیکن بھئی! ماتھے کی شکنوں سے تو کوئی فلسفی یا شاعر معلوم ہوتا ہے دیکھو وہ ایاونس کی طرف کس محویت سے دیکھ رہا ہے"۔

"ہاں ——— اس شہر میں اجنبی ہے۔ اور اسے "بازارِ عیش" دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا ہے"۔

اتنے میں ایک نوجوان حسین لڑکی اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"کون ہے؟ ——— کہاں ہے؟؟ ———"

ایک شخص نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"وہ جا رہا ہے ——— وہ ڈھیلی عبا والا جس غریب کو اتنا بھی علم نہیں کہ یہاں اس قسم کی عباؤں کو کوئی پوچھتا تک نہیں"۔

لڑکی بے تحاشا بھاگتی لوگوں کو ہٹاتی ہوئی جوطا کے قریب جا پہنچی اور اُس کو شانوں سے پکڑ کر بولی۔

"ارے ——— کہاں جاتے ہو؟"

وہ حیران و ششدر ہو کر اسکی طرف دیکھنے لگا چپ چاپ ——— لڑکی نیم عُریاں سی تھی۔ اُس کا لہنگا پنڈلیوں تک لمبا تھا۔ خوبصورت ریشمی صدری کی وجہ سے سینے کا ابھار بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ سر کے بال پریشان تھے۔ چہرے کا رنگ سُرخ تھا نقش و نگار سے

یونانی معلوم ہوتی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں محبت اور شرارت کے دلوں جذبے جاگ رہے تھے۔ اور یونانی چپل میں سے اُس کے پاؤں کی نازک نازک انگلیاں عجیب انداز سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

لڑکی نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور پُوچھنے لگی۔

کیا تم نوارد ہو؟"

حطوط پہلے تو خاموش رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں ——"

لڑکی نے اُس کے لباس اور چہرے کے خدوخال سے اندازہ لگایا کہ وہ "جزیرہ" کا کوئی ان پڑھ تاجر ہے کیونکہ مفلس ہی وہی اس قسم کا لباس پہن کر آیا کرتے تھے۔ اور جب مصری لڑکیوں کے ہتّھے چڑھ جاتے تھے تو کافی رقم لُٹا جاتے تھے۔

لڑکی نے پھر مُسکرا کر پُوچھا۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

حوط نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ بولی۔

"رات رہو گے؟"

حوط حیرت پاش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا —— وہ سوچ رہا تھا کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تو ایسا ہو گیا تھا اور آئندہ نہ معلوم اور کیا کچھ ہونے والا تھا —— اُسکی حیرانی کو دیکھکر لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔

"تم یہاں کی باتیں نہیں سمجھتے؟"

حوط نے کھسیانا سے ہو کر جواب دیا۔

"سمجھتا ہوں"۔

"پھر چُپ کیوں ہو؟"

"بول تو رہا ہوں"۔

"اچھا تو بولو۔ رہو گے رات؟ —— ہے میری ضرورت؟"

اب لڑکی کا مطالبہ بالکل صاف تھا اور اتنا صاف کہ شاید اس سے زیادہ واضح الفاظ اُس کے ذہن میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

حوط نے اُس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ کہ اُس کی منزل کا وہ سفر شروع ہو گیا ہے جو اُسے زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ وہ مختلف خیالات کی گہرائیوں میں کھو گیا اُس کے ذہنی افق پر یونیہ کی عشرت انگیز راتوں کے حسین تصورات طلوع ہوئے اور ایک ساتھ دل میں سینکڑوں شہوانی جذبے جاگ اُٹھے جنہوں نے اسکی نس نس میں آگ سی بھڑ دی۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ بے اختیار اس لڑکی سے جو اُسے رات رکھنا چاہتی ہے لپٹ جائے اُس کے شہد آمیز ہونٹوں کو چوم لے —— وہ ذرا آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں مذہبی تقدس کے سانپ نے اُس کے دل کو ڈس لیا اور وہ تلملا کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ آٹھ سالہ کلیسائی زندگی بھی آخر اُسی کی زندگی تھی جو کسی صورت میں اسے اس قدر بے باک ہونے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ دماغ کے اُن تاریک گوشوں میں اُسے کبھی خیال تک نہ آیا تھا آج عجیب عجیب ہیبتناک وسوسے رینگ رہے تھے۔ "گناہ" اور "جہنم"۔ پھر بن بلائے مہماں کی طرح ذہن میں گھس کر ڈراؤنا رقص کرنے لگے۔ ایک ثانیہ تک یہ رقص ہوتا رہا۔

مذہب نے کہا۔

"گناہ کی مزدوری موت ہے"۔

حوط بولا۔

"ہاں میں اِسے تسلیم کرتا ہوں"۔

"غیر عورت سے زنا کرنے کی سزا جہنم ہے"۔

"ہونی چاہیے"۔

چھنالا کرنے والیاں گناہ کی بیٹیاں ہیں"۔

"ہونگی ——"

"تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ جب تم تسلیم کرتے ہو کہ اس وقت جہنم کے دروازے پر کھڑے ہو —— یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ تم اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤ گے"۔

اِس خیال کے ساتھ ہی حوط نے چاہا کہ وہ بھاگ جائے، ان تمام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے۔ کہ یکلخت اُس کے ذہن میں ایک غیر معمولی بلند اور خوش آہنگ آواز گونجی۔

"ذرا ٹھہرو —— اور سُنو کہ گو ایک مُدت تک تم نے مجھے فراموش رکھا، اور میری زد سے نکل بھاگے لیکن اب کہ تم میرے پاس نئی اُمنگیں لیکر آئے ہو یونہی واپس نہ جا سکو گے۔ دُنیا کے ہنگاموں سے شکست کھا کر کنیسہ کی غیر مانوس تنہائیوں میں جا چھپنا تمہاری پہلی اور آخری بُزدلی تھی جو ہو چکی تھی۔ لیکن آئندہ نہ ہوگی —— ہاں تم کہاں رُوپوش تھے؟ کہ تمہارا انتظار دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں دُکھنے آ گئیں۔ تمہارے ہجر میں میری رونقیں ماند پڑ گئی ہیں —— اب آؤ اور اپنی میراث سنبھالو تم نئے نئے حادثات سے دوچار ہونا چاہتے ہو۔ نئی نئی باتیں سُننے کے خواہشمند ہو یہ سب کچھ تمہیں

یہیں سے ملیگا۔ عجیب عجیب حادثات بھی ہونگے اور نئی نئی باتیں بھی ——— ہاں عشق تمہیں وہ کچھ دکھائیگا جو تم نے آج تک نہ دیکھا، ان نازنینوں کو حقیر جان کر یونہی دھتکار نہ دو کیونکہ دنیا میں ان کا وجود بھی آخر کوئی مقصد رکھتا ہے ——— "یہ گناہ کی بیٹیاں" پیاسے انسانوں کی تشنگی بجھاتی اور مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہیں ——— گناہ؟ ——— کیا گناہ کا فلسفہ یہی ہے جو تم سمجھے ——— ؟ اچھا تو پھر بتاؤ کلیساؤں کی کنواریاں ——— جن کے حمل گرائے جاتے ہیں یا جو تہ خانوں کے اندھیرے کمروں میں بچے جنتی ہیں تمہارے فلسفہ کے نزدیک کیا ٹھہریں؟ ———"

یکدم اُس کے مذہبی احساسات پر ایک بجلی سی گری اس کی آنکھوں میں مسرت کی ایک مبہم مگر لازوال چمک پیدا ہوئی، اور اُس کے دماغ کے تاریک گوشے منور ہو گئے۔

اُس نے خود بخود کہا۔

"ہاں اگر یہ سچ ہے تو پھر کلیساؤں کی کنواریاں کیا ٹھہریں؟"

وہ منتظر رہا کہ شاید کہیں سے جواب آئے لیکن آج رہبانیت اُس کے قدموں پر اوندھی پڑی تھی۔ کلیسا کے تمام دروازے بند تھے، اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب یہ ابد تک بند رہیں گے اور یہاں سے رُوحانی زندگی کی ایک آواز بھی اُس کے کانوں میں نہ آسکے گی۔

کئی لمحوں کے سکوت نے لڑکی کو مضطرب کر دیا تھا۔ وہ اُس کے چہرہ پر بدلتے ہوئے اثرات کو دیکھ رہی تھی۔ آخر اُس نے پھر پوچھا۔

"تم چُپ کیوں ہو؟ ——— بولتے کیوں نہیں؟؟"

حوط نے پہلی بار مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"مَیں کچھ سوچ رہا تھا۔"

"کیا ——— ؟"

"یونہی کچھ تھا ——— خیر رہنے دو ——— ہاں تمہاری ماں ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔

"کیا ماں کے ساتھ رہو گے؟ عجیب آدمی ہو تم بھی ——— جوان کو چھوڑ کر بوڑھیوں پر مرتے رہو۔ چلو ہے میری ماں لیکن بہت بوڑھی ہے۔ بالکل مرنے کے قریب ———"

"نہیں میرا مطلب کچھ اور ہے۔"

"کیا؟"

حوط بولا۔

"مَیں تمہارے ہاں رات بھی رہ لوں گا۔ لیکن سب سے پہلے مجھے اِس بازار کی سیر تو کرا دو تا یہاں کے رسم و رواج سے واقف ہو جاؤں۔ مَیں اجنبی ہوں۔ سنا کرتا تھا کہ ممفس کے بازارِ عیش میں بڑی بڑی حسین عورتیں رہتی ہیں جن کی خوبصورتی نے "لفیس" کی یاد بھلا دی ہے۔ مَیں اُن سب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے تم شاعر ہو۔"

"نہیں!"

"تو پھر مصوّر ہو گے۔"

"مَیں اِن دونوں میں سے کچھ نہیں ہوں ——— ایک قیس ہوں۔"

لڑکی نے حیرت زدہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا اور بولی۔

"قیس ہو؟"

حوط نے دل میں سوچا خواہ کچھ بھی ہو اُسے کنیسہ کو بدنام نہیں کرنا چاہیئے، اور اُس نے جلدی سے جواب دیا۔

"ہاں ہاں قیس ہوں لیکن کسی کو بتاتا نہیں ——— سنا؟"

"اچھا اچھا میں سمجھ گئی ہوں۔"

اور وہ دونوں ایک سمت کو چلنے لگے۔

سُورج کی حدت مر چکی تھی۔ مکانوں کی منڈیروں۔ اونچے اونچے مناروں اور بلند ایوانوں پر اسکی رنگین شعاعیں بنفشی غازہ سا پھیر رہی تھیں۔ عشرتگاہوں کے خوبصورت پلاٹوں میں قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے جن کو پانی کے چھینٹوں سے دھویا گیا تھا۔ بلند درختوں کے سائے بھی ہولے ہولے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور دو رویہ عمارتوں کے درمیانہ خلا میں سے نظر آنے والے نیلگوں آسمان پر سیاہی و سُرخی کی ملی جلی لکیریں رینگ رہی تھیں۔ اُس خلا میں سے حوط نے دیکھا مرغابیوں کے غول کے غول اور دُوسرے آبی پرندے نیل کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ اور دُور کہیں کوئل کی آوازیں تھرتھراتی ہوئی بے آہنگ سُروں کی طرح فضا کے سینہ پر تیر رہی تھیں۔ شام کی آمد کے اِس دلفریب منظر اور "بازارِ عیش" کی نکہت آلود ہواؤں نے حوط کے دل و دماغ پر ایک جادو سا کر دیا۔ وہ بازار کے نظارہ سے لُطف اندوز ہوتا ہوا مسرور و متکیف چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک لڑکی ایک عشرتگاہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"یہاں "شمیرس" رہتی ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ "آموسی" کے بعد وہ مصر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن مجھے اُس کے حبشنوں جیسے موٹے موٹے ہونٹ پسند نہیں ہیں۔ ہاں اسکی گردن بہت خوبصورت ہے،

اور باتیں ؟ ــــ بس یہ سمجھ لو کہ فلسطینی ہے سرد زانچیز اور نشہ آور ــــ بہت باتونی ہے۔ آج وہ یہاں نہیں شاید ساحل کی طرف گھومنے چلی گئی ہوگی کیونکہ اُس کے یار باش بہت ہیں ــــ"

حوط نے پوچھا۔

"اچھا تو آموسی کون ہے ؟"

"ایک رقاصہ۔"

اور لڑکی جھنجھلا کر بولی۔

"اُس کے ذکر کو چھوڑو ــــ اُدھر دیکھو وہ جو نیلے رنگ کے ریشمی بندہ والی کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔"

"ہاں وہ ــــ اُس کا نام سافو ہے۔ وہ بھی یونان سے آئی ہوئی ہے ــــ"

"خوب، کیا یہ بھی اپنی ہمنام کی طرح شاعرہ ہے ؟"

"یہ تو شاعروں پر لعنت بھیجتی ہے۔ جب مسکرائے تو اُسکی طرف غور سے دیکھنا اسکی مسکراہٹ بہت دل آویز ہے۔"

حوط نے سافو کی طرف دیکھا وہ ایک نوجوان کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اُس کے بال یونانی اچھوتیوں کی طرح کئی گول دائرے بناتے ہوئے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ چھاتیوں پر ایک مہین سا کپڑا تھا جس میں سے دونوں گولائیوں کے لطیف خم صاف نظر آ رہے تھے، اور راج ہنس کی سی گردن میں سمندری موتیوں کا بیش قیمت ہار تھا، باتیں کرتی کرتی جب وہ مسکرائی تو اُس کے رخسار میں خوبصورت گڑھے نمودار ہوئے اور لب ایک شگفتہ پھول کی طرح کھل گئے۔

حوط ابھی اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی نے بازار کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"ذرا اُدھر دیکھنا۔"

"کیا ہے ؟"

"تم ممفس میں نئے ہو یہاں کے مشہور آدمیوں کو بھی دیکھنا چاہتے ہوگے ؟"

"ہاں ہاں ــــ ضرور۔"

"اچھا تو دیکھو یہ جو چار آدمی جا رہے ہیں نا ــــ"

یہ کہکر لڑکی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

ــــ "دائیں طرف کے دونوں قبطی فوج کے سردار ہیں۔ ارسلاؤس اور سنفرو۔ اُن کے ساتھ بادشاہ کا بھتیجا ماسیوس ہے اور بائیں طرف ممفس کا مشہور رئیس طیماتورع ہے بڑا رنگین مزاج آدمی ہے۔"

حوط نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ شہزادہ ماسیوس ابھی نوجوان ہی تھا۔ اُس کی زرق برق پوشاک اور سر پر کلغی کا نشان اُس کے شاہی خاندان کی علامت تھی۔ ارسلاؤس، سنفرو اور طیماتورع کو ادھیڑ عمر کے تھے۔ لیکن اُن کے چہروں پر بھی زندہ دلی کے آثار پائے جاتے تھے، اور طیماتورع کی آنکھیں تو خطرناک حد تک شرابی تھیں، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعی یہ شخص بڑا رنگین مزاج ہے۔

حوط کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک عشرتگاہ میں داخل ہو گئے، جب وہ پلٹا تو لڑکی اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پٹی کو کس رہی تھی۔

ممفس کے سب سے حسین و جمیل قطعۂ زمین ــــ "بازار عیش" کی پچاس عشرتگاہوں کو دیکھ کر وہ اُس چوک پر آ گئے جہاں سے ایک راستہ کسبیوں کے بازار کو جاتا تھا اور دوسرا شہر کی مشرقی فصیل کی طرف جس کے ساتھ ہی بندرگاہ تھی۔

حوط کے دل میں اس وقت سوئی ہوئی آرزوئیں بیدار ہو رہی تھیں۔ بازار عیش کی عریانیوں کو دیکھ کر جہاں انسان اپنے اصل روپ میں نظر آتا ہے، کلیسا کی زندگی اُسے ایک خواب معلوم ہونے لگی ــــ جو اُس نے نیم خوابیدگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جاؤں ــــ کیونکہ موت اور زندگی کے دونوں راستے اُس کے سامنے تھے۔

لڑکی نے پوچھا۔

"اب کہاں چلیں ؟"

"کہاں چلیں ــــ ؟"

یہی تو وہ سوچ رہا تھا۔ یعنی دونوں کے ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی سوال پیدا ہوا اور حوط دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"جہاں تمہاری مرضی ہے مجھے لے چلو۔ تم جوان ہو۔ خوبصورت ہو اور پھر باتونی بھی اس لئے کسی ایسی جگہ چلو جہاں تنہا بیٹھ کر زندگی کا لطف اُٹھا سکیں۔"

لڑکی نے پوچھا۔

"گھر چلو گے ؟"

"ہاں ــــ چلوں گا۔"

وہ اُسے ساتھ لیکر "بازار عیش" کے اُس حصہ کو روانہ ہوئی جدھر کسبیاں اور بانسری بجانے والیاں رہتی تھیں۔ ادھر ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ پھل، پھول اور مٹھائیاں بیچنے والوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ نوجوان عورتیں اور مرد

طرح طرح کی پوشاکیں پہنے گھوم رہے تھے۔ چلتے چلتے حوط کا کندھا ایک کسبی کے کندھے کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اور اُس نے مسکرا کر اپنا نام پیش کیا۔

"تشمونینی ــــ"

لیکن لڑکی نے اُس کی طرف ایسی نگاہوں سے گھورا کہ وہ چلتی بنی ــــ پھر وہ آگے بڑھے، ایک جگہ دو لڑکیاں دف بجا بجا کر گا رہی تھیں اور دو بانسریاں بجا بجا کر لوگوں سے پیسے اکٹھے کر رہی تھیں، ابھی یہ دونوں بازار کے اُس حصہ میں داخل نہیں ہوئے تھے جہاں بھیڑ زیادہ تھی۔ کہ کسبی نے لڑکی کو روک لیا اور بولی۔

"خوش رہو رودس!"

لڑکی نے جواب دیا۔

"تم بھی خوش رہو"

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

"مَیں تو یہیں تھی ــــ تم اپنی سناؤ"

ایک منٹ خاموش رہکر کسبی نے جواب دیا۔

"آج کوئی گاہک نہیں مل سکا "شاہراہ" پر جا رہی ہوں شاید وہاں کوئی پھنس جائے ــــ"

"اچھا تو جاؤ"

یہ کہکر لڑکی آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ کسبی نے پھر روک لیا۔ اور کہنے لگی۔

"بڑی روکھی ہوتی جا رہی ہو۔ مَیں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی تھی"

"کیا؟"

"سنا ہے طیمانوع پھر کوئی دعوت دے رہا ہے۔ کیا تمہیں بھی بلایا ہے"

لڑکی نے غصہ میں کہا۔

"مَیں اُس حرامی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ اُسے "بادِ خمسین" تباہ کرے اگر بلائے بھی تو نہیں جاؤں گی ــــ"

"خیر شمیرسی۔ بلقارہ۔ ریڈونس۔ تشمونہ اور رابی کو تو پیغام آ بھی چکے ہیں اور وہ تیاریاں کر رہی ہیں"

"اور تمہیں نہیں بلایا؟"

کسبی نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

"ہم کو اب کون پوچھتا ہے۔ خیر گذارہ تو ہو ہی رہا ہے۔ لیکن مہاماتا کی قسم ہے کہ جب یہ چھوکریاں میری عمر کو پہنچیں گی تو اپنے یاروں کے جوتے چاٹیں گی۔ اور مَیں تو اب بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی"

پھر اُس نے حوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ مُرغا کہاں سے ہاتھ لگا۔ خوب سجیلا جوان ہے۔ لمبے کتنے اچھے ہیں اور سینہ بھی کشادہ ہے ــــ ہائے ــــ میرا تو جی چاہتا ہے کہ بس لپٹ جاؤں"

لڑکی نے اُسے ایک طرف دھکا دیا اور بولی۔

"چل دُور ہو تیری رال تو ٹپکتی ہی رہتی ہے"

کسبی نے اُس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور خوب زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسنے کے ساتھ ہی اُس کے چہرہ کی جھرّیاں نمایاں ہو گئیں، اور حوط نے محسوس کیا کہ اسکی عمر چالیس پچاس سے کم کیا ہو گی۔ لیکن ظاہری آراستگی سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سال کی ہے۔ جب اُسکی ہنسی تھمی تو کہنے لگی۔

"اچھا مذاق تو ہو چکا۔ ایک بات سنو ــــ تمہاری "پیاری" آ رہی ہے"

لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ اِدھر کہاں؟"

"ہم کسبیوں کا تماشہ دیکھنے آئی ہو گی"

"ہے کہاں؟"

"میرے پیچھے ہی تو چلی آ رہی تھی۔ شاید کہیں رُک گئی ہو گی، ــــ اچھا لو مَیں جاتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔ شاید "شاہراہ" پر بھی کوئی نہ مل سکے اور پھر تم تو اپنی "پیاری" کے ساتھ اُلجھ جاؤ گی"

لڑکی نے کہا۔

"مجھے کیا پڑی کہ خواہ مخواہ کسی سے اُلجھتی پھروں وہ اگر اپنے آپ کو بڑا سمجھتی ہے کہ شاید اُس کی شان ہاترداوی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن ہے تو آخر رقاصہ ہی نا ــــ"

"ہاں سچ ہے مری جانی! تم کس سے کم ہو"

یہ کہکر کسبی آگے بڑھی اور بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ نوجوان لڑکی نے فخریہ انداز سے حوط کی طرف دیکھا اور اسے ساتھ لیکر چلنے لگی۔

چلتے چلتے حوط نے پوچھا۔

"تمہارا نام رودس ہے؟"

"ہاں ــــ چھوڑو یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، مجھے کوئی نام پسند نہیں"

ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ انہوں نے ایک عجیب تماشہ دیکھا۔ لوگ راستہ سے ہٹ رہے تھے، بعض چبوتروں پر

کھڑے ہو گئے تھے، اور بازار کے وسط میں ایک عورت آہستہ آہستہ پُر وقار انداز میں چلی آ رہی تھی۔ رُوڈس اس کو دیکھ کر فوراً ایک بانسری بجانے والی لڑکی کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اور حوط سے بولی۔

"ذرا اِدھر آ جاؤ ۔۔۔ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ پائے"۔

عورت چلی آ رہی تھی۔ اور لوگ مشتاق نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بعض نوجوان اُسے پھول بھی پیش کر رہے تھے۔ جن میں سے وہ اپنی پسند کا ایک پھول چُن لیتی اور باقی لوٹا دیتی۔ اُس کا جسم نیم عُریاں سا تھا۔ مرمریں شانوں سے لیکر پنڈلیوں تک لٹکتی ہوئی ریشمی عبا میں سے بدن کا ہر عضو نظر آ رہا تھا۔ اور وہ یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی بہترین کاریگر کا تراشا ہوا مجسمہ بازار میں متحرک ہو، اُس کے چہرے پر سفید اور مہین جالی کا نقاب تھا۔ جس میں سے دو حسین ترین موٹی موٹی آنکھیں جو اپنے آخری گوشوں تک وا تھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اُن کے ساتھ خوبصورت متناسب ناک اور گلابی عارضوں کا بھی کچھ حصّہ نقاب سے خالی تھا۔ سیاہ بالوں کی دو لٹیں کنپٹیوں کے پاس سے ایک دلفریب سا خم کھا کر پیچھے کو مُڑی ہوئی تھیں۔ عبا میں سے نظر آنے والی چھاتیاں کھلی تھیں جن کے قدرتی اُبھار سے معلوم ہوتا تھا کہ کسبیوں کی طرح اُن پر مردوں کے ٹھونکے یورش نہیں ہو سکی ۔۔۔ اُس کی رفتار میں ایک وقار تھا۔ ایک مستی تھی، اور اُسی گھائل کر دینے والے انداز کے ساتھ وہ ہولے ہولے چلی آ رہی تھی۔

حوط نے ڈوبی ہوئی شکار شدہ نگاہوں کے ساتھ سر سے لیکر پاؤں تک اُس کے طلسمی حُسن کو دیکھا ۔۔۔ دیکھتا رہا اور جب وہ گزر گئی تو اُس نے رُوڈفس سے پوچھا۔

"یہ کون تھی ۔۔۔ ؟"

وہ بولی۔

"ایک رقاصہ ۔۔۔ کبھی میری "پیاری" تھی مگر اب نہیں کیونکہ چاہتی ہے کہ مہاماتا کی طرح اُس کی عزت کی جائے۔ آجکل تمام ممفس میں اسکی دھاک ہے۔ اسکندریہ میں منعقد ہونے والے درباروں سے کئی بار انعام پا چکی ہے۔ کل قصر الشمع میں اس کا رقص ہوگا"۔

حوط نے پلٹ کر دیکھا شاہانہ انداز کے ساتھ وہ چلی جا رہی تھی۔ اور بے شمار لوگ ٹکٹکی باندھے اُسے جاتے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ بازارِ عیش کے پچاس عشر نگاہوں والے حصّے میں داخل ہو گئی تو حوط نے زیر لب دہرایا۔

"کل قصر الشمع میں اس کا رقص ہوگا ۔۔۔ کل"۔

رُوڈفس نے کہا۔

"اچھا اب آؤ ۔۔۔ دیر ہو رہی ہے دیکھو بازار میں فانوس بھی روشن ہونا شروع ہو گئے"۔

حوط نے ایک آخری بار رقاصہ کی طرف دیکھا پھر چُپ چاپ مصری حسینہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لیکن اُس کے دل میں ایک طوفان سا بپا تھا اور اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے،

مہر اکبر آبادی بی۔اے

سہارے

دل ضبطِ الم کرتا ہی رہا پلکوں پہ نمی کچھ آ ہی گئی ۔۔۔ کچھ اُن کے تسلی دینے سے اشکوں کو سہارا مل ہی گیا
بیتاب سہی کتنا ہی یہ دل اظہارِ تمنا کیا کرتا ۔۔۔ یُوں کہئے کہ ان کی نظروں کا کچھ اس کو سہارا مل ہی گیا
اس درد کی ماری دنیا میں کب کون کسی کا ساتھی ہے ۔۔۔ اس یاس بھرے دل کو لیکن اِک غم کا سہارا مل ہی گیا
کیا جانے مجھے کیا یاد آیا پھر آنکھ میں آنسو بھر آئے ۔۔۔ پھر اُن کے فریبِ سعیٔ کرم کو ایک سہارا مل ہی گیا

وہ مجھ سے چھپا کر میری طرف دزدیدہ نگاہی کیا کہنا
اس حُسنِ تغافل کے صدقے جینے کا سہارا مل ہی گیا

ضیا عظیم آبادی

احساسات

وفورِ جلوہ سے پیدا حجاب درمیاں کرنا
اسی کا نام ہے تابِ نظر کا امتحاں کرنا

یہ میری خود شناسی ہے کہ میری خود فراموشی
بہک جاتا تو اپنی ذات پر اُن کا گماں کرنا

مرے بعد آنے والو قصۂ ہستی ادھورا ہے
جہاں سے میں نے چھوڑا ہے وہاں سے تم بیاں کرنا

نشیمن پھونکنے والے مرا دل ہے ابھی زندہ
مجھے مشکل نہیں تعمیر پھر سے آشیاں کرنا

جنھیں بادِ مخالف کے تھپیڑوں نے بجھایا ہے
مجھے اک دن انھیں شعلوں کو ہے برقِ تپاں کرنا

محبت میں اک ایسا بھی مقامِ خاص آتا ہے
گراں ہوتا ہے اپنے دل کو خود آہ و فغاں کرنا

جھکا لینا تو سر کو ایک سطحی سی عقیدت ہے
جبیں کو چاہیے تھا جذبِ تیرا آستاں کرنا

اسیروں کو ضیا اپنا زمانہ یاد آئے گا
نہ اُن کے سامنے ذکرِ بہارِ گلستاں کرنا

عبدالمجید بیتاب

طوفانِ آرزو

جل کر ہوا ہے راکھ گریبانِ آرزو
بھڑکا ہے جب سے شعلۂ پنہانِ آرزو

دیکھے تو کوئی جوشِ فراوانِ آرزو
اب ہر نفس ہے سلسلہ جنبانِ آرزو

اُف یہ فریبِ جلوۂ تابانِ آرزو
سمجھا ہوں صبحِ عیش کو عنوانِ آرزو

آ اور اس کو زخمۂ الفت سے چھیڑ دے
پھر بے صدا ہے سازِ رگِ جانِ آرزو

ہر زخمِ دل ہے صورتِ غنچہ کھلا ہوا
ہے دیدنی بہارِ چراغانِ آرزو

لاؤں کہاں سے اب وہ جراحت کی تیزیاں
خالی پڑا ہوا ہے نمکدانِ آرزو

جو دل کبھی تھا مرکزِ ہنگامۂ حیات
وہ دل ہے آج بے سر و سامانِ آرزو

بیتاب میری ہمت پہ کس کی نظر ہے آج
پھر موجزن ہے قلب میں طوفانِ آرزو

اشعر ملیح آبادی

اُردو شاعری میں منظر نگاری

اردو شاعری میں جمالیاتی ادب نے اتنا عروج پالیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اردو شاعری پر غزل اس طرح چھا گئی ہے کہ ہماری مغرب زدہ اور کوتاہ نظر ترقی یافتہ نسل نے ہماری دنیائے شاعری کو محض غزل تک محدود سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ گر معانِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات آئینہ ہو جائے کہ اردو شاعری میں ہزارہا ایسے ادب پارے موجود ہیں جو بتیر کسی جھجک کے مغربی نظموں کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اردو کی اکثر و بیشتر نظموں کا جواب بھی انگریزی شاعری میں مشکل سے ملیگا۔ انگریزی نظمیں محض دماغی حظ کا سامان فراہم کرتی ہیں برخلاف اس کے اردو نظمیں دماغ میں گونجتی ہوئی رگ احساس تک پہنچ جاتی ہیں اور ان سے روح کو ایک خاص قسم کا انبساط حاصل ہوتا ہے۔ احساس کو عجیب لذت ملتی ہے۔ اور دل پر ایک خاص سرورکی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان سب سے بڑھکر اردو نظموں میں جو موسیقیت ہے وہ دوسری زبانوں میں مفقود ہے۔

مغربی شعرا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی نیچرل شاعری ہے۔ ہماری ترقی یافتہ اور مغرب زدہ نسل اردو شاعری سے محض اس لئے متنفر ہے کہ اس میں وہ نیچرل شاعری اور منظر کشی کے نمونے نہیں ملتے جن سے مغربی شاعری کی جھولی بھری پڑی ہے۔ دراصل یہ ان لوگوں کی کوتاہ نظری ہے ورنہ اردو شاعری کا دامن بھی ایسے ہی صدہا مناظر سے پُر ہے۔ لیکن یہ نظمیں منتشر ہیں اس لئے ان کو یہ کہنے میں قطعی باک نہیں ہوتا کہ اردو میں یہ چیزیں سرے ہی سے مفقود ہیں۔

منظر نگاری بذات خود ایک وسیع صنف سخن ہے لیکن اردو شعراء نے اس کو خاص طور پر کوئی صنعت سمجھ کر اپنے اشہب قلم کی جولانگاہ نہیں بنایا بلکہ یونہی سرراہے تقریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ مناظر کھینچے ہیں۔ اور ایسی نظموں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

حقیقت میں منظر نگاری شاعر کا ایک بڑا کمال ہے۔ لفظوں کے ذریعہ سے عالم تصویر پیدا کر دینا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ جس طرح ایک چابکدست مصوّر اپنے قلم کے اُبھرے اور گہرے نقوش (Touches) سے تصویر کے تمام خدوخال اُجاگر کرتا ہے اسی طرح شاعر اپنے تخیّل کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کسی منظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ آنکھوں میں اس کی تصویر پھر جاتی ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بچشم خود ان مناظر کا مشاہدہ کر رہا ہے بلکہ اکثر اوقات شاعرانہ مصوّری اصل تصویر سے بڑھ جاتی ہے۔ اگر کوئی مصوّر کسی منظر کی تصویر کھینچتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اصل سے مشابہ کر دے گا لیکن شاعر اس منظر کے بعض نقوش اُبھار کے اور بعض کو دھندلا کر کے تشبیہات و استعارات سے اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ تصویر اصل سے بڑھ جاتی ہے۔ مصوّر زیادہ سے زیادہ تصویر کے ظاہری پہلوؤں پر غور کرے گا لیکن شاعر ہر پہلو کا امعانِ نظر سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اور جزئیات کو کبھی اس کی دوررس نظریں بیان کرتی ہیں اور کبھی نظر انداز کر جاتی ہیں۔

عربی شاعری میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ فارسی میں البتہ فرخی۔ انوری اور قاآنی کے یہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قاآنی کے قصائد منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں چونکہ اردو شاعری فارسی شاعری کی ڈگر پر چلی ہے اس لئے اس میں بھی اول اول منظر نگاری کا کوئی خاص التزام نہیں کیا گیا۔ البتہ جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ہر شاعر نے غیر التزامی طور پر کچھ نہ کچھ منظر کشی ضرور کی ہے۔

میر حسن کی مثنویوں میں منظر نگاری کی اعلیٰ تصویریں ملتی ہیں لیکن انھوں نے منظر نگاری کے ضمن میں کوئی علاحدہ نظم نہیں

لکھی ہوئی واقعات کے بیچ میں کہیں کہیں ضمنی طور پر کچھ مناظر آ گئے ہیں۔ چونکہ ان کا دھیان زیادہ تر واقعات کی ترتیب و تدوین پر رہا ہے اس لئے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ تصویر اصل سے مشابہ ہے یا نہیں۔ اکثر جگہ اجتماع ضدین ہو گیا ہے۔ میر حسن کی منظر نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

چاندنی اور خانہ باغ

نظر آئی واں چاندنی کی بہار۔ کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
زمیں نور کی آسماں نور کا۔ جدھر دیکھو ادھر سماں نور کا
لبالب وہ پوپڑ کی پاکیزہ نہر۔ پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم۔ ملیں جلوۂ ماہ کو زیر قدم
ستاروں کا جنباب میں خیال ہوا۔ کہ جھرنے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
کرے ہو نگہ جس طرف کو گذر۔ بجز نور آتا نہیں کچھ نظر

چاندنی رات اور تالاب میں میر حسن نے دلکش حکایاتی تصویر پیش کی ہے۔

جدید نیچرل شاعری کے پیشرو نظیر اکبر آبادی مانے جاتے ہیں۔ منظر نگاری میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کے کلیات میں منظر نگاری کے سینکڑوں نادر نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے قدرتی مناظر کی بہت پر اثر الفاظ میں تصویر کھینچی ہے۔ اور بقول سروری "ان کے یہاں جدید شاعری کے تخم موجود ہیں" لیکن سوقیانہ خیالات اور مبتذل الفاظ کی بنا پر ادب میں ان کی اتنی قدر نہیں جتنی ان کے ہم عصروں کی ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں فطری شاعر تھے۔ شاعری ان کا پیشہ یا مشغلہ نہ تھا بلکہ جب فطرت ان کو شعر کہنے پر مجبور کرتی تو وہ مجبور ہو جاتے۔ ان کی منظر نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ "برسات کا تماشا"

ساون کے بادلوں نے پھر آ گھٹا جو چھائی
بجلی نے اپنی صورت پھر آن کر دکھائی
ہر مست رعد گرجا، کوئل کی کوک آئی
بدلی نے کیا مزے کی رم جھم جھڑی لگائی
آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہر کوہ کی کمر تک سبزہ ہے لہلہاتا
برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ پانی ہے بہہ جاتا
وحشی طیور ہر اک مل جل کے ہے نہاتا
غوغا کریں ہیں مینڈک، جھینگر ہے غل مچاتا
آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

اس کے علاوہ "برسات کی بہاریں"۔ "اکبر آباد"۔ "برسات کی عبادت"۔ "برسات کے عیش و سیج"۔ "آفت خزاں"۔ اور "... کی برسات" وغیرہ نظیر کی منظر کشی کا بہترین نمونہ ہیں۔

نظیر کے علاوہ ضمیر نے اپنے مرثیوں میں منظر نگاری کی ایک مستقل صنف قائم کی ہے۔ جس کو انیس اور دبیر نے پایۂ عروج تک پہنچایا ہے۔ میر ضمیر معاملہ بندی، تشبیہات اور استعارات سے اپنے کلام کو مزین کرتے تھے۔ جس سے وہ پڑھنے والے کے دل پر اثر پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے انیس اور دبیر نے منظر نگاری کی جزئیات پر زیادہ زور دیا۔ انیس کے یہاں دبیر سے زیادہ فصاحت پائی جاتی ہے۔ انیس کی منظر نگاری ملاحظہ ہو ؎

"نور ظہور کا وقت"

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج۔ کبک۔ تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھامے بھی نخل کے سبد گلفروش تھے
وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

یا "ظہور صبح" میں کہتے ہیں ؎

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس میں شک نہیں کہ انیس اور ان کے ہمعصروں نے نظرت نگاری کو بہت عروج دیا۔ لیکن ابھی تک یہ لوگ منظر نگاری کی اصل تکنیک سے واقف نہ تھے۔ اس کے بعد ہندوستانی طرز تمدن

...فطرت نے کروٹ لی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے
...جھنڈے لہرانے لگے مغربی طرزِ تمدن کے ساتھ مغربی شاعری
کا اثر ہونا بھی ضروری تھا۔ یہیں سے اردو شاعری میں ایک
...نئے دور اور جدید شاعری کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے چھوٹی چھوٹی جدید
...نظمیں لکھیں۔ آزاد کی نظموں سے فطرت پرستی صاف نمایاں
ہے۔ طرزِ جدید کے شاعروں کی بنیاد ڈالنے میں آزاد کا بڑا
...ہے لیکن آزاد کی نظموں میں شعریت، لطافت اور رنگینی
...کم ہے۔ آمد کے بجائے آورد اور کاوش نظر آتی ہے
...ملاحظہ ہو۔

"زمستان"

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو بہتے ہوئے تھے وہ منجمد ہو کے جم گئے
دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا غلافِ برف میں منہ کو لپیٹ کر
سنسان جنگل ہے اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف بہاریں ہیں دوڑتی بلائیں

...نظم "باغ" میں کہتے ہیں۔

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گل خودرو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں
سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری
سنگ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی
اس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی
رنگِ رخ کو گلِ رخسار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

آزاد نے اس طرز کو عروج دینے کے لئے انتھک کوششیں
کیں اور اردو شاعری ان کے بارِ احسان سے کبھی گردن نہیں
اٹھا سکتی۔ ان کی نظمیں "خوشا وقت شام"، "شام کی آمد اور رات
کی کیفیت"، "ابرِ کرم"، اور "موسمِ خزاں" وغیرہ فطرت نگاری کی
عمدہ مثالیں ہیں۔

آزاد کے ساتھیوں میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام
بہت نمایاں ہے۔ جدید طرز کی نظموں کی ابتدا بے شک آزاد
ہی کی مرہونِ منت ہے لیکن اس کو کمال پر پہنچانے میں حالی
کا زبردست ہاتھ ہے۔ آزاد نے جس عمارت کی بنیاد رکھی تھی
حالی نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ حالی کی نظموں میں شیرینی
اور شعریت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس سے کلام کا لطف و
اثر دوبالا ہو گیا ہے۔ مناظرِ قدرت پر ان کی بہت سی نظمیں
ملتی ہیں۔ "برکھا رُت" ان کی وہ نظم ہے جس کے لکھتے ہی
تمام ہندوستان میں حالی کی دھوم مچ گئی اور آزاد کی برساتی
نظموں کی قدر و قیمت گھٹ گئی۔ ملاحظہ ہو ؎

"برکھا رُت"

گرمی کی تپش بجھانے والی ؛ سردی کا پیام لانے والی
ہے ابر کی فوج آگے آگے ؛ اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی ؛ آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں ؛ جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت ؛ کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار ؛ دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں ؛ جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
ندی نالے چڑھے ہوئے تھم ہیں ؛ تیرکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی ؛ مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کی تھپیڑیں کھا رہی ہیں

دیکھئے برسات کا نقشہ کس قدر صحیح پیش کیا ہے۔ اس کے
علاوہ "برکھا رت" اور "پردیس"، "سیرِ کشمیر" اور "گرمی کا موسم" وغیرہ
نظمیں عمدہ اور دلکش تصویریں پیش کرتی ہیں۔ آزاد اور حالی
ہی کے ہمعصروں میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام خاص طور پر
قابلِ ذکر ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی منظر نگاری میں حالی اور آزاد سے بھی چند
قدم آگے بڑھ گئے ہیں سب سے پہل انھوں نے انگریزی نظموں
سے ترجمے شروع کئے مگر جلد ہی خود بھی کہنا شروع کر دیا۔ ان کی
منظر نگاری میں مقامی رنگ بڑی خوبی سے جھلکتا ہے۔ حقیقت و
معرفت کا عنصر بھی غالب ہے۔ "تعمیم اخلاق" ان کا زبردست
اور گرانقدر کارنامہ ہے۔ وہ ہر نظم میں کسی نہ کسی پہلو سے اخلاق
کی تعلیم ضرور دیتے ہیں۔ اسمٰعیل کی نظر جزئیات پر بڑی خوبی
سے پڑتی ہے۔ ہر چند اسمٰعیل کے یہاں وہ عمق نہیں جو انیس

کے یہاں ہے، لیکن پھر بھی سادگی، تنعمگی، روانی اور سلاست وہ شے ہے جو دل کو موہ لیتی ہے۔ بے قافیہ نظموں کا رواج اردو شاعری میں اسمٰعیل ہی سے شروع ہوا۔

اسمٰعیل نے بچوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھیں لیکن طرزِ بیان میں ہر جگہ مناسبت کا خیال رکھا ہے۔ اسمٰعیل کی ایک نظم "نسیم سحر" ملاحظہ ہو جس میں منظر کشی محاکات کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

ہونے کو صبح آئی تو ٹھنڈی ہوا چلی ☆ کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہو کھیت کو لہتی ہیا بالیاں ☆ لودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی
سویا ہوا کتا سبزہ اسے بھی جگا چلی

ایک اور نظم ملاحظہ ہو۔ "شام کا جھٹپٹا" سے

جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا ☆ صاحبو یہ وقت ہے آرام کا
قصد چڑیوں نے بسیرے کا کیا ☆ ڈھونڈھتی ہیں اپنا اپنا گھونسلا
دیکھو سورج ہے چھپنے کے قریب ☆ تھم گئے چلتے مسافر بھی غریب
شام کو بستی سے باغوں کی طرف ☆ اڑ چلے کوے بھی مل کر صف بہ صف
اب ہوا کے تیز جھونکے رک گئے
سو گئے پیڑ اور پودے جھک گئے

ان کے علاوہ "بارش کا پہلا قطرہ"۔ "کوہ ہمالہ"۔ "صبح کی آمد"۔ "شفق"۔ "رات"۔ "نظارۂ قدرت"۔ "خدا کی صنعت"۔ وغیرہ منظر نگاری کے اچھوتے نمونے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسمٰعیل کی نظموں نے اردو شاعری میں ایک معتدبہ اضافہ کیا ہے۔

اسی قافلے کے ساتھ شوق قدوائی بھی نظر آتے ہیں۔ آزاد کے یہاں تصنع اور بناوٹ ہے مگر جوش نہیں۔ حالی کے یہاں شعریت ہے تو تخئیل نہیں۔ اسمٰعیل کے یہاں جزئیات نگاری ہے تو امعانِ نظر نہیں۔ لیکن شوق کے یہاں یہ سب خصوصیات بہم موجود ہیں۔ اس لئے ان کی منظر نگاری اپنے پیشرووں میں سب سے افضل ہے۔ شوق کے اندازِ بیان میں گہرائی اور زبان میں شگفتگی ہے۔ سلیس اور مترنم بحروں کے استعمال میں شوق کو یدِطولیٰ حاصل ہے جس سے کلام کا لطف بڑھ گیا ہے۔

نمونۂ کلام

بندھیاچل کی چاندنی رات

چاندنی رات اور بندھیاچل کا جنگل پُر فضا
مالوے کی شب کہ گرما میں بھی سرد اس کی ہوا
چاندنی کے پھول روشن چاندنی کے نور سے
چاندنی ایسی کہ تم پتوں کو گن لو دور سے
گر رہا ہے کوہ پر جھرنوں سے پانی جابجا
دے رہی ہے لطف نہروں کی روانی جابجا
پھول پھل سب بل رہے ہیں وجد میں آئے ہوئے
پیڑ جتنے ہیں کھڑے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے
وہ ادھر سرخاب پانی میں پڑے ہیں دیکھنا
وہ کنارے پر تنے سارس کھڑے ہیں دیکھنا
نیلگوں رنگِ سما اس پر ستارے جلوہ گر
جیسے آئیں بلبلے جمنا کے پانی پر نظر

"جنگل کی رات" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جنگل کی اندھیری رات سنسان ☆ بادل بھی گھرا ہوا پریشان
پیڑوں کا وہ ہولناک انداز ☆ شیروں کی وہ خوفناک آواز
شعلوں کا وہ خود بجھ کے بھڑکنا ☆ پتوں کا وہ جابجا کھڑکنا
وہ بوم کا ہو، وہ ہو کا عالم ☆ وہ وہم کی صورتیں مجسم
اے حسن وہاں بھی جلوہ گر تو
جگنو بن کر ادھر ادھر تو

اگر "لطفِ سحر" کے چند اشعار پیش نہ کروں تو ناظرین ایک بہت عمدہ منظر سے محروم رہ جائیں گے۔

لطفِ سحر

وہ دن کے لئے سرور کا وقت ☆ وہ لطفِ سحر وہ نور کا وقت
آہستہ نسیم کا وہ چلنا ☆ سورج کا وہ آڑ سے نکلنا
منہ پھولوں کے دھو گئی ہے شبنم ☆ سبزے کو بھگو گئی ہے شبنم
نوکوں پہ جو قطرے تھم گئے ہیں ☆ دانے موتی کے جم گئے ہیں
کلیوں سے لگی ہے کیسی ہویدا ☆ کچھ قصد تبسم ان سے پیدا
دل کو جو لبھایا رنگ و بو نے
اے حسن کشش یہ دی ہے تو نے

ان نظموں کے علاوہ "بادل کا پھٹنا"۔ "آمدِ بہار"۔ "برسات کی شام"۔ "باغ و بہار"۔ "آبشار"۔ "برکھا رت" وغیرہ بہترین نظمیں ہیں۔ فطرت کی عکاسی میں فلسفہ کو سمو کر شوق نے ایک عجیب امتزاج لطیف پیدا کر دیا ہے۔

ان لوگوں کے ساتھ بے نظیر شاہ کا بھی نام لیا جاتا ہے وہ جدید شاعری سے بہت متاثر ہوئے اور صدہا مناظرِ قدرت

کی عکاسی کی ہے۔ اس تصویر کشی میں ان کے تصوف کی چاشنی سے عجیب شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے بیان روانی اور سلاست بدرجۂ اتم موجود ہے۔

حقیقت میں وہ مثنوی نگار ہیں اور ان کی مثنویوں میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ اپنی مثنوی "انکلاعہ" کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی زبان پر فارسی کا غلبہ ہونے کی وجہ سے لفظوں کے ذریعہ وہ محاکات نہیں پیدا ہوئی جو دوسرے شعرا کے ہاں ملتی ہے۔ بعض بعض مثنویوں کے بیچ میں اچھے مناظر آ گئے ہیں۔ ان کی نظم "صبح بنارس" بہت مشہور ہے۔ ملاحظہ ہو سے
نمایاں ہے کس درجہ تاروں کی چھاؤں ⁂ ٹہلنے کی خاطر نکلتے ہیں پاؤں
نہانے کو وہ نازنینانِ شہر ⁂ چلی آتی ہیں کس طرح سوئے نہر
نزاکت سے کوئی لچکتی ہوئی ⁂ ادھر آ رہی ہے جھجکتی ہوئی
وہ ہر بار ٹھکرا کے سیڑھی کوئی ⁂ سناتی ہے جھنکار پازیب کی
کسی کا وہ اترا کے چلنا کہیں
کسی کا وہ گر کر سنبھلنا کہیں

دیکھئے کتنا صحیح منظر پیش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے شاعر نے اسی جگہ بیٹھ کر یہ نظم لکھی ہے۔ "صبح صحرا کا ایک منظر" ملاحظہ ہو سے
فلک پر اڑا وہ سنہرا غبار ⁂ منور ہوئے وادی و کوہسار
مطلا پہاڑوں کی وہ چوٹیاں ⁂ دکھاتی ہیں اس وقت کیا کیا سماں
ہرے نخل ان پر زر افشاں کرن ⁂ شعاعوں سے وہ کونپلوں کی پھبن
وہ پانی کا جھرنا وہ چاندی کے تار ⁂ وہ شیشے کی چادر وہ صاف آبشار
وہ گنجان شاخیں شجر سایہ دار ⁂ پہاڑوں کے دامن میں وہ سبزہ زار
چٹانوں پہ وہ چادر آب صاف ⁂ ہو چاندی کے پتر کا جیسے غلاف

یا پھر "ریل میں پہاڑی سفر" ملاحظہ کیجئے اور شاعر کے مشاہدے کی داد دیجئے۔

عجب شان سے آج جاتی ہے ریل
کدھر کو نہ جانے بھاگی جاتی ہے ریل
اندھیرا پہاڑوں کے اندر کہیں
چڑھائی کہیں اور چکر کہیں
کہیں کوئی دریا کہیں کوئی جھیل
کہیں سلسلے کوہ کے مستطیل
بلندی پہ جس وقت آتی ہے ریل
سماں دور تک کا دکھاتی ہے ریل
کہیں سبزہ ہر دو طرف موجزن
کہیں پھر رہے ہیں ہزاروں ہرن
پہاڑوں کے اندر ہے رستہ جہاں
وہاں دن کو روشن ہوئیں بتیاں

ان کے علاوہ "آرائش باغ" "بہار صبح" "آمد آمد" "گلگشت چمن" "طلوع آفتاب" "چاندنی رات" "ڈھلتی رات" "چاندنی کی بہار" "سپیدۂ سحر" "بہار صبح" "آندھی" "رونق بارش" "بہار" "تارے" "پہاڑی رات" وغیرہ بہت عمدہ نظمیں ہیں جن میں تصویر کشی کا کمال بہت عروج پر ہے۔ سید نظیر کے اکثر مناظر طویل ہوتے ہیں لیکن وہ تسلسل کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

اس کے بعد نظم نگاری کو کچھ اور ترقی ہوئی۔ اکبر الہ آبادی اور نظم طبا طبائی نے بہت اچھے اچھے مناظر پیش کئے۔ اکبر کی ایک مشہور نظم ملاحظہ ہو جو ساؤدے کی نظم کا ترجمہ ہے۔ اکبر نے اس خوبصورتی سے ترجمہ کیا ہے کہ اس کو اپنا لیا ہے۔ ملاحظہ ہو سے

دریا کی روانی

روانی میں اک شور کرتا ہوا ⁂ رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا ⁂ چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا ⁂ وہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا ⁂ نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں میں بھرتا ہوا ⁂ وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا

ہر چند جدید شاعری مختلف مدارج طے کر چکی تھی پھر بھی ابھی تک مشرقی نیچرل شاعری اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ ہم اس کو مغربی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے کہ پنجاب سے اقبال اٹھا اور مشرقی شاعری کو اتنا عروج دیا کہ ہمیں دوسرے کے آگے کوتاہ دامنی کا شکوہ نہ رہا۔ اقبال نے منظر نگاری میں بڑی ندرت سے کام لیا۔ تصویروں کے ساتھ جذبات کا نقشہ کھینچ کر اس نے فطرت نگاری میں جان ڈال دی۔ نظموں میں فلسفہ اور تصوف کی ملاوٹ سے اقبال نے ایک امتزاج لطیف پیدا کر دیا۔ اس نے منظر کشی کے موقعہ پر عام باتوں کو نظر انداز کر کے خاص اور اہم باتوں پر روشنی ڈالی اور ان میں گہرائی اور زور پیدا کیا۔ اقبال نے مناظر میں ایجاز و اختصار پیدا کیا۔ لیکن اس کی

یہ مختصر نظمیں بھی دیگر شعراء کی طویل نظموں پر بھاری ہیں۔ اقبال معمولی سے معمولی چیز کو عمق کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے انجام پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے اور پھر دست تاسف ملتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اقبال کی منظر نگاری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنا پیغام فطرت کی زبان سے سناتا ہے۔ اس سے اس کے کلام کا اثر دوبالا ہو گیا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت بھی احساس رکھتی ہے۔ اس لئے وہ پھول۔ پتوں سے بھی گفتگو کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم "بزم انجم" میں مادی چیزوں کی حرکت کو زندگی سے تعبیر کرتا ہے ؎

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کی لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

اقبال کی نظم "ایک آرزو" منظر کشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ایک چابکدست مصور بھی اپنے قلم سے اتنی عمدہ تصویریں نہیں کھینچ سکتا جتنی شاعر نے الفاظ میں کھینچ دی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

لیکن جلد ہی اقبال منظر کشی سے ہٹ کر اپنا پیغام سنانے لگتا ہے ؎

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

"ایک شام" میں اقبال نے دریا کے کنارے کا منظر کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو دریا کے کنارے کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا

اس نظم کے آخری شعر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اقبال کسی زبردست ذہنی کشمکش اور انتشار میں مبتلا ہے۔ جب وہ ہر چیز کو ساکت اور خاموش دیکھتا ہے تو اپنے دل سے کہنے لگتا ہے ؎

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اسی طرح "کنار راوی" میں اقبال تصویر کھینچتے کھینچتے دیکھتا ہے کہ دریا میں ایک کشتی تیزی سے بہی چلی جا رہی ہے یکایک وہ کشتی نظر سے گم ہو جاتی ہے۔ اقبال اس منظر سے بہت متاثر ہوتا ہے اور جو تصویر وہ کھینچ رہا ہے اسکو اسی طرح ادھورا چھوڑ کر فلسفۂ حیات کو حل کرنے لگتا ہے۔ کشتی کے چھپ جانے پر وہ کہتا ہے ؎

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

وہ پودا جو آزاد اور حالی کی کوششوں سے نصب کیا گیا تھا اس کی صحیح معنوں میں اقبال نے پرورش کی۔ اقبال کی منظر نگاری پر بعض بعض جگہ شخصی عنصر غالب آ جاتا ہے اور تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ لیکن ہم اس کی بیشتر نظموں کو محض اس بات پر کہ ان میں شخصی عنصر جھلکتا ہے۔ منظر نگاری کی حد سے قطعی خارج نہیں کر سکتے۔ اقبال نے منظر نگاری کے لئے نئے نئے راستے نکالے جن پر چلنے والے آنکھیں بند کئے بغیر کسی جھجک اور ڈر کے چلے جا رہے ہیں۔

"گورستان شاہی"، "پیام صبح"، "آفتاب صبح"، "ابر کہسار"

"ہمالہ" "چاند" "صبح کا ستارہ" "ستارہ" وغیرہ نظموں میں بہت اچھے اچھے مناظر ملتے ہیں۔

اقبال سے بہت سے شعرا متاثر ہوئے ان میں سب سے پہلا نام سرور جہان آبادی کا آتا ہے۔ سرور اقبال کے معصر تھے۔ لیکن ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ جس کا اندازہ ان کی نظم "فضائے برشگال" اور اقبال سے اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

بہار آئی شگفتہ ہوئے گل پنجاب ✽ چٹک چٹک کے کدھر ہو تو بلبل پنجاب
ادھر بھی کوئی ایا رشیدیئے سخن باقی ہے ✽ اٹھے وہ جھوم کے بادل گھٹا کے دن آئے

سرور کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی کارفرما نظر آتا ہے لیکن پھر بھی منظر نگاری میں کمال حاصل تھا ان کی رنگین بیانی اور اس میں سوز و گداز کی شمولیت سے ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ طرز ادا کی جدت ان کی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ بعض بعض جگہ اقبال اور سرور کے خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن سرور کے یہاں وہ امعان نظر اور وہ گہرائی نہیں جو اقبال کے یہاں رواں دواں ہے۔ کہیں کہیں سرور کے یہاں ایک قومی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ غالباً وہ ان ہی کی زندگی کا دھندلا سا عکس ہوتا ہے۔ سرور کی نظموں میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دیسی رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سرور کی نظم "فضائے برشگال" ملاحظہ ہو ۔۔

اٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابر بہار
چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
سہی قدان کا ہے جمگھٹ کنارِ آب رواں
کہ برج میں لب جمنا ہے گوپیوں کی قطار
ترانہ ریز ہے یوں شاخ سرو پر قمری
کہ جیسے گاتی ہو مدھوبن میں کوئی ستدر نار
ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی
ہوا میں اڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں انار

سرور کی نظم "چشمۂ وطن" بھی تصویر کشی کا ایک کامیاب مرقع ہے ۔۔

جاری رہے گا یونہی تو اے وطن کے چشمے
انداز خوش خرامی ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
گذرے گا سبزہ زاروں میں کھیلتا ہوا تو
موجوں میں تیرے دلکش کیا پیچ و خم نہ ہوں گے
ہلتی رہیں گی یونہی پھولوں کی سبز بیلیں
جھونکے نسیم کے یہ کیا صبح دم نہ ہوں گے
تیرا کریں گے یونہی مرغابیوں کے جوڑے
ساحل پہ آ کے تیرے پنچھے قدم نہ ہوں گے
کھیلا کریں گی تجھ سے سورج کی کرنیں دن میں
کیا شب کو چاندنی کے ساماں بہم نہ ہوں گے

ان کے علاوہ "جمنا جی" "پریاگ کا سنگم" "گنگا جی" "مزار دوست" وغیرہ نظمیں سرور کی منظر نگاری کی اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اقبال اور سرور کے ہمعصروں میں چکبست کے قلم سے بھی اچھے اچھے مناظر نکلے ہیں اور ان کی نظم "سیر دہرہ دون" کا جواب تو مغربی ادب میں مشکل ہی سے ملے گا۔ پہلے پہل چکبست نے اپنی شاعری تغزل سے شروع کی لیکن بعد میں ان کی شاعری ملک و قوم کی محبت میں ڈوب گئی۔ چکبست بھی ہر شئے کو بڑی گہری نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اقبال کے یہاں قوم کی محبت کارفرما ہے اور چکبست کے یہاں حب الوطنی کا رنگ جھلکتا ہے میں اپنے موضوع سے دور ہٹا جا رہا ہوں۔ اول اول چکبست بالکل اقبال کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ "خاک ہند" "وطن کا راگ" "ہمارا وطن" وغیرہ نظمیں اس دور کی یادگار ہیں مناظر قدرت پر چکبست نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں "سیر دہرہ دون" ان کا شاہکار ہے۔ اس نظم میں محاکات اور تخئیل نے مل کر ایک عجیب شان پیدا کر دی ہے "سیر دہرہ دون" میں چکبست نے زبردست مطالعہ نظر سے کام لیا ہے۔ اور ہر شے کا استقصا کر کے بیان کیا ہے۔ تصویروں کی صفائی اور بیان کی تازگی اور شگفتگی اس نظم کی جان ہیں ۔۔

سیر دہرہ دون

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی
لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزے کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزے کا
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

بلند ہوں سو سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر
نگہ کو دور سے پانی جو سے نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

بس ایک عالم محو جا رحمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اختتام پر پہنچکر یہ نظم فلسفیانہ ہوگئی ہے۔ شاعر خود کو ہر اس چیز کا جو اسے نظر آتی ہے ایک جزو سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی ہر شے میں ایک ہم آہنگی اور ربط پایا جاتا ہے۔ اس کی نظر میں پیڑ پودے، شجر، ابر و باد، اور خود انسان سب کی اصل ایک ہے۔ چکبست کی ایک نظم "جلوۂ صبح" بھی منظر نگاری میں ایک دلفریب اضافہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جب زنگِ شب آئینہ ہستی سے ہوا دور
ہنگام سحر کون و مکاں ہوگئے پرنور
تبدیل ہوئی صورت کوہِ شبِ دیجور
چمکا وہ تجلائے سحر سے صفتِ نور

. . . .

ہنگامِ سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم
وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
آرام میں سبزہ تھا تہ چادرِ شبنم

. . . .

جو نخل تھا گلشن میں برومند کھڑا تھا
دامانِ سحر میں گل خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستان کا لڑا تھا
ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخلِ چمن جھوم رہے تھے

کرشن کنہیا میں چکبست ایک جگہ کہتا ہے ؎

شبِ تاریک کے قبضے میں ہے ایوانِ فلک
چھپکی جاتی ہے اندھیرے میں ستاروں کی چمک
وہ ہوا ہے کہ اڑ جاتے ہیں فانوس تلک
نظر آتی نہیں بستی میں چراغوں کی جھلک

صرف جگنو ہے جو دیوانہ صفت پھرتا ہے
شمع لے کر کبھی اٹھتا ہے کبھی گرتا ہے
راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی
وہ تگڑا مینہہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی

پاگنگا پرشاد ورما کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں دو ایک بند بہت اچھی تصویر کشی کے نمونے نظر آتے ہیں۔ سنئے ؎

پیڑ سرسبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے
ڈوبتی کرنوں سے فوارے میں اک تاب بھی ہے
گل نوخیز بھی ہیں سبزۂ شاداب بھی ہے
شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے

ان کے علاوہ "برسات"، "مرقع عبرت" وغیرہ نظموں میں اچھے اچھے مناظر مل جاتے ہیں۔

چکبست کے بعد تلوک چند محروم کا نام منظر نگار شعرا کی صف میں نظر آتا ہے۔ محروم کا احساس بہت شدید ہے اور ان کی نظر بہت تیز اور گہری پڑتی ہے۔ ان کے یہاں بھی فلسفیانہ طرز بیان جھلکتا ہے۔ ان کی نظر کسی شے کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کے انجام پر پہنچ جاتی ہے۔ فلسفہ کے امتزاج نے ان کے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ ممکنات سے زیادہ محروم کے یہاں تخیل کی کارفرمائی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام گنج معانی میں منظر کشی کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں۔ ایک نظم "صحرا" ملاحظہ ہو ؎

ہیں قریب شہر کچھ باغ و چمن ⁂ بے گماں ہے دلکشا ان کی پھبن
ہیں شگفتہ ان میں نسترن و سمن ⁂ طائرانِ خوشنوا ہیں نغمہ زن
روبرا ہے ہر طرف ساری زمین ⁂ صاف آتا ہے نظر چرخ بریں
سارے جنگل کی فضا ہے دلنشیں ⁂ کوہ و دریا کے مناظر ہیں کہیں

"بندرا بن کی صبح" محروم کی تصویر کشی کا ایک سچا نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

آثار عیاں ہوئے سحر کے ⁂ ساماں ہونے لگے سفر کے
ہلچل میں ہے کاروان انجم ⁂ مشرق کو چلا نشان انجم
مشرق میں ہے نور ہلکا ہلکا ⁂ طلعت کا ظہور ہلکا ہلکا
صبح بن کر عروس تازہ ⁂ آئی مل کر شفق کا غازہ
کرنیں جمنا سے کھیلتی ہیں ⁂ ظلمت کو پرے دھکیلتی ہیں

ساحل پہ وہ دب دب پڑا ہیں ÷ محمل تو ہے ڈوب ڈوب گرا دیں
دھیمے دھیمے ہوا کے جھونکے ÷ انداز خرام وہ گلوں کے

ترانہ بیداری میں لکھتے ہیں ؎

باد سحر کے جھونکے آنے ÷ نکہت تر کے جھونکے آنے
نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے ÷ دست دعا شاخوں نے اٹھائے
گویا خدا سے سبزہ ÷ سر بسجود پڑا ہے سبزہ
شاخ پہ بلبل زمزمہ خواں ہے ÷ خاک پہ سنبل زمزمہ خواں ہے

اس نظم کے آخری اشعار فلسفیانہ ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان اس بحر فنا میں ایک شناور ہے۔ اگر وہ صبح تک سوتا رہے تو جانے قافلے کے دوسرے لوگ کتنا آگے نکل جائیں گے۔ اس لئے وہ کہتا ہے ؎

تجھ کو بھی درپیش سفر ہے ÷ جاگ اٹھ جاگ اٹھ وقت سحر ہے

مرحوم کے ہم عصروں میں وحیدالدین سلیم، عظمت اللہ خاں، صفی لکھنوی۔ مرزا ہادی اور عزیز وغیرہ نے منظر نگاری میں خوب کمال دکھائے ہیں۔

ان کے علاوہ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی، فراق گورکھپوری، اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ نے منظر نگاری کی صنعت کو بہت عروج دیا۔ جوش اور حفیظ ان شعراء میں بہت بلند ہیں۔

جوش ملیح آبادی۔ موجودہ دور شاعری میں محاکات کے بادشاہ مانے جاتے ہیں۔ تصویر کشی میں جوش کا اس وقت کوئی ثانی نہیں ملتا جوش کی نظر جزئیات پر پہلے پڑتی ہے۔ اور تشبیہات اور حسین استعاروں سے جوش اپنے فن کو ترقی دیتے ہیں۔ جوش کی سادہ نگاری بعض اوقات میر حسن کی یاد دلاتی ہے۔ "روح ادب" میں منظر نگاری کے اچھوتے نمونے ملتے ہیں۔ مگر اکثر اوقات جوش کا رجحان تغزل کی منظر کشی میں حائل ہو جاتا ہے۔ "جلوۂ سحر" ملاحظہ ہو۔

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذروں کا تبسم
چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جس پہ ترنم
گردوں پہ سپیدی و سیاہی کا تصادم
طوفان وہ جلووں کا وہ نغموں کا تلاطم

- - - - - - -

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا
وہ چاندنی مدھم وہ سمندر کا چھلکنا
وہ چھاؤں میں تاروں کی گل تر کا چمکنا
وہ جھومنا سبزے کا وہ کھیتوں کا لہکنا

. . . .

خنکی وہ بیاباں کی وہ رنگینئ صحرا
وہ وادئ سرسبز وہ تالاب مصفا
پیشانئ گردوں پہ وہ ہنستا ہوا تارا
وہ راستے جنگل کے وہ بہتا ہوا دھارا
ہر سمت گلستاں میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رخسار گلوں کے

"جنگل کی شہزادی" محاکات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دور پر تھا پانی موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

یا "جمنا کے کنارے" ایک نظم ہے جس میں تخیل اور محاکات کے امتزاج سے بڑی بلندی پیدا ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خورشید طلوع ہو رہا ہے ÷ افسانہ شروع ہو رہا ہے
جلووں کی ہے چھوٹ خار و خس پر ÷ رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے ÷ پردوں کی کمر لچک رہی ہے
جاگے ہیں طیور چہچہاتے ÷ چونکے ہیں حسین کسمساتے
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی ÷ شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی

جوش کی شاعری پر مستی و رندی کا اس قدر غلبہ ہے کہ اگر وہ کوئی منظر پیش کرتے ہیں تو اقبال کی طرح اپنے شخصی عنصر نمایاں کئے بغیر نہیں رہتے۔ جس سے پڑھنے والا منظر کی دنیا سے ہٹ کر افکار و خیالات کی گہرائی میں جا پہنچتا ہے۔

"خواب کی پرچھائیں"، "سہاگن بیوہ"، "برق عریاں"، وغیرہ نظمیں جوش کی اعلیٰ منظر نگاری کی مثالیں ہیں۔ جوش کی ایک نظم ہے "ساون کے مہینے" جس کے متعلق اہل فن اور نکتہ شناس حضرات کا خیال ہے کہ اس نظم کا جواب مغرب کے زبردست شاعر "ورڈزورتھ" کے یہاں بھی مشکل سے ملے گا۔ لیکن اکثر و بیشتر جوش

کی گہرائی فلسفۂ عمق فکر اور شخصی عنصر ان کی منظر نگاری پر غالب آجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے تصویر کے خد و خال واضح طور پر نمایاں نہیں ہونے پاتے۔

ایک اور شاعر جس نے اردو شاعری میں نئے نئے مناظر کا اضافہ کیا حفیظ جالندہری ہے۔ حفیظ جالندھری نے منظر کشی کو بحور اور قوافی کے مناسب سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ تصویر کشی میں حفیظ کو پوری مہارت ہے مقامی رنگ حفیظ کے یہاں اپنے دیگر ہمعصر شعراء سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں مطلب ادا کرنے پر حفیظ کو بڑی قدرت حاصل ہے "تصویر کشمیر" حفیظ کی معرکۃ آرا نظم ہے اور اس کی نظیر اردو ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قاری بچشم خود کشمیر کی سیر کر چکا ہے۔

"راوی میں کشتی"۔ "شام رنگیں"۔ "جلوۂ سحر"۔ "تاروں بھری رات"۔ "برسات"۔ "طوفانی کشتی"۔ اور "شام کہسار" وغیرہ اس کی بہترین نظمیں ہیں۔ جن میں منظر نگاری کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ "شام کہسار" ملاحظہ ہو۔

نور کے زریں ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے
بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں
ایک پر اسرار خاموشی فضا میں بس گئی
اک سبک رفتار مدہوشی فضا میں بس گئی
منظر کہسار پر اس دم یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے، اترا ہے کوئی کارواں
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

جوش۔ حفیظ کے علاوہ دور حاضر میں سیماب اکبر آبادی فراق گورکھپوری۔ حامد اللہ افسر۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ احسان بن دانش۔ روش صدیقی۔ فطرت واسطی۔ اختر حیدر آبادی عبدالحمید عدم۔ وغیرہ سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ ان لوگوں نے منظر نگاری کی دنیا میں بڑی وسعت پیدا کی ہے۔

ظفر علی خاں کی نظم "دریا کے موسلے کی طغیانی" اور "بارش" اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ ہے۔ جذبات تخئیل اور محاکات کے باہم مل جانے سے نظم میں عجیب لطافت پیدا ہو گئی ہے۔

حامد اللہ افسر بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں کہتے ہیں۔ لیکن ان سے بڑے بوڑھے بھی حظ اٹھا سکتے ہیں ان کی نظمیں چاند اور "ہم"۔ "چاند" بڑی خوبیوں کی حامل ہیں۔ افسر نے مترنم اور دلکش بحروں کو اردو میں عروج دیا۔ مقامی رنگ ان کے بہت نمایاں ہے۔

روش صدیقی کے یہاں تصویر کشی میں پاکیزہ معنویت نمایاں رہتی ہے۔ احسان ایک خاص نظر سے قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ انداز نظر ابھی صرف انہی تک محدود ہے۔

عدم کی چند نظمیں مثلاً "دنیا اور شاعر"۔ "ایک دن"۔ "راوی کے کنارے"۔ "ایک شام"۔ "شب ماہتاب"۔ "سکوت نیم شب"۔ "دنیا" وغیرہ نظمیں مشاہدہ قدرت کا اعلیٰ نمونہ ہیں جذبات کی صحیح عکاسی نے اس میں کمال پیدا کر دیا ہے۔

فطرت واسطی نے بھی اردو شاعری میں اچھے مناظر کا اضافہ کیا۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کے اعلیٰ اعلیٰ نمونے آپ کی نظر سے گذرے مگر پھر بھی ہماری شاعری میں مناظر کی بہت کمی ہے۔ البتہ موجودہ ترقی کی تیز رفتاری سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہت جلد ہماری منظر کشی اس منزل پر پہنچ جائے گی جس پر ہماری نظریں جمی ہوئی ہیں۔

علی احمد بی اے (عثمانیہ)

امیر مینائیؒ

اے امیر! اے کشورِ شعر و سخن کے تاجدار
تجھ سے ہی پیراہنِ لیلائے اردو زرنگار
شاعرِ فطرت، امیرِ شعر، سلطانِ سخن
روحِ بادہ، جانِ میخانہ، ضیائے انجمن
فکر تھی تیری منور عرش کی قندیل سے
آتشیں نغمے ہوئے پیدا تری تخییل سے
وارداتِ قلب کی تفسیر تیری ہر غزل
کر دیئے شعروں میں تو نے زیست کے اسرار حل
تو نے کی بارش تصوف کی خودی کے جام سے
نعت کے دریا بہائے وادیٔ الہام سے
زہد تیری زندگی، تقویٰ ترا شغلِ مدام
سدرۂ و طوبیٰ ترے کشف دریا کے مقام
تیری مستی میکدہ، تیری نظر میخانہ ساز
تیری پستی میں بھی گردوں کی جبینوں کا فراز
تیری گردِ کارواں سے کارواں پیدا ہوئے
تیرے تنکوں سے ہزاروں آشیاں پیدا ہوئے
محفلِ شعر و ادب میں تیرا چرچا ہے ہنوز
تو حسینوں کے صنم خانوں میں رسوا ہے ہنوز

چھین کر تجھکو وطن سے اے امیرِ بے وطن
آج تک نازاں ہے اپنی خاک پر ارضِ دکن

نظم نشرگاہ حیدرآباد سے امیر ڈے پر پڑھی گئی۔

طاہرہ قریشی

میں کون؟

میں عشق مجسم ہوں، میں عشق سراپا ہوں
میں درد کی دنیا ہوں، میں حسن کا نقشا ہوں
میں سوز کا منبع ہوں، میں آگ کا دریا ہوں
میں اپنی حقیقت کا سب حال سناؤں گا

مضرابِ رگِ گل ہوں سورج کی کرن ہوں میں
کلیوں کا تبسم ہوں غنچوں کا دہن ہوں میں
نغمات کی محفل ہوں اور سازِ چمن ہوں میں
ہر لمحہ خودی کا اک پیغام سناؤں گا

ہیں میری حرارت سے خورشید و قمر زندہ
تاروں کی جبیں رخشاں ذرّوں کی نظر زندہ
راتوں کی سیاہی میں انوارِ سحر زندہ
میں اپنی بڑائی کے سو راگ سناؤں گا

میں سازِ خودی کا اک معصوم ترانہ ہوں
فطرت کے کرشموں کا منظوم فسانہ ہوں
تفسیرِ اناالحق ہوں خود دارِ زمانہ ہوں
ہر سانس کو دمسازِ منصور بناؤں گا

ذرّوں کو جلا دونگا تاروں کی جبیں بن کر
بخشوں گا گلوں کو بو فردوس بریں بن کر
ہر بزم میں آؤنگا اک شمعِ یقیں بن کر
خود داریٔ فطرت میں سو چاند لگاؤں گا

احمد شجاع پاشا بی اے

موت

گھر میں کہرام مچ گیا۔ چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اڑوس پڑوس کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ وہ اٹھا۔ چکرا کے گرا اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اس کی آنکھوں سے زندگی کی چمک مفقود ہو گئی۔ اسکی الجھی الجھی سانسیں آپس میں کچھ دیر تک لڑتی جھگڑتی رہیں۔ اس کی قوتِ ارادی کچھ دیر تک موت کا مقابلہ کرتی رہی۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں میں پسینے کی بوندیں از خود منجمد ہو گئیں۔ وہ تھک گیا۔ وہ ہار گیا۔ بال تاریک پیشانی پر بے ترتیبی سے پھیل گئے۔ سر ایکطرف کو ڈھلک گیا۔ اور حلق کے نیچے حرکت کرتی ہوئی باریک سی رگ ساکت ہو کے رہ گئی۔ موت اس کی رُوح کو دبوچ کے لے گئی تھی۔

بہت سی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔

"ابا ۔۔۔ ہائے ابا۔"

"سرتاج۔"

"بیٹے ۔۔۔ میرے بیٹے" قیامت آگئی، مایوس نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھیں۔ آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔ آنکھیں برسنے لگیں، برستی رہیں حتٰی کہ آنسوؤں اور آہوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، گلے بیٹھ گئے، آنکھیں سُوج گئیں۔ سسکیاں دب گئیں۔ رہ گئیں خلا کو گھورتی ہوئی نظریں۔ زرد زرد مغموم چہرے اور ہیبتناک خاموشی۔ ریگستانوں ایسا سناٹا۔ مرگھٹ ایسا سکوت۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ۔ جوان عورت کا خاوند۔ بوڑھی ماں کا بیٹا۔ ایک دبلی پتلی پارہ گز کی سفید چادر اوڑھ کر ہزاروں من مٹی کے نیچے جا سویا۔ زمین کے سینے میں، عورت کی آغوش میں ۔۔۔۔۔

موت ۔۔۔! اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں کے سامنے سُرخ و سیہ رنگ کے دھبے رقص کرنے لگے کتنی پھرتی اور صفائی سے کام کیا تھا اپنا۔ ابھی کل ہی وہ اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے سڑک پر جاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ کل ہی اپنے بہت سے دوستوں سے ملاقات کی تھی اس نے۔ سیر و تفریح کے پروگرام بنائے تھے۔ رقص و سرود کی محفلوں کا ذکر کیا تھا۔ سینما جانے کی خواہش تھی، اپنے اور بیوی کے لئے اچھے اچھے کپڑے خریدے تھے۔ کل ہی ۔ اور آج وہ

اپنی تمام اُمنگیں۔ تمام خواہشیں۔ تمام آرزوئیں سینے میں دبائے دُنیا و مافیہا سے بے خبر مٹی کے نیچے ہمیشہ کیلئے سو چکا تھا۔ اسکی بیوی کی دبی دبی سسکیاں۔ اس کے بچوں کی چیخ پکار۔ اسکی ماں کی آہ و زاری۔ سب کا دل پسیج گیا تھا اس وقت۔ سب کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ چہروں پر غم و اندوہ کی تاریکیاں سی چھا گئی تھیں۔ بیوی کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو اسکی بے رونق آنکھوں میں گر رہے تھے جو چھت کو گھورے جا رہی تھیں۔ وہ لاش کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اسے پڑوسیوں کا کچھ خیال نہ تھا۔ اپنے کپڑوں۔ اپنی حالت کی کچھ پروا نہ تھی۔ وہ روئے جا رہی تھی اور آنسوؤں کا منہ تھمتا نظر ہی نہ آتا تھا۔ وہ رو رہی تھی اپنے شوہر کیلئے اپنے سرتاج کیلئے۔ جو اسے اور اس کے بچوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ گیا تھا جو ایسے لمبے سفر پر چلا گیا تھا جہاں سے واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ زندگی کے مُلک سے کوسوں دُور۔ موت کی سلطنت میں ۔۔۔۔

وہ مر گیا۔ موت چھین کر لے گئی اُسے، اور پڑوس کے چند آدمیوں کی آنکھیں اس کے بچوں کی حالت دیکھ کر کچھ دیر کیلئے پُرنم ہو گئیں۔ کسی کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے اس کی موت پر۔ نعیم نے سوچا۔ کتنا خوش قسمت انسان تھا مرنے والا۔ اسے خبر بھی نہ تھی، اور اس کے بعد اس کے لئے آنسو بہائے جا رہے تھے۔ اس کے بچوں سے ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ایسے شخص کی ضرورت تھی ابھی دُنیا میں۔ دُنیا میں نہ سہی اس کے اپنے گھر میں اسکی بیوی کو۔ اس کے بچوں کو۔ جو اسکی موت کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ جو اسکی موت پر آنسو بہا رہے تھے، اسے ابھی مرنا نہ چاہیئے تھا۔ بہت دن اور زندہ رہنا چاہیئے تھا۔ تاکہ سب کا جی بھر جاتا۔ کسی کو اسکی کمی محسوس نہ ہوتی۔ کوئی اس کی موت پر آنسو نہ بہاتا۔ گھر والے مسرت کے ساتھ اسے نہلاتے۔ کفناتے اور سپردِ خاک کر دیتے۔ مگر موت ۔ وہ ہمالہ کی چٹانوں سا مضبوط سخت دل رکھنے والی موت۔ اپنے مکروہ ہاتھوں کو اسکی طرف بڑھائے بغیر نہ رہ سکی۔ ہاتھ جلادوں کے سے جنھوں ایسے ظالم ہاتھ

بعجلت اس کے گلے کی طرف بڑھنے لگے انگلیاں مضبوطی سے اپنی جگہ پر جم گئیں۔ زندگی تڑپ تڑپ کر اس شکنجے سے نکلنے کی کوشش کرتی رہی مقابلہ ہوتا رہا۔ مگر زندگی نے دم توڑ دیا وہ مر گیا اور اس کی موت پر آنسو بہائے جانے لگے ——

موت — ندیم کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی، ہاں اس کمرے میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آسمانی رنگ کی مغموم روشنی ہر چیز پر پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر لٹکتی ہوئی تصویروں پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ کھونٹیوں پر لٹکتے ہوئے سفید کپڑے کفن سے معلوم ہو رہے تھے۔ اور کمرے کا ماحول قبر کے ماحول سے مشابہ تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا اسی گھر کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے آج ایک موت واقع ہو گئی تھی۔ ہوا آنسوؤں سے لبریز تھی۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی، سہمے ہوئے بچے خاموشی سے کونوں میں دبکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گھر پر ماتمی پھریرا لہرا رہا تھا۔ زندگی کا نشان تک نہ تھا ہنگامے بالکل خاموش ہو چکے تھے۔ اور موت سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی خون آلود انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کے دماغ میں سوچنے کی قوت موجود تھی۔ ٹانگوں میں چلنے کی سکت باقی تھی، ٹانگیں چلتی تھیں۔ دماغ سوچتا تھا اور ہاتھ حرکت کرتے رہتے تھے

اور وہ زخمی سانپ کی طرح رینگتا ہوا ایک کشادہ راہ پر چلا جا رہا تھا۔ مردود نسل کے ایک انبوہ کثیر کے ہمراہ، چرچراتی ہوئی ہڈیوں اور زرد زرد چہروں والے لوگ، بالکل سایوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ وہ زندہ تھے مگر ان میں زندگی نہ تھی مشین کے پرزوں کی طرح وہ اپنی اپنی جگہ پر چلے جا رہے تھے۔ دنیا سمجھ رہی تھی وہ زندہ ہیں۔ ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک موجود ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں حرکت کر رہے ہیں، ان میں آندھیوں اور بگولوں کا زور ہے۔ مگر وہ اس احساس سے بے خبر تھے۔ وہ مُردہ تھے۔ ان کے احساسات پر برف جم چکی تھی۔ ان کے خیالات ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ اور موت کی گہری تاریکیاں ان کے چہروں پر لرزاں تھیں ——

اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے۔ اس ہجوم میں شامل ہونے سے پیشتر، ریوڑ میں مل جانے سے قبل۔ کیا کچھ سوچا تھا اس نے۔ کتنے ہوائی قلعے تعمیر کئے تھے۔ کتنی تمناؤں کی پرورش کی تھی۔ کتنی آرزوؤں کو پال پوس کر جوان کیا تھا۔ نہیں۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ اس ماحول کے اثر کو قبول نہیں کریگا۔ وہ اس کے سامنے سر نہیں جھکائے گا۔ وہ اپنے خیالات کا خون نہ کریگا۔ اگر وہ اس کمرے میں داخل ہوا تو اسکی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے داخل ہوگا۔ اسکی ہجوم میں شمولیت فاتح کی حیثیت سے ہوگی۔ وہ چرواہا بن کے ریوڑ کے ساتھ چلے گا۔ اک نئی دنیا بسائیگا اک نیا جہان آباد کریگا جس میں آزادی اور مساوات کی شمعیں جگمگائینگی۔ جس میں اس ماحول اور اس نظام کی دھجیاں اُڑا دی جائینگی۔ مگر زنجیریں بہت وزنی تھیں۔ زندان کی دیواریں بہت بلند تھیں۔ محافظ بہت ہوشیار تھے اور اس کا جسم بہت کمزور تھا — وہ اُٹھا — چکرا کے گرا — اور اس کی آنکھوں سے زندگی کی چمک مفقود ہو گئی۔ یہ بھی اک موت تھی۔ بہت ہی ذلیل قسم کی موت۔ انقلاب کے سپاہی نے میدان سے بھاگتے ہوئے پشت پر زخم کھائے۔ زخموں سے خون کے فوارے سے نکلنے لگے۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ طویل راستے کے پیچ و خم دیکھ کر سر چکرانے لگا۔ ٹانگیں جواب دے گئیں، اور موت نے اسے آ لیا۔ اس کے لمبے لمبے ناخن اسکی آنکھوں میں دھنس گئے۔ اس کے مکروہ دانت اس کی گردن میں پیوست ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ ہمالہ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سرد۔ وہ مر چکا تھا۔ یہ بھی اک موت تھی۔ اس کی آنکھیں ہر چیز کو دیکھتی تھیں اس کے ہاتھ ہر چیز کو چھوتے تھے۔ اس کا دل بھی سینے میں دھڑکتا تھا۔ مگر آنکھوں میں دیکھنے کی قوت۔ ہاتھوں میں چھونے کی طاقت اور دل میں دھڑکن کے علاوہ کچھ موجود نہ تھا ——

فضا میں ایکدم بہت سی چیخیں بلند ہوئیں۔ جیسے قبرستان میں بہت سے الّو بول اُٹھے ہوں۔ بھیانک اور ہیبتناک چیخیں، ہوا کے دوش پر لہرائیں۔ فضا میں گونجیں اور سکوت میں غرق ہو گئیں، ابھی زخم بالکل تازہ تھے۔ ابھی خون رس رہا تھا۔ ابھی پٹیوں پر سُرخی اُبھرتی آ رہی تھی۔ وہ نہیں تھا اس کی یاد موجود تھی۔ شاید بیوی اس کا خالی پلنگ دیکھ کر تڑپ اُٹھی ہو۔ آج — ایک مُدت کے بعد وہ اپنے کمرے میں تنہا سونے کی تیاری کر رہی ہو۔ گذشتہ زندگی کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی ہوں۔ بہت دِن ہوئے تو وہ دُلہن بنکر آئی تھی اس کے کمرے میں۔ سُرخ جوڑا پہنے، سونے اور چاندی سے لدی ہوئی۔ اس کے سرتاج نے اسے گود میں بٹھا کر بڑے پیار سے گھونگھٹ اُٹھایا تھا۔ وہ شرم سے سمٹی جا رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی، وہ مُسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کا وفور سُرخی بن کر جھلک رہا تھا۔ اور اس رات ایک افسانہ شروع ہوا تھا جس کے آخری الفاظ آج صبح موت نے لکھے تھے ——

اسے مُردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا۔ اس کے جسم کو بیکار تصور کر کے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مگر اس کا خیال جسم کے ساتھ دفن نہ ہو سکا۔ وہ گھر کے چپے چپے پر نقش ہو چکا تھا۔ ان سڑکوں پر بھی اس کے نشانات موجود تھے جن کی سطح سے مرنے والے کے پاؤں مس ہوئے تھے۔ وہ زندہ تھا جسم کے بغیر۔ دُنیا میں نہ ہوتے ہوئے بھی دُنیا میں موجود تھا۔ دل کی بیکراں وُسعتوں پر پھیل چکا تھا۔ خیالات کی لامحدود سلطنت پر قابض ہو چکا تھا۔ ابھی سے اسے مُردہ سمجھ لینا زندگی کا مذاق اُڑانا تھا۔ ابھی تو اس کی لحد پر سبزہ بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی بھی مدھم نہ ہوئی تھی۔ ہاں مُدّتوں بعد۔ جب "پدرم سلطان بود" کہنے والا کوئی نہ رہیگا۔ جب اس کے لڑکے ماحول کا جزو بنجائیں گے جب اس کی بیوی خدا کی یاد میں محو ہو جائیگی۔ اس کی لحد پر اُگے ہوئے گھاس کی سبز کونپلوں پر زردی اپنا رنگ جمانے لگے گی۔ گھاس بالکل زرد پڑ جائیگی۔ بالکل سوکھ جائیگی۔ جب لحد کے سرہانے جلتا ہوا چراغ گل ہو جائیگا۔ جب تہواروں اور تقریبوں پر اشکوں اور آہوں کی بھینٹ نہ دیجائیگی ۔۔ اس وقت ۔۔ افسانہ مکمل ہو جائیگا۔ پردے گرا دیئے جائیں گے۔ اسٹیج کی بتیاں بجھا دی جائیں گی۔ ہال پر سناٹا چھا جائیگا۔ موت کا بھیانک سناٹا ۔۔۔

دھیرے دھیرے رونے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جیسے ضبط کرنے کے باوجود آنسو بہے جا رہے ہوں۔ تاریک اتھاہ خاموشیوں کو ہمراہ لیکر بلند و پست پر چھا چکی تھی۔ ندیم کھڑکی کے پاس بیٹھا اسی گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی قبر کے پاس بیٹھا ہے اور ایک روشن دان سے موت کی مملکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ وہاں کتنا سکون تھا۔ کتنا آرام تھا۔ چوبیس گھنٹے دھندلکے چھائے رہتے تھے۔ ہر وقت نیند کی بارش سی ہوتی رہتی تھی۔ شور و غل کو کوئی دخل نہ تھا۔ سفید سفید بے داغ کفن گہرے سرمئی دھندلکوں کا پس منظر لئے ہوئے تھے۔ سب کی سب بے رونق آنکھیں قبر کی چھت کو تکے جا رہی تھیں۔ سیدھی اکڑی ہوئی ٹانگوں میں کوئی خم نہ تھا۔ بے حس و حرکت بانہیں پسلیوں کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ سو وہاں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کوئی تصنع نہ تھا۔ کمرے کی دیواروں پر نیلگوں جھیل میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر نہ بنایا گیا تھا۔ رقص کرتی ہوئی برہنہ عورتوں کی پینٹنگز نہ تھیں۔ سو وہاں مخملیں صوفے نہ تھے۔ خوبصورت میزیں نہ تھیں۔ چمکیلے بھڑکیلے میز پوش نہ تھے۔ وہاں سخت زمین کا فرش تھا۔ اینٹ کا کھردرا تکیہ

اور سکوت کا مدہوش کُن راگ جس میں خمار انگڑائیاں لے رہا تھا۔ نشہ اُبل رہا تھا۔ اور جس سے مستیاں چھلک رہی تھیں۔ سادگی اور پُرکاری۔ آرٹ کا بہترین نمونہ۔ آرٹسٹ کا کمال۔ اور اس آرٹسٹ سے دُنیا خوف کھاتی تھی۔ اس کے نام سے لرز جاتی تھی۔ اس کے خیال ہی سے کانپ جاتی تھی۔ اس آرٹسٹ کو مکروہ کہا جاتا تھا۔ چڑیل اور ڈائن کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ انتہا ہے کور ذوقی کی۔ حد ہے بد مذاقی کی۔ دُنیا کے سب سے بڑے آرٹسٹ کو اس قدر ذلیل تصور کیا جائے۔ بہترین فن کار کو موت سا بھونڈا نام دیا جائے۔ کس قدر پھرتی اور صفائی سے کام کیا تھا اس نے۔ صرف چند لمحوں کے اندر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کو گہرے دُھندلکوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سفید کو سیاہ بنا دیا تھا۔ انسان مُدّت سے اس آرٹ کو اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نئے نئے طریقے اور نئی نئی تراکیب سوچی جا رہی تھیں۔ مگر اس آرٹسٹ کے مقابلے میں اس کی حیثیت صرف ایک دودھ پیتے بچے ایسی تھی۔ اسی آرٹسٹ نے جس کا فن کمال انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا شاہجہان کے ہاتھوں آگرے میں تاج محل بنوا دیا۔ ہلاکو اور چنگیز کو غیر فانی شہرت بخشدی دُنیا کے فرسودہ نظاموں کو کھوکھلا کر دیا۔ انقلابوں کے لئے راستے کھول دیئے۔ پُرانے بہت پُرانے درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔ نئی بیلوں۔ نئے پودوں۔ نئے درختوں کے لئے میدان صاف کر دیا۔ ننگوں۔ بھوکوں اور مظلوموں کی ہڈیوں سے نئے محلوں کی بُنیادیں رکھیں۔ ان کے خون سے زمین کو سیراب کر کے مٹی کی خاصیت ہی بدل دی۔ وہی زمین جہاں سامراجیت کے پودے چند لمحوں میں تناور درخت بنجاتے تھے سامراجیت کا بیج قبول کرنے سے انکار کرنے لگی۔ آرٹسٹ نے سب کچھ کیا۔ آرٹ کی ترقی کے لئے خون پسینہ ایک کر دیا۔ دن اور رات میں تمیز نہ کی۔ وقت بے وقت کا خیال نہ کیا۔ کسی کا انتظار نہ کیا۔ کسی کی پروا نہ کی۔ آرٹ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ مگر نگاہیں پھر بھی اس کی خوبیاں نہ دیکھ سکیں۔ پھر بھی آرٹ کا کوئی بھی قدردان پیدا نہ ہوا۔ اس کے فن کی تعریف میں کسی کی زبان سے چار لفظ ادا نہ ہوئے۔ کسی نے اس کے کمال کو نہ سراہا۔ سب اسے کوستے ہی رہے۔ گالیاں ہی دیتے رہے۔ نفرت ہی کرتے رہے۔ اس کے نام سے ڈائن ہی کہتے رہے اسے ۔۔ موت ۔۔ یہ جلاد دل [illegible]۔

یعنی وہ اپنی ماں کی مجبور سی زندگی کی دشمن۔ نہ جانے آج اسے اتنی حسین۔ اتنی پیاری کیوں معلوم ہو رہی تھی ——

بتیا کی ستاروں ایسی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ گیا تھا۔ اس کی ماں کی حالت بہت نازک تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، انہوں نے آنے والے خطرے سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ تپِ دق کی مریضہ اور عمر کے بوجھ سے دبی ہوئی بڑھیا۔ بہت سے بچوں کی ماں۔ بہت سے پوتوں کی دادی۔ منزل کے بہت قریب پہنچ گئی تھی وہ۔ رنگ آلود برش کینوس پر آخری بار مچل رہے تھے۔ وہ بستر پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی اور اسے بچانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے موت کے چنگل سے چھڑانے کی ترکیبیں سوچی جا رہی تھیں، وہ اس دن بہت مغموم نظر آ رہی تھی۔ بالکل حسین موت کی طرح، چہرے پر اداسی کھیل رہی تھی۔ آنکھوں میں ریگستانوں کے سناٹے سمٹ آئے تھے۔ اعضا کچھ مضمحل سے تھے۔ باریک باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نشان تک موجود نہ تھا۔ ماتھے پر مبہم سی شکنیں نمایاں تھیں۔ وہ سوگوار حسن کو دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔ اسے بتیا کی والدہ کی علالت کی خبر تھی۔

اس نے پوچھا "بتیا تمہاری والدہ کیسی ہیں اب"؟

"حالت بہت نازک ہے" بتیا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز نشتر کی طرح اس کے دل میں چبھ گئی۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"جواب دے چکے ہیں" نرگسی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی آنسوؤں میں تیرنے لگی۔

"بس چند دنوں کی مہمان ہیں وہ" وہ تاروں ایسی آنکھیں دھندلا گئیں اور برسنے لگیں۔ وہ گداز سینہ آہوں اور سسکیوں کے تلاطم سے ابھرنے لگا۔ حسین ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں آپس میں الجھ گئیں۔ وہ تڑپ گیا۔ بے چین سا ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ ایک خواہش پیدا ہوئی۔ ایک بگولا سا اٹھ کر اس کی ہستی پر چھا گیا۔ اس خواہش نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اس کا زور بڑھتا گیا۔ اس کی طاقت زیادہ ہوتی گئی۔ اس خواہش نے تمنا کی صورت اختیار کر لی۔ اسی خواہش نے۔ مرنے کی خواہش نے، کاش بتیا کی ماں کی جگہ وہ تپِ دق کا مریض ہوتا۔ اس کی حالت سخت نازک ہوتی۔ ڈاکٹر جواب دے دیتے۔ مایوسیاں چھا جاتیں، زندگی تھکن سے نڈھال ہو جاتی۔ اور موت ایک اور پینٹنگ تیار کرنے کے لئے اپنے برش تیار کر لیتی۔ اور کاش بتیا کو اس بات کا افسوس ہوتا۔

لوگ پوچھتے "بتیا کیسی طبیعت ہے ندیم کی"۔

"حالت بہت نازک ہے"۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں"۔

"جواب دے چکے ہیں"۔

"مگر . . ."

"بس چند دنوں کا مہمان ہے وہ"۔ اور پھر نرگسی آنکھیں برسنے لگتیں۔ اس کے لئے صرف اس کے لئے۔ اور وہ اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتا۔ ناز کرتا اپنی تقدیر پر۔ فخر کرتا اپنے نصیبوں پر۔ اور مرتے وقت اس کے چہرے پر ایک اطمینان انگیز سکون ہوتا۔ کاش یہ لانبی لانبی سیاہ پلکوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کے شفاف قطرے اس کے لئے وقف ہو جاتے یہ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے سینے سے نکلتی ہوئی ٹھنڈی آہیں صرف اسی کیلئے رہ جاتیں۔ اسے نہلا کے سفید کپڑے پہنا دیتے۔ اس کا جنازہ اٹھتا، لوگ جوق در جوق جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے اور پھر اسے زمین کے سینے میں دفن کر دیا جاتا۔ ایک متبرک راز کی طرح۔ دنیا کہتی کتنی دردانگیز موت ہے۔ اتنی چھوٹی عمر۔ ابھی تو اس نے کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ کچھ بھی نہ کیا تھا اس دنیا میں، بالکل جوان تھا ابھی۔ موت اور جوانی میں۔ مدتوں بعد بھی اس کی قبر کے کتبے کو دیکھ کر لوگ اظہارِ افسوس کرتے ——

اور پھر اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی بالکل بیکار ہے۔ بے سود ہے۔ وہ بے مدعا جی رہا ہے۔ اس کے سانس لینے کا کوئی مطلب نہیں۔ کھانے پینے اور سونے کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکا۔ اس کے ارادے جو پہاڑوں کی طرح غیر متزلزل سمجھے جاتے تھے سب چکنا چور ہو گئے۔ اس کی امنگوں نے تباہی کو جیا ڈالا۔ اسکی امیدوں نے بربادی کو کچل دیا۔ یہ جینا، یہ زندگی، کمینگی اور ذلالت کا دوسرا نام ہے۔ موت سے بدتر ہے۔ زندگی صرف سانس کے آنے جانے کا نام نہیں، زندگی اس سے بلند ہے، بہت بلند ہے، وہ اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اتنا اونچا پرواز نہیں کر سکتا۔ اس کے پر اڑنے سے پہلے ہی نوچ ڈالے گئے تھے۔ اس کا آشیانہ چمن کے سب سے چھوٹے درخت کی سب سے چھوٹی شاخ پر

بنایا گیا تھا۔ اسے قناعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب اس کے
نچے ہوئے پروں میں سکت نہ تھی۔ بازوؤں میں زور نہ تھا، اور
وہ بے بال و پر اپنے آشیانے میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس چمن میں
کسی کو اڑنا سکھایا ہی نہ گیا تھا۔ سب کے پر کتر رکھے تھے صیاد نے
سب کو دانے دُنکے کی فکر نے محو کر رکھا تھا۔ چمن کی خوبصورتی میں
اُلجھا رکھا تھا، اور وہ خاموش تھے۔ انہیں خیال تھا تو صبح و شام
گیت گانے کا۔ بارش اور دھوپ سے پناہ لینے کا۔ بچوں کیلئے
چوگا مہیا کرنے کا۔ یہ طریقے، یہ عادتیں، یہ اطوار بہت فرسودہ
ہو کے رہ گئے تھے۔ ایک خستہ حال پگڈنڈی پر بیل گاڑی کے
پہیوں کے نشانات موجود تھے۔ یہ نشان، یہ لکیریں، بہت
گہری ہو گئی تھیں۔ آنے جانے والے اسی راہ پر چلتے تھے، انکی
بیل گاڑیوں کے پہیے انہی لکیروں پر گھومتے تھے۔ چکراتے تھے
اور چکراتے چلے جاتے تھے، اور کوئی پگڈنڈی نہ تھی اور کوئی
راستہ نہ تھا زندگی ڈامر کی سڑکوں کے زمانے میں بھی پگڈنڈی پر
چلی جا رہی تھی۔ برسات کے مہینوں میں جب یہ پگڈنڈی دلدل
بنجاتی تو سفر پا پیادہ شروع ہو جاتا۔ دھوپ پڑتی کیچڑ خشک
ہو جاتا۔ ایک بیل گاڑی۔ دو چوڑی چوڑی۔ گہری گہری
لکیریں بناتی ہوئی گذر جاتی۔ اور زمین اپنے محور کے گرد پھر
گھومنے لگتی۔ سورج چڑھتا اور غروب ہو جاتا۔ راتیں
آتیں اور بیت جاتیں۔ مگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا۔ کسی میں اتنی
ہمت نہ تھی کہ کسی زمیندار کے کھیت میں اک نئی پگڈنڈی
بنا دے، ایکدفعہ صرف ایکدفعہ اس کھیت میں سے گذر جائے۔
وہ چلا جائیگا۔ اس کے قدموں کے نشان رہ جائیں گے اور
ریوڑ انہی نشانوں پر چلتا رہے گا ــــ بیکار بالکل بیکار۔
بیسود بالکل بیسود۔ یہ جینا۔ یہ زندگی۔ اس کے ماں باپ نے
اس کی پرورش کی۔ پڑھایا سکھایا۔ ڈگریاں دلائیں۔ وہ ان
کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا بوڑھا باپ اب بھی کام کر رہا تھا۔
اس کی ضعیف ماں اب بھی پریشان حال رہتی تھی۔ اسکے بھائی
ابھی بھی دوسروں کے دستِ نگر تھے۔ دوسروں کے محتاج
تھے۔ وہ انہیں بھی خوش نہ کر سکتا تھا۔ ان کے آنسو بھی نہ پونچھ
سکتا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی
نظریں ابھی اس پہ جمی ہوئی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں اُمید کی
چمک تھی۔ وہ اسے امید افزا نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

اور وہ بیچارا ماحول کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا [illegible] سے
اوپرے اوپرے آسمان کو تکتا رہتا تھا کیا وہ ان کی تمنائیں پوری
کر دیگا۔ ان کی امیدوں پہ پانی پھیر دے گا۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں
کر سکتا۔ ان کو ناامید نہیں کر سکتا۔ ان کے چہروں پر پھیلتی ہوئی
مایوسیاں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے اپنی مجبوریوں، کمزوریوں اور
نقائص کو چھپانے کے لئے کسی فنکار کی مدد لینا ہوگی۔ کسی
آرٹسٹ کی۔ دنیا کے بہترین آرٹسٹ کی مدد۔ اسے موت سے
التجا کرنا ہوگی۔ اے حسین دیوی۔ اے دُنیا کے غموں سے نجات
دلانے والی ساحرہ، اے سکوت کی ملکہ۔ انقلابوں کی محبوبہ۔
بغاوتوں کی سہیلی۔ آ۔ مجھے تیری مدد کی سخت ضرورت ہے۔
میں ماحول سے مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں۔
میں رینگتا ہوں تو میری مجبوریاں اور میری کمزوریاں میرے
راستے میں پہاڑ بنکر حائل ہو جاتی ہیں۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں
تو میرے نقائص پتھر کی بھاری بھرکم سلیں بنکر میرے اوپر گر پڑتے
ہیں۔ آ۔ تو ہی مجھے اپنے دامن میں لے لے۔ اپنا خوبصورت لبادہ
مجھے اوڑھا دے تاکہ میری کمزوریاں دُنیا کو نظر نہ آسکیں۔ اپنے
دامن میں چھپا لے تاکہ میری مجبوریوں کو لوگ دیکھ نہ سکیں، تو
دُنیا کی عظیم المرتبت فنکار ہے۔ کینوس کو اسٹینڈ پر پھر جما دے
حسین صندوقچے سے پھر برش نکال لے۔ خوبصورت پلیٹوں میں پھر
رنگ انڈیل لے، تجھے پھر اک تصویر بنانا ہے۔ موت۔ یہ موت،
اس کے ماں باپ کو افسوس ہوگا۔ اس کے بھائیوں کے دلوں پر
چھریاں سی چل جائینگی۔ کون اس کے لئے آنسو بہائے گا۔ مگر ان
آنسوؤں میں خون ہوگا۔ چمک نہیں ہوگی۔ یہ آنسو سرخ ہونگے شفاف
نہیں ہوں گے۔ ایسے آنسو تو ایک مالک اپنے کتے پر بھی بہا سکتا ہے۔
جو بہت دیر تک اس کے ساتھ رہا ہو۔ مگر یہ موت اس زندگی سے
بہتر ہوگی۔ والدین کا ایک بیٹا چلا گیا اور موجود ہیں بھائیوں کا
ایک بھائی ختم ہو گیا دوسرے باقی ہیں۔ شاید وہ کچھ کر سکیں۔
شاید وہ ماں باپ کو زیادہ راحت پہنچا سکیں۔ شاید وہ ان کا نام
روشن کر سکیں۔ ان کے لئے دُنیا جہان کے آرام و آسائش مہیا
کر سکیں۔ ان کی پریشان حالی کو دور کر سکیں ــــ اور اسے
وہ دن یاد آ گیا جب اس کے پڑوس میں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔
ایک نئی زندگی آئی تھی۔ بالکل معصوم بالکل انجان۔ گھر والوں نے
خوشیاں منائی تھیں۔ ڈھول تاشوں سے اس کا استقبال کیا تھا۔

غریبوں کو خیرات تقسیم کی گئی تھی۔ امیروں کو کھانے پر بلایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ خبر سنکر بے اختیار آنسو آگئے تھے۔ شیو بھی اسی طرح ایک دن دنیا میں آیا تھا۔ خیرات تقسیم کی گئی تھی۔ دعوتیں کی گئی تھیں۔ ایک بیکار سی زندگی کے لیے اتنی زحمت اٹھائی گئی تھی۔ نادان لوگ یہ نہ سمجھ سکے کہ غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ دنیا پر خدا کی طرف سے ایک اور لعنت بھیجی گئی ہے۔ ایک اور بھکاری پیدا ہوا ہے۔ وہ اسے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔ مسرت سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اور آج ایک مدت کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس کی عمر اس نوزائیدہ بچے کو لگ جائے۔ تا کہ وہ کچھ کرنے کیلئے بہت دیر تک زندہ رہے۔ وہ اس لعنت۔ اس بھکاری کی تجارت نہ ہونے دے۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نوزائیدہ جوان ہونے پر یہی دعا کریگا۔ وہ بھی مر جائیگا اور دنیا اسکی کمی بھی محسوس نہ کریگی ——

وہ مر جائیگا —— اور اسکی آنکھوں کے سامنے اس امریکن سپاہی کی شکل پھرنے لگی جسے اس نے ایک دن سڑک کے کنارے ایک ہندوستانی عورت سے سودا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کس قدر خوبصورت جوان تھا۔ لمبا قد۔ سڈول جسم۔ چوڑا چکلا سینہ اور مشرقی چہرہ۔ اور وہ مریل مچھر کی قسم کی ہندوستانی لڑکی اس کے سامنے کھڑی نخرے کر رہی تھی۔ کس قدر مکروہ صورت تھی اسکی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔ کیرم بورڈ کی قسم کا سینہ۔ بیاہ مجنوں ایسا جسم۔ سیاہ فاؤنٹین پن ایسی ٹانگیں۔ وہ شکل و صورت سے مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ اُسے دق کے علاوہ کچھ اور مرض بھی ہے۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ اسے دوسری بیماریاں بھی ہیں۔ چلنے والے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عورتیں اسکی طرف دیکھکر ناک بھوں چڑھا رہی تھیں —— مگر وہ امریکن سپاہی، اسے ان چیزوں کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ کوئی چیز اسے دھکیل رہی تھی۔ کوئی چیز اسے کھینچ رہی تھی۔ اور وہ جا رہا تھا۔ دوڑتا ہوا۔ موت کے منہ میں۔ اس رات کے بعد۔ ہزاروں راتوں کی تکلیف، بیماریاں۔ دنیا بھر کی لعنت۔ اور پھر موت۔ مگر اسے ان چیزوں کا مطلق خیال نہ تھا۔ موت اسے سبز باغ دکھا رہی تھی۔ ایک رات جوانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے رہی تھی۔ وہ لذت کیلئے مر رہا تھا۔ کچھ چیز حاصل کر کے کچھ چیز دے رہا تھا۔ وہ امریکن سپاہی

—— اور ندیم —— دونوں ملکوں میں بہت فرق تھا۔ زمین و آسمان کا فرق۔ اندھیرے اُجالے کا فرق۔ بہت فرق تھا ہندوستان اور امریکہ میں ——

بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی، محلے کے سب لوگ سو گئے تھے، آنکھیں بوجھل ہوتی جا رہی تھیں، صرف سامنے کے مکان میں ایک بیچین بیوی، ایک بیقرار ماں اور کچھ توف زدہ بچے جاگ رہے تھے۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اونچے اونچے مکانوں کے باغیچے ویرانوں کی طرح سائیں سائیں کر رہے تھے اور موت کے اسکول کی ایک اور آرٹسٹ اپنا پرچم لئے آہستہ خراماں سے آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اس کا جسم بھی گٹھری سی بن کر رہ گیا تھا۔ ہر ایک عضو اپنی جگہ پر ساکت و صامت تھا۔ صرف دماغ سامنے والے مکان کی طرح جاگ رہا تھا۔ اس کا دماغ اور وہ مکان دونوں میں موت گھوم رہی تھی۔ اُداس روشنیاں تاریکی کا پردہ چاک کرنے کی سعی نا مشکور کر رہی تھیں۔ مکان میں رہنے والوں کی چیخیں خاموشی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی تھیں اور دماغ کے خیالات جمود کے خلاف بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ مگر موت، وہ حسین ساحرہ دونوں جگہ موجود تھی۔ مکان کی خاموشی کو اور زیادہ بھیانک بنا رہی تھی۔ اور دماغ کے جمود پر ایک اور غلاف چڑھائے جا رہی تھی —— صبح۔

—— کل صبح —— اگر وہ اپنے کمرے میں مردہ پایا جائے دنیا کہے گی اس نے خودکشی کر لی۔ وہ بزدل تھا۔ ڈرپوک تھا۔ دنیا کے آلام و مصائب برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اسے محبت میں ناکامی ہوئی۔ اسے نوکری نہیں ملی۔ وہ امتحان میں فیل ہو گیا۔ وہ زندگی میں فیل ہو گیا۔ کوئی خدا کا بندہ ترس کھا کر اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دیگا۔ گھر میں کہرام مچ جائے گا۔ چیخیں فضا میں گونجیں گی۔ اڑوس پڑوس کے سب لوگ جمع ہو جائیں گے۔ مگر تبینا کے آنسو صرف بوڑھی ماں کے لئے ہوں گے اس کی آہیں صرف دق کی مریضہ کے واسطے ہوں گی۔ زندگی کسی کے کام نہ آئی۔ موت بھی کسی کے کام نہ آئے گی —— دونوں بیکار —— دونوں بے سود —— دونوں لاحاصل —— اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بیچین سا ہو گیا —— آنسو آنکھوں میں آئے۔ آنسو چہرے پر ڈھلک پڑے —— آنسو قمیص کے دامن پر گرنے لگے —— وہ رونے لگا —— پھوٹ پھوٹ کر —— بچوں کی طرح —— جیسے اپنی زندگی اور اپنی موت پر خود ہی آنسو بہا رہا ہو ——

وزیرزادہ مہر عثمانی

تجلیات

اگر بیدار میرا جذبۂ دیدار ہو جائے
تو ہر ذرّہ بدل کر جلوہ گاہِ یار ہو جائے

چمن میں رہ مگر ہر پھول سے دامن کشاں ہو کر
کہیں ایسا نہ ہو دامن ترا بیکار ہو جائے

یہی آئین اور دستور ہے دنیائے اُلفت کا
کوئی مجبور بن جائے کوئی مختار ہو جائے

وہ کیفِ دردِ اُلفت تو نہیں کچھ اور ہی شے ہے
کہ جس کی کیفیت شرمندۂ اظہار ہو جائے

وہیں سے ابتدا ہوتی ہے عرفانِ حقیقت کی
جہاں عقل و خرد کی رہبری بیکار ہو جائے

محبت کی وہی رنگینیوں سے کھیل سکتا ہے
جو شعلوں سے اُلجھنے کیلئے تیار ہو جائے

میں کیوں جاؤں وہاں توہین کے صدمے اُٹھانے کو
مری موجودگی جس انجمن پر بار ہو جائے

اسی مرکز پہ حسن و عشق یکجا ہو کے رہتے ہیں
جہاں قلب و نظر کی تیز تر رفتار ہو جائے

وہ مجبورِ محبت کیا سنائے داستاں اپنی
جسے اک حرفِ مطلب بھی زباں پر بار ہو جائے

سُنا ہے مہرؔ وہ مائل ہیں پیمانِ محبت پر
مزا جب ہے کہ تیری جانب سے اب انکار ہو جائے

نفیس سندیلوی

متارکہ

ناصحِ ناداں کوئی کیوں دوستی کو چھوڑ دے
کیا ستم ہے آدمی اور آدمی کو چھوڑ دے

عاشقی میں ضبط کر یا عاشقی کو چھوڑ دے
رہنے دے اپنی خوشی اپنی خوشی کو چھوڑ دے

اے وفا دشمن محبت تو مرا ایمان ہے
میں نہ چھوڑوں گا تجھے گو تو مجھی کو چھوڑ دے

ہم نے مانا وجہِ رسوائی ہے لیکن پند گو
دل جہاں بہلے کوئی کیوں اُس گلی کو چھوڑ دے

خود کو کچھ کہتے نہیں جلوہ دکھا یا چھپ گئے
مجھ سے کہتے ہیں کہ تو دیوانگی کو چھوڑ دے

اے دلِ بیمار یہ آثار کچھ اچھے نہیں
گھٹ کے مر جائے گا ورنہ خامشی کو چھوڑ دے

سچ کہا ناصح! کہ سمجھے جو نہ سمجھانے سے بھی
پھر اُسی کے حال پر اُس آدمی کو چھوڑ دے

اے دلِ بیتاب پیہم اُن سے عرضِ مدّعا
باز آ اس چھیڑ سے اس دل لگی کو چھوڑ دے

بے وفا انداز تیرا ہے یہ دنیا سے میاں
جو کرے تجھ سے محبت تو اُسی کو چھوڑ دے

ہم کو تو باور نہیں آتا نہیں آتا نفیسؔ
میکشوں میں رہ کے اور تو میکشی کو چھوڑ دے

غلام دستگیر نامی

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (متوفی سنہ ۱۰۵۲ھ) کی کتاب اخبار الاخیار سے بادشاہوں اور امراء سے درویشوں کے استغنا اور صاف گوئی کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ ان سے ثابت ہوگا کہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے اہل اللہ کیسے مستغنی المزاج واقع ہوئے تھے اور انہیں دنیوی عزوجاہ سے جو قرب سلاطین سے حاصل ہوتا ہے کیسی نفرت تھی۔ ہم انہیں کے نام لیوا کہلاتے ہیں مگر معاملہ برعکس ہے۔ وہ دنیا کو ٹھکراتے تھے اور ہم دنیا کی طرف۔ اہل دول ان کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور ہم اہل دول کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔

(۱) حضرت شیخ نظام الدین اولیا (جن کی درگاہ دہلی میں مرجع انام ہے) کی خدمت میں بادشاہ وقت علاؤالدین خلجی نے (جو سنہ ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء سے سنہ ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء تک حکمران رہا) بغرض امتحان اپنے محبوب فرزند خضر خاں کے ہاتھ جو شیخ موصوف رح کا مرید تھا، ایک عریضہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ جب "بندگی شیخ" اہل جہاں کے مخدوم اور حاجتمندوں کے حاجت روا ہیں تو آپ میری بھی مدد فرمائیں حق تعالیٰ نے زمام حکومت میرے ہاتھ میں دی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے مشورہ سے کام کروں۔ اس غرض کے لئے میں چند امور عرض کرتا ہوں جس طرح آپ ان کے متعلق حکم دیں میں کروں۔

جب یہ مکتوب خضر خاں نے پیش کیا تو آپ نے اس کے پڑھنے سے اجتناب فرمایا اور حاضرین مجلس سے کہا کہ آؤ فاتحہ پڑھیں۔ بعد فراغت فرمایا کہ درویشوں کو بادشاہی امور سے کیا کام نہیں۔ میں فقیر ہوں اور شہر سے الگ ایک گوشے میں بیٹھا ہوں اور مسلمانوں اور بادشاہوں کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ اگر بادشاہ مجھے پھر کوئی بات کہے گا تو اللہ کی زمین وسیع ہے۔ میں یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔

جب سلطان علاؤالدین نے یہ جواب سنا تو وہ خوش ہوا اور حضرت کا معتقد بن گیا اور التماس کی کہ اگر قبول فرمائیں تو میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں غائبانہ ہی دعا کرتا رہتا ہوں اور ایسی دعا میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ سلطان نے پھر بڑی عاجزی سے حاضری کی تمنا کی۔ آپ نے تو اس سے کہا کہ اس درویش کے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل خانہ ہوگا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا۔

آپ کے پاس جو آتا مسکینوں کو دے ڈالتے۔ روز وفات اقبال خادم کو حکم دیا جو کچھ موجود ہے فوراً محتاجوں کو دے دو تاکہ قیامت میں حساب دینا نہ پڑے۔ خادم نے کچھ غلہ درویشوں کے علوفہ کے لئے رکھ لیا۔ آپ نے فرمایا یہ مردہ ریگ کیوں رکھ چھوڑی ہے۔ دروازہ کھول دو اور ڈال دو تاکہ درویش لوٹ لیں۔ اور جھاڑو دے کر صاف کر دو۔

متعلقین نے عرض کیا کہ آپ کے بعد ہم مسکینوں کا کیا حال ہوگا۔ فرمایا کہ تمہیں میرے روضہ میں بقدر حاجت پہنچتا رہے گا نیز آپ نے فرمایا کہ میں کسی کے مکان میں سونے والا نہیں صحرا میں سوؤں گا۔ چنانچہ کھلے میدان میں آپ دفن کیا گیا۔ بعد میں سلطان محمد بن تغلق نے جس کا دور حکومت سنہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء تا سنہ ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء تھا آپ کے مزار پر عالیشان عمارتیں بنائیں۔ آپ ۱۸ ربیع الاول سنہ ۷۲۵ھ کو فوت ہوئے تھے۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ آپ کے روضہ کے دروازہ پر لا یستاذن الناس الحا فا چپکا ہوا ہے اور دہلی کی دوسری درگاہوں کے مجاوروں کی طرح پیچھے پڑ کر زائروں کے گرد نہیں ہو جاتے۔

(۲) حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانی رح جن کا زمانہ معتقد ہے اور جو نوے برس عمر پا کر سنہ ۵۶۱ھ میں واصل بحق ہوئے، کبھی ارباب جاہ اور دنیاداروں کی تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے اور

ایک دفعہ کے سوا کبھی کسی بادشاہ کے پاس بھی نہیں گئے تھے اور نہ اس کی بساط و سماط پر بیٹھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ بساطِ ملوک پر بیٹھنا بہت جلد عذاب میں ڈالنے کا موجب بنتا ہے۔ اگر بادشاہ کو کبھی کچھ لکھتے تو اس طرح لکھتے۔

"تمہیں عبداللہ دو حکم دیتا ہے کہ یہ کام کرو اس کی اطاعت کرنا تیرے لئے واجب ہے اور اس کا حکم حجت اور نافذ ہے"

بادشاہ کی مجال نہ تھی کہ ان کے حکم سے انحراف کرتا اور جو کچھ وہ فرماتے اس پر عمل پیرا نہ ہوتا۔

(۴۳) شیخ منور پسر شیخ برہان الدین بن شیخ جمال الدین ہانسوی شیخ نظام الدین اولیاء رحہ کے اعاظم خلفاء میں سے تھے۔ آپ نے سلطان محمد تغلق جیسے سخت گیر بادشاہ کا عہد پایا۔ آپ تمام عمر حجرے سے نکل کر اپنے اختیار سے امراکے ہاں کبھی نہ گئے سلطان مذکور ایک دفعہ ہانسی کے قریب منزل گزیں ہوا۔ شیخ اپنے حجرے میں مقیم رہے اور بادشاہ کے سلام کو نہ آئے اس نے شیخ حسن سربرہنہ کو بھیجا کہ شیخ کو حاضر کرو۔ جب وہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ مجھے اختیار ہے کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس نے کہا نہیں، تو لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ آپ گھر آئے اور فرمایا میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ مصلیٰ کندھے پر ڈالا عصا ہاتھ میں لیا اور پیادہ روانہ ہو پڑے۔ حسن سربرہنہ نے آپ کے بشرے سے واصلانِ حق کی علامات مشاہدہ کیں تو اس کے دل میں آپ کی عظمت پیدا ہوئی اور عرض کیا کہ سواری موجود ہے سوار ہو جائیں۔ فرمایا میں چلنے کی قوت رکھتا ہوں۔ جب اپنے آبا و اجداد کے خطیرہ کے قریب پہنچے تو حسن کی اجازت سے گور پدر کے پاس کھڑے ہو کر کہا کہ میں تمہارے گوشۂ تنہائی سے اپنے اختیار سے نہیں نکلا مجھے زبردستی لے جا رہے ہیں میں نے چند بندگانِ خدا کو بے خرچ چھوڑا ہے۔ یہ کہہ کر جب باہر آئے تو ایک شخص نے کچھ چاندی بطور نذر پیش کی۔ آپ نے فرمایا یہ میرے گھر پہنچا دو۔

جب سلطان کے پاس پہنچے تو حسن نے تمام سرگزشت گوش گزار کر دی۔ اس نے اغماض سے کام لیا اور شیخ کو لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں انہیں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب اس نے آپ کو دیکھا تو تیر کمان سے کر کھڑا ہو گیا مگر خدا نے اس سے طاقت سلب کر لی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ ہم آپ کے دیار میں حاضر ہوئے مگر آپ نے تربیت نہ فرمائی اور اپنی ملاقات کا شرف نہ بخشا۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے پہلے ہانسی کی حالت دیکھنی چاہیئے تھی اور پھر ہانسی کے درویش بچوں کی۔ یہ درویش اپنے آپ کو بادشاہوں کی ملاقات کے لائق نہیں پاتا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر شاہانِ اسلام اور مسلمانوں کے لئے دعا کرتا رہتا ہے۔ سلطان محمد تغلق کا شیخ کے حسن تقریر سے دل نرم ہوا اور حکم دیا کہ جو کچھ آپ فرمائیں پورا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا میرا مقصد دو فقر ہے اور جدّ و پدر کا گوشۂ تنہائی۔ پھر بادشاہ نے فیروز اور ضیا برنی کے ہاتھ آپ کو ایک لاکھ تنکہ بھیجا۔ آپ نے فرمایا۔ نعوذ باللہ کہ درویش اتنی رقم قبول کرے۔ سلطان نے کہا کہ اچھا پچاس ہزار لے جاؤ۔ آپ نے وہ بھی قبول نہ کیا۔ آخر دو ہزار تک پہنچے آپ نے اس سے بھی انکار کیا۔ اور فرمایا کہ درویش کے لئے دو سیر کھچڑی اور ایک دانگ گھی کافی ہے اسے ہزارہا روپیہ سے کیا کام۔ انھوں نے کہا ہم بادشاہ کو جا کر کیا منہ دکھائیں، آخر ان کے اصرار پر آپ نے دو ہزار لے کر اپنے پیروں کے مقامات اور فقراء پر خرچ کر دیا۔ اور چند روز بعد ہانسی کو لوٹ آئے جہاں آپ کا مزار ہے۔

(۴۴) مولانا فخر الدین زرادی رحہ شیخ نظام الدین اولیاء رحہ کے مرید تھے بڑے عالم اور متقی۔ آپ احکام سماع پر ایک کتاب کے مصنف ہیں جو اصول فقہ کے قواعد پر لکھی گئی ہے۔ سلطان محمد تغلق سے آپ کو بھی سابقہ پڑا۔ جب اس نے دہلی کو اجاڑنے کی نیت سے باشندوں کو دیوگیر (دولت آباد دکن) چلے جانے کا حکم دیا اسی اثنا میں اس نے ایک عظیم الشان مجلس منعقد کی اور اس میں بڑے بڑے علماء و فضلاء اور اصفیا کو مدعو کیا اور خود بر سر منبر بیٹھ کر خطبہ دینے لگا کہ آل چنگیز نے دنیائے اسلام میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ترکستان اور خراسان پر چڑھائی کر کے چنگیزیوں کو وہاں سے خارج کروں۔ مولانا فخر الدین کو بھی بلایا گیا۔ آپ آنا نہیں چاہتے تھے مگر آپ کا ایک مرید خواجہ قطب الدین دبیر آپ کو بعد منت لے گیا۔ آپ نے فرمایا میں حق گوئی سے نہیں رکوں گا اور وہ جابر مجھے قتل کر دے گا۔ خیر آپ مجبوراً چل پڑے۔ دبیر سب سے پہلے ان کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ آپ کا جوتا اپنی بغل میں دبایا تھا۔ تغلق یہ بات مشاہدہ کر کے خاموش رہا اور مولانا سے مخاطب ہو کر کہا میں آل چنگیز کو دفع کرنا چاہتا ہوں تم بھی اس کام میں ہمارا ساتھ دو

کریں گے جب آپ نے فرمایا انشاء اللہ۔ اس نے کہا یہ جملہ آپ نے شکی بولا۔ فرمایا مستقبل کے لئے ایسا ہی آتا ہے سلطان اس جواب پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پھر بولا آپ مجھے کچھ نصیحت کریں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔ فرمایا کہ غصے پر قابو رکھو۔ پوچھا کونسا غصہ۔ فرمایا۔ وہ غصہ جس سے تیری تلوار جھٹ میان سے نکل کر ناحق خونریزی شروع کر دیتی ہے۔ بادشاہ یہ تلخ حقیقت سن کر ضبط کر گیا اور حکم دیا کہ کھانا لاؤ۔ مولانا نے بادل ناخواستہ تھوڑا سا طعام تناول فرمایا اس کے بعد خدام حسب الحکم بزرگوں کے لئے جامۂ صوف اور ایک بدرہ سیم لائے۔ شیخ نصیرالدین محمود۔ مولانا شمس الدین یحییٰ اور دوسرے حاضر الوقت بزرگوں نے یہ عطیے قبول کر لئے قطب الدین دبیر کو معلوم تھا کہ مولانا فخر الدین یہیں لیں گے اور اس سے سلطان کو بہانۂ قتل مل جائے گا پس ان کا حصہ اس نے تھام لیا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سلطان نے اس سے کہا۔ اے بدبخت مزوّر (مکار) تو نے یہ کیا حرکتیں کیں کہ فخر زرادی کو میری تلوار سے بچا لیا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ میرے مخدوم کے خلیفہ ہیں۔ اور میں ان کا شاگرد بھی ہوں مجھے ان کا ادب ملحوظ ہے۔ تغلق نے کہا کہ ان کفریہ اعتقادوں کو چھوڑ دے نہیں تو میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا زہے نصیب کہ میں اپنے مخدوم کے لئے مارا جاؤں۔ مولانا موصوف دہلی سے دیوگیر اور وہاں سے خانہ کعبہ اور بغداد ہوتے ہوئے دہلی واپس آئے تو جس کشتی میں بیٹھے تھے غرق ہو گئی اور آپ بھی شہید ہو گئے۔

(۵) شیخ جلال پانی پتی کے مرید شیخ احمد عبدالحق فاروقی ردولوی (متوفی سنہ ۸۳۷ھ) عظیم فقر و تجرید کے مالک ہوئے ہیں۔ (قاضی سے کے جد امجد قلندر شاہ ولی رحمہ (متوفی سنہ ۱۲۴۸ھ) نے ان کے روضے کی زیارت کی اور ایک غزل کہی جس کا مقطع ہے

در ردولی بہ مرقد مخدوم
اے قلندر چہ زور و شور حق است

ایک دفعہ آپ کو جونپور جانے کا اتفاق ہوا۔ قاضی شہاب الدین سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ سلطان ابراہیم شرقی (جو سنہ ۸۰۳ھ سے سنہ ۸۴۴ھ تک فرمانروا رہے) کو آپ سے ملائیں۔ میر صدر جہاں نے روکا کہ شیخ صاحب بڑے صاحب جذب و تصرف ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نظر سے بادشاہ حکومت چھوڑ دے

اور سلطنت کا نظام ٹوٹ جائے۔ چنانچہ قاضی صاحب اپنے ارادے سے باز رہے مگر سلطان سے ذکر کر کے آپ کے لئے چار ہزار تنکے کا فرمان لکھوا کر بھیجدیا۔ شیخ نے اس کو قبول نہ کیا اور آدھی رات کسی کو خبر کئے بغیر وہاں سے چل دیئے۔

(۶) مولانا عماد الدین رحمہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں بڑے حق گو مرد ہوئے ہیں۔ ان کے آباء و اجداد عرب سے عجم اور وہاں سے سلطان شہاب الدین غوری کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس جابر سلطان نے ایک دن غرور سلطنت سے سرشار ہو کر کہا کہ خدا نے نبوت کا دروازہ بند نہیں کیا۔ اگر اب بھی کوئی پیغمبری کا دعویٰ کرے اور معجزہ دکھائے تو اس کی تصدیق کرنی چاہیئے۔ مولانا عماد یہ بات سن کر ضبط نہ کر سکے، اور بولے کہ وہ نہ کھائے گا۔ بکواس کرتا ہے۔ تغلق ایسا کلمہ سن کر خاموش رہتا نا ممکن تھا۔ حکم دیا کہ عماد کی زبان کھینچ کر باہر نکالو۔ اور ذبح کر دو۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(۷) حضرت پیران پیر گیلانی (متوفی سنہ ۵۶۱ھ) کے صاحبزادے سید سیف الدین عبدالوہاب رحمہ (متوفی سنہ ۶۰۳ھ) کی آٹھویں پشت میں ایک بزرگ سید محمد غوث حلبی (متوفی سنہ ۹۲۳ھ) جن کے دادا کے پڑدادا سید مسعود ہلاکو خاں کے ہنگامۂ قتل و خون بغداد میں روم اور روم سے حلب میں مقیم ہوئے تھے) اپنے والد سید شمس الدین کی وفات کے بعد اوچ میں تشریف لائے۔ سلطان حسین لانگاہ اور دیگر رئیسوں نے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا موجب فخر و مباہات جانا۔ بادشاہوں کے پیر کو مال و دولت کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ ان کے فرزند عبدالقادر ثانی اوچی (متوفی سنہ ۹۴۰ھ) عیش و طرب کی طرف راغب ہوگئے۔ آلات غنا و مزامیر شتر بار ہمراہ رکھتے اور کتوں کی جھولوں کا ایک بھی خس کا بنواتے۔ آخر سعادت خاندانی رہنما ہے ہدایت ہوئی سامان عیش توڑ پھوڑ کر الگ اور شکاری جانوروں کو دور کیا۔ دربار شاہی میں آنا جانا موقوف ہوا۔ یہ امر بادشاہ کو گراں گزرا۔ مگر آپ کو اس کی پروا نہ تھی چنانچہ والد بزرگوار کی وفات کے بعد آپ نے تمام فرامین اسانید و وظائف بادشاہ کو واپس کر دیئے اور کہلا بھیجا کہ مجھے ان کی حاجت نہیں ہے۔ جسے چاہیں دے دیں۔ چنانچہ فقر و فاقہ سے کئی سال بسر کئے۔ ایک دن بادشاہ کو خیال آیا۔ اس نے آپ کی

خدمت میں لکھا کہ "اگر آپ میری مجلس کو حضور فائض النور سے مشرف فرمائیں تو سعادت وکرم پر مبنی ہوگا۔ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی دعوئے مشیخت و بزرگی نہیں کرسکتا۔ مجھ سے جو تقصیر تاخیر ہوئی ہے معاف فرمائیں اور تشریف لائیں۔ آپ نے جواب میں لکھا ہے

ہیچ باب ازیں باب روئے گشتن نیست
ہر آنچہ بر سر ما می رود مبارک باد
کسے کہ خلعت سلطان عشق پوشیدہ است
بخلعہائے بہشتی کجا شود دلشاد

یہ واقعہ حضرت غوث الثقلین رضہ کے واقعہ سے مشابہ ہے جن کی خدمت میں سلطان سنجر (آخری سلجوقی سلطان از ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء تا ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) نے لکھا تھا کہ اگر حضور کی عنان توجہ اس طرف معطف ہو تو ولایت سیستان جو ملک نیمروز ہے، حضور کی خانقاہ کے لنگر کے لئے نذر کروں۔ انہوں نے جواب میں لکھا تھا ہے

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
جز فقر اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
صد ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

بعض اس حکایت کو شیخ نجم الدین کبریٰ (متوفی ۶۱۸ھ) کی نسبت نقل کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۸) شیخ احمد محمد شیبانی رحہ۔ از اولادِ امام محمد شیبانی رحہ صاحبِ امام اعظم، نارنول میں پیدا ہوئے۔ اجمیر میں مدت العمر رہے اور ناگور میں اپنے مرشد خواجہ حسین رحہ کے پاس ۹۲۷ھ میں مدفون ہوئے۔ خواہ امیر ہوتا یا فقیر امر معروف اور نہی منکر میں آپ ہرگز مداہنت نہیں کرتے تھے۔ یہ جرأت بدو شعور سے ہی ان کا خاصۂ طبیعت تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں خورد سالی میں اپنے اقربا کے ساتھ مدد معاش کے لئے مندو گیا۔ وہاں شیخ محمود دہلوی شیخ الاسلام کے عہدے پر ممتاز اور صدارت علما پر سرفراز تھے۔ نماز پڑھنے لگے تو آپ نے امام سے تکبیر تحریمہ میں سبقت کردی کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ انہیں اس غلطی پر گرفت کرتا۔ آخر میں آگے بڑھا اور کہا شیخ الاسلام آپ کی نماز درست نہیں ہوئی کیونکہ آپ نے امام سے پہلے تکبیر کہکر نماز شروع کردی۔

سلاطین مندو کے سامنے جب لوگ حاضر ہوتے تو پشت جھکا کر اور سر بہ زمین پر ٹیک کر سلام کرتے۔ امام شیبانی رحہ اور قاضی ادریس دہلوی نے اس بدعت کے خلاف بادشاہ کو اسلام مسنون کیا۔ بادشاہ کے دل میں اس جرأت کا اثر ہوا۔ اس نے قاضی ادریس کو اجمیر کا قاضی مقرر کرکے چار مواضع دیئے اور امام صاحب موصوف کو ان کے بزرگوں کا حق فتویٰ عطا کیا۔

سلطان غیاث الدین کی طرف سے ملوخاں غلام ولایت اجمیر کا صوبہ دار تھا اور بارہ ہزار اسلامی سپاہ اس کے زیر فرمان تھے۔ اس نے بادشاہی کا دعوٰے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کے لئے امام شیبانی رحہ سے فتوے طلب کیا۔ آپ نے کہا میں جانتا ہوں کہ تو بادشاہ کا غلام ہے تیرے نام کا خطبہ پڑھنا جائز نہیں۔ ایک دن ملوخاں کے گرد بڑا مجمع تھا۔ امام صاحب امر معروف کے لئے وہاں پہنچے تو ملوخاں میدان چھوڑ کر چل دیا۔ آپ اس کے گھر پہنچے اندر سے اس کی ماں نے پر زر طبق بطور نذر بھیجے۔ آپ نے واپس کردیئے ملوخاں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

محمد خاں ناگوری راجانِ ہند کی طرح زر اور زیور پہنتا تھا ایک دن وہ امام موصوف کی خدمت میں تمام لباس نامشروع اتار کر حاضر ہوا صرف ایک زریں انگشتانہ ہاتھ میں تھا۔ آپ نے مصافحہ سے ہاتھ کھینچ لیا حتیٰ کہ اس نے اسے اتار دیا۔ اس نے لمبے کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ بھی آپ نے اپنے سامنے کٹوا کر برابر کر دیئے۔ اسی طرح آپ نے ایک بادشاہ کے کپڑوں کی نامشروع لمبائی کاٹ دی مگر اس نے وہ قطع کردہ حصہ گھر جاکر پھر برابر کرالیا اور شکار کو نکل گیا۔ راہ میں ایک سخت کانٹا دامنگیر ہوا جس سے وہ پارچہ بازو دختہ الگ ہوگیا۔ بادشاہ نے فوراً واپس آکر توبہ کی کہ پھر جامۂ درازنہ پہنوں گا۔

حسن خاں میواتی نے عریضہ ارسال خدمت کیا کہ نارنول کے نزدیک بہت سے دیہات میں میو آباد ہیں جس گاؤں کو آپ پسند فرمائیں میں اسی کے لئے آپ کو پروانہ لکھکر بھیجدوں اور اگر میوات میں تشریف لائیں تو زہے سعادت۔ یہ ولایت علما و صلحا سے خالی ہے آپ کی برکت قدم سے یہاں بھی علم و صلاح کی جلوہ گری ہوجائے گی۔

امام موصوف کو علم تھا کہ حسن خاں نے اپنے بھائیوں کو

قتل کیا ہے۔ پس آپ نے اس رقعے کی پشت پر جواب لکھ بھیجا کہ تیرا منہ دیکھنا جائز نہیں کیونکہ تو اپنے بھائیوں کا قاتل ہے۔

جب آپ نارنول میں پہنچے تو سکندر نے آپ کی زیارت کی استدعا کی آپ کے رشتہ دار قریبی خوش ہوئے کہ وہ فتوائے تکفیر ہیں جو کافروں سے انہیں نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ہو جائیگی آپ نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ میں نے اس سفید ڈاڑھی سے ستر سال خواجہ معین الدین رح کے آستانہ کی جاروب کشی کی ہے اب اسے پسر بہلول کی دہلیز کی جاروب کس طرح بناؤں اور دراصل سکندر کے پاس جانے سے اصل مانع یہ تھا کہ اسے نتف لحیہ (ڈاڑھی کے بال اکھاڑنے) کی عادت تھی اور وہ اس لئے کہ اس کے موئے ریش بہت کم تھے۔

جب حاتم خاں نے ولایت نارنول کو سلطان سکندر سے خالی پایا تو پہلے ایک ہندو کو جو اس کا وکیل تھا بھیجا۔ یہ شخص امام موصوف کے حکم کے مطابق محکوم شریعت رہا۔ اس وکیل نے جبکہ حاتم خاں نارنول آیا آپ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ سب سے پہلے آپ کو ان کی خدمت میں جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بصد عقیدت حاضر ہوا۔ سب سے پہلے جو بات آپ نے اس سے کہی وہ یہ تھی کہ حیف ہے کہ تو نے اس کافر کو مسلمانوں کا والی بنایا ہے۔ کل قیامت کو تیرے اور اس کے درمیان پر از آتش خندق ہوگی اور تجھے کہا جائیگا کہ اسے پار کر کے اپنے کارکن سے حساب لے اسے نہیں کہا جائے گا کہ اپنے آقا کو جا کر حساب دے۔ پھر اور نصیحتیں کر کے اسے رخصت کیا۔ جب اس ہندو وکیل نے یہ بات سنی تو آکر عرض کی کہ مجھ سے کیا تقصیر ہوئی۔ میں تو ہمیشہ آپ کا تابع حکم رہا۔ آپ نے فرمایا تو خدا اور اس کے رسول کا دشمن ہے۔ تیرا مسلمانوں کا والی ہونا جائز نہیں مجھے تجھ سے کیا کام۔

(۹) شیخ علی بن حسام الدین بن عبدالملک بن قاضی خاں المتقی القادری الشاذلی نوے سال کی سن میں ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں فوت ہوئے (تاریخ وفات شیخ مکہ) ایام شباب میں بادشاہ مندو کی ملازمت میں مال جمع کیا مگر جلد ہی احوال دنیا اور اہل دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آپ کے سامنے آگیا اور آپ کو اہل دنیا سے نفرت ہو گئی ——— ایک دفعہ سلطان بہادر کے عہد میں جو ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء سے ۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ء تک رہا گجرات تشریف لے گئے بادشاہ نے حاضر ہونے کی اجازت مانگی مگر آپ نے انکار کر دیا۔

اسی اثنا میں قاضی عبداللہ صاحب سندھی جو علم و تقویٰ اور صلاح کے زیور سے آراستہ تھے اپنے کثیر اہل و عیال سمیت مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہونے کی نیت سے گجرات آئے اور عرض کی کہ سلطان بہادر کے التماس کو درجہ اجابت بخشیں بیشک اس سے کلام نہ کریں۔ ہم اسے مشغول سخن رکھیں گے اور وہ آپ کے دیدار سے بہرہ اندوز ہوگا۔ آپ نے فرمایا میں اس کے وضع اور لباس وغیرہ میں منکرات ملاحظہ کر کے کس طرح چپ رہ سکتا اور امر معروف اور نہی منکر کے فرض کو ترک کر سکتا ہوں عرض کیا گیا کہ آپ جو چاہیں کہیں اور کریں اس کی آرزو ہے کہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ حسب اجازت حاضر خدمت ہوا اور آپ نے جو مناسب نصیحتیں تھیں اسے کیں

دوسرے دن بادشاہ نے ایک کروڑ تنکہ گجرات کی فتوح حاضر خدمت کی۔ آپ نے وہ سب مبلغات قاضی موصوف کو دے دیئے۔ کہ یہ ملاقات کرانے کا حق ہے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔

ایک دفعہ ایک وزیر نے آپ کی خدمت میں ضیافت قبول کرنے کی درخواست کی کہ حضور کا آنا میرے لئے برکت کا باعث ہوگا۔ آپ نے فرمایا مجھے معاف رکھو۔ میں یہیں بیٹھا دعا کروں گا کہ خدا تعالیٰ تمہیں برکت دے۔ جب اس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا اچھا میں آؤں گا مگر تین شرطیں ماننی ہوں گی۔

(۱) میں جہاں چاہوں بیٹھوں یہ نہ کہنا کہ اوپر آئیں اور صدر نشین ہوں وزیر نے کہا کہ یونہی سہی۔ جہاں خاطر اقدس میں آئے تشریف رکھیں۔

(۲) یہ تکلیف نہ کرنا کہ یہ چیز کھاؤ وہ چیز کھاؤ۔ جو میرے دل پسند ہوگا کھاؤں گا۔

(۳) جب میرا دل چاہے گا اٹھ کر چلا آؤں گا یہ نہ کہا جائے کہ تکلیف کریں اور ایک گھڑی اور بیٹھ جائیں۔ وزیر نے ہر شرط منظور کر لی تو آپ نے وعدہ فرمایا کہ کل انشاءاللہ تعالیٰ آؤں گا۔

جب اگلا دن آیا تو آپ نے اپنے خریطے میں جو ہمیشہ گردن میں آویختہ رکھتے تھے، روٹی کے چند ٹکڑے ڈال لئے اور

اکیلے وزیر کے ہاں پہنچ گئے۔ اور دروازے کے پاس بیٹھ گئے اس نے بڑے پر تکلف فرش بچھائے ہوئے تھے اور شاہ پسند جگہ بنائی ہوئی تھی کہ حضرت یہاں تشریف لے آئیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میرے اور تمہارے درمیان یہ شرط نہ تھی کہ جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا۔ وزیر لاجواب تھا۔ آپ نے فرمایا جلدی کرو وقت تنگ ہے چنانچہ کھانے چنے گئے۔ آپ نے خریطہ سے روٹی کا ٹکڑا نکالا اور کھانے لگے۔ عرض کیا گیا کہ کچھ تو ان کھانوں سے بھی تناول فرمائیں، فرمایا شرط یہی تھی کہ جو کچھ مجھے اچھا لگے گا کھاؤں گا۔ اس کے بعد فوراً آپ اٹھ بیٹھے اور وداع کہکر چلے آئے کیونکہ شرط یہی تھی کہ جب چاہیں گے چلے آئیں گے۔

(۱۰) اتنی شیخ متقی رحمہ کے پیر شیخ باجن کے مرشد عزیز اللہ متوکل رح تھے۔ بڑے صاحب فقر و توکل۔ جب رات آتی تمام زائد از ضرورت اشیاء ہمسایوں میں بانٹ دیتے حتیٰ کہ پانی بھی اتنا رکھتے جتنا کہ نماز تہجد کے وضو کے لئے مکتفی ہوتا اغنیا کو ان کی مجلس میں آنے کی اجازت نہ تھی ایک امیر نے آپ کے فرزند سے التماس کیا کہ مجھے اجازت زیارت دے دو۔ آپ نے فرمایا اجازت ہے مگر اسے دوسرے فقیروں کے ساتھ صف نعال (جوتوں) میں بیٹھنا ہوگا اس نے یہ بھی منظور کر لیا۔ شام کا وقت نزدیک تھا کہ وہ توانگر شیخ کے ہاں پہنچا۔ دیکھا کہ گھر تاریک ہے اور گھر میں کوئی شے نہیں کہ تیل خریدیں۔ اس نے صاحبزادہ سے کہا کہ میں تیل کے چند سبو بھیجوں گا وہ خرچ کریں جب وہ ختم ہو جائے تو اطلاع کریں اور بھیجدوں گا۔ دوسرے دن شیخ نے مشاہدہ کیا کہ چراغوں کی روشنی سے گھر منور ہے۔ پوچھا کہ اتنے چراغ کہاں سے آئے۔ جواب ملا کہ اس امیر کے ہاں سے جو کل حاضر خدمت ہوا تھا۔ آپ نے وہ تیل فقرا و مساکین میں بانٹ دیا اور کہدیا کہ اس امیر کو تیل بھیجنے سے منع کر دیا جائے۔ آپ کا مسکن برہانپور میں تھا۔ اور اولاد میں سے بعض احمد آباد میں (بھی) رہتے تھے۔

(۱۱) بی بی زلیخا حضرت نظام الدین اولیاء رح کی عذار سیدہ والدہ تھیں آپ کا معمول تھا کہ جب نیا چاند برآمد ہوتا تو آپ والدہ ماجدہ کی خدمت میں مبارک عرض کرنے اور دعا لینے حاضر ہوتے سلطان علاءالدین خلجی کے بیٹے قطب الدین نے جس کا دور ۱۳۲۰ تا ۱۳۲۴ء میں چار سالہ حکومت کے بعد تمام ہوا قلعہ سیری میں جامع مسجد بنوائی اور پہلا جمعہ روز مجلس قرار دے کر مشائخ و علماء کو طلب کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے کہلا بھیجا کہ اپنی نزدیکی مسجد اولیٰ ہے کہ وہاں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ نہ گئے۔ نیز بادشاہ کا حکم تھا کہ ماہ نو کی مبارکباد کہنے آئمہ و مشائخ حاضر ہوں۔ شیخ موصوف اس تقریب پر بھی نہیں گئے۔ خادم اقبال کو بھیجتے رہے۔ حاسدوں نے چغلی کر کے بادشاہ کو مخالف کر دیا۔ اس نے کہا اگر وہ آیندہ غرہ کو نہ آئے تو ہم ان کو پکڑ بلائیں گے۔ اور بازپرس کریں گے۔ جب شیخ رح کو یہ خبر ملی تو آپ اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بادشاہ درپئے آزار ہے اگر آیندہ چاند چڑھنے تک اس کا کام تمام نہ ہوا تو میں آپ کی زیارت کو نہ آؤں گا۔ اور یہ بات آپ نے اپنی والدہ سے ازراہ ناز و نیاز فرزندانہ کہی اور گھر واپس چلے آئے۔ قضائے الٰہی سے اگلے چاند کا غرہ بداندیش کی جان پر خنجر بن کر پڑا، اور خسرو خاں پراؤ نے جو اس کے مقربوں میں سے تھا اسے قتل کر کے محل کے اوپر سے باہر پھینکدیا جیسا کہ مشہور ہے۔

بی بی زلیخا کا روضہ شیخ نجیب الدین متوکل کے روضے کے متصل ہے۔ آپ کا گھر بھی وہیں تھا۔ اور بی بی نور، جن کی زیارت کو عورتیں جاتی ہیں کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ بی بی زلیخا کے مقبرہ کے عقب میں آسودہ ہیں۔

یہ عشرۂ کاملہ (دس) تاریخی حقائق ہیں جو میں نے ایسے بزرگوار کی کتاب سے اخذ کئے ہیں جس کے علم فقہ و حدیث و تفسیر و عمل و زہد و ریاضت میں ہندوستان نے کوئی ثانی پیدا نہیں کیا۔ آپ پہلے حضرت موسٰے پاک شہید گیلانی ملتانی رح (متوفی سنہ ۱۰۰۱ھ) سے فیضیاب ہوئے اور پھر مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب رح مرید شیخ حسام الدین متقی رح سے تکمیل معرفت کی اور شریعت، طریقت و حقیقت میں مقتدائے وقت ہوئے۔ شرح مشکوٰۃ۔ صراط مستقیم۔ اخبار الاخیار۔ شرح فتوح الغیب۔ اور جذب القلوب الی دیار المحبوب اور آپ کے علم تصوف میں رسالے وغیرہ مقبول خاص و عام ہیں۔

ایسے زمانہ میں جبکہ تہذیب و مذہب سے بیگانہ اشخاص بے ادبی کو فروغ دے رہے ہیں خدا رسیدہ بزرگوں کے سچے حالات مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے تاکہ ہم میں وہ سپرٹ پیدا ہو جو ان میں کارفرما تھی اور سلاطین کی گردنیں ان کے سامنے خم تھیں۔ فرضی قصے اور جھوٹی حکایتیں مخرب اخلاق اور برباد کن ہیں اور بس ۔

سردار جلیل شیرکوٹی ایم۔ اے

افسانۂ غم

کیا تجھکو بتائیں اے ہمدم صدمات جو دل پر سہتے ہیں
دن رات مری ان آنکھوں سے اشکوں کے دریا بہتے ہیں
ایسے بھی ہیں خوش قسمت جو سدا ہمراہ تمہارے رہتے ہیں
بس ایک جھلک کی خاطر ہم کیا جانئے کیا کیا سہتے ہیں
دل خون کے آنسو روتا ہے ظاہر میں ہنستے رہتے ہیں
جو ہم پہ گزرتی رہتی ہے چپ چاپ ہم اسکو سہتے ہیں
اللہ رے یہ خودداریٔ غم، اللہ رے یہ مجبوریٔ دل،
وہ مشقِ ستم فرماتے ہیں ہم پیہم ہنستے رہتے ہیں
کیا سن کے تجھے حاصل ہوگا کیا کہہ کے ہمیں تسکیں ہوگی
اک بت کی محبت میں ہمدم صدمات جو دل پہ سہتے ہیں
یہ زخمِ جگر، یہ زخمِ دل، اب ان کا مداوا رہنے دو
یہ زخم وہ ہیں جو بھرنے پر بھی یونہی رستے رہتے ہیں
افسانۂ غم، قسمت کے گلے، کچھ اُن کی جفاؤں کے شکوے
سچ پوچھئے تو یہ کچھ بھی نہیں کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

شبنم رومانی

ربابِ شوق

دم بھر میں آفتابِ امیدکا ڈھل گیا
تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
میرے تصورات کے سانچے میں ڈھل گیا
وہ عہدِ کامیاب جو پہلو بدل گیا
اس طرزِ التفات کے قربان جایئے
ہاتھوں سے اپنے ضبط کا دامن نکل گیا
چھیڑا ہے اُن کی نظروں نے جب سے ربابِ شوق
میرے لئے تو رنگِ زمانہ بدل گیا
اس ربطِ واقعی سے نہ احساس ہو سکا
نظریں مچل گئیں کہ مرا دل مچل گیا
پہلو بدل بدل کے گزاری شبِ فراق
اچھا ہوا کہ سر سے بڑا بوجھ ٹل گیا
لوٹیں کسی نے عرضِ تمنا کی جراٗتیں
اک جنبشِ نظر سے زمانہ بدل گیا

طفیل ملک

سمجھوتہ

یک دم باپ کی آنکھیں سلگتے ہوئے کوئلوں کی طرح دہک اٹھیں۔

رشید کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر دیوار سے ٹکراتا ہوا دہلیز پر چاروں شانے چت ہوگیا اور اسے دن کے وقت نیلے پیلے تارے نظر آگئے۔

"لفنگا، بدمعاش، کھیل کود شرارت کے سوا جیسے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ روز ماسٹر شکایت کرتا ہے، کبھی اِس کو مار، کبھی اُس سے لڑ، ہر وقت سکول میں ایک کہرام سا مچا رہتا ہے۔ جب یہ ننھا سا تھا تو اسے دیکھ کر دل باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ بلا کا ذہین ہوگا۔ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے آثار دکھائے گا، باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ مگر یہ گدھے کا بچہ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں بالکل کند ذہن ہے۔ جب کوئی مجھ سے ملنے کے لئے آتا ہے اور باتوں باتوں میں اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو اس کی بابت دریافت کرکے وہ صاحب مکروہ سی ہنسی کے ساتھ مسکرا دیتے ہیں۔ اجی بچہ ہے، سمجھ جائیگا تو بہی، اور پھر جاتے جاتے اپنی تسلی دکھا کر کہتے ہیں۔ جی یہی عمر ہے بچے کی سمجھ لے سمجھ لے ورنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنتی ہو رشید کی ماں ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے ایمان اگر تمہارا ذہن اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی۔ میں کہتا ہوں کم بخت پڑھائی کی طرف توجہ دو، میں کیا کہہ رہا ہوں، سنتی ہو رشید کی ماں، میری تمام امیدیں اسی سے وابستہ ہیں، میری ساری توجہات کا مرکز یہی ہے۔ میرا ارادہ اسے علیگڈھ بھیجنے کا ہے۔ علیگڈھ علیگڈھ ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ لیکن تم دیکھ رہی ہو رشید کی ماں یہ ڈھیٹ کی اولاد جی لگا کر پڑھتا ہی نہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں چھٹی کے دن گھر میں بھی ٹکلا نہیں بیٹھ سکتا۔ ایک عذاب کی طرح نازل ہو جاتا ہے۔ ماما کے چٹکی لی، محمود کو منہ چڑایا۔ اسے گالی دی۔ نہیں تو چیزیں ہی ادھر ادھر بکھیر دیں۔ ناہید کو دیکھو کتنی حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہے، یہ اس کے بالکل برعکس ۔ ۔ ۔ ۔"

رشید نے ایک اکتائے ہوئے انداز سے قمیص کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں، شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگالیا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ کھانا کھانے کے لئے اسے لاکھ بلایا گیا مگر وہ یہ کہکر خاموش ہوگیا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ سہ پہر کے قریب ناہید بلانے آئی لیکن اسے نہ جانا تھا نہ گیا۔ جب بہن نے زیادہ اصرار کیا تو منہ پھلا کر کہنے لگا۔ "مجھے مت ستاؤ۔ میں ایک بار نہیں ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" ناہید قہقہہ مار کر بولی "نہ کھاؤ، ایک دن کیا سو دن کھانا نہ کھاؤ۔ تمہارے نہ کھانے کی پروا کسے ہے۔"

وہ بالکل غیر متوقع سی باتیں کرکے ہنستی ہوئی اندر چلی گئی اور وہ نہایت سنجیدگی سے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ کیا واقعی امّاں ابا مجھے منانے کے لئے نہیں آئیں گے۔ نہیں، یہ ناممکن ہے، ناہید جھوٹی ہے، ناہید کے لئے وہ ایک مطلق العنان آمر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی کیا مجال کہ اس کا کوئی حکم ٹال دے اس کی ہر جائز و ناجائز فرمائش ناہید کو پوری کرنی پڑتی۔ بے بس نے یونہی چڑانے کے لئے کہہ دیا ہوگا۔ اماں میرے کھانا نہ کھانے سے ضرور پریشان ہوں گی۔ پھر میں کیا کروں پریشان ہوں تو ہوں، قصور سراسر ابا کا ہے۔ انھوں نے اتنی سی بات پر کہ مجھے سبق جلد یاد نہیں ہوتا پیٹ ڈالا۔ انہیں کیا معلوم کہ سکول میں میں کیسے فر فر سبق سناتا ہوں۔ وہ ماسٹر جی کے جھانسے میں آگئے اور لگے مجھے پیٹنے۔ ماسٹر، وہ تو نرا اُلّو کا پٹھا ہے۔ جھوٹ کہتا

ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں اس کے گھر پڑھا کروں اور مہینے کے مہینے وہ پانچ چھ روپے مفت میں بٹور لیا کرے۔ اس کی شکل تو ذرا دیکھو۔ دیکھتے ہی سب لڑکوں کی بے باکی، چلبلاپن اور شوخ مزاجی غائب ہو جاتی ہے۔ ٹاٹ پر ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھے ہوئے طالب علم مجسمۂ بے جان مجسموں کی طرح رونے بسورتے اونگھا کرتے ہیں۔ اکثر ڈر رہے یا جھجک رہے ہوتے ہیں۔ سکول میں داخل ہو کر اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی زندگی ہی بدل گئی ہے۔ یہاں متواتر چار پانچ گھنٹے پاؤں توڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ کرو یہ نہ کرو۔ ہر کسی کے ساتھ بولنے کی اجازت نہیں۔ ہر لمحہ ماسٹر کے بید کا خطرہ ہوتا ہے۔ بید کی ضرب سے بیحد تکلیف ہوتی ہے۔ ہاتھ پر نیل پڑ جاتے ہیں۔ جان سی نکلنے لگتی ہے، کئی کئی دن تک۔ یہ مار یار ہتی سے نرم نرم نازک ہاتھوں پر زور زور سے بید پڑتے تو وہ ڈبل روٹی کے پھیلاؤ کی طرح ابھر آتے ہیں اور ان میں سے باسی روٹی کی ایک ایک سی بو امنڈنے لگتی۔ ہاتھ کچھ ایسے سرخ ہو جاتے جیسے ان پر مہندی رچ دی گئی ہو۔ کئی بار اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ مہندی صرف خوشی کے لئے لگائی جاتی ہے تاکہ ہاتھ خوبصورت انگارہ کے سے چمکتے ہوئے شنگرفی رنگ کی طرح بھلے معلوم ہوں۔ اور ان میں سے بھینی بھینی خوشبو لہرائے۔ مگر بید پڑتے سے جو ٹیس مارتی ہوئی سرخی ہاتھوں میں پھیلی ہوئی نیلی رگوں کی ایک جانب سے دوسری جانب پھڑکتی ہوئی معلوم ہوتی، کتنی تکلیف دہ ہوتی آہستہ آہستہ اسے مہندی سے بھی نفرت ہو گئی۔ پچھلے دنوں اس کے ماموں کی لڑکی آصفہ کی شادی تھی۔ ماں اور ناہید کے بے حد اصرار پر بھی اس نے مہندی نہ لگائی۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ جب ناہید نہایت شوق کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر مہندی لگوا رہی تھی وہ غسل خانے میں جا کر اپنے ہاتھ صابن سے مل مل کر دھونے لگا۔ ماسٹر مرتا بھی نہیں، ہر روز اتنے لڑکے اسے بد دعائیں دیتے ہیں مگر اسے ایک بھی نہیں لگتی۔

تڑتڑا کے طمانچے کے ساتھ اس کے باپ نے خدا جانے اسے کیا کیا کہہ ڈالا۔ شاید یہ بھی کہا تھا کہ رشید آوارہ ہو جائے گا۔ تیلی یا موچی بنے گا۔ خیر موچی بنوں گا یا تیلی، مگر ان کے یہاں کا کھانا تو نہیں کھاؤں گا۔ وہ سامنے کے مکان کے چھجے پر نیلی سی ڈنڈیوں پر مسکراتے ہوئے گلابی پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ نظر پھولوں پر تھی دل کسی نئے خیال میں تھا اور کان ماں باپ کی آواز کے منتظر تھے۔ کہ اتنے میں اندر سے ماں کی آواز آئی "رشید نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا" ناہید نے ہنس کر کہا "جی وہ ابھی تک روٹھا ہوا ہے" "کیا کہتا تھا کہ نہیں آؤں گا" ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ یہ اس کا باپ تھا۔

ماما بولی "جب میں بازار جانے لگی تو منہ چڑا کر کہنے لگا آج میں کھانا نہیں کھاؤں گا"

"اس کے کھانے کے لئے چیزیں بھیج دو" اور باپ نے اسے پکارا لیکن اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ باپ نے دوبارہ آواز دی تو وہ بچہ خاموش رہا۔

"ابا" ناہید بولی "میں نے رشید سے کہا تم ایک دن کیا ہزار دن نہ کھاؤ" اور اس کے غصے کی حد نہ رہی۔ وہ چپکے چپکے بڑبڑانے لگا۔ یا اللہ یہ ماما، ناہید اور ماسٹر تینوں مر جائیں رشید کو باورچی خانے سے ماں کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور ناہید کی باریک تیز آواز چڑیوں کی کہانی پڑھ رہی تھی۔

سیڑھیوں کے قریب ہی ناہید کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا اسے مٹی میں لپٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس کے بدن میں سرسریاں سی دوڑنے لگیں۔ خون تیز تیز چلنے لگا۔ رگیں پھڑکنے لگیں۔ اگر اس وقت ناہید کسی خوبصورت تیتری کی طرح اڑتی ہوئی اپنے دونوں بازو پھیلاتی ہوئی اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی تو وہ اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔

جی ہی جی میں اپنے مخالفوں کو ہزار ہزار بے نقط صلواتیں سنا کر رشید سوچنے لگا۔ ناہید کو اماں جی نے بھیجا تھا۔ لیکن میں نہ گیا۔ سخت غلطی کی، بھوک زور کی لگی ہوئی ہے۔ مگر نہیں اس طرح جانا ٹھیک نہیں، دب کر گیا تو موچی اور تیلی سے بھی بدتر سلوک کے لائق سمجھا جاؤں گا۔ ماما کے بلانے پر بھی ہرگز نہیں جانا چاہیئے۔ ہاں اگر ابا اماں خود منانے آئیں اور آئندہ ماسٹر کی بات نہ ماننے اور کبھی کچھ نہ کہنے کا پکا وعدہ کریں تو اور بات ہے۔ خیر ابا تو خشک مزاج واقع ہوئے ہیں۔ ان کا غصہ بہت مشہور ہے۔ وہ تو آنے سے رہے۔ شاید اماں گھنٹے دو گھنٹے تک ضرور آ جائیں۔ لیکن دو کیا تین چار گھنٹے گزر گئے اور اماں منانے نہ آئیں۔ شدت یاس نے اس کے دماغ کو معطل سا کر دیا۔ وہ کچھ

دیر تک حیران سا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کیا وہ یکلخت رونا شروع کر دے۔ رونے سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں، خدا جانے آج کے رونے میں کوئی اثر ہو۔ اگر خدانخواستہ آنسوؤں کا رونا کام نہ آیا تو بڑی سبکی ہوگی۔ گھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ اس پر ایک غیر معمولی اور عجیب قسم کی افسردگی اور پژمردگی چھانے لگی اس کے دل پر ایک اندھیرا سا پھیل گیا ایک لامتناہی افسوس کی کیفیت اس پر طاری ہوگئی جب وہ گھر کے دائیں بائیں کونوں میں ادھر ادھر رینگتا ہوا ایک پلّہ سا تھا تو وہ جانتا تھا کہ غوں غوں کر کے وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے۔ باپ کو اپنے ارد گرد ناچ نچا سکتا ہے۔ یعنی اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے اسے صرف ہونٹ ہلانے کی ضرورت تھی اور رفتہ رفتہ اس پر آشکارا ہو گیا کہ محمود اس کا بڑا بھائی ہے، ناہید اس کی چھوٹی بہن ہے وہ اکیلا ہی اپنے والدین کی آنکھوں کا نور نہیں بلکہ محمود، ناہید اور .... وہ کسی مبہم سی سوچ میں الجھ کر رہ جاتا دفعتاً اس کا جی چاہتا کہ دالان میں ڈربے کے قریب بندھی ہوئی مرغی کی دُم زور سے کھینچ لے یا دیوار پر رینگتی ہوئی قطار میں سے کسی ننھی سی چیونٹی کو اپنے پاؤں سے مسل دے۔

اس وقت وہ تقریباً پانچ چھ برس کا ایک شوخ طبیعت کا بچہ تھا۔ بے باک، تیز زبان اور شوخ مزاج لڑکا۔ قطار در قطار بیٹھی ہوئی روتی بسورتی اور جھینکتی ہوئی صورتوں سے کس قدر مختلف، سکول میں مردہ تصویروں کو دیکھ کر اس نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا کہ اس کی آزادی سلب ہو چکی ہے۔ ماں کی گود اور ابا کے لاڈ کا دوبارہ نہ آنے والا زمانہ بیت چکا ہے۔ بغل میں بستہ دبائے صبح صبح سکول جاؤ، چاروں طرف گہرے گہرے بادل گھرے ہوئے ہوں۔ شدت کی سردی پڑ رہی ہو۔ دانت سے دانت بج رہے ہوں۔ منہ سے گرم گرم ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا گاڑھا سفید دھواں نکل رہا ہو۔ مگر بازار میں کہیں کھڑے نہ ہو۔ ہولے ہولے قدم اٹھاؤ۔ زیادہ اونچی آواز میں بات نہ کرو۔ سست مت رہو۔ ماسٹر جی کو سلام کرو۔ نگاہیں نیچی رکھو۔ بڑوں کا ادب کرو۔ اب سبق خوب جی لگا کر یاد کرو۔ اور سردیوں میں سرخی مائل نیلے ہاتھوں پر جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے ہیں بید کھاؤ۔ شفٹ سے تنگ آ کر اسکول میں سکول سے باہر یا کھیل کے میدان میں جب لڑکے اپنے ہنستے ایک جگہ ڈھیر کی صورت میں اکھٹا ڈٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول ہوتے تو اس وقت دور سے نظر آتے ماسٹر جی کو شرما کر جھینپ کر خوف زدہ انداز میں سلام کرتے وقت کتنی ذہنی کوفت ہوتی۔ جیسے رسہ کشی کھینچتے کھینچتے فریق پارٹی نے ایکا ایکی رسہ چھوڑ دیا ہو اور وہ بے سہارا ہو کر دھڑام سے گر پڑا ہو۔

سبق کے دوران میں وہ ہمیشہ اپنی کہنی پر منہ ٹکا کر اکبر کے ساتھ کوئی ایسا طریقہ سوچا کرتا تاجر رہے ماسٹر سے چھٹکارا حاصل ہو جائے کوئی ایسی صورت ہی نکل آئے کہ باوجود ہزار خواہش کے یہ منحوس شکل کبھی نظر نہ آئے۔ پورا وقت وہ خوف زدہ غصہ سے کھولتے ہوئے خاموش بیٹھے رہتے ان کے دلوں میں ماسٹر جی کی طرف سے نفرت بھری ہوتی۔ اگر ان میں ہمت ہوتی تو وہ بیر دور ہی سے قتل کر دیتے۔ لیکن یہ عذر ان کے دلوں تک ہی محدود رہتا۔ وہ کچھ نہ کر سکتے منہ ہی منہ میں دعا کرتے۔ بازار میں گزرتے گزرتے اچانک کوئی ٹوٹا پھوٹا مکان گر پڑے اور آناً فاناً ہر طرف ایک شور سا مچ جائے "رشید تمہارے ماسٹر جی مکان کے نیچے دب گئے" وہ بظاہر انتہائی افسوس کرے "چ ..... چ ماسٹر جی بڑے اچھے تھے" مگر دل ہی دل میں وہ بے حد خوش ہو۔ اور اس بے کراں خوشی میں اکبر کو شریک کرنے کے لئے اس کے گھر جا کر اسے یہ خوشخبری سنائے، ناگہاں ماسٹر کی نگاہ پڑھتے پڑھاتے اس پر جا پڑتی "رشید تمہارا دھیان کدھر ہے۔ کس سوچ میں ہو"

ماسٹر کی گرجدار آواز سن کر اس کا دم خشک ہو جاتا سارا جسم کانپنے لگتا۔ اس کی سوچیں مٹ جاتیں اور منصوبے ٹوٹ جاتے "اکبر تو آوارہ اور نکھٹو ہے۔ یہ کبھی پاس نہیں ہو سکتا اس کے پاس مت بیٹھو" ایک حقارت بھری آواز بہت دیر تک اس کے کانوں میں بھنبھناتی رہتی۔ اور ماسٹر کے ہاتھ گڑ گڑ کرتے ہوئے ننھی ہتھیلیوں پر دھن دھن چلنے لگتے۔ چٹ چٹ چاٹ، اکبر کی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے، وہ اپنے ہاتھوں کو زور زور سے پھونکتا، چھٹی کے وقت وہ دیکھتا کہ اکبر کے ہاتھوں پر بید نے انگلیوں کے نشان ڈال دیئے ہیں۔ اگرچہ پچیس تیس لڑکوں کی جماعت میں اسے کوئی لڑکا پسند تھا۔ یا کسی سے رغبت تھی تو وہ اکبر تھا وہ اپنے دوستوں سے فخریہ انداز میں کہا کرتا "اکبر میرا دوست نہیں بھائی ہے"

اتنا کبھی بھاگ سے سکول سے بھاگنے اور سبق یاد نہ کرنے کے متعلق طرح طرح کی نئی نئی ترکیبیں بنایا کرتا ابھی دو مہینے ہوئے اکبر سکول نہ جانا چاہتا تھا۔ اس نے عجیب بہانے تراشے۔ مگر والدین کے سامنے اس کی ایک بھی نہ چلی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اسے اسکول بھیجنے پر وہ بضد رہے۔ اکبر نے دیکھا کہ اب اسکول جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا وہ بھاگتا بھاگتا بازار گیا۔ ڈاک خانے کے قریب پتنگ فروش سے تھوڑی سی لئی مانگ لایا اور اسے اپنے پاؤں اور جوتے تلے چپڑ دی اور منہ بسور کر روتی آواز سے ماں سے بستہ طلب کیا۔ دھڑ..... دھڑام..... دھڑ..... دھڑام دو تین ہی سیڑھیاں اترا ہوگا کہ وہ ربڑ کی گیند کی طرح اوندھے منہ لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آ پڑا۔ سارے گھر میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ اس کے سر سے خون بہتا دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے "ہائے اللہ میرا بچہ" "اکبر میاں خیر تو ہے" اس کے باپ نے اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا "اکبر، اکبر۔ اکبر، بولو تو سہی۔ میری جان اکبر، اکبر آنکھیں تو کھولو۔ ہوش کرو بیٹا اکبر، اکبر"

ڈاکٹر آیا، باپ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ لیکن اس نے تسلی دی۔ کوئی خطرہ نہیں۔ مکمل آرام کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ہفتہ تک اسے چارپائی سے بالکل نہ ہلایا جائے۔

سکول آتے جاتے وقت عموماً رشید کی نگاہ کارپوریشن کی طرف سے پرانی کوتوالی کے چوک میں نصب کردہ نوٹس بورڈ پر ٹھہر جاتی۔ نوٹس بورڈ کے سامنے لوگوں کی ایک بھیڑ لگی ہوتی شہر میں جو اچھی بری خبر بھی آتی۔ وہ اشتہارات کے اسی تختے پر پہلے پہل پڑھی جاتی تھی۔ جنگ کی خبریں، سرکاری اعلانات ریلوے نیلام کے متعلق اطلاعات، وغیرہ، وہ پنجوں کے بل کھڑا ہو کر سرسری طور پر ہجے کر کے اشتہار کو شروع سے آخر تک بلا تکلف فرفر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ کبھی کسی اشتہار کو سمجھ نہ سکا۔ خدا جانے اس نوٹس بورڈ پر نئے اشتہار کو چسپاں دیکھ کر اس کا دل کیوں سہم جاتا۔ کہ ماسٹر صاحب آج ضرور بگڑیں گے اور برسیں گے۔ زیادہ ڈر اس خیال سے ہوتا کہ انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ آج وہ لڑکوں سے "پرندے کی فریاد" سنیں گے۔ اس کی یہ کیفیت ہوتی کہ اس نظم کا ایک لفظ بھی یاد نہ ہوتا۔ ذرا دیر کو یہ خیال اس کے دل میں آتا کہ بھاگ چلیں۔ اور آج کا دن کہیں اِدھر اُدھر پھر کر گذار دیا لیکن وہ دل کا اتنا کمزور تھا کہ وہ بھاگ جانے کی خواہش پر غالب نہ آ سکتا۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی قدم اٹھا کر سکول روانہ ہو جاتا۔

مزید دو تین گھنٹے گذر گئے مگر اندر سے کوئی بلانے نہ آیا۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ شام ہونے کو ہے اور ابھی تک ایک تنکا بھی اس کے حلق میں نہیں اترا۔ کیا واقعی گھر والے اسے قطعی طور پر نظر انداز کئے بیٹھے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو صبح اسکول ہرگز نہیں جاؤں گا۔ پاؤں تلے لئی لگا لوں گا۔ پھر ایک طویل رخصت پر یہ شام کیسے گذرے گی۔ بات کہاں کاٹی جائے گی غیر شعوری طور پر وہ اپنے جزدان سے اردو کی کتاب نکال کر ورق الٹنے لگا۔ مگر جلدی اکتا گیا۔ اکتاہٹ سے نجات پانے کے لئے وہ کچھ سوچنے لگا۔ ابھی سوچ ہی میں مستغرق تھا کہ ایک سرکاری آدمی اپنے بائیں کاندھے پر سیڑھی اٹھائے اور دائیں ہاتھ میں لئی کی بالٹی اور بغل میں قدِ آدم اشتہارات کا ایک بھاری بھرکم بنڈل دبائے چوک کی طرف تیز تیز جاتا ہوا دکھائی دیا۔ آج کونسی اچھی یا بری خبر ہے۔ وہ اس آدمی کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

"تپ ہیضے کے متعلق چودہ ہدایات" افسرانِ محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے اہلِ شہر کو ہیضے سے بچانے کے لئے قدِ آدم اشتہار دروازوں، گذرگاہوں، شاہراہوں، اور سرکاری نوٹس بورڈوں پر لگائے جا رہے تھے۔ اور کمیٹی کی گلیوں اور بازار کے ٹکڑوں میں قلعی بکھیری جا رہی تھی تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔

چوک سے دائیں بائیں اس کی نظریں خوانچوں پر پڑ رہی تھیں۔ ایک خوانچے والے کی مسلسل آواز نا امیدی کا سماں پیدا کر رہی تھی، گڑ کی ریوڑیاں، بیسن کی پکوڑیاں، تیل یا بناسپتی گھی کے شکر پارے، جلیبیاں، میدے کی کھجوریں۔ جن پر بازار میں دھم سے گذرنے والی کاروں کی دھول اڑ اڑ کر جم گئی تھی اور ان کا اصلی رنگ بدل گیا تھا۔ مکھیوں کی ایک ان گنت تعداد خوانچے کے گرد بھنبھنا رہی تھی۔ کمیٹی کے آدمیوں نے اس خوانچے کو الٹ دیا تھا "حرامزادے تمہارا نام کیا ہے"

"چلو تھانے"

"یہاں قلعی پھیر دو"

تھا اس کے ذہن میں کسی خوش آیند نغمے کی جھنکار کی طرح ایک تدبیر سی رینگ گئی۔ اس نے اپنے بستے کو بغل میں دبایا اور کشمیری بازار کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا، وہ گنگنا رہا تھا۔ وہ اپنے دائیں بائیں دکانوں کو نہایت سنجیدگی اور ایک سلجھی ہوئی نظر اور سنبھلی ہوئی کیفیت کے ساتھ دیکھتا ہوا آگے ہی آگے تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ ایک دو بار مویشیوں کے گلوں نے اس کا راستہ روک لیا اور وہ دیوار سے چمٹنے کی بجائے ایک بیل سے ٹکرا گیا۔ اگلے موڑ پر ایک بھلے مانس سے ٹھوکر کھائی تو اس نے پرے دھکیل دیا۔ ایک جگہ پہنچ کر اچانک اس کے قدم رک گئے۔ کتابوں کی سب سے پرانی دکان پر کوئی کتاب فروخت کی جائے، پھر جب ماں باپ سے میل جول ہو جائے تو وہی کتاب خرید لی جائے کونسی کتاب فروخت کی جائے۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے اردو سے سخت نفرت تھی۔ پرندے کی فریاد، کوہ ہمالیہ، قومی گیت یہ نظمیں باوجود کئی بار زخم زخم ہاتھوں پر بید کھانے کے اسے کسی طرح یاد نہ ہوتیں۔ یہی اردو کی کتاب ہے جس کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچی ہے اور وہ دوسروں کی نظروں سے گر گیا ہے۔ اسے بیچ دینا چاہیئے۔ اس نے کتاب کو جزدان میں سے نکال کر ماسٹر محمد حسین دکاندار کے ہاتھ پر رکھ کر کہا "ماسٹر جی کتاب خرید و گے" "کونسی کتاب بیچنا چاہتے ہو" ماسٹر کتاب کو الٹتے پلٹتے ہوئے یونہی بولا

" اردو کی تیسری کتاب چوتھی جماعت کے واسطے بالکل نئی ہے "

" مولوی ممتاز علی کی لکھی ہوئی "

"جی ہاں"

" اوہو یہ تو پرانا اڈیشن ہے " لال ڈاڑھی والے ماسٹر محمد حسین کا یہ فقرہ سن کر نہ تو وہ مایوس ہوا۔ اور نہ اسے کوئی تعجب ہوا بلکہ کچھ امید سی بندھ گئی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب کوئی کتاب فروخت کرنے کے لئے ماسٹر جی کے پاس آتا ہے تو وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھ کر یہی کہتے ہیں۔

" خیر میں خرید لیتا ہوں، ماسٹر نے کہا " تین آنے دونگا"

وہ برابر جھکتے ہوئے تین سکوں کو دیکھتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہ سوچنے کی بالکل سعی نہ کی کہ اسے کس طرح خرچ کریگا۔ کون کون سی چیزیں کھائیگا۔

سامنے کی دکان پر سموسے دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی اور جیسے کوئی بھاری سا بوجھ اس کے ذہن پر سے اتر گیا ہو۔ سموسے چٹ پٹے، گول گپے، کھیرا، پانی، سرکاری آدمی، نوٹس بورڈ، صفائی کے متعلق چودہ ہدایات تھے اور درست، والدین سے مسلم سکول سے ایک لمبی رخصت اور وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا سامنے کی دکان پر جا بیٹھا۔ دو سموسے لئے۔ سموسے کھا چکا تو پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ذرا شان سے گڑ کے حلوے والے کے پاس گیا۔ پھر گلی میں سے گذرتے ہوئے ایک کنجڑے سے ایک کھیرا لیا۔ پیٹ بھر گیا تو پیاس معلوم ہوئی۔ قریب کے نل سے اپنا منہ لگا دیا۔ پیٹ بھر کر پانی پیا تو سر کچھ چکرانے لگا۔ اور وہ چپ چاپ روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچتے ہی چکر بڑھتا گیا۔ بلکہ چکر کے ساتھ ساتھ متلی بھی شروع ہو گئی۔ اور اچانک قے کر دی۔ ماما بازار سے سودا سلف لے کر مکان میں داخل ہو رہی تھی رشید کو کراہتے اور قے کرتے دیکھ کر اس نے باہر ہی سے زور سے پکارا "بی بی جی رشید کو .... دروازہ جلد کھولنا بی بی، رشید کو" .... "کیا ہوا میرے رشید کو" ماں کی پریشان آواز سنائی دی اور وہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی "میرے لال، میرے رشید میری جان" اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔

" میرے بچے" باپ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا "تمہیں کیا ہو گیا رشید، بولو تو سہی رشید، رشید ......"

" ہائے اللہ نہ جانے میرے لال کو کیا ہو گیا ہے"۔ ماں ٹھنڈی سانس بھرنے لگی ماما گھبرائی گھبرائی سی ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ ناہید ستون کے ساتھ خاموش کھڑی چارپائی پر لیٹے ہوئے بے حس و حرکت رشید کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ ماں باپ اسکی چارپائی پر جھکے ہوئے تھے۔

" رشید آنکھیں تو کھولو"

" میری جان رشید"

" ہوش کرو بیٹا "

" میری آنکھوں کے تارے بولو تو سہی "

" رشید ..... رشید "

اور رشید چارپائی پر چت لیٹا کراہ رہا تھا اسکا باپ، اسکی ماں، اسکی بہن، سب نہایت بے تابی سے ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے ۔

کسریٰ منہاس

شاعر

سخن آشنا تخیل کے شہنشاہ
ترے شعروں میں سازِ قدس کی لے
ترے نغموں میں حکمت کے خزانے
ترے ساغر میں کیفِ روح کی مے

فروغِ بزمِ سوز و ساز ہے تو
جہانِ تیرہ روشن تیری ضو سے
بچائی بارہا قوموں کی کشتی
فنا بردوشِ سیلِ تندرو سے

ترا الہام- استبداد کی موت
ترا پیغام- روحِ خفتہ بیدار
تری آواز- احساسات کی جاں
ترا دل کیفِ حریت سے سرشار

نویدِ زندگی تیرے عمل سے
ہے تجھ سے عسکری تنظیم لرزاں
خس و خاشاکِ باطل کیلئے تو
ہے بحرِ بیکراں کا تند طوفاں

تجھے تفریق کی دنیا سے نفرت
ترا مذہب اخوت کا پرستار
ترے نغمے محبت کے ترانے
نزاعِ باہمی سے تو ہے بیزار

مگر زیبِ زباں ہے آج تیرے
گل و بلبل کی پارینہ حکایت
الجھ کر زلف و رخ کی داستاں میں
بھلا دی زندگی کی اصل و غایت

جو ذہنیت غلامانہ بدل دے
سنا آزادیٔ فطرت کے وہ راگ
جو گرما دے جوانوں کے لہو کو
وہ برسا جذبۂ ایثار کی آگ

سرورِ زندگی کی نزہتوں کا
جہاں کو آشنائے راز کر دے
ذرا اٹھ! اور تاریخِ امم میں
نئے اک دور کا آغاز کر دے

ساقی صدیقی

کل

زندگی آج غمِ دہر پہ خنداں ہی سہی
حسن نازاں ہی سہی عشق پشیماں ہی سہی
بامِ افلاک کو چھو لینے کا امکاں ہی سہی

عرش والوں سے روابط بھی بڑھانا آساں
چاند تارے مری مضبوط کمندوں کے نشاں
شبِ دیجور بھی خنداں ہے سحر بھی خنداں

اور کل بھی جو اگر چاہو کہ ایسا ہی رہے
عشق بجھتا ہی رہے حسن نکھرتا ہی رہے
درد محتاجِ کرم ہائے مداوا ہی رہے

کل کے ماتھے پہ بغاوت کا پسینہ ہوگا
کل فقط دیس کی خاطر ہمیں جینا ہوگا
جس کی مٹھی میں بھنور ہونگے سفینہ ہوگا



پروڈیوسر ڈائرکٹر آر۔سی تلواڑ

کی

البیلی

میں

رمولا

ستیش

سندر

سروپ

منورما

روپ لیکھا

ہیرالال و دیگر

پیلیس لاہور میں بیحد کامیابی سے چل رہی ہے

جاری کردہ :۔ واڈیا پیرامونٹ پکچرز۔ لاہور۔ دہلی

ایوب سرور خاں

چھ ایکٹ کا ڈراما

شرابی

کردار

رحیما ـــــــ ایک شرابی مزدور	شاداں }
ربو ـــــــ اس کی بیوی	کریما }
رحمت ـــــــ اس کا چھوٹا بھائی	رحمٰن } ـــــــ رحیما کے بچے
فیضو ـــــــ رحمت کا دوست	مریم }
نوراں ـــــــ بیگاں کی ماں	بہت سے مزدور، مل کے مالک کے بنگلے پر
برکت ـــــــ بیگاں کی سہیلی	چوکیدار وغیرہ

منظر

ایک چھوٹا سا کمرہ۔ ایک طرف الگنی پر چند کپڑے پڑے ہوئے ہیں۔ گوشے میں چولھا سلگ رہا ہے۔ جس پر ہنڈیا چڑھی ہوئی ہے۔ ربو ہنڈیا پکانے میں مشغول ہے ایک طرف رحمٰن اور مریم کھیل رہے ہیں۔ یک لخت مریم رونے لگتی ہے۔ ربو مڑ کر دیکھتی ہے۔

مریم۔ (روتی جاتی ہے اور تتلا کر بولتی ہے) اماں ان نے ہم کو مالا ہے۔

ربو۔ (غصیلی آواز میں) کیوں بے رحمٰن۔

رحمٰن۔ اماں سچ کہتا ہوں۔ میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔

ربو۔ ہاں یہ خودبخود رو رہی ہے۔ تو نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

[اٹھ کر مریم کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ اور پچکارتی ہے شاداں اور کریما اندر آتے ہیں]

کریما۔ ہاں بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔

ربو۔ بس ابھی کھانا پکا جاتا ہے۔ ذرا دیر صبر کرو میرا لال۔

شاداں۔ اماں ہم تلیا کے پاس کھیل رہے تھے۔ کہ ایک موٹر ہمارے قریب آکر رکی۔ کیسی اچھی موٹر تھی کریو؟

کریما۔ اور اس میں جو لڑکا بیٹھا ہوا تھا اس نے کتنے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

شاداں۔ اس کے ساتھ اس کا ایک نوکر بھی تھا۔

کریما۔ (شاداں کی بات ان سنی کرتے ہوئے) کتنے اچھے کپڑے تھے۔ ماں ہمارے پاس اچھے کپڑے کیوں نہیں ہیں۔

رحمٰن۔ ہمیں بھی اچھے کپڑے بنوا دو نا ماں۔

ربو۔ اچھا بیٹا میں اپنے لال کو اچھے اچھے کپڑے بنوا دوں گی۔

رحمٰن۔ (روتے ہوئے انداز میں) اونہہ کتنے دنوں سے تم یہی کہتی رہتی ہو۔ مگر کپڑے اب تک نہیں آئے۔

شاداں۔ رحمٰن اس کی موٹر بڑی اچھی تھی۔ کیسا لال لال رنگ تھا۔ جیسے طوطے کی چونچ۔ میں نے تو اسے ہاتھ بھی لگا کر دیکھا۔

مریم۔ ماں میں موتل لوں دی۔

[دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلتا ہے۔ ہلکے سرور کی کیفیت میں رحیما اندر داخل ہوتا ہے]

رحیما۔ (مریم کو گود میں اٹھا کر) اچھا ہماری بٹیا موٹر لے گی ہہ ہہ ہہ (ہنستا ہے) موٹر ہہ ہہ ہہ موٹر اتنی قریب تھی کہ شاداں نے اسے ہاتھ بھی لگا کر دیکھ لیا۔ مگر تمہارے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ تم سے کتنی دور تھی (ایک لمبی سانس لیتا ہے) ان بچارے

بچوں کو کیا معلوم کہ ان کے نزدیک ہوتے پر بھی وہ موٹر ان سے کتنی دور تھی۔

کریما۔ ابا موٹر تو دور نہیں تھی۔

رحیما۔ (اسے بات کا جواب نہیں دیتا۔ ربو کی طرف دیکھتا ہے) کیا ہو رہا ہے۔ او ہو کھانے کا انتظام۔ پیٹ کے دوزخ میں ایندھن کا بندوبست۔

شاداں۔ ابا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔

مریم۔ ابا تو بھی بھوت لگی ہوئی ہے۔

رحیما۔ ہاں بیٹا۔ ہم سب کو بھوک لگی ہوئی ہے۔ یہ بھوک ہماری بڑی وفادار ساتھن ہے۔ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ یہ ہمیشہ ہمارے ساتھ جھونپڑوں میں رہتی ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ کب تک رہیں گے (ربو کے قریب جا کر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ہے) میری رانی کیوں خاموش ہے؟ کیا بات ہے؟

ربو۔ (اس کا ہاتھ پرے کو ہٹاتے ہوئے) ہٹو بھی شرم نہیں آتی بچے آس پاس بیٹھے ہیں۔ مگر تم ہو کہ .... (جملہ نامکمل چھوڑ دیتی ہے)

رحیما۔ (شرارت سے مسکراتا ہے) یہ بچے ہماری بے شرمی ہی کا تو نتیجہ ہیں۔

ربو۔ چپ رہو۔ پی کر تمہاری عقل غارت ہو جاتی ہے۔

رحیما۔ پی کر عقل غارت ہو جاتی ہے (اور بھی ہنستا ہے) تو کیا جانتی ہے کہ پی کر کیا ہوتا ہے؟ تو نے کبھی پی ہے؟

ربو۔ میں تو لعنت بھیجتی ہوں۔ بھلا میں کیوں پینے لگی۔

رحیما۔ نہ تو نے کبھی پی ہے اور نہ تو اس کے سرور سے آشنا ہے۔ ہائے یہ لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد

(سر کو ذرا ترچھا کر کے سرور کے عالم میں آنکھیں آدھی موند لیتا ہے)

ربو۔ (طنزیہ) جی ی ی ی۔ اس سرور و کیف میں آپ نے سارا گھر بار پھونک دیا۔ چھوٹا بھلائی نہ ہوتا تو آج فاقوں مر رہے ہوتے اور آپ چلے ہیں سرور و کیف کی لینے۔

(ہنڈیا بھوننے میں مشغول ہو جاتی ہے)

رحیما۔ (آنکھیں کھول کر اسے دیکھتا ہے) اب تو مجھے غصہ نہ دلا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں نے تیرے اور تیرے بچوں کے لئے کتنا جان توڑ محنتیں کیں۔ کیسی کیسی مشقتیں اٹھائیں۔ مگر کیا کبھی اس روٹی سے زیادہ کچھ میسر ہوا؟ جو اب بھی مل رہی ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے کیا کبھی اس سے زیادہ کچھ حاصل ہوا؟

ربو۔ تو کیا اب شراب نوشی سے حاصل ہو جائے گا۔

رحیما۔ کیا احمق عورت ہے۔ میں کب کہتا ہوں۔ میں تو اب ان جگر گداز مشقتوں سے تھک چکا ہوں۔ زندگی کے اس فرسودہ چکل میں ادھر ادھر ٹکریں مار مار کر ادھ موا ہو چکا ہوں۔ میں اب اس زندگی کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔ اپنے آپ کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔

ربو۔ لیکن مرد تو ہمیشہ مصیبتوں کا مقابلہ کیا کرتے ہیں۔ ہمت ہار کر نہیں بیٹھ رہتے۔

رحیما۔ تمہیں حق حاصل ہے کہ مجھے بزدل اور کم حوصلہ کہو۔ مگر ربو جب زندگی کی اس جان لیوا اور دشوار جدوجہد میں آگے بڑھنے کے لئے کوئی راستہ نہ ملے۔ جب نومیدی کے گھور اندھیرے میں امید کی کوئی شعاع نظر نہ آتی ہو۔ تو ایسی بلا خیز تاریکی میں کوئی کب تک راستہ ٹٹولے گا۔ اور کب تک پتھروں سے ٹکراتا رہیگا

ربو۔ اس لئے تم شرابی ہو گئے؟

رحیما۔ (تھوڑی دیر تک خاموشی سے اسے تکتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولتا ہے) ہاں کیونکہ اب اس سے زیادہ میں انسانیت کی خدمت نہیں کر سکتا۔

ربو۔ (مڑ کر بڑی حیرت سے پوچھتی ہے) انسانیت کی خدمت! یہ تم انسانیت کی خدمت کر رہے ہو؟

رحیما۔ کیوں اس میں تعجب کی کیا بات ہے ربو۔ خرابی کا وجود امتیاز خیر و شر کے لئے بڑا لازمی ہے۔ دنیا میں جب تک گناہ کرنے والے نہ ہوں گے۔ لوگوں کو گناہ کی ضرر رسانی کا اندازہ کیونکر ہوگا؟ اور وہ اس سے بچاؤ کی صورتیں کیونکر تلاش کر سکیں گے۔

ربو۔ کیا اوندھی منطق ہے۔

رحمن۔ اماں اب تو کھانا پک گیا ہوگا

مریم۔ اماں ہمیں بھوت لگی ہے۔

ربو۔ بیٹا بس تیار ہو گیا۔ ذرا سا اور ٹھہر جاؤ۔

(ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر چمچے سے ذرا سا نکال کر چکھتی ہے۔ بچے سب بھوک سے بیتاب ہیں۔ وہ اور بھی قریب کھسک آتے ہیں شاداں گردن آگے کر کے ہنڈیا میں جھانکتی ہے)

شاداں۔ اماں اب تو تیار ہو گیا۔

رکھو - ہاں بس دونا - کتنی دیر ہوگئی پکتے پکتے -

ربو - ارے ذرا دم تو لو - میں کیا پھونک مار کر پکا دوں - کھانے جاتے ہو ماں ماں کر کے - بیٹا شاداں ذرا تھالی تو دینا -

رحیما - کیوں بگڑتی ہو ناحق - بھوک سے بچارے بلبلائے جا رہے ہیں - ذرا جلدی پکا دیا کرو - ان بچوں کی زندگی کی واحد مسرت کھانا ہی تو ہے -

[شاداں تھالی لا کر ماں کو دیتی ہے - ربو جلدی جلدی کھانا نکال کر بچوں کو دیتی ہے بچے گرم گرم کھانے کو تیزی سے منہ چلا چلا کر نگلتے ہیں]

ربو - (رحیما سے) آؤ تم بھی کھا لو -

رحیما - رحمت اب تک نہیں آیا -

ربو - اب آتا ہی ہوگا - اٹھو تم بچوں کے ساتھ کھا لو -

(سب کھانا کھاتے ہیں)

منظر

وہی کمرہ ہے - رحیما بیٹھا ہوا بیڑی پی رہا ہے - ساتھ ہی ساتھ اونگھتا بھی جا رہا ہے - ربو مریم کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے - غالباً سو گئی ہے - شاداں ایک میلی کچیلی گڑیا سے کھیلنے میں مشغول ہے - رحمت اندر آتا ہے -

رحیما - آؤ رحمت آ گئے تم -

رحمت - ہاں بھیا - آتے آتے ذرا دیر ہو گئی - فیضو کا چھوٹا بچہ بیمار ہے - اسے دیکھنے کے لئے رک گیا تھا - باہر کتنی دھوپ ہے سر چکرا رہا ہے (ربو کو آواز دیتا ہے) بھابی - او ہو بھابی تو سو رہی ہیں - اچھا میں خود ہی کھانا نکال لوں -

ربو - (آنکھیں کھول دیتی ہے) تم آ گئے بھیا - بڑی دیر لگا دی آج (اسے چولہے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر) ٹھیرو میں دیتی ہوں کھانا تمہیں -

رحمت - بھابی تم سو رہو - میں کھا لوں گا -

ربو - میں سو تھوڑی رہی تھی - یونہی ذرا سستانے کے لئے پڑ رہی -

[اٹھ کر اسے کھانا دیتی ہے]

رحمت - (کھانا کھاتے ہوئے) بھیا صبح تم مل میں نہیں آئے -

رحیما - تمہیں نہیں معلوم - آج سے ہماری یونین کا سالانہ اجلاس شروع ہونے والا ہے - صبح کی گاڑی سے ہمارے پریذیڈنٹ آنے والے تھے - اس لئے سٹیشن پر گیا ہوا تھا -

رحمت - اچھا آج سے اجلاس شروع ہو رہا ہے -

رحیما - آج شام سے - اب کی بار مزدوروں کی موجودہ پستی اور افلاس کو دور کرنے کے لئے چند تجاویز پر خاص طور سے غور کیا جائے گا -

رحمت - لیکن بھیا میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یوں شور و ہنگامہ مچانے سے کیا حاصل ہوگا - تم ہی بتاؤ جو مزدور صبح سے شام تک لیڈروں کے استقبال اور جلسے میں لگا رہیگا وہ رات کو گھر جا کر کھائے گا کیا؟

رحیما - انسان کی زندگی کا صرف یہی ایک مصرف نہیں کہ وہ پیٹ بھرنے کے لئے دن رات ایک کر دے - صرف پیٹ بھرنا زندگی کا مقصد نہیں - ایسی زندگی تو جانور بھی جی لیتے ہیں -

ربو - تو آخر تمہارے نزدیک زندگی کا مقصد کیا ہے؟

رحیما - یہ اپنے دل سے پوچھو ربو - کیا اس غلیظ مکان میں تمہارا جی نہیں گھبراتا - کیا ان سڑے ہوئے بدبودار کپڑوں میں تمہارا سانس نہیں گھٹتا - کیا تم ہمیشہ اپنے بچوں کو بھوک سے بلبلاتا ہوا دیکھنا چاہتی ہو تم انہیں بیمار اور لاغر دیکھ مطمئن رہ سکتی ہو - بولو - بولو

ربو - نہیں یہ سب تو میں نہیں چاہتی مگر ......

رحیما - ہاں تم یہ نہیں چاہتی ہو - اور تم کیا ہم میں سے ہر ایک یہ نہیں چاہتا - ہم اپنے معیار حیات کو بلند کرنا چاہتے ہیں - ہم صاف اور ہوادار مکان چاہتے ہیں - ہم ستھرا اور پاکیزہ لباس چاہتے ہیں - ہم اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں - ہمارے دلوں میں اپنے آپ کو اونچا لے جانے کی امنگیں اٹھتی ہیں - اور اس کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دینی پڑے گی -

رحمت - بھیا یہ سب تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو - مگر یہ اس طرح بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ہم دوسروں کی دولت پر قبضہ کرنے کی فکر کریں -

رحیما - لیکن یہ کون کہتا ہے کہ ہم دوسروں کی دولت پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں -

رحمت - اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کو تباہ کر دو

ان سے سب کچھ چھین لو۔ آخر ان لوگوں نے اپنی محنت اور کوشش سے روپیہ جمع کیا ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ان سے یہ سب کچھ چھین لے۔

رحیما۔ لیکن تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ مزدوروں کا خون ہے۔ جو مشینوں میں ڈھل کر سونا بن جاتا ہے۔ دیکھو ایک تو وہ ہے جو صبح سے شام تک لگاتار محنت کرتا ہے۔ اور جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو ہر ہر قدم پر اس کی ہڈیاں درد سے کراہ اٹھتی ہیں اور ایک وہ ہے جو موٹر پر بیٹھ کر آتا ہے اور چند گھنٹوں کے لئے بجلی کے پنکھوں تلے بیٹھ کر کاغذات الٹ پلٹ کر چلا جاتا ہے اور تم کہتے ہو کہ سب کچھ اسی کا ہے۔

رحمت۔ بھیا تم جو کچھ کہتے ہو۔ وہ ٹھیک تو معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

رحیما۔ صدیوں کی غلامی ذہن کو ماؤف کر دیتی ہے بھیا۔ لوگ کو اپنی حالت کا احساس ہی نہیں رہتا۔ پنجرے میں رہ رہ کر آخرکار پرندے کے بال و پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ وہ پنجرے سے مانوس ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی زندگی کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ وہ فضا کی لامحدود وسعتوں میں کھو جائے۔ اس کی پرواز ہر قید سے بے نیاز ہو۔

رحمت۔ جو کچھ بھی ہو۔ میرے نزدیک ہر انسان کو اپنی مدد خود کرنا چاہیئے۔

شاداں۔ [جو گڑیا سے کھیلنا چھوڑ کر تھوڑی دیر سے ان کی باتیں سن رہی تھی] لیکن چچا میری گڑیا تو اپنی مدد کر ہی نہیں سکتی۔

رحیما۔ (مسکراتا ہے) رحمت دیکھو یہ گڑیا اپنی مدد خود نہیں کر سکتی۔ اور دنیا میں ایسے ہی ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسان ہیں۔ جو مدد کے محتاج ہیں۔ جنہیں اپنی بے کسی اور بے بسی کا کوئی علاج نہیں سوجھتا۔ وہ لوگ جو خود غرضی سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے بدنصیبوں کو کچل ڈالتے ہیں۔ ہمیں صرف اپنی نہیں۔ انسانیت کے ان مظلوم طبقوں کی بھی مدد کرنا ہی ہوگی۔

رحمت۔ لیکن بھیا یوں دنیا کو تہ و بالا کر دینے کے منصوبے باندھنے سے کیا حاصل، جب ہماری مدد کے لئے کوئی تیار نہیں تو ہمیں کیا ضرورت کہ ناحق ہر ایک کی فکر کرتے پھریں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی کامیابی کے لئے جدوجہد کرے۔ اور باقی ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔

رحیما۔ رحمت اول تو یہی بہت دشوار ہے کہ تم کامیاب ہو گئے اور بفرض محال تم کامیاب ہو بھی گئے۔ تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچے گا یہ اضطراب اور بے چینی اسی طرح برقرار رہے گی۔ یہ فرد کا فرد سے تصادم۔ طبقے کا طبقے سے تصادم۔ قوم کا قوم سے اور حکومت کا حکومت سے تصادم۔ ان میں سے کوئی چیز کم نہ ہوگی۔ اور زندگی بدستور جہنم بنی رہے گی۔

[رحمت کھانا کھا کر اٹھتا ہے اور ربو برتن اٹھا کر لے جاتی ہے]

شاداں۔ ابا تصادم کیسا ہوتا ہے؟

رحیما۔ [ہنستے ہوئے] تصادم ایک بہت بڑا جانور ہے جو اپنے سر کو اپنی پونچھ سے ٹکراتا رہتا ہے۔

[دونوں بھائی قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔ شاداں بھی انہیں ہنستا ہوا دیکھ کر ہنستی ہے]

رحمت۔ اچھا بھیا۔ میں تو جاتا ہوں۔ چلو تم نہیں چلتے۔

رحیما۔ نہیں بھئی۔ مجھے تو یونین کے اجلاس میں جانا ہے۔

ربو۔ جاؤ بھیا۔ تم تو کام پر جاؤ۔ ان کے تو جلسے ہی ختم نہ ہونگے۔

رحمت۔ ہاں بھابی چلتا ہوں۔ [چلا جاتا ہے]

وقفہ

ربو۔ [چولہے کے پاس بیٹھ کر برتنوں کو کچھ ڈھونڈ رہی ہے] تم کبھی اپنی خیالی دنیا سے نکل کر اپنے فرائض بھی یاد کرو گے۔ دیکھو یہ بے چارا دن بھر اپنی جان ہلکان کرتا ہے۔ اور اس کی کل آمدنی تمہارے بیوی بچوں پر صرف ہو جاتی ہے۔ آخر یہ کب تک۔

رحیما۔ اے عورت میری آمدنی کا بہت کچھ حصہ اس پر صرف ہو چکا ہے۔ اور اس گھر کے اخراجات کی کفیل اسی اکیلے کی آمدنی نہیں ہے۔ تو چاہتی ہے کہ میں جانوروں کی طرح محض پیٹ بھرنے کے لئے زندہ رہوں۔ یہ مجھ سے اب نہیں ہو سکتا میں اپنے خوابوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا [ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے آپ سے بول رہا ہے] یہ میٹھے اور سنہرے سپنے جو بڑے خوفناک اور بھیانک بھی معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں شدید مایوسی کا پاگل پن بھی ہے۔ مگر امید مندی کا جذبہ و عمل بھی ہے۔

ربو۔ جانے کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا۔

رحیما۔ خواب کسی کی سمجھ میں آتے ہیں ربو جب تک یہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں۔ خواب دیکھنے والے پاگل سمجھے جاتے ہیں۔

ربو۔ مگر خدا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اس بھائی کا بھی تو تم پر کچھ حق ہے۔ یہ ہر وقت بیگاں کی دھن اس پر کیوں سوار رہتی ہے وہ ہر روز بجائے سیدھا ل جانے کے کیوں کوس بھر راستہ چل کر بیگاں کے گھر کے سامنے سے گذر کر جاتا ہے۔ اب تم اس کی فکر نہ کرو گے تو اور کون کرے گا۔ اور پھر بیگاں کتنی اچھی لڑکی ہے۔ کتنی شرمیل اور سگھڑ اس کے آنے سے میرا بہت کچھ ہاتھ بٹ جائے گا۔

رحیما۔ تم بھی ٹھیک کہتی ہو ربو۔

ربو۔ خاک پڑے ایسے ٹھیک پر۔ جو ٹھیک ہو کر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔

رحیما۔ کیا بتاؤں ربو۔ بعض دفعہ میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں دو حصوں میں بٹا ہوا ہوں ایک تو اس غلیظ مکان میں مقید ہے۔ اور دوسرا نہیں معلوم کن کن فضاؤں میں پرواز کرتا پھرتا ہے۔ یہ دونوں میرے اندر الگ الگ بستے ہیں۔ مگر جب کبھی یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے جاتے ہیں۔ تو میری ذہنی کوفت میری برداشت سے بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر .... اور پھر تم جانتی ہو۔ (مسکراتا ہے)

ربو۔ خدا کی لعنت۔ شراب

رحیما۔ خدا کی لعنت اور شراب۔ (ہنستا ہے) مزدور کو عمر بھر میں صرف دو ہی تحفے ملتے ہیں۔ خدا کی لعنت اور اگر اس سے تنگ آجائے۔ تو شراب ہہ ہہ ہہ ہہ

ربو۔ خدا سے ڈرو۔ اور خاموش رہو۔

رحیما۔ [متاثر ہوتے جا رہا ہے] اچھا بھئی میں جاتا ہوں۔ ورنہ جلسہ میں وقت پر نہ پہنچ سکوں گا۔

[جاتا ہے]

دوسرا ایکٹ

منظر۔ دور تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں ادھر ادھر درختوں کی قطاریں بھی ہیں بعض جگہ درخت بے ترتیب بھی اُگے ہوئے ہیں سامنے درختوں کے جھنڈ میں ایک کنواں بھی ہے۔ رحمت اور فیضو برگد کے ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں

رحمت۔ [تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھتا ہے] آؤ بھئی تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں۔

فیضو۔ ہاں بھئی بیٹھو۔ میں تو چلتے چلتے تھک گیا ہوں تمہارا بھی عجب شوق ہے۔ کہہ رہا تھا۔ چلو گھر میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔ لیکن نہیں۔ تم پر تو جنگل کی ہوا کھانے کی دھن سوار تھی۔

رحمت۔ ارے بھیا۔ تو میں نے کب کہا تھا کہ تم زبردستی چلو

فیضو۔ اچھا تو یہ ساتھ دینے کے لئے دس میل چل کر ہم فضول ہی آئے۔

رحمت۔ اب تھک گیا ہے۔ تو بیٹھ کر آرام کر لے بھائی۔ بگڑتا کیوں ہے۔

[دونوں بیٹھ جاتے ہیں]

فیضو۔ دیکھ آج رحیمو بھائی نے خود مجھے جلسہ میں آنے کے لئے کہا تھا۔ مگر تیری خاطر میں ادھر آگیا۔ اب سوچتا ہوں۔ ان سے ملوں گا۔ تو کیسی شرمندگی ہوگی۔ اور تیرا دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں

رحمت۔ تو وہاں جلسہ میں جا کر کیا کر لیتا تو۔ اب تک جلسے کر کے کچھ رحیمو بھائی نے بنا لیا ہے۔ اور کچھ تو نے۔ جو آج وہاں جا کر باقی کی کمی پوری ہو جاتی۔

فیضو۔ بھیا میں تو ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی۔ جلسے و لسے کر کے کیا ہوگا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ رحیمو بھائی جو کچھ کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔

رحمت۔ جی اور یہ شراب جو پیتے ہیں۔

فیضو۔ ارے بھائی اب انسان فرشتہ تو بن نہیں سکتا۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لو کہ لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے کتنی عزت ہے۔ اور آخر کوئی بلا کسی وجہ کے کسی کی عزت کرے گا؟

رحمت۔ لیکن تم لوگ کتنے سال سے ان کی باتیں مان رہے ہو۔ ان کے ساتھ کام کاج چھوڑ کر مارے مارے پھرتے ہو۔ پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ہو۔ اور پھر بھی جو کچھ انھوں نے کہہ دیا وہ ٹھیک۔ باقی سب غلط۔

فیضو۔ رحمت۔ وہ ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ ہمیں تکلیف اور غم میں اگر کسی کا سہارا ملتا ہے۔ تو صرف ان ہی کا۔ افسوس ہے تم قریب رہ کر بھی بھائی کو نہیں پہچانتے۔ تم اگر راستہ پر چلتے ہوئے کسی نوکیلے پتھر کو دیکھ لو گے تو پیر بچا کر چلو گے۔

مگر رحیمو بھیا پیچھے آنے والے سے بھی مڑ کر کہدیں گے کہ پیچھے سے ہٹ کر چلے۔ ورنہ اس کا پاؤں زخمی ہو جائیگا۔ اچھا یار ہٹاؤ۔ کیا فائدہ ہے۔ اس بحث سے۔ سناؤ بیگاں صبح ملی تھی؟

رحمت۔ نہیں یار صبح نہیں ملی۔

فیضو۔ اچھا اب یاروں ہی سے اڑتے ہو۔ یہ ہر صبح جو آپ گول بازار کا چکر لگا کر پیر دلین میں سے ہوتے ہوئے مل جاتے ہو تو محض ہوا خوری کے لئے؟

رحمت۔ صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ مل جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کیا کرتا۔ سیدھا کام پر جانا پڑا۔ لیکن خدا کی قسم جس روز میں اسے نہیں دیکھتا۔ میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔

فیضو۔ خوب تو معاملہ یہاں تک آ گیا ہے۔ مگر اب تم کس چیز کی راہ دیکھ رہے ہو۔ بیگاں یونہی تو تمہارے ساتھ ساتھ لگی نہیں پھرتی۔ اُسے بھی تم سے محبت ہے۔ نوراں چاچی بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور پھر اگر رحیمو بھائی نے جا کر رشتہ مانگا۔ تو مزدوروں میں سے تو کوئی انکار کر نہیں سکتا۔

رحمت۔ تو نوراں چاچی کب انکار کرتی ہے۔ وہ البتہ دو سو روپیہ مانگتی ہے۔ اب دو سو روپیہ کہاں سے آئے۔

فیضو۔ ہاں یہ تو معاملہ ذرا مشکل ہی ہے۔

رحمت۔ دو سو روپے کا تو کیا ذکر۔ یہاں دو سو پیسوں کا ٹھکانہ نہیں۔ جو کچھ آتا ہے۔ سب خرچ ہو جاتا ہے بلکہ ہر وقت تنگی ہی رہتی ہے۔ جتنی محنت کرو۔ جان ہلکان کرو۔ مگر پھر رہیں کے رہیں۔

فیضو۔ ہوں

رحمت۔ اکثر بیٹھ کر سوچتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں۔ مگر کچھ نہیں سوجھتا۔ کبھی کبھی مجھے ڈر معلوم ہونے لگتا ہے کہ کہیں نوراں کوئی اور آ کر یہ شرط پوری نہ کر دے۔ فیضو خدا کی قسم میں پاگل ہو جاؤنگا۔

فیضو۔ ہاں ہاں مرد آدمی۔ بالکل اتنے مایوس بھی نہ ہو جاؤ۔ کوئی نہ کوئی ضرور نکل آئیگا۔

رحمت۔ کیا راستہ نکلے گا۔ آسمان سے تو ٹپکنے کر گرنے سے رہی۔

فیضو۔ اب تم جی توڑ کر محنت سے کام کر رہے ہو۔ اب آگے جو اللہ کی مرضی۔

رحمت۔ ہاں یہی ایک صورت ہے جس میں کچھ اُمید نظر آتی ہے۔ مگر یار بچتا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ میں تو اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔

[آسمان پر سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف قوس قزح بن جاتی ہے]

فیضو۔ ارے یار دیکھ وہ دیکھ [انگلی سے قوس قزح کی طرف اشارہ کرتا ہے] رحمت ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھتا ہے]۔

رحمت۔ فیضو۔ اس وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قوس قزح ہی کی طرح بیگاں مجھ سے دور ہے اور میں اگر ساری عمر بھی دوڑتا رہا۔ تو اس تک نہ پہنچ سکوں گا۔

فیضو۔ اتنے ناامید مت ہو دوست۔

رحمت۔ میں بعض دفعہ ڈرنے لگتا ہوں فیضو۔ میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے لئے خود راستہ تلاش کر لوں گا۔ میں ناامید ہو کر خواب نہیں دیکھنا چاہتا تم لوگ خواب دیکھتے ہو۔ نہیں معلوم کیسی زندگی کے خواب۔ مگر تم میں سے ایک بھی بیگاں کی ماں کو رضامند نہیں کر سکتا کہ وہ دو سو روپے لئے بغیر اپنی بیٹی کو بیاہ دے۔ نہ تم۔ نہ تمہارے رحیمو بھائی۔ اس دنیا میں ہر ایک خود غرض ہے۔ بس منہ کی باتیں بنتے جاؤ۔

فیضو۔ سچ کہتے ہو یار۔

رحمت۔ مجھے تو اکثر رحیمو بھیا کی باتوں پر غصہ آ جاتا ہے۔ مزدوروں کے لئے یہ ہونا چاہیئے۔ وہ ہونا چاہیئے۔ اور مزدور ہیں کہ ہمیشہ ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار۔ بھلا بتلاؤ۔ نوراں کو کس بات کی کمی ہے۔ دو جوان لڑکے کمانے والے ہیں اگر وہ دو سو روپیہ لئے بغیر بیٹی کی شادی کر دے۔ تو کونسی آفت آ جائے گی۔

فیضو۔ ہاں اس کے ہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔

رحمت۔ مگر لالچ لالچ۔ جب انسان فطرتاً لالچی ہے۔ تو پھر اسے چھپانے اور بڑی بڑی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے]

رحمت۔ رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ ایک بہت بڑا قلعہ ہے اور اس کے اندر بڑا خوبصورت باغیچہ ہے۔ حوض ہے فوارے چل رہے ہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں کہ اس باغیچہ میں ایک طرف بیگاں کھڑی ہے۔ اور اس نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں ہو تمہیں یاد ہے۔ ہم پرسوں ایک فلم دیکھنے گئے تھے۔ اس میں

جولڈکی تھی۔ بین ویسے ہی کپڑے تھے۔ اور میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے لپٹا لوں۔ اور ابھی میں آگے بڑھا ہی نہ تھا کہ اتنے میں ایک لال لال موٹر نجانے کہاں سے آگئی اور بیگاں اس میں بیٹھ کر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور چلی گئی۔

فیضو۔ ہمارے سیٹھ کی موٹر بھی تو لال رنگ کی ہے۔

رحمت۔ ہو گی شاید۔ میرا تو اس وقت سے اُسے دیکھنے کو جی بے تاب ہو رہا ہے۔ صبح آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ کیا کرتا۔

[بے چینی سے چاروں طرف دیکھتا ہے]

فیضو۔ کیا دیکھ رہے ہو بھئی۔

رحمت۔ کچھ بھی نہیں یار۔ یونہی ادھر ادھر دیکھ رہا ہوں۔

فیضو۔ وہ سامنے سے کوئی آ رہا ہے۔ ارے برکت ہے۔

رحمت۔ ہاں برکت ہے۔ [زور سے آواز دیتا ہے] برکت برکتے۔

[برکت انہیں دیکھ لیتی ہے۔ اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھتی ہے]

برکت۔ [رحمت سے] واہ بھیا واہ ہم دونوں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئیں۔

فیضو۔ دونوں! تو یہ اور کون ہے تمہارے ساتھ۔

برکت [شوخی سے] ہے کوئی۔ ہم نہیں بتاتے۔

فیضو۔ [ہنستے ہوئے] اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔ [رحمت سے] تو جبھی آپ بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اب پتہ چلا معاملہ کیا ہے؟ اچھا بھئی میں تو اب جاتا ہوں۔

رحمت۔ بیٹھو یار اتنی جلدی کیا ہے

فیضو۔ دل ہی دل میں تو میرے دفع ہونے کی دعائیں مانگ رہے ہو۔ اور پھر اب مجھے جانا ہی چاہیئے۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا تمہیں تو معلوم ہے۔ بچے کی طبیعت اچھی نہیں۔

برکت۔ [سنجیدگی سے منہ بنا کر] اور ہاں بھیا۔ بھابی بھی رستہ دیکھ رہی ہوں گی۔

فیضو۔ چپ رہ [ہنستا ہوا چلا جاتا ہے]

رحمت۔ برکت بیگاں کہاں ہے؟

برکت۔ بھلا میں کیا جانوں۔

رحمت۔ [منت سے] بتا دو برکت۔

برکت۔ تیاری۔ اب میں کیا صبح سے شام تک خبر رکھوں کہ آپ کی بیگاں کہاں ہے۔ کدھر ہے۔ کیا کر رہی ہے۔

رحمت۔ دیکھو برکت اب تنگ مت کرو۔ ہاں ہماری بڑی اچھی بہن ہے۔ ابھی ہمیں بتا دے گی۔

برکت۔ جی نہیں۔ آپ کی بہن بڑی خراب ہے۔ وہ بھیا کو خوب تنگ کرے گی۔

رحمت۔ اچھا کر لو تنگ۔ جتنا جی چاہے خراب کر لو۔ ہم اب تم سے بولیں گے ہی نہیں [منہ پھیر کر بیٹھ جاتا ہے]۔

برکت۔ دوسری طرف سے اُس کے سامنے آ کر] رحمت بھیا۔

[رحمت ادھر سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ برکت شریر نظروں سے اسے دیکھتی ہے]

برکت۔ اچھا بھیا تو تمہیں بتاؤں۔

رحمت۔ [جلدی سے مڑ کر] بتاؤ۔

برکت۔ [زور سے ہنستی ہے] کیسے بات کروالی تم سے بھیا۔ مانتے ہو کہ نہیں۔

[رحمت پھر ناراض ہو کر مڑنے لگتا ہے]

برکت۔ اچھا اچھا بھیا۔ تم ناراض ہو جاؤ۔ [شریر نظروں سے اسے دیکھتی ہے] ہائے اللہ کیا کروں۔ بھیا بگڑے جاتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں کہ بھابی کہاں ہے۔ اب کیا کروں۔

رحمت۔ [کسی درخت کی گری ہوئی ٹہنی اُٹھا لیتا ہے] برکت اب تم پٹو گی۔

برکت۔ [جھوٹ موٹ سہم کر] ہائے اللہ۔ دیکھو بھیا مجھے پیٹنا مت۔

رحمت۔ تو بتاؤ بیگاں کہاں ہے؟

برکت۔ [مصنوعی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے] ذرا ٹھہرو بھیا۔ میں ادھر ادھر دیکھ تو لوں۔

رحمت۔ [ٹہنی زمین پر پٹک دیتا ہے] خدایا کس آفت میں جان آگئی ہے۔

برکت۔ [ہنس پڑتی ہے] اچھا بھیا۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں کنوئیں کے قریب کون ہے؟

[رحمت ادھر جاتا ہے۔ برکت ہنستی ہوئی اسے دیکھتی ہے]

تیسرا ایکٹ

وہی رحیمو کا کمرہ۔ بچے سوئے ہوئے ہیں۔ صرف مریم جاگ رہی ہے۔ رحیمو نے اپنا بہترین لباس

پھنسا ہوا ہے۔ شاید کہیں باہر سے آئی ہو۔ رحیم بیڑی پھونک رہا ہے۔

رحیما۔ اچھا تو کیا کہا نوراں چاچی نے۔

ربو۔ کہتی کیا۔ میرا رحمت اب خیر سے ہیڈ مستری ہو گیا ہے اس کے رشتے سے اب کون انکار کر سکتا ہے دو سو روپے کا تو وہ پہلے ہی سے کہہ رہی تھی۔ خدا نے چاہا تو اسکا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

رحیما۔ ہوں۔

ربو۔ میں جو وہاں گئی تو بیگاں کیسی ہنستی ہوئی اٹھی ہے۔ "آؤ بھابی آج تم راستہ کیسے بھول گئیں کیسی اچھی لڑکی ہے اچھی صورت۔ سگھڑ۔ حیا دار۔ جیسے ہی بچاری کو معلوم ہوا کہ میں کیوں آئی ہوں بس منہ چھپا کر بھاگ گئی۔

رحیما۔ [مسکراتا ہے] یہ لڑکیاں جھوٹ موٹ ہی شرمایا کرتی ہیں

ربو۔ اے لو۔ جھوٹ موٹ کیوں۔ کنواری لڑکیاں ہمیشہ بیاہ شادی کے ذکر پر شرما جاتی ہیں۔

رحیما۔ چاہے پیٹ میں لڈو پھوٹ رہے ہوں۔

ربو۔ بس چپ بھی رہو۔ تمہاری اوندھی بدھی سے تو میرا ناک میں دم آ گیا ہے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔ نیکی پڑے اس یاد پر بالکل بھول ہی گئی۔

[اٹھ کر مریم کو جو فرش پر کھیلتے ہی کھیلتے سو گئی تھی۔ اٹھا کر بستر پر لٹا دیتی ہے]

ربو۔ مگر تم نے دیکھا۔ ہیڈ مستری ہونے کے بعد سے رحمت کا تو طور طریقہ ہی بدل گیا ہے۔ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیں کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اس روز برکت آئی ہوئی تھی۔ وہ تو بڑی نٹ کھٹ ہے۔ کہنی لگی "بھیا بیاہ کے بعد تم کیا کرو گے" تو کہنے لگا کہ نئی چال جو بن رہی ہے۔ وہاں جا کر رہوں گا۔ تم سمجھے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ ہم سے الگ رہے۔ ہاں ہیڈ مستری جو ہو گیا۔ اب ہمارے ساتھ رہنے میں اس کی بے عزتی ہے۔

رحیما۔ تو ہمیں کیا۔ جو اس کا جی چاہے کرے۔ ہمارا کچھ زور تو نہیں، مجھے تو صرف اس بات پر صدمہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے بدسلوکی کرتا ہے۔ کئی لوگ آ کر مجھ سے کہتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں؟ میری تو وہ مانتا نہیں۔

ربو۔ ارے تم کیسے ہیں آخر تم ہی نے تو اسے پال پوس کر جوان اور کماؤ ہو گیا ہے۔ تو کیا ہوا۔ تمہاری بات اسے ماننی ہی پڑے گی۔

رحیما۔ تم نے اسے پہچانا نہیں ربو۔ اور پھر وہ آخر کس کا بھائی ہے۔ مجھے لوگوں نے کتنا دھمکایا ڈرایا۔ وہ بار جیل جانا پڑا مگر اپنے کام سے باز نہ آیا۔

ربو۔ مگر تمہاری اور بات ہے۔ تم نے جو کچھ کیا لوگوں کے بھلے کے لئے کیا۔

رحیما۔ یہ تم کہہ رہی ہو ربو [طنزیہ مسکراتا ہے] تم جو مجھے منع کرنے والوں میں پیش پیش رہی ہو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ شاید تم کبھی نہ سمجھ سکو گی۔ کہ میں کیوں یہ سب کچھ کرتا ہوں۔

ربو۔ ہاں تم تو مجھے ہمیشہ بیوقوف سمجھتے ہو۔

رحیما۔ نہیں ربو یہ بات نہیں۔ ہے [تھوڑی دیر خاموش رہتا ہے] لیکن رحمت پر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی باتوں کو ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے اندر ایک زہریلا ناگ پرورش پا رہا ہے۔ اور اب تو وہ ناگ ڈس لینے کے قابل ہو گیا۔ میں تو ڈرتا ہوں۔ کہیں مجھے بھی نہ ڈس جائے۔

ربو۔ اے ہے۔ اب سے دور دفاں۔ کیسی باتیں کر رہے ہو رحمت دل کا اتنا برا بھی نہیں۔ ابھی بچہ ہے اس کی عمر ہی کیا ہے سمجھ آتے آتے ہی آتی ہے۔ ذرا نئی نئی حکومت ملی ہے۔ اس کا خمار ہے۔ بیوی کے آنے پر خود بخود ٹھیک ہو جائیگا۔

رحیما۔ [طنزاً ہنستا ہے] حکومت ہنہ ہنہ ہنہ

[دروازہ کھلتا ہے۔ فیضو اندر داخل ہوتا ہے۔ مگر وہ رو رہا ہے]

رحیما۔ ارے فیضو روکیوں رہے ہو کیا بات ہے؟

فیضو۔ بھیا [زور سے رو پڑتا ہے]

ربو۔ مت رو بھیا۔ آخر کیا ہوا۔ بچہ تو اچھا ہے۔

[فیضو اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ مگر شدت گریہ سے بول نہیں سکتا]

رحیما۔ آخر کچھ کہو تو سہی بات کیا ہے؟

فیضو۔ [گلوگیر آواز میں اٹک اٹک کر] بھیا۔ تم جانتے ہو میرا بچہ تین دن سے زیادہ بیمار ہو گیا ہے صبح تو کچھ امید ہی نہ تھی۔ میں کام پر گیا تو سہی۔ مگر میرا دل بچے ہی میں پڑا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے مجھے

اسی سے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ مگر مجھے اطمینان تھا۔ کہ رحمت بھیا کے ہوتے ہوئے کچھ زیادہ ڈر نہیں۔ مگر آج .... [ہچکیاں لے لے کر روتا ہے]

رحیما۔ آج کیا ہوا فیضو۔ آج کیا ہوا؟

فیضو۔ بھیا مجھے آج نوکری سے جواب مل گیا ہے [روتے ہوئے]
جمو بھیا میں کیا کروں گا۔ بچہ پہلے ہی سے بیمار ہے۔ علاج کے لئے بہت سا قرض لے چکا ہوں۔ اب کیا بنے گا۔ خدایا اب کیا بنے گا۔

رلو۔ ہمت کرو بھیا۔ اللہ سب آسان کرے گا مشکل سب بڑی ہے۔ یوں حوصلہ نہ ہارو۔ چپ ہو جاؤ میرا بھیا۔ یوں بلک بلک کر نہ روؤ۔

[فیضو آنسو پونچھتا ہے۔ خاموش تم ذرا تھم رہے رحیما اس بالکل خاموش ہے۔ جیسے کچھ بول ہی نہیں سکتا]

رلو۔ بس بھیا بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔

رحیما۔ بھروسہ [انتہائی طنز سے] ہونہہ بھروسہ!

[دروازہ کھلتا ہے۔ اور رحمت اندر آتا ہے۔ اُسے دیکھ کر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ رحمت بھی فیضو کو دیکھ کر خاموش ہی رہتا ہے]

فیضو۔ اچھا بھیا۔ میں اب جاتا ہوں۔

[آنسو پونچھتا ہوا۔ چلا جاتا ہے۔ سب اسی طرح خاموش ہیں۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا]

رحمت۔ بھابی کھانا تیار ہے؟

رلو۔ ہاں تیار ہے بھیا۔

[اٹھ کر چولہے کے قریب جاتی ہے۔ آگ بجھی ہوئی ہے۔ وہ لکڑیاں چولہے میں رکھ کر آگ جلاتی ہے]

رحمت۔ بھابی فیضو کیوں آیا تھا۔

رلو۔ بھیا تم نے بہت برا کیا تمہیں ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔

رحمت۔ لیکن بھابی میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے جس کام کے لئے تنخواہ ملتی ہے۔ اس کا پورا کرنا میرا فرض ہے۔

رحیما۔ انسانیت بھی تم پر چند فرائض عائد کرتی ہے۔

رحمت۔ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا بھیا۔ لیکن میں جس بات کی مزدوری لیتا ہوں۔ اُسے ضرور پورا کروں گا۔ میں اپنی ترقی کے موقعوں کو ضائع نہ ہونے دوں گا۔

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے]

رحیما۔ ہمارے راستے الگ ہو گئے ہیں رحمت، ہم سب ایک ہی تھا تاریکی میں چل رہے ہیں تم چاہتے ہو کہ اس تاریکی سے باہر نکل جاؤ۔ چاہے تمہیں دوسرے کے سینہ پر پاؤں رکھ کر ہی کیوں نہ چلنا پڑے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس تاریکی کا وجود ہی مٹا دیا جائے۔ ہم اور تم بالکل مختلف راستوں پر چل رہے ہیں نہیں معلوم اس کا انجام کیا ہوگا؟

[رلو کھانا گرم کر کے لاتی ہے۔ اور رحمت کے سامنے رکھ دیتی ہے]

رلو۔ رحمت اب تم کھانا کھالو۔ [رحیما سے] چلو اب جانے دو خاموش ہو جاؤ۔ ابھی بچہ ہے۔ بچوں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔

رحیما۔ بچہ۔ [رحمت کو زور دار [illegible] کر کے بولتا ہے۔ اور اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے]

چوتھا ایکٹ

منظر:۔ رات کا وقت ہے بہت سی لڑکیاں اور عورتیں ایک جگہ ڈھولک لئے بیٹھی ہیں۔ بیچ بیچ میں ہی ڈھولک بج رہی ہے۔ جس کی آواز کبھی کبھی قہقہوں میں دب کر رہ جاتی ہے۔ برکت لڑکیوں سے کافی فاصلے پر اپنی طرف منہ کئے دیکھ رہی ہے۔

قریب کے درخت سے آواز آتی ہے:۔ برکت

برکت۔ [ڈر کر اچھل پڑتی ہے] اُوئی کون ہے۔ اوہ رحمت بھیا۔

رحمت۔ ہاں میں ہوں برکت

برکت:۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ اوہ ہ ہ ہ [لمبا سانس لیتی ہے]

رحمت۔ [ہنستا ہے] تم تو بہت دلیر بنتی ہو۔ اب کیسے ڈر گئیں۔

برکت۔ لیکن میں پوچھتی ہوں۔ یہ تم اتنی رات گئے۔ یہاں لڑکیوں کے آس پاس کیوں منڈلا رہے ہو۔

رحمت۔ میں بیگاں کو دیکھ رہا تھا۔ بیگاں اب تک نہیں آئی۔

برکت۔ بھیا اب تمہاری سگائی ہو چکی ہے۔ کوئی دیکھ لے تو بہت برا ہوگا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کی تو بات ہے۔ تمہیں ذرا بھی دل پر قابو نہیں۔ بس جب دیکھو بیگاں بیگاں۔

رحمت۔ کیا کروں اس دل پر قابو نہیں چلتا۔

برکت۔ اور ہاں بھیا۔ آج کل تو سب جگہ مشہور ہو رہا ہے کہ تم

بڑے مغرور ہو گئے ہو۔ ہر ایک پر حکومت جتاتے ہو۔ فیضو کا سُن کر مجھے اور بیگاں کو سخت صدمہ ہوا۔ یہ کیوں کیا تم نے ؟

رحمت ۔ میں بیگاں کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میں کام پوری طرح نہ کرتا۔ تو مجھے ترقی کیونکر ملتی ؟ اور میں نوراں چاچی کی شرط کیونکر پوری کرتا۔

برکت ۔ لیکن رحمت بھیا۔ آدمی کو دوستوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

رحمت ۔ ارے برکت اس دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں سب جھوٹ اور فریب ہے۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہو اسے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہٹاؤ تم بھی کیا قصہ لے بیٹھے ہو۔ بیگاں اب تک کیوں نہیں آئی ؟

برکت ۔ ارے سنو تو راجو گا رہی ہے۔

[گانے کی آواز آتی ہے]

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
آئے براتی آئے ساجن آنکھوں میں بٹھلانا ہوگا
دے دے تن من پیت کے گاہک ہاتھ انکے بک جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
دھمک رہی ہے دور سے ڈھولک سوئے بھاگ جگانا ہوگا
چمک اُٹھی ہے مشعل کی لو اب تو لگن لگانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
گونج اُٹھی شہنائی ترنا من کی پیاس بجھانا ہوگا
دھن بنسی کی پریم کی دھن ہے اسی میں گھل مل جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

(مقبول احمد پوری)

برکت ۔ راجو کتنا اچھا گاتی ہے۔

رحمت ۔ لیکن بیگاں اب تک کیوں نہیں آئی ۔

برکت ۔ اب میں کیا جانوں ؟ کوئی کام ہو گیا ہوگا۔ [تھوڑی دیر چپ رہتی ہے] بھیا تم جا کر اُسے ذرا دیکھ تو آؤ۔ وہ تو ہمیشہ سب سے پہلے آجایا کرتی تھی ۔

رحمت ۔ تو جاؤں۔ دیکھ آؤں ۔

برکت ۔ ارے ٹھہر جاؤ۔ وہاں چلے نہ جانا۔ اب تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔

رحمت ۔ [تنگ آکر] تو پھر کیا کروں ؟ کبھی کچھ کہتی ہو کبھی کچھ۔

برکت ۔ [شرارت سے ہنستی ہے] بہت بے چینی ہو رہی ہے بھیا

رحمت ۔ دیکھو برکت آج اگر تم نے ذرا بھی شرارت کی تو سچ کہتا ہوں پٹ جاؤ گی ۔

برکت ۔ یہ کون آرہا ہے ۔

رحمت ۔ کدھر۔

برکت ۔ وہ دیکھو وہ۔ ارے یہ تو نوراں چاچی ہے۔

نوراں ۔ [بہت تیزی سے چلتی ہوئی آرہی ہے۔ اس لئے ہانپ رہی ہے] رحمت ۔ رحمت ۔

رحمت ۔ کیا بات ہے چاچی

نوراں ۔ [بولنا چاہتی ہے۔ مگر بری طرح ہانپ رہی ہے۔ بول نہیں سکتی] رحمت .... بیگاں۔

برکت ۔ [گھبرا کر] چاچی کہاں ہے بیگاں ۔

رحمت ۔ وہ اچھی تو ہے نا چاچی۔ کچھ بولو تو سہی ۔

نوراں ۔ [اس کا سانس اب قابو میں آچلا ہے] رحمت۔ بیگاں شام کو باہر گئی ہوئی تھی ۔ وہاں سے کہتے ہیں مل کے سیٹھ کے آدمی اُسے زبردستی پکڑ کر لے گئے ۔

رحمت اور برکت ۔ [یک لخت چیخ اُٹھتے ہیں] چاچی ۔

نوراں ۔ میں تو بڑی دیر سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی ۔

[رحمت یکلخت ایک طرف بھاگ اُٹھتا ہے]

برکت ۔ بھیا کہاں جا رہے ہو ؟

نوراں ۔ رحمت بیٹا رحمت

برکت چلا گیا ۔

نوراں ۔ کہاں گیا ہوگا یہ برکت ؟

برکت ۔ نہیں معلوم چاچی۔ مگر اب ہوگا گیا ؟

[نوراں رونے لگتی ہے]

برکت ۔ چاچی روؤمت چاچی ۔ سب لڑکیاں قریب ہی ہیں۔ کوئی ادھر نہ آجائے۔ آؤ اس طرف آؤ۔

[نوراں کو ساتھ لیکر ایک طرف جاتی ہے]

پانچواں ایکٹ

منظر ۔ ایک بہت بڑے بنگلہ کا پھاٹک۔ اندر کا کچھ حصہ پھاٹک میں سے نظر آتا ہے۔ پھاٹک بند ہے رحمت تیزی سے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ پھاٹک کھولنا چاہتا ہے۔ مگر وہ بند ہے۔ وہ اسے زور زور سے

دھکے دیتا ہے۔

رحمت۔ [چلاکر] دروازہ کھولو۔ کوئی اندر ہے۔ دروازہ کھول دو۔ [اندر سے نہ کوئی آواز آتی ہے۔ نہ کوئی باہر نکلتا ہے] دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔ [مجنونانہ جوش سے پھاٹک کو ہلاتا ہے۔ اندر سے کسی کی آواز آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پھر چلاتا ہے] کوئی ہے۔ دروازہ کھولو۔

[ایک چوکیدار اندر سے آتا ہے]

چوکیدار۔ ابے تو کون ہے؟

رحمت۔ میں رحمت ہوں۔ دروازہ کھولو۔

چوکیدار۔ کون رحمت؟ کیا چاہتے ہو تم۔

رحمت۔ [غصے میں] میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔

چوکیدار۔ ابے تو کون لاٹ کا سالا ہے۔ دروازہ نہیں کھل سکتا۔

رحمت۔ [دروازے کو بہت بری طرح کھڑکھڑاتا ہے۔ دروازہ کھول دو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھول دو ورنہ بہت برا ہوگا۔

چوکیدار۔ میں کہتا ہوں دروازہ نہیں کھلے گا۔ سیدھی طرح چلے جاؤ۔ دروازہ کھڑکھڑاؤ مت۔

[رحمت دیوانہ وار دروازے پر زور آزمائی کرتا ہے]

رحمت۔ ایک مجنونانہ وحشت کے عالم میں] میں اسے توڑ ڈالوں گا۔

چوکیدار۔ تجھ پہ شامت آئی ہے تیری ابے۔ ابھی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

[آگے پیچھے تین اور چوکیدار آتے ہیں]

بوڑھا چوکیدار۔ کیا بات ہے؟ کون ہے یہ؟

پہلا چوکیدار۔ نہیں معلوم کون ہے۔ معلوم ہوتا ہے کمبخت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

پٹھان چوکیدار۔ [چلاکر] او تم سگ کیا کرتا ہے۔

[رحمت دروازے سے زور آزمائی کرتے کرتے تھک گیا ہے]

رحمت۔ بھیا دروازہ کھول دو۔ مجھے اندر آنے دو۔

دوسرا چوکیدار۔ ارے یہ تو ہمارے ہی مل میں کام کرتا ہے۔

رحمت۔ ہاں ہاں میں رحمت ہوں۔ ہیڈ مستری۔

بوڑھا چوکیدار۔ تو تم اتنی رات گئے۔ یہاں سیٹھ کے بنگلے پہ کیوں آئے ہو؟

رحمت۔ میں نہیں بتاؤں گا۔ دروازہ تو کھولو۔

بوڑھا چوکیدار۔ اتنی رات گئے دروازہ کھولنے کا حکم نہیں ہے۔ جاؤ تم صبح آنا۔

[رحمت یکلخت پھر سے دروازے کو بڑے جھٹکے دیتا ہے]

رحمت۔ دروازہ کھولو کمبختو۔ ورنہ کسی کا خون ہو جائیگا۔

پٹھان چوکیدار۔ [غصے میں آکر] خو بچہ خوک تم اندر آکر کیا کریگا۔ ٹھہرو ہم دروازہ کھولتا ہے۔

[پٹھان آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ رحمت لپک کر اندر گھستے ہی بنگلے کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر پٹھان چوکیدار اسے پکڑ لیتا ہے]

پٹھان چوکیدار۔ او تو تم کدھر جاتا ہے۔ بولو ہم سے بات کرو۔

رحمت۔ [زور کرکے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے] مجھے جانے دو۔ مجھے اندر جانے دو۔

[ایک اور چوکیدار بھی بڑھ کر اسے پکڑتا ہے]

رحمت۔ [زور کرتے ہوئے] مجھے جانے دو۔ بیگاں کہاں ہے۔ مجھے جانے دو۔

پہلا چوکیدار۔ (قہقہہ مار کر ہنستا ہے) ارے یہ بیگاں کو ڈھونڈنے آیا ہے۔ ہو ہو ہو ہو بھیا تو کیوں فکر کرتا ہے بیگاں بڑے آرام سے سیٹھ کے پلنگ پر سو رہی ہوگی۔ ہو ہو ہو۔

[رحمت مڑ کر اسے دیکھتا ہے۔ اور یکلخت ایک ہاتھ چھڑا کر زور سے ایک گھونسہ اس کے منہ پر مارتا ہے۔ پٹھان چوکیدار اپنی لاٹھی تان کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ دوسرے چوکیدار بھی لاٹھیاں اٹھا کر اس پر پل پڑتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں رحمت زمین پر بے ہوش پڑا ہوتا ہے۔]

چھٹا ایکٹ

منظر۔ رحیما کا گھر۔ ۔۔ بچے سب سوئے ہوئے ہیں رو جاگ رہی ہے۔ مگر بے چین سی معلوم ہوتی ہے۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ یکایک دروازے کے قریب قدموں کی چاپ اور آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بہت سے مزدور رحمت کو اٹھائے ہوئے اندر آتے ہیں۔ فیضو اور رحیما بھی ساتھ ہیں

[رحمت خون میں لتھڑا ہوا اور بے ہوش ہے]

ربو۔ [رحمت کو خون میں تر بتر دیکھ کر بد حواس ہو جاتی ہے] ہائے اللہ یہ کیا ہوا [سینہ پیٹنے لگتی ہے]

رحیما۔ ہوش میں آؤ ربو۔ یہ رونے یا واویلا مچانے کا وقت نہیں ہے [مزدوروں سے] لاؤ بھئی۔ اسے یہاں لٹا دو۔

ایک مزدور۔ یہاں دروازے کے قریب بستر بچھا دو یہاں ہوا آئے گی۔

دوسرا مزدور۔ ہاں ہاں یہاں ہوا میں لٹانا چاہیے۔

[ربو جلدی سے بستر گھسیٹ کر دروازے کے قریب لے آتی ہے]

دوسرا مزدور۔ بس اب ٹھیک ہے۔ یہاں لٹا دو۔

تیسرا مزدور۔ ذرا آہستہ سے بھئی۔ کہیں چوٹ نہ آ جائے۔

چوتھا مزدور۔ ہاں آہستہ آہستہ

[اسے لٹا دیتے ہیں]

پانچواں مزدور۔ بھابی ذرا پنکھا دو۔

[ربو جھپٹ کر پنکھا دیتی ہے]

دوسرا مزدور۔ بھئی ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہوا آنے دو۔

پانچواں مزدور۔ ٹھہرو میں پنکھے سے ہوا دیتا ہوں۔

[مزدور زور سے پنکھا جھلتا ہے]

رحیما۔ ربو ذرا جلدی سے پانی اور کوئی کپڑا دو۔

ربو۔ مگر یہ بات ....

رحیما۔ یہ سوال و جواب بعد میں ہوتا رہے گا۔ پانی لاؤ پہلے۔

[ربو پانی اور کپڑا لا کر دیتی ہے۔ رحیما کپڑا بھگو کر رحمت کا منہ صاف کرتا ہے۔ پانچواں مزدور برابر پنکھا کر رہا ہے۔]

چھٹا مزدور۔ بھیا کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔

فیضو۔ ہاں ڈاکٹر کو فوراً بلانا چاہیے۔

دوسرا مزدور۔ مگر اتنی رات گئے کون ڈاکٹر آئے گا۔

پہلا مزدور۔ یہ ہسپتال کا ڈاکٹر۔

دوسرا مزدور۔ ارے وہ تو شیطان ہے خبیث۔ پیسے کا کتا۔

[رحمت کو آہستہ آہستہ ہوش آ چلا ہے]

فیضو۔ بھیا اسے ہوش آ رہا ہے۔

ربو۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر۔

رحیما۔ بھئی ذرا خاموش رہو۔ اتنا شور نہ کرو۔

[سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ رحمت آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر سب کو دیکھتا ہے۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے]

رحیما۔ [پیار بھرے لہجے میں] رحمت ...... بیٹے۔

رحمت۔ [نحیف آواز میں آنکھیں بند کئے ہوئے] بھیا

رحیما۔ [اس کے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہے] اب کیسی ہے طبیعت۔

دوسرا مزدور۔ ہاں بھیا کیسی ہے طبیعت اب؟

رحمت۔ [آنکھیں کھول کر سب کو دیکھتا ہے] اچھا ہوں۔

فیضو۔ [آگے بڑھ کر] بھیا رحمت

رحمت۔ [اسے دیکھتا ہے] فیضو [پھر سے آنکھیں بند کر لیتا ہے]

دوسرا مزدور۔ اب اسے آرام کرنے دو بھیا۔

چھٹا مزدور۔ ہاں بھئی اسے آرام کی ضرورت ہے۔

رحیما۔ اچھا بھائیو میں نے تمہیں بڑی تکلیف دی۔ تم لوگ بھی اب جاؤ آرام کرو۔ بہت رات ہو گئی۔ صبح کام پر بھی جانا ہو گا۔

چوتھا مزدور۔ ارے بھیا تکلیف کس بات کی۔ تم ہمارے لئے کیا کم تکلیفیں برداشت کرتے ہو۔

چھٹا۔ بھگوان کی سوگند۔ ہم تو ابھی اس مل والے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ بھیا تم ایک بار حکم دے دو۔

رحیما۔ نہیں بھائی جانے دو

دوسرا مزدور۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ رحمت اتنی رات گئے وہاں گیا کیوں؟

رحیما۔ اب ذرا اس کی طبیعت اچھی ہو تو میں پوچھوں گا۔

پہلا مزدور۔ ہاں بھئی ابھی تو اس کا جی اچھا نہیں۔

دوسرا۔ اچھا اب چلو۔ انہیں بھی آرام کرنے دو۔

چھٹا مزدور۔ ہاں اب چلنا چاہیے۔

[سب مزدور چلے جاتے ہیں۔ صرف فیضو رہ جاتا ہے]

فیضو۔ رحیم بھیا۔ اب میں بھی جاتا ہوں۔

ربو۔ جاتے ہو فیضو۔

فیضو۔ ہاں بھابی بہت رات ہو گئی۔ اب آپ لوگ بھی آرام کریں

ربو۔ اچھا ـــــ بچہ کیسا ہے اب۔

فیضو۔ اب تو ذرا اللہ کی مہربانی ہے۔

[جانے لگتا ہے۔ رحمت آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر نحیف آواز میں اسے بلاتا ہے]

رحمت۔ فیضو

فیضو۔ [پلٹ کر رحمت کو دیکھتا ہے] رحمت [اس کے قریب آجاتا ہے] تم نے مجھے بلایا۔

رحمت۔ [خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑی دیر اسے دیکھتا ہے] مجھے معاف کر دو فیضو

فیضو۔ [آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں] میں نے معاف کیا بھیا۔ میرے خدا نے معاف کیا

[رحمت پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ فیضو تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری ہے رحیما بیڑی سلگاتا ہے]

رحمت۔ [پھر آنکھیں کھول دیتا ہے] بھیا

رحیما۔ [آگے بڑھ کر اس پر جھک جاتا ہے] رحمت میرا بیٹا۔

رحمت۔ [یک بیک رو پڑتا ہے] بھیا

رحیما۔ نہ رو میرے بیٹے نہ رو۔ اپنے دل کو مضبوط کر۔ ہماری زندگی یونہی شکستوں اور ذلتوں ہی سے لپٹی رہتی ہے۔ اس پر سے دکھ کے کالے بادلوں کی گھٹائیں کبھی نہیں ہٹیں۔ تم نہ گھبراؤ رحمت۔ تم نے اس بھیانک اور اندھی طاقت سے پہلی ٹکر کھائی ہے۔ اپنے دل کو مضبوط کرو میرے بچے۔ تمہارے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔

رحمت۔ لیکن بھیا تمہیں . . . .

رحیما۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔

ربو۔ کیا معلوم ہو گیا ہے۔ آخر بات کیا ہوئی ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ کسی سے جھگڑا ہو گیا۔

رحیما۔ ذرا صبر سے کام لو ربو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔

رحمت۔ بھابی ذرا پانی دو۔

[ربو جلدی سے گھڑے سے پانی لاتی ہے۔ رحمت پانی پی کر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا ہے۔ ربو بچوں کے قریب بیٹھ جاتی ہے]

رحمت۔ بھیا۔

رحیما۔ کیا بات ہے رحمت۔

رحمت۔ بھیا تم سچ کہتے تھے۔ اب تمہاری باتیں میری سمجھ میں آتی ہیں۔ جب تک ہماری زندگی کا نظام خود غرضی کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔ انسانیت کبھی سکھی نہیں ہو سکتی۔ ہم کبھی سکھی نہیں رہیں گے۔ ہم جنگلیوں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہم ہوس اور لالچ میں اندھے ہو کر انسانیت کو بھول جاتے ہیں۔

رحیما۔ [اسے تھپکتے ہوئے] اس وقت تم اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔ سو جانے کی کوشش کرو۔

رحمت۔ [تھوڑی دیر خاموش رہتا ہے۔ مگر پھر بولنے لگتا ہے] آج میں نے دیکھا کہ چند غریب مفلس کیوں اپنی غریب بہن کو بے عزتی کی طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ وہ کیوں اپنے ایک غریب بھائی پر جنگلی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اُف یہ پیٹ کا جہنم جو ہمارے دلوں کو جلا کر سیاہ کر دیتا ہے۔

رحیما۔ چپ ہو جاؤ رحمت اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔

رحمت۔ مجھے بولنے دو بھیا۔ جب تک ہم اس سیم و زر کے آہنی قلعے کو مسمار نہ کر دیں گے۔ جب تک ہم ان شیطانی ہاتھوں کو جن کی گرفت ہمیں مارے ڈال رہی ہے۔ توڑ نہ ڈالیں گے ہماری مصیبتیں کبھی دور نہ ہوں گی [نیم مجنونانہ جوش سے بولتا ہے] ہمیں تخریب کا علمبردار بننا پڑیگا ایک ایسی تخریب جس میں شاید آگ کے شعلے بھڑکیں گے۔ اور خون کی ندیاں بہیں گی۔ تباہی بربادی چیخ پکار۔ مگر ہم ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ ایک نئی دنیا۔ . . . .

[نڈھال ہو کر بستر پر گر جاتا ہے۔ رحیما گھبرا کر اسے پنکھا جھلتا ہے]

پردہ گرتا ہے

پی۔ این۔ بھنوٹ نادر
(ای۔ اے۔ سی)

اعترافِ شکست

کل اک انجمن میں جو شامل ہوا میں
مسرت کی دنیا میں داخل ہوا میں

وہاں کا سہانا سماں اور ہی تھا ۔ زمیں اور تھی آسماں اور ہی تھا

در و بام پر تھا مسرت کا عالم ۔ بشاشت، لطافت، نزاکت کا عالم

نسیم بہاری چلی آ رہی تھی
خزاں گرد بن کر اُڑی جا رہی تھی

وہ جوشِ مسرت عیاں ہو رہا تھا
کہ پیرِ فلک بھی جواں ہو رہا تھا

ہر اک شے مجسم لطافت تھی گویا
وہ دُنیا نہ تھی ایک جنت تھی گویا

جہاں حسن و الفت میں آمیزشیں تھیں
جہاں آنکھوں آنکھوں میں آویزشیں تھیں

جہاں بے زبانی زباں بن رہی تھی،
جہاں ہر نظر داستاں بن رہی تھی

جہاں حسن کی سحر کاری بلا تھی
ادا میں حیا تھی حیا میں ادا تھی

تھا اک طرف سے یہ آواز اُٹھی
وہ دیکھو نگاہِ فسوں ساز اُٹھی

حزیں دل سے فریادِ جانکاہ اُٹھی
اُدھر آنکھ اٹھی اِدھر آہ اُٹھی

وہ رُوئے حسیں تھا کہ روئے قمر تھا
فروغِ جبیں تھا کہ نورِ سحر تھا

وہ سینے میں دو سرکشانِ جوانی
بڑھی اور بھی جن سے شانِ جوانی

جنھیں دیکھ کر آرزوئیں جواں ہوں
نگاہوں سے دل کی اُمنگیں عیاں ہوں

ہوا ختم آخر سماں وہ خوشی کا
کہ وہ کھیل تھا بس گھڑی دو گھڑی کا

میں ناچار و مجبور محفل سے اُٹھا
جگر تھام کر سخت مشکل سے اُٹھا

غمِ عشق کی چوٹ کھا کر چلا میں
غرورِ جوانی لُٹا کر چلا میں

ہوا ثبت دل پر نشانِ محبت
خموشی بنی داستانِ محبت

نظر میں ہے اب تک فسانہ کسی کا
کہ اس ساز میں ہے ترانہ کسی کا

دو شعر

نہ مجھکو امید ہے کسی سے نہ مجھکو اندیشہ ہے کسی کا
مزے میں اپنی گزر رہی ہے بھلا ہو اس بے تعلقی کا
روش زمانے کی دیکھتا ہوں خوشی مجھے ہو تو کس طرح ہو
وہی مرے رونے کا محل ہے محل جو اوروں کی ہے ہنسی کا

(رضا علی وحشت)

کسی کو اس کی خبر نہیں ہے گدائے گوشہ نشیں ہے کیسا
نہ جس کو پروائے شہریاری نہ فکر تاج و شہنشہی کا
نسیم آسا ہے بیقراری مثال شبنم ہے اشکباری
یہ رنگ کس نے بدل دیا ہے جہاں سے گزرا ہے زندگی کا

([illegible])

دہشت تیند و گھوش

ترجمہ:- محمد یونس احمر

وہ تین!!!

وہ تین کنگال رُوحیں تھیں — شوہر، بیوی اور ایک نحیف دلزار بچی! انہیں دیکھ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے ہاتھ پاؤں، آنکھیں، چہرہ سب انسان ہی کی طرح تھے لیکن وہ انسان نہ تھے۔ ان کی دھنسی دھنسی آنکھوں میں آگ کی سُرخ چنگاریوں کی مانند بھوک کی خوفناک پرچھائیں سمٹی ہوتی تھیں اور ان کا بدن ہڈیوں کا بس ڈھانچہ رہ گیا تھا!

چند دنوں سے گاؤں میں غریبوں محتاجوں اور مفلسوں کے لئے ایک لنگر خانہ کھولا گیا تھا۔ وہیں تین چار دنوں سے یہ مفلوک الحال رُوحیں اپنی بھوک مٹا رہی تھیں۔ لیکن ستم بالائے ستم گاؤں میں غلہ کی نایابی کی وجہ سے یہ لنگر خانہ بھی بند کر دیا گیا — اور وہ تین فلک زدہ جانیں ناامیدی اور یاس کی تاریکیوں میں ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ گاؤں چھوٹ گیا اور شہر آباد ہوتے۔

لیکن شہر کی سڑکیں گاؤں کی گلیاں جیسی تو نہ تھیں۔ گاؤں کی گلیاں مٹی کی ہوتی ہیں۔ مٹی کے دل ہوتے ہیں۔ وہیں ان کو اسکون ... وہیں ان کے پچکے گالوں، دھنسی آنکھوں اور سوکھے بدن میں ترنگیں پھوٹتی ہیں، اور یہ شہر کی عالیشان سڑکیں — یہاں دل کہاں؟ یہی سبب تھا کہ یہاں بھی ان کی بھوک مٹ نہ سکی۔ اور مجبور و بے بس ہو کر شہر کی سُنہری و روپہلی راہوں میں یکے بعد دیگرے مرنے کیلئے تیار ہو گئے۔

لاج اور شرم کے مارے بھیک کے لئے ہاتھ بھی نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ صرف فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر راہگیر کو دیکھتے رہتے، اور بے قصور معصوم بچی پہروں چیختی چلاتی رہتی۔

تین دن بعد —!

بیوی عالمِ مجبوری میں گویا ہوئی — "اب کیا ہو گا؟"

شوہر نے بچی کے افسردہ چہرہ کو دیکھ کر جواب دیا — "کیا کروں بتاؤ۔ آہ!"

"چلو بھیک مانگیں اب۔"

"اچھا۔"

فٹ پاتھ پر جہاں امراد و شرفا کی آمد و رفت جاری رہتی تھی وہیں یہ تینوں بھیک مانگنے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔

"بھگوان بھلا کریگا بابا۔ ایک مٹھی کھانا" اور عورت صرف اپنی بچی کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دل و دماغ میں یہ تصویریں پھر جاتی تھیں — اس بچی کی طرح اور بھی دو کیڑے تھے اسکی گود میں ایک چھ سال کا بچہ اور ایک سات سال کی بچی۔ بچی ملیریا کی نذر ہو گئی اور بچہ —؟

"بابا اس بچی کو دیکھو — دیا ہو گی، دیا — دیا!" کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی پھر سوچنے لگی سات آٹھ دن کی پچھلی باتیں۔ شہر آتے وقت ایک گاؤں کے باغیچہ سے لگی ہوئی دیوار کے قریب وہ، اس کا شوہر، بچہ اور لڑکی محوِ خواب تھے۔ نصف شب گذرنے بھی نہ پائی تھی کہ یکایک گیدڑ کی آواز سُن کر وہ جاگ اُٹھی۔ اس نے دیکھا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور کچھ دور کے فاصلہ پر کوئی جانور کھانے میں مصروف ہے۔ ہڈی توڑنے کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ صبح ہوئی تو اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ بچہ غائب تھا اور اس کی نگاہوں میں وہی گیدڑ گھوم رہا تھا۔ اسے سوچ سوچ کر وہ رونے لگی — مگر آہ!

"بابا اب تاب نہیں، ایک مٹھی چاول، صرف ایک ... ایک" شوہر گڑگڑاتا جا رہا تھا — یکایک عورت کانپتے کانپتے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم اُٹھ کیوں گئیں تم —؟"

"چلو..."

"کہاں...؟"

"چلو اس بچی کی خاطر۔ اس کو بچانے کے لئے صرف اسے"

"اچھا" اور وہ بھی تیار ہو گیا — "لیکن تم رو کیوں رہی ہو؟"

"معلوم نہیں۔"

آسمان بھی ان ماتم گسار آنکھوں کے آنسو دیکھ کر برس پڑنا چاہتا تھا —!

اکھے بابو گھر کے برآمدہ میں بیٹھ کر اخبار دیکھ رہے تھے اور چائے بھی پیتے جا رہے تھے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے تین بھیانک شکلیں نمودار ہوئیں۔

"کیا ہے؟ جاؤ، چلے جاؤ ۔۔۔ ہوں!"

شوہر کہنے لگا ۔۔۔ "میری بچی مر رہی ہے اسے ایک مٹھی بھات دے دیجئے بابو۔ عنایت ۔ ۔ ۔"

وہ اپنی منت مکمل بھی نہیں کر سکا تھا کہ اکھے بابو گرج کر بولے ۔۔ "مر رہی ہے تو میں کیا کروں۔ میرے یہاں کوئی لنگر خانہ تو نہیں ہے۔ یا میں نے ٹھیکہ لیا ہے تم لوگوں کا۔ نکل جاؤ یہاں سے، فوراً، ابھی" یہ سنکر وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

لیکن بیوی مجبور ہو کر بالکل نحیف آواز میں بولی ۔۔ "بابا ۔ ۔ ۔"

اس لفظ 'بابا' میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ اکھے بابو یکایک چونک اٹھے۔

"بابا ہمیں اپنے محل میں نوکر رکھ لیجئے۔ دیا ہو گا۔" اکھے بابو نے اسکی طرف غور سے دیکھا اور جیسے ان کے تاریک دل کے اندر روشنیاں جاگ اٹھیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کو آواز دی ۔۔ "سنو جی، ادھر آؤ تو ۔ ۔ ۔"

ہیما یہ سنکر دوڑی آئی اور پوچھنے لگی ۔۔ "کیا ہے؟"

"تم نے کہا تھا نا کہ ان دنوں تمہاری صحت اچھی نہیں رہتی ہے اور پھر اس کے علاوہ مکان میں کوئی نوکر چاکر بھی تو نہیں کہ تمہارا ہاتھ بٹا لے۔ اکیلی کب تک گرہستی چلاؤ گی۔"

ہیما نے متعجب ہو کر سوال کیا ۔۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"نوکر کیوں نہیں رکھ لیتی ہو ۔۔۔ تھوڑی بہت تنخواہ دیدی جائیگی ۔۔۔ یہ یہاں نوکری چاہتی ہے رکھ لو نا اسے،" (اس کی طرف مخاطب ہو کر) "تو منظور ہے تجھے۔ کام کریگی یہاں؟"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اس نے فوراً منظوری دیدی۔

اور جب ہیما نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگی ۔۔۔ "ارے ہے! اسے نوکر رکھوں گی ۔۔۔ یہ تین! پتھر پڑے تمہاری عقل پر۔ اتنا کھانا کہاں سے لاؤں گی۔"

عورت کمزور آواز میں گویا ہوئی ۔۔ "ہم دونوں میں سے ایک ہی کو نوکر رکھ لیجئے۔ جان تو بچ جائیگی ماں۔"

"ہوں! اور باقی کیا کریں گے؟"

"کہیں نوکری مل ہی جائے گی ماں ۔۔۔ اور یہ بچی ۔ ۔ ۔"

"میں سب جانتی ہوں ۔ ۔ ۔ بچی ۔ ۔ ۔ اس کو ہے کیا۔ اسے بھوک نہیں لگے گی۔ ایک کو تو نوکر رکھ لوں گی اور دو نوکری ملنے تک کیا کریں گے بولو؟"

"ماں جی! ایک کا کھانا ہم سب تقسیم کر لیں گے۔"

اکھے بابو نے کہا ۔۔ "رکھ لو انہیں رتو کی ماں۔ باہر والے کمرے میں پڑے رہیں گے۔ تو ایسا ہو گا۔"

"خاموش رہو جی تم۔ آخر ٹھہرے نا جاہل اور میں سمجھوں لیکن ان میں سے کس کو رکھوں؟"

"مرد کو رکھ لو۔"

یہ سن کر ہیما کا چہرہ تمتما اٹھا ۔۔ "کتنا بدشکل ہے وہ! سیاہ رنگ جیسے کالا کوئلہ۔ نہ دیکھنے کا نہ سننے کا۔ سر پر لمبے لمبے بال ۔۔ "نام کیا ہے رے تیرا؟" ہیما نے اس سے سوال کیا۔

"جی مانک ہے میرا نام" اس کی آواز میں بھاری پن تھا۔

"ایں مانک! ہے تو کالا کلوٹا اور نام مانک۔ ہوں۔"

ہیما نے پھر عورت کی طرف نگاہ ڈالی۔ اسکی عمر پچیس کے لگ بھگ تھی۔ اگرچہ بھوک اور فاقہ کشی کی وجہ سے چہرہ بالکل اداس اور پژمردہ ہو گیا تھا۔ تاہم ستم رسیدہ حسن کی جھلکیاں صاف ظاہر تھیں۔

"تیرا نام کیا ہے سنوں تو؟"

"پاربتی!"

"تجھے نوکر رکھ سکتی ہوں۔ لیکن فی الحال تنخواہ کچھ نہیں ملیگی، صرف ایک فرد کی خوراک پر۔ آجکل چالیس روپے سے کم خرچ نہیں ہوتے ہیں۔ جانتی ہو۔"

پاربتی نے دھیمی آواز میں جواب دیا "جی ہاں!" اور اسی وقت اس کے تخیل میں پچھلی باتیں رینگنے لگیں ۔۔۔ ان کے یہاں چاول کی فراوانی رہتی تھی۔ چھوٹا سا باغ تھا۔ باغ میں قسم قسم کی سبزیاں اگا کرتی تھیں۔ پھل لگتے تھے۔ بچوں کی نگوں میں ترکاریں چلا کرتی تھیں۔ شوہر کے لبوں پر خوشی کا گیت پھوٹتا تھا۔ ساس سسر مطمئن تھے۔ آہ! اس چھوٹے سے سنسار میں کیا کچھ نہیں تھا۔

اکھے بابو کا خاندان ماشاءاللہ کچھ چھوٹا تھا

لڑکے تھے۔ ان لڑکوں کی بیویاں۔ پھر لڑکی کا نواسا، نواسی، بیوی۔ غرض کل دس افراد تھے اور ان کی خدمات کے لئے بدبخت پاربتی مقرر تھی۔

ایک دن مانک نوکری کی تلاش میں باہر گیا تھا اور پاربتی چھوٹی بچی کو گود میں لیکر گھر کا کام انجام دے رہی تھی کہ ہیما کی کرخت آواز سنائی دی "بچی کو گود سے اتار کر کام کیا کرو۔ اس طرح کام کرنے کا کوئی طریقہ ہے بھلا"۔ اور پاربتی چھوٹی بچی کو زمین پہ بٹھا کر اسے چمکارنے لگی — "بیٹھو میری رانی! ابھی آتی ہوں"۔

چھوٹی بچی ماں کے پیار ولار کو کیا سمجھے۔ وہ زمین سے اٹھ کر رونے لگی۔ "چپ رہو میری گڑیا۔ مت روؤ۔ ابھی آئی۔ بس ذرا"۔ لیکن وہ سنتی رہی — روتی ہی رہی۔ اسی اثنا میں ہیما کا سات سالہ بچہ راجہ ہاتھ میں ناشپاتی لیکر اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "خبردار رونے لگا جو اور روئے گی"۔ اس پر بچی اور گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ ہیما سے جب برداشت نہ ہو سکا وہ گرج کر بولی — "باپ رے باپ۔ کیا گلا پایا ہے۔ شیر جیسا۔ سن پاربتی اگر یہی انداز رہا تو اپنی راہ دیکھ"۔ لیکن پاربتی چپ چاپ کام کرتی رہی، اور بچی بھی تھک ہار کر مٹی کے اوپر سو گئی۔

شاید اس وقت ڈھائی کا عمل ہوگا کہ پاربتی لوہے کی ایک بدنما تھالی میں چند مٹھی بھات لیکر باہر کے شکستہ اور اندھیرے کمرہ میں داخل ہوئی۔ مانک بھی بچی کو گود میں لیکر تھپ تھپا رہا تھا! اس نے پاربتی کو آتے دیکھ کر کہا "کھانا لائی ہو۔ کھانا۔ اسے ٹونی اٹھ، دیکھ تیری ماں کیا لائی ہے — دیکھ!"

اور بچی کو نیند سے جگا کر پاربتی کھلانے لگی — "لو کھاؤ میری لاڈلی۔ منہ سوکھ کر کیسا ہو گیا ہے۔ اف بھگوان!"

"یہ کیا؟" پیچھے سے ہیما کڑک کر بولی۔

"کیا —؟"

"گھر سے سارا کھانا لا کر ان دونوں کو کھلا رہی ہے کیوں؟ کئی دفعہ تجھے خبردار کیا ہے۔ اب آخری مرتبہ سن لے میں تیرے یہ کرتوت برداشت نہیں کر سکتی۔ تین افراد کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے میں نے۔ سمجھی"۔

"مگر ماں! یہ تو میرے حصے کا کھانا ہے۔ میں زیادہ کیسے لے سکتی ہوں۔ آپ جتنا دیدیں گی اسی پر اکتفا کروں گی"۔

"خیر! یہ باتیں یاد رکھنا" اور ہیما بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔

"لو کھاؤ" پاربتی شوہر سے مخاطب ہوئی۔

"اور تم؟"

"میں بھی کھاؤں گی۔ پہلے تم کھا لو"۔

مانک نے جونہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پاربتی بھی مانک یہ حال دیکھ کر اداس ہو گئی۔

"نہیں اب تم کھاؤ پاربتی"۔

"نہیں تم —"

"مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ سر چکرا رہا ہے"۔ یہ سنکر پاربتی رونے لگی۔

"تم رو رہی ہو پاربتی — میری رانی"۔

"پھر کیا کروں بتاؤ؟" — اور یکایک اس کے دل و دماغ میں بیتی باتیں جاگ اٹھیں۔ کھیت کے دھان کا میٹھا چاول، مچھلی کا سالن، خالص دودھ۔ ان چیزوں کی کمی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے یہاں دیگر لوگ بھی اپنا پیٹ بھر لیا کرتے تھے۔ لیکن آج خود —!

تین دن بعد!

سامنے والی عمارت میں مانک کی نوکری ہو گئی۔ گھر کا مالک ریٹائرڈ جج تھا۔ لیکن مانک کی نوکری سے پاربتی کو کیا فائدہ ہوا۔ اس کی محنت اور پریشانیاں تو دوگنی ہو گئیں۔ مانک اکثر بچی کو لیکر بہلایا پھسلایا کرتا تھا اور اب —؟ بچی کی نگہبانی بھی پاربتی ہی کو کرنا ہوگی۔ بچی بھی ایسی تھی کہ گود سے الگ ہونا نہیں چاہتی۔ زمین سے اسے ڈر لگتا تھا۔

اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ پاربتی بچی کو زمین ہی پہ بٹھا کر کام کاج کیا کرتی۔ بچی کو ہر وقت روتے چلاتے دیکھ کر ایک دن ہیما نے کہا "اگر میری بچی اس طرح کی ہوتی فوراً اس کا گلا دبا دیتی۔ باپ رے باپ کیا گلا ہے اس کا"۔

اکھے بابو بھی جھلا کر کہنے لگے — "دماغ خراب کر دیا ہے اس لڑکی نے۔ اف!" پاربتی ان باتوں کو سن کر ٹونی کو مارنے لگی اور زور زور کر بول اٹھی "مر بھی نہیں جاتی بدنصیب"۔ لیکن ہیما کو پھر بھی چین نہ ہوا اور کہنے لگی — "دیکھو نا غصہ سے اور مار رہی ہے، اگر تیرا یہی مزاج رہا تو فوراً دفعہ ہو جا۔ تیری ضرورت نہیں ہے ہمیں"۔

اور پاربتی ٹونی کو لیکر دوسری طرف چلی گئی۔ وہاں اسے

چمکارتے لگی اور روتے روتے بولی — "بیٹی میں کیا کروں، تیرا کتنا مار ہے۔ میں نے تجھے میری لاڈلی، میری پیاری!" لیکن بچی سوتی ہی بھوک کی آگ کیا مار سے بجھ سکتی ہے؟"

ہیما کی بیٹی ہوتے ہی اپنے بچوں کے لئے حلوا تیار کیا تھا۔ پاربتی وہاں جاکر کھڑی ہوگئی۔

"بہو رانی؟"

"کیا چاہئے تجھے؟"

"تھوڑا بہت میری اس بچی کو بھی دید یجئے بہو رانی!"

"کیا —!"

"کچھ حلوا۔"

"اچھا! یہ منہ اور مسور کی دال۔ بڑی آئی حلوا مانگنے والی۔"

"کیا ہوا بہو؟" ہیما نے دور ہی سے پوچھا۔

"دیکھئے نا، پاربتی اپنی لاڈلی کے لئے حلوا مانگتی ہے!"

"اتنا چھوٹا پن اچھا نہیں ہے پاربتی۔ بار بار کہتی ہوں مجھے تیری ضرورت نہیں۔ دور کیوں نہیں ہو جاتی یہاں سے۔"

"ہاں ماں!"

ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد مکان میں ہیما کا چھوٹا بھائی انوپم باہر سے آیا — چھبیس ستائیس سال کی عمر ہوگی۔ بڑا گبرو جوان اور شوقین مزاج تھا۔ جہم کے کسی ملک میں اس کی ملازمت تھی وہاں سے تبادلہ ہو کر یہاں آیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت انوپم کی نظر مانک پر پڑی۔

"تو کون ہے رے؟"

"جی میں پاربتی کا سوامی ہوں۔"

انوپم نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ اس درمیان میں مانک کے چہرہ میں کچھ تبدیلی ہو چکی تھی۔ ایک رنگ جاتا تھا دوسرا رنگ آتا تھا — وہ سوچ رہا تھا — گاؤں میں اسکی کتنی عزت تھی۔ اپنے سے بڑوں کی محفلوں میں بھی وہ شریک ہوتا تھا۔ لوگ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے — اور اب جب سے جج صاحب کے یہاں مانک کو ملازمت ملی تھی اس کا چہرہ پہلے سے بہت زیادہ شگفتہ ہو گیا تھا۔ پیسے بھی جیب میں بجنے لگے تھے۔

"اوہ تو پاربتی کا شوہر ہے — تیرا ہی نام مانک ہے نا؟"

"جی حضور —!"

"اچھا ذرا پاؤں دبا دے!"

"بہت اچھا حضور۔"

مانک کے چہرہ میں غم و الم کی سیاہ بدلیاں سی چھا گئیں مگر پھر بھی وہ حکم بجالانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف پاربتی گھر کے کام کاج میں کھوئی تھی۔ ہیما نے پاربتی کو دیکھ کر انوپم سے کہا — "دیکھتے ہو جی تینوں کھا کھا کر کتنے بدل گئے ہیں۔ جسم میں گوشت بھر گیا ہے۔ آنکھیں کیسی نکل آئی ہیں۔" لیکن اکھلے بابو نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے دن انوپم اپنے کمرہ میں لیٹے لیٹے پاربتی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور کبھی کبھی دیکھتے دیکھتے آنکھ بھی مار دیتا۔ اور جب پاربتی کی آنکھیں انوپم سے لڑ گئیں وہ خوشی سے پھول گیا اور لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن پاربتی نے نظریں نیچے کر لیں اور اس کا جسم لرزنے لگا۔

ان دنوں مانک جج صاحب کے ہاں بڑا مصروف رہتا تھا۔ اب اس کے چہرہ میں کافی سے زیادہ شگفتگی بھی آگئی تھی۔ کبھی کبھی نہ جانے کہاں سے کھانے کی عمدہ عمدہ چیزیں گھر لاتا اور اب کئی دنوں سے بیڑی کی جگہ اس نے سگریٹ بھی پینا شروع کر دیا تھا۔

پاربتی نے ایک دن مانک سے دریافت کیا۔ "تمہیں ایسی اچھی چیزیں کہاں سے مل جاتی ہیں؟"

"کیوں —؟ نہیں جانتیں جج صاحب مجھ پر بڑے مہربان ہیں، وہی دیتے ہیں مجھے۔"

لیکن پاربتی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایک دن سچ مچ مانک کی چوری پکڑی گئی اور جج صاحب نے اسے گھر سے نکال دیا۔

گھر آ کر مانک اندھیرے میں سو رہا تھا کہ پاربتی بچی کو لے کر اندر داخل ہوئی۔ مانک کو دیکھ کر وہ چونک پڑی اور بولی — "کیا ہوا ہے جی؟" حالانکہ پاربتی کو ہیما کی زبانی سب کچھ معلوم ہو گیا تھا کیونکہ چوری کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔

مانک نے کہا — "کیا بتاؤں پاربتی جج صاحب نے آج بہت مارا ہے مجھے۔ اُف!"

اور پاربتی روتے ہوئے بولی — "سچ کہنا چوری بھی کی ہے تم نے۔ اتنے گر گئے تم۔ چھی!"

مانک نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد مخاطب ہوا۔
"کچھ کھانے کو دو پاربتی۔ بھوک لگی ہے!"
"یہ لو کھاؤ" اور اس نے بچی کو زمین پر لٹا کر مانک کے آگے کھانا رکھ دیا اور سوچنے لگی — اس کا گاؤں کتنا خوبصورت تھا ندی میں وہ اور اس کی سہیلیاں اشنان کرنے جاتی تھیں۔ ان کی کمر میں گاگر ہوتی تھی اور ہونٹوں پر رس بھرا گیت۔ گاؤں کے آسمان میں تاروں کی مست خرامیاں کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں لیکن اب — ایک خواب — خواب پریشاں!"

آج آتو پم جھوٹ موٹ بیماری کا بہانہ کر کے آفس نہیں گیا تھا ہاتھ میں کتاب لئے اپنے بستر پر لیٹا لیٹا پاربتی کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ اتفاق سے اس وقت پاربتی اکھلے بابو کے نواسے کو سلانے کے لئے پاس ہی کے کمرہ میں داخل ہوئی اور آتو پم نے اسے پکارا۔
"پاربتی ذرا ادھر تو آنا!"
"جی بابو جی!"
"ادھر آ — اس طرف" اور پاربتی دروازہ کے قریب کھڑی ہو گئی آتو پم ہنسنے لگا۔ "ارے شرماتی کیوں ہے مجھ سے۔ اندر تو آ—"
یہ کہکر اس نے پاربتی کا بازو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔
"بابو جی ایسا کرتے ہیں آپ۔ چھی"۔ پاربتی نے معصومانہ نگاہوں سے آتو پم کو دیکھا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی اور باہر آکر وہ بری طرح کانپنے لگی۔ پھر زبان سے ایکا ایکی نکل گیا۔ "ہے بھگوان!"
اس وقت مانک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ پاربتی کھانا لا کر کمرہ میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ بہت دیر بعد وہ آیا۔ اس کی شکل سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور بالکل پاگل جیسا معلوم ہو رہا تھا۔
"آج بھوک نہیں لگی ہے کیا"۔ پاربتی نے اس سے پوچھا۔
"کیا کھاؤں خاک، تجھے کیا خبر پاربتی۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے!"

یہ سنکر پاربتی ششدر سی ہو گئی اور بولی۔ "تمہاری زبان سے ایسی باتیں۔ یہ کیا سن رہی ہوں سوامی۔ اگر پھر ایسا کہا تو میں اپنا گلا آپ دبا دوں گی"۔ اور وہ یہ کہکر دیوار سے سر توڑنے لگی۔ مانک نے اسے روکا لیکن بچی کی نیند ٹوٹ گئی اور اسکی چیخ سے قیامت جاگ اٹھی۔

بچی کی اس چیخ سے آتو پم کو بڑا غصہ آیا اور کہنے لگا — "سالے مانک کا بچہ چپ کیوں نہیں کراتا لڑکی کو" مانک کو بھی طیش آگیا اس نے جواب دیا۔ "چپ تو کرا رہا ہوں۔ مار ڈالوں کیا اسے بچی ہی تو ٹھہری—"
آتو پم تڑپ کر کمرہ سے آیا اور بولا۔ "راسکل! زبان کھینچ نہ لوں تو میرا نام آتو پم نہیں۔ ایسی بدکلامی!" یہ کہکر اس نے مانک کے گال پر کئی طمانچے رسید کر دیئے — اور یکایک مانک کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

رات کے وقت کام کاج سے فارغ ہو کر پاربتی بچی کو سلا رہی تھی کہ یکایک عقب سے اس کی پشت پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک اٹھی اور بولی — "کون؟"
"خاموش! میں ہوں آتو پم!"
"بھاگ جایئے فوراً — ورنہ میں چیخوں گی"۔
ٹھیک اسی وقت چند گز کے فاصلہ پر مانک ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی مفلس آنکھوں میں خون اتر آیا اور فوراً ایک ہی چھلانگ میں آتو پم کے قریب آگیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ لیکن کمزور اور نحیف مانک کب تک آتو پم کا مقابلہ کرتا۔ اس کی سانس پھول گئی اور زمین پر لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔ اس شور و غل میں ہیما کی آنکھ کھل گئی اور آکر پوچھنے لگی — "کیا ہوا آتو پم؟"
اور آتو پم نے جیب سے منی بیگ نکالتے ہوئے کہا۔ "سالا چرا رہا تھا اسے!"

مانک نے بڑی مشکل سے ہانپتے ہانپتے جواب دیا — "بالکل جھوٹ، سفید جھوٹ — یہ پاربتی کو بے عزت کرنا چاہتے تھے۔ بولو، بولو میں جھوٹا ہوں یا تم—"
"چپ رہتا ہے یا نہیں۔ اسٹوپڈ، چور، بدمعاش، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ چوری بھی کی اور میرے بھائی کو بدنام کرنا چاہتا ہے — دور ہو جا میرے مکان سے۔ ایسے چھچھورے اور غنڈے کو میں نہیں رکھ سکتی"۔ ہیما نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

"ماں!" پاربتی کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔
"میں کچھ نہیں سنوں گی نکل جاؤ ابھی۔ گٹ آؤٹ!"
پاربتی نے ایک یاس آگیں نگاہ سبھوں پر دوڑائی لیکن کسی کو رحم نہ آیا۔ پھر اس نے بچی کو گود میں لیکر اور سوامی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اچھا ہم جاتے ہیں!" اور یہ کہکر تینوں باہر نکل آئے۔

شہر کی خوبصورت سڑکیں — مگر پتھروں کی!

"بھگوان کے نام پر ایک پیسہ بابو — دیا ہوگی بابو..."
لیکن دیا کس چیز کا نام ہے — کون جانتا ہے اسے؟
— بچی رونے لگی اور مانک اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا —
"چپا ڈالی مجھے — اب مجھ سے جیا نہیں جاتا —"

راہیں — گلیاں — سڑکیں — بھیک — کٹھور انسان
— وہی ایک تاریخ — کیا یہ تاریخ کبھی بدل نہیں سکتی —!
نوکری کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں — لیکن کسی نے ملازم نہیں رکھا۔ گھوروں پر بھوک مٹانے جاتے مگر گھورے بھی خالی نظر آتے تھے۔

"اب سکت باقی نہیں رہی پاربتی" مانک نے پارک کی دیوار سے لگ کر ہانپتے کانپتے کہا۔

"بابو صاحب دیا ہوگی — ایک مٹھی بھات — صرف ایک! بھگوان کے نام پر!"
لیکن دیس تو کنگال ہو چکا ہے — چاول کہاں —!
دن گزرتا گیا —!
مانک اب بالکل بیدم ہو چکا تھا۔ اس نے پاربتی سے مایوسانہ لہجے میں کہا — پاربتی چاول کے چار دانے ہی کہیں سے لا دو —"

پاربتی سر پہ ہاتھ رکھے کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی —
"اچھا کھانا لاتی ہوں"
"کھانا — لیکن پاربتی — میں تو مر رہا ہوں — پاربتی!"
"چپ رہو تھوڑی دیر تک — میں ابھی لیکر آتی — ٹونی کو پکڑے رہنا — فوراً آتی ہوں"
"اچھا!"
لکڑی جیسے سوکھے ہوئے پتلے ہاتھوں سے مانک نے ٹونی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس وقت اس کی دھنسی اور ڈبڈبائی آنکھوں میں تاریکیاں ناچ رہی تھیں اور وہ — آخری ہچکی کا منتظر تھا۔

پاربتی اندھیرے میں جا رہی تھی — تنہا!

"بابو جی — بابو!" یہ آواز سنکر اوتم متحیر سا ہو گیا۔
"کون —؟"
"میں پاربتی — !"
"پاربتی —! کیا چاہتی ہو تم؟" [illegible]
"دروازہ تو کھولو۔ آج جو مانگو گے مل جائیگا" اس کی آواز میں درد شامل تھا۔

ادھر ادھر دیکھ کر اوتم نے دروازہ کھول لیا۔ پاربتی اندر داخل ہوئی اور اوتم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "سہمی سی معلوم ہو رہی ہو کیوں —؟"
اور پاربتی نے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا "پسند نہیں آتی میں آپ کو —؟"
"نہیں، نہیں — یہ بات نہیں ہے" اور اوتم کی پیشانی میں پسینہ کے بیشمار قطرے جھلملانے لگے۔

اندھیرا — تاریکی!!

اب پاربتی واپس آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند لقمے کھانا اور کچھ سالن تھا۔
"اجی سنتے ہو —؟" پاربتی نے مانک کو آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔
"لے ٹونی کے ابا — میں آ گئی کھانا لیکر" اور اسکے ہاتھ سے کھانا گر گیا۔ مانک مر چکا تھا۔ پاربتی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں — ٹونی کدھر —؟
"ٹونی، ٹونی — میری بچی کہاں ہو تم؟" پگلی کی طرح پاربتی پارک کے اندر گھس کر آوازیں دینے لگی اور تلاش کرتے کرتے بالکل نڈھال ہو گئی — لیکن لاحاصل۔

جن لوگوں پر اسکی نظر پڑتی وہ پوچھ بیٹھتی — "بھائی ادھر تم نے ایک بچی کو دیکھا ہے۔ ننھی سی بچی — ننھی سی جسم پر سرخ کپڑا ہے۔ بولو — بولو — کیا؟ نہیں! کوئی نہیں جانتا" تھک ہار کر بیٹھی اپنی شکلوں سے پاربتی پھر اپنے سوامی کے قریب آئی اور مردہ چہرہ کو ما سا دیکھتی رہی۔ مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں — کھانا جو زمین پر گر گیا تھا — اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ لیکن پاربتی کے آنسو نکل نہیں رہے تھے، وہ پتھر بن گئی تھی — شہر کی سڑک جیسا پتھر! اس نے گیس کی روشنی میں اپنی مٹھی کھولی — ایک روپیہ کا نوٹ اور چند آنے نظر آئے۔ پیسے روشنی میں چمکنے لگے اور ان چمک میں اوتم کی تصویر نمایاں ہو گئی۔

ان پیسوں کو دیکھ کر یکایک پاربتی کے دونوں ہونٹ کپکپا اٹھے گویا پھر سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی — لیکن پھر اسکی مٹھی بند ہو گئی — وہ مٹھی کی طرف دیکھ کر کچھ سوچ رہی تھی — مستقبل کی باتیں — گذشتہ دنوں کو یاد کرکے اب وہ کیا کہتی؟

[illegible]جبیں

تم

محبت کے نغمے سناتے رہو تم!
جوانی کو بے خود بناتے رہو تم
مجھے دردِ الفت سے نفرت نہیں ہے
میں ہنستا رہوں گا رُلاتے رہو تم
تمھیں اپنے تیرِ نظر کی قسم ہے
مری زندگی گُدگُداتے رہو تم
مری روح بھی رقص کرنے لگے گی
ذرا دیر تک گنگناتے رہو تم
یہی داد ہے میری بربادیوں کی
مرے حال پر مسکراتے رہو تم
میں خاموشیِ ہستی سے اُکتا نہ جاؤں
کہ وقتاً فوقتاً ستاتے رہو تم
تجلی تمھاری پرکھتا رہوں میں
مرا ذوقِ دید آزماتے رہو تم
نہ ہو رنگ جس میں وہ تصویر کیسی
میں حرفِ غلط ہوں مٹاتے رہو تم
مری زندگی کی کلی کھل رہی ہے
خدا کی قسم مسکراتے رہو تم
زمانے کو جبریل اب بھی ہے حاجت
مشیت کا پیغام لاتے رہو تم

ساحر بھوپالی

تیرے بغیر

زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
ہر نفس تلوار ہے تیرے بغیر
روتے روتے مسکرا دینا کبھی
اب یہی آزار ہے تیرے بغیر
چہرہ بے رونق ہے اور آنکھیں اُداس
اب یہ حالِ زار ہے تیرے بغیر
یہ شفق آلودہ منظر یہ گھٹا
کس قدر خونبار ہے تیرے بغیر
دل ہے افسردہ تو میری شاعری
کتنی غم آثار ہے تیرے بغیر
رحم کر ساحرؔ کے حالِ زار پر
زندگی بیکار ہے تیرے بغیر

شوکت جونپوری

وہ کہاں ذوقِ عشق سے آگاہ
کہ جسے بندگی نہیں آتی
تو کبھی صبح و شام آتا تھا
اب تری یاد بھی نہیں آتی
مجھ سے آتی تھی پہلے شرم اُن کو
اب تو غیروں سے بھی نہیں آتی
چشمۂ کوثر اور حضرتِ شیخ!
کہ جنھیں مے کشی نہیں آتی

انصار حسین نیوتنوی

ریڈیائی ڈراما

سمندر کا دوسرا کنارا

(رقص و سرود کی محفل پیش کی جائے۔ سازوں کے ساتھ گھنگرو باندھے ہوئے تا پیچ سنائی دے۔ طبلہ کی تھاپ اور سرود پر لوگ تعریف کرتے سنائی دیں) دیر بعد دروازہ پر دستک ہو۔

...زیادہ بھی تو کچھ ہے کون صاحب تشریف لائے ہیں۔
...میں آ سکتا ہوں؟ (آواز دور سے آتی ہے)
...سلیم صاحب ہیں؟
...(آواز پر زور دے کر) آیئے تشریف لایئے۔
...(سازوں سے) بس اب بند کرو۔
(رقص کی محفل خاموش ہو جاتی ہے) سلیم اندر داخل ہو جاتا ہے۔

...آداب۔

...(مسکرا کر) تشریف رکھئے۔ آداب آپ آنے میں اس قدر تکلف کیوں ہوتا ہے۔ پہلے دستک۔ پھر اجازت۔ زخشندہ آپ کا گھر ہے جب چاہے آ جایئے۔ ... ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ (پکار کر) گلاب چاء ... بنا کر لاؤ۔

(آوازیں) ...(مسکراتا ہوا) سر ہی اپنے شباب پر ہے۔

...(ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے) جی ہاں زخشندہ کہاں ہیں؟

...صبح سے غائب ہے۔ کوئی آٹھ بجے کشور موٹر لیکر آ گئے تھے۔ صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ نئی گاڑی لے کر آئے تھے کہتے تھے ہندوستان میں یہ ماڈل بہت کم ہیں۔ اس پر ...کو گھمانے لے گئے ہیں۔

...(رنجیدہ خاطر ہو کر) آپ نے بے حد آزادی دے رکھی ہے۔ برا نہ مانئے گا۔

...(مسکرا کر) صحیح ہے مگر دیکھئے ہماری زندگی آزادی کی ہے، یہ ایک طوائف کا گھر ہے۔ یہاں کی ہر چیز آزاد ہے۔ آپ دستک دیتے ہیں۔ اجازت مانگتے ہیں حالانکہ یہ باتیں ہمارے آداب میں شامل نہیں۔ برا نہ مانئے گا میں آپ کو بے باک بنانا چاہتی ہوں۔

سلیم۔ (مسکرا کر) شکریہ۔ مگر زخشندہ کی زندگی آپ کی زندگی سے مختلف ہے۔ اس کا اقرار تو آپ کو بھی ہے کہ اسے آپ کے پیشہ سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ اس نے کالج میں تعلیم پائی۔ یہ آداب زخشندہ کے گھر کے لئے ہیں جن کو میں برت رہا ہوں۔

نرگس۔ اور اس حقیقت کو بھلا کر کہ وہ ایک طوائف کی لڑکی ہے۔ اس کے خمیر اس کی فطرت میں بناوٹ شامل ہے۔ (مسکرا کر) یہی وجہ ہے کہ آپ اسے اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔ آپ سے کشور سے پہلے سے جانتے ہیں کشور کو آپ ہی یہاں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ... کس قدر ... کی غلطی ... زخشندہ کو اپنی طرف راغب کر لیا۔

سلیم۔ بہر حال آپ تو خلوص اور سچائی کی قائل ہیں۔ آپ کو اعتراف ہے کہ بناوٹ اور جھوٹ ایک طوائف کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ پھر کشور کی کامیابی اور زخشندہ کی اس کی طرف رغبت کسی اچھے نتیجہ پر ختم نہ ہوگی؟

(گلاب چاء کے برتنوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

گلاب۔ یہ چاء حاضر ہے۔

نرگس۔ اچھا رکھ کر چلی جاؤ۔

(برتن میز پر رکھنے کے بعد گلاب چلی جاتی ہے)

سلیم۔ (تلخی سے پیالی میں چاء انڈیلتے ہوئے) ہاں تو میری بات کا جواب دیجئے۔

نرگس۔ (مسکرا کر) میں نے اس معاملہ پر اکثر سنجیدگی سے

خودکشی. ہو سکتا ہے یہ رخشندہ کی تعلیم کا نتیجہ ہو۔ اتنی تعلیم یافتہ لڑکی ہمارے خاندان میں اور کوئی نہیں گزری (چاء کا گھونٹ لے کر) مجھے اپنی ایک غلطی کا اعتراف ہے۔ عشق کا پہلا سبق جس نزاکت کے ساتھ ہمارے یہاں شروع زندگی میں رنگینوں کو دیا جاتا ہے وہ ہم اسے نہ دے سکے اور اس کے دل و دماغ پر دوسری چیزوں نے قبضہ کر لیا۔ ان تمام باتوں میں نواب صاحب مرحوم کا ہاتھ تھا۔ وہ رخشندہ کو میرے ساتھ مجلس میں بیٹھنے کی اجازت تک نہ دیتے تھے ان کے انتقال کے بعد میں نے اسے راہ راست پر لانا چاہا مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ کالج میں تعلیم پا رہی تھی اس کی زندگی میں پہلے آپ بعد میں کشور داخل ہو چکے تھے۔ مگر مجھے یہ اطمینان ہے کہ رخشندہ نے یہ کھیل اور لڑکیوں کی طرح ہر تزنی کے ساتھ نہیں کھیلا کشور میں اور اس میں شادی کا عہد و پیمان ہو چکا ہے اور اس ہفتے کے اندر دونوں میاں بیوی ہو جائیں گے ــــ مگر کیا آپ کو ان باتوں کا علم نہ ہوگا؟ کشور کی کونسی بات آپ سے پوشیدہ ہے؟

سلیم۔ نہیں مجھے اس بات کا کوئی علم نہ تھا۔ کشور سے میری بہت کم ملاقات ہوتی ہے۔ اور جب کبھی ملتے تو رخشندہ کا ذکر عمداً کرتے معلوم نہیں کیوں اس موضوع پر ہم میں سے کوئی گفت گو کرنا نہیں چاہتا۔

نرگس۔ (کچھ سمجھ کر) ہوں۔ مگر یہ موقعہ انہیں آپ ہی نے تو دیا مجھے یاد ہے رخشندہ آپ سے کافی خوش تھی، آپ کی آواز سن کر سوتے سے جاگ جانا اس کا معمول تھا۔ پھر یہ انقلاب کس طرح آ گیا؟

سلیم۔ (ہنس کر) یہ آپ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ رخشندہ کی نفرت سمجھنے کا دعوےٰ کرنے کے بعد آپ یہ سوال مجھ سے کر رہی ہیں؟

نرگس۔ جی ہاں آپ سے۔ اس لئے کہ آپ یقین نہیں کرتے نہ میں رخشندہ کو آپ دونوں سے زیادہ تیسر سمجھتی ہوں یہ میں نے پیدا کیا ہے۔

سلیم۔ مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے۔

نرگس۔ مگر ـ بتا دیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب بھی آپ غلط نہ سمجھ رہے ہوں۔

سلیم۔ کشور مجھ سے زیادہ مالدار ہے۔ آج جس موٹر پر وہ رخشندہ کو گھمانے لے گیا ہے۔ وہ ـ روز ایک نئی موٹر اس طرح کی خرید سکتا ہے کیوں یہی بات ہے نا۔

نرگس۔ آپ بھی کچھ کم مالدار ہیں (بات کو ٹالتے ہوئے) آپ کی چاء ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری پیالی بناؤں۔

سلیم۔ پہلے میری بات کا جواب دیجئے۔

نرگس۔ ایسی باتوں کا جواب زبان سے زیادہ واقعات دیا کرتے ہیں۔ میں آپ کے لئے چاء کی دوسری پیالی بناتی ہوں؟

(کیتلی سے چاء انڈیلنے کی آواز)

کتنا اچھا ہوتا اگر کشور میں مستقل مزاجی بھی ہوتی۔ ان میں لڑکپن زیادہ ہے۔ اور ابھی عمر ہی کیا ہے ان کی۔ سن کیساتھ سنجیدگی بھی بڑھے گی میں دونوں کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ رشتہ مجھے منظور ہے (فکرمند ہو کر) کافی دیر ہو گئی آج دونوں کو۔ اب آتے ہی ہوں گے۔

سلیم۔ کئی مرتبہ ان کے گھر گیا مگر ہمیشہ لاپتہ ملے۔ پھر سوچا کہ آپ ہی کے یہاں چل کر ملا جائے۔

نرگس۔ تو کہئیے ہمارے گھر آنے کی زحمت محض کشور کی تلاش ہے؟ حالانکہ آپ نے آتے ہی رخشندہ کو پوچھا تھا۔

سلیم۔ رخشندہ ہی سے کشور کا پتہ چلتا نہ؟ ان سے یہ شکایت کرنا تھی کہ ہم دونوں ایک مدت کے بعد بچھڑ گئے۔

نرگس۔ ایسا تو ہوتا ہے۔ دور رہتے ہوئے دوستوں کے درمیان کوئی عورت ضرور کھڑی ملے گی۔

سلیم۔ مگر میں اسے اپنی کمزوری سمجھتا ہوں۔ یہ ہمارے کیریکٹر پر ایک بدنما داغ ہے۔ یہی خیال کشور اور رخشندہ کے متعلق نہیں ہوگا۔ مگر ان کا کوئی سلوک ہم کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ کشور کی ہر خوشی میری عین خوشی ہے۔

(کشور داخل ہوتا ہے)

نرگس۔ بڑی عمر ہے تمہاری کشور۔ اس وقت بیٹھے ہوئے ہم لوگ تمہاری باتیں کر رہے تھے۔ رخشندہ کہاں ہے۔

کشور۔ (مضمحل آواز میں) آ رہی ہے۔

نرگس۔ کیوں اس قدر مضمحل کیوں ہو۔ کیا ہوا؟ سلیم صاحب سے ملنا نہیں تم سے شکایت ہے؟

کشور۔ (سلیم کی طرف مخاطب ہو کر) اوہو۔ معاف کرنا میں بھول گیا

اچھے ہو۔ کہاں رہے اتنے دنوں (گھبرا کر) سلیم۔ سلیم۔ اچھا کچھ نہیں۔

نرگس۔ کیوں کیا ہوا آخر اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ چاء پیو گے، ابھی کافی گرم ہے۔

(رخشندہ داخل ہوتی ہے)

رخشندہ۔ ہیلو مسٹر سلیم۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے .... امی مجھے غسل لینا ہے باتھ روم ٹھیک کرائیے۔

نرگس۔ (پکارتی ہے) گلاب کشور اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ آپس میں لڑائی ہوگئی کیا؟

رخشندہ۔ (ہنس کر) لڑائی؛ لڑنے کے بعد آدمی روٹھتا ہے گھبراتا نہیں۔ انہیں دراصل وہم ہوگیا ہے آج موٹر سے ایک سخت حادثہ ہوگیا۔

نرگس۔ حادثہ؟

سلیم۔ حادثہ؛ خیریت تو ہے۔

رخشندہ۔ بالکل۔ ۵۰، ۶۰ میل کی رفتار سے موٹر چل رہا تھا۔ ایک بوڑھا زد میں آگیا۔

نرگس۔ (تعجب سے گھبرا کر) پھر کیا ہوا مر گیا ہوگا؟

رخشندہ۔ ظاہر ہے سڑک پر ہی پھڑک کر مر گیا۔ آخر کیا جانا اس کی موت اسی بہانہ سے تھی۔

کشور۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مر گیا۔

سلیم۔ کیوں تم نے گاڑی روک کر اس کی حالت نہیں دیکھی۔

کشور۔ نہیں میں گھبرا گیا۔ رخشندہ کی رائے ہوئی کہ یہاں رکنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس بوڑھے کی موت ضرور واقع ہوگئی ہوگی

سلیم۔ موٹر روک لینا ضروری تھا تاکہ حادثہ کی شہادت مل سکتی حادثہ کے وقت کوئی شخص سڑک پر موجود نہ تھا۔؟

کشور۔ کوئی نہیں۔

رخشندہ۔ یہی تو اچھا ہوا ورنہ ہم لوگ آفت میں پھنس جاتے۔

نرگس۔ سلیم صاحب کیا رائے ہے آپ کی اس معاملہ میں۔ اب پولیس کو اطلاع کردی جائے۔

سلیم۔ اب تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ویسے ہی اس بوڑھے کی لاش اب پولیس کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اور وہ لوگ تفتیش کر رہے ہونگے۔

کشور۔ (گھبرا کر) سلیم

سلیم۔ گھبراؤ نہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

نرگس۔ ذرا ریڈیو بند کرو۔ رخشندہ۔ ریڈیو بند کرو۔ یہ واقعہ بہت ہی اہم ہے۔

رخشندہ۔ (بات کو ٹالتے ہوئے) اونہہ۔ کیا کچھ

ریڈیو اناؤنسر۔ ادب عرض۔ یہ بمبئی ہے۔ اس وقت پروگرام سننے سے پہلے ایک اعلان سنئے۔ آج شام کو بندر باغ کے قریب میو روڈ پر شہر کے مشہور تاجر عبدالحلیم کی لاش پائی گئی۔ موت کسی حادثہ سے واقع ہوئی ہے۔ جو شخص واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ملزم کا پتہ لگائے گا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملے گا۔

سلیم۔ دیکھا آپ نے وہ بوڑھا عبدالحلیم تاجر تھا۔

نرگس۔ عبدالحلیم۔ تب ہی تو ایک لاکھ روپیہ انعام مقرر کیا گیا (گھبرا کر) مگر اب کیا کیا جائے۔

رخشندہ۔ کچھ بھی نہیں کسے معلوم ہے کہ عبدالحلیم کی موت کا باعث تم لوگ ہوئے۔

نرگس۔ اور اگر پتہ چل گیا؟

کشور۔ (گھبرا کر) سلیم۔

سلیم۔ تو پھر کسی وکیل سے مشورہ کر لیا جائے نا۔

رخشندہ۔ غرض یہ کہ بات اپنے منہ سے نکال کر دوسروں کے کانوں میں پہنچانی ضرور چاہیئے۔

سلیم۔ مگر قانونی صلاح ضروری ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھا پہلو ہمیں دکھا سکے۔

کشور۔ مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ مگر اس بات پر کافی غور کر لو۔ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔

سلیم۔ (نرگس سے) آپ کی کیا رائے ہے؟

نرگس۔ میری خود عقل گم ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ رخشندہ بھی ٹھیک کہتی ہے کہ منہ سے نکلنے کے بعد بات پرائی ہو جائے گی۔

سلیم۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ کسی وکیل کو بلا کر اس سے مشورہ لینا چاہیئے۔

کشور۔ فیاض کو بلانا چاہیئے۔ اپنا دوست ہے بیرسٹر بھی اچھا ہے۔

سلیم۔ میں ٹیلیفون کرتا ہوں۔

گھنٹی

[illegible] - فیاض [illegible] رخشندہ کے یہاں - [illegible]
موجود ہیں۔ کشور بھی جا رہے ہیں تمہیں - آ رہے ہو [illegible]
[illegible] ہیں۔ سب ہیں۔ تم فوراً آؤ۔ پانچ منٹ کے اندر
اچھا - اچھا - شکریہ۔

گھنٹی

[illegible] فیاض - اب ذرا اطمینان سے بیٹھ کر اس معاملہ پر
غور کیا جائے گا۔

رخشندہ - میں غسل کرنے کے بعد اپنے کمرہ میں رہونگی، اگر
ضرورت پڑے تو بلا لیجیئے گا۔ کشور صاحب آپ غسل لیں گے؟
طبیعت بحال ہو جائے گی۔

کشور - ذرا ٹھہر کر - فیاض آ رہے ہیں - تم بھی بیٹھو۔ غسل ذرا دیر
کے بعد لینا۔

رخشندہ - سارے بدن پر گرد ہی گرد ہے (پکارتی ہے)
گلاب -

(وقفہ - قدموں کی چاپ)

گلاب - جی -

رخشندہ - غسل تیار ہے۔

گلاب - جی سرکار (قدموں کی چاپ - گلاب باہر نکل آتی ہے)

کشور - تم شاید اس واقعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ رہی ہو -

رخشندہ - کوئی ایسا زیادہ سنگین واقعہ تو ہے نہیں۔

نرگس - رخشندہ تم جا کر غسل لو - تمہاری موجودگی سے کوئی فائدہ
نہیں۔

(رخشندہ جاتی ہے)

(تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہتی ہے)

نرگس ایک ٹھنڈی سانس لیکر کرسی سے اٹھتی ہے۔

سلیم - آپ کہاں جا رہی ہیں؟

نرگس - باورچی خانہ تک - ذرا دیکھوں وہاں کیا ہو رہا ہے -

قدموں کی آواز - فیاض کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔

فیاض - ہیلو (کشور کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کہو کیا
بات ہے - بڑی مصیبت ہے کہ ہم پیشہ ور لوگوں کو بھی
تم اپنی طرح بیکار سمجھتے ہو - تمہارا انداز بتلا رہا ہے کہ کوئی خاص
کام نہ تھا - بجز تفریح کے۔

[illegible]

فیاض - کیا بات ہے - [illegible]
نہیں - ان کی صورت سوال ہے - [illegible]

سلیم - نہیں سنجیدہ رہنے کی کوشش کرو - ان کے [illegible]
حادثہ ہو گیا - عبدالحلیم کی موت واقع ہو گئی -

فیاض - حادثہ؟ کیسے - کس طرح؟

سلیم - قریب شام کے وقت گھومنے نکلا ہوگا - ہم اور رخشندہ
موٹر پر ۵۰ - ۶۰ میل کی رفتار سے جا رہے تھے - [illegible]
کیسے زد میں آ گیا۔

فیاض - پولیس کو اطلاع دے دی گئی؟

سلیم - نہیں -

فیاض - کیوں حادثہ کے طور پر اس بات کی اطلاع کر دی جاتی

سلیم - حادثہ کیسے ثابت ہوتا -

فیاض - سڑک پر مجمع لگ گیا ہوگا - بے شمار شہادتیں مل سکتی تھیں -

سلیم - مگر جس وقت یہ واقعہ پیش آیا سڑک پر کوئی اور نہ تھا -

فیاض - لاش کہاں ہے؟

سلیم - اس سڑک پر - ان دونوں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا
نہ اس واقعہ کی کسی کو اطلاع دی - ابھی [illegible] کے علاوہ
ہمارے کہ ملزم کو گرفتار کرنے کا انعام ایک [illegible]

فیاض - تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟

سلیم - کوئی قانونی بات بتاؤ -

فیاض - مجھے افسوس ہے وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیئے تھا
اور حادثہ کے لئے شہادتیں مہیا کرنی ضروری تھیں [illegible]
ہے کہ ایسا عمداً کیا گیا ہو - دوسرے کسی انسان کو مار کر
اگر ارادہ میں بدنیتی نہ تھی چھوڑ کر بھاگنا انسانی فطرت کی
توہین ہے - کشور - کیا یہ سچ [illegible]

کشور - ہاں - مگر اب تو سب کچھ ہو چکا۔

سلیم - اب پولیس کو اطلاع کر دی جائے؟

فیاض - نہیں۔

سلیم - عذر گناہ بدتر از گناہ۔

فیاض - یہ کسی قانون کی کتاب میں [illegible]

کشور - پھر کوئی اور ترکیب بتاؤ [illegible]

[illegible]

[illegible] کی بات نہیں ہو رہی ہے

سلیم۔ تمہارا دوبارہ جی چاہتا ہے فیاض۔ خود کو کشور کی جگہ رکھ کر سوچو۔

فیاض۔ مجھے گھر جا کر سوچنے دو۔ میں ضرور کوئی صورت نکالوں گا۔ اچھا اب اجازت دو۔ گھر میں مہمانوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔

سلیم۔ تو پولیس کو اطلاع تو دی جا سکتی ہے۔

فیاض۔ ہرگز نہیں۔ میں صبح ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ گڈ بائی

(قدموں کی آواز۔ فیاض چلا جاتا ہے)

(تھوڑی دیر تک فضا میں مکمل سکوت رہتا ہے)

رخشندہ غسل خانہ سے گنگناتی ہوئی باہر نکلتی ہے (پکارتی ہے) گلاب!

گلاب۔ (دوڑ کر آتے ہوئے) سرکار۔ (قدموں کی آواز)

رخشندہ۔ دوسرا غسل تیار کر دو۔

گلاب۔ بہت بہتر۔ (گلاب چلی جاتی ہے)

رخشندہ۔ جا کر غسل کرو۔ اُف۔ دماغ کو سکون ملے گا۔ میں انتہائی فرحت محسوس کر رہی ہوں۔

کشور۔ سلیم تم بیٹھنا بھاگ مت جانا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔

(کشور چلا جاتا ہے۔ سلیم اور رخشندہ کمرہ میں اکیلے رہ جاتے ہیں)

سلیم۔ (رخشندہ کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے) سگریٹ پیو۔

رخشندہ۔ لائیے۔ یہ وہی کیس ہے جو تم نے مجھ سے چھینا تھا۔

سلیم۔ ہاں۔ زندگی میں صرف تمہاری اسی چیز پر تو قبضہ کر سکا۔

رخشندہ۔ آج ایک عرصہ کے بعد دکھائی پڑے ہو۔ کہاں تھے اتنے دنوں سے؟

سلیم۔ (دیا سلائی جلاتے ہوئے) کہاں کہاں؟ تم دونوں کی بڑھتی ہوئی محبت میں مخل ہونے کو دل نہیں چاہا۔

رخشندہ۔ مگر میں تمہیں اکثر یاد کیا کرتی تھی۔ کشور نے بھی کئی بار پوچھا تھا۔

سلیم۔ صرف یہ کہنے کے لیے ہی [illegible] ہے کہ تم دونوں شادی کرنے جا رہے ہو۔

رخشندہ۔ محبت کیوں نہ ہو گا۔ مگر دیکھو وقت سے [illegible] نظر آ رہے ہیں۔ تمہاری کیا رائے ہے سلیم؟

سلیم۔ (تعجب سے) کیسے واقعات؟

رخشندہ۔ یہی آج کا حادثہ۔ شاید فیاض صاحب ہی نے کو [illegible] اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

سلیم۔ نہیں۔ مگر اس حادثہ کا اثر تمہارے اوپر کچھ نہیں ہے؟

رخشندہ۔ اثر ضرور ہے مگر میں اس حادثہ کو اتنا سنگین نہیں [illegible] زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے سلیم؟

سلیم۔ زیادہ سے زیادہ پھانسی اور کم سے کم کچھ نہیں۔

رخشندہ۔ پھانسی۔ کیا کہہ رہے ہو سلیم۔

سلیم۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ حادثہ نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا کہ موت اتفاقیہ ہوئی۔

رخشندہ۔ کس قدر حسرتناک انجام ہے۔ ہماری شادی [illegible] ہو جاتی۔

سلیم۔ اور اب؟

رخشندہ۔ اب کیا۔ ان حالات میں امی کیوں تیار ہونے لگیں۔

سلیم۔ (سنجیدہ ہو کر) سمجھ گیا۔

رخشندہ۔ کیا۔ بعض اوقات تم بات کو غلط سمجھتے ہو۔

سلیم۔ نہیں میں سمجھ گیا۔ تمہیں کشور سے محبت نہ تھی۔

رخشندہ۔ (قہقہہ لگا کر) محبت نہ تھی۔ پھر کیا تھا۔ مجھے محبت تھی۔ مجھے کشور سے دیوانہ وار محبت تھی۔ [illegible] تو اسی محبت کے نشے میں یہ حادثہ پیش آ گیا ہم دونوں کی نظروں میں دنیا اس قدر رنگین تھی کہ کسی افتاد کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔ موٹر کی رفتار تیز کرتا رہا اور میں اس کی ہمت بندھاتی رہی اور آخر کار ۔۔۔۔۔۔۔۔

سلیم۔ پھر تمہیں پس و پیش کیوں ہو رہا ہے۔ جس وقت شادی کا عہد و پیمان ہوا تھا اس وقت تمہاری امی نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ میں یہ کچھ ماننے کو تیار نہیں۔ تم کو کشور سے محبت نہیں ہو سکتی۔

رخشندہ۔ محبت انسان کے واقعات و حالات سے بالکل [illegible] نہیں۔ اس سے نہیں۔ مجھ کو تم سے محبت نہ تھی۔ (اور کیا اب بھی ہے؟) مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کوئی انداز ایسا اختیار کیا ہو جس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہو۔

سلیم۔ کشور کے آنے سے پہلے تم بولا جھجک میں تو سمجھا [illegible]

یہ انقلاب کیسے آگیا۔ اگر تم واقعات اور حالات کا ساتھ دیتے ہو۔ کوئی صورت ایسی نکل آتی ہوگی۔

رخشندہ۔ تم نے رفتہ رفتہ آمد و رفت کم کر دی۔ کشور نے پینگ بڑھانا شروع کئے شادی بہرحال مجھے کرنا ہی تھا میں نے وعدہ کر لیا

سلیم۔ کشور کے حالات بہت نازک ہیں۔ تم شاید اس کا اندازہ نہ لگا سکو مگر میں سمجھتا ہوں میرے پاس دل ہے مجھے کشور سے ہمدردی ہے۔

رخشندہ۔ اور مجھے محبت ہے۔ میں اس محبت کو بیان کرنے کے لئے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتی۔ مگر یہ کوئی ایسا سنگین معاملہ نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ فیاض صاحب کچھ تو بتا ہی گئے ہونگے۔

سلیم۔ وہ کل فون پر بات کریں گے۔ وعدہ کر گئے ہیں کہ رات قانونی کتابیں الٹ پلٹ کر کوئی صورت نکالیں گے۔

رخشندہ۔ امی کو اطمینان ہوگیا؟

سلیم۔ وہ یہاں نہیں تھیں۔ تم انہیں جا کر اطمینان دلا آؤ۔

رخشندہ۔ پکارتی ہوئی جاتی ہے۔ امی۔ امی۔ امی۔ امی

(فیڈ آؤٹ)

کشور داخل ہوتا ہے۔

کشور۔ اکیلے بیٹھے ہو سلیم۔

سلیم۔ نہانے کے بعد تمہاری طبیعت کو کچھ فرحت ہوئی۔

کشور۔ کچھ دماغ ہلکا تو ضرور ہے مگر ابھی تک کوئی رائے نہیں قائم کر سکا۔ کیا کرنا چاہیئے۔ فیاض ابھی کچھ مطمئن نہیں ہیں

سلیم۔ خدا پر بھروسہ رکھیئے۔ مگر ان تمام باتوں کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں ہی تھیں یہاں [illegible] رخشندہ کی ملاقات کرائی تھی۔ تم نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے رخشندہ سے محبت ہے۔ میں اسے اپنی زندگی سمجھتا ہوں۔ یہ سب کچھ تم نے اچھا نہیں کیا

کشور۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے دل دکھانے کی سزا ہو۔ کل تک تو مجھے ان باتوں کا خیال نہ تھا مگر آج یہ سب کچھ شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔

سلیم۔ سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی ماں اپنے دو معصوم بچوں کو سمندر کے کنارے چھوڑ کر مر گئی۔ بچے آپس میں کھیلتے ہوئے پانی میں چلے گئے۔ ایک بچہ ڈوب کر مر گیا اور دوسرا بچہ اس کی لاش پر بیٹھکر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ اس محبت کے سمندر میں تم میری لاش پر بیٹھ کر دوسرے کنارے پر پہنچے۔ رخشندہ کو تم سے نہیں تمہارے واقعات اور حالات سے محبت ہوگئی۔ تم دونوں شادی کا عہد و پیمان کر بیٹھے۔ مگر......

کشور۔ میں حالات اور واقعات پھر بدلنے کی کوشش کرتا ہوں

رخشندہ۔ (کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے) کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے کشور۔ امی کو بالکل اطمینان ہے

کشور۔ ہاں کوئی سنگین معاملہ نہیں۔ (ٹیلی فون اٹھاتا ہے) ہیلو پولیس اسٹیشن ہاں پولیس۔

آواز تو سنائی دیتی ہے۔ الفاظ صاف سمجھ میں نہیں آتے۔

غزل

شارب لکھنوی

اب اس منزل میں اپنا کارواں معلوم ہوتا ہے جہاں ہر مہرباں، نامہرباں معلوم ہوتا ہے

رہِ الفت میں اک ایسی بھی منزل پیش آتی ہے جہاں دردِ جگر تسکین جاں معلوم ہوتا ہے

وہ کیا جانیں کہ کیا شے ہے جہاں میں لطف آزادی قفس ہی جن کو اپنا آشیاں معلوم ہوتا ہے

جہاں جاتے لرزتی ہیں شعاعیں چاند سورج کی اسی منزل میں وہ جلوہ کناں معلوم ہوتا ہے

حسن رضی

ادب اور اخلاق

اخلاقی نقطۂ نظر سے جب عریاں ادب کا محاسب کیا جاتا ہے تو نہ معلوم کیوں اس کے ایوان سے اخلاق سوز شرارے برسنے لگتے ہیں۔ پیشانیوں پر بل پڑجاتے ہیں، قدامت پرستی کا الزام چسپاں کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ صحیح الخیال لوگوں کی باتوں پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اپنی "قلم کاری" کا جائزہ لیں۔ اس کے برعکس ایک مخصوص الزامی جواب سے وہ تمام آوازوں کو دبانا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کیا قدما کے یہاں یہ عریانی، یہ فحاشی اور مذہب وخدا سے بغاوتی ادب نہیں پایا جاتا؟ ایسا الزامی جواب دے کر وہ اس امر کا اعتراف تو کرلیتے ہیں کہ ہمارے ادب میں بھی یہ رکیک عناصر موجود ہیں، لیکن ہم صرف اس نئے "رنگِ قدیم" کو ترک نہیں کرتے کہ ہمارے قدما ہی ہمارے لئے یہ سرمایہ ادب چھوڑ گئے ہیں۔ جس کی ڈگر پہ چلنا ہمارے لئے قطعاً ناگزیر ہے۔ اپنے بیان کی تائید میں وہ سعدی۔ شیخ علی حزیں۔ ملا جامی۔ عرفی۔ قاآنی۔ ملا جنید ذکائی ولی۔ سودا۔ میر۔ نظیر۔ غالب۔ انشا۔ داغ۔ امیر۔ امانت اور اقبال کے دواوین سے چھانٹ چھانٹ کر رکیک اور مبتذل اشعار پیش کرتے ہیں اور پھر بانگ دہل کہتے ہیں کہ ہمارے یہ سب بزرگ ایسا کہتے آئے ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں تو ہمارے ادب پر عریانی اور فحاشی کا الزام لگایا جارہا ہے۔ ہمارے خلاف سازشیں ہورہی ہیں مضامین لکھے جارہے ہیں۔ پلیٹ فارم سے تقریریں کی جارہی ہیں۔ زہر اگلا جارہا ہے۔ اس الزامی جواب سے قطع نظر ایک چیز ان کی طرف سے علمی اور سنجیدہ طریق سے پیش کی جاتی ہے جو سنجیدہ طبائع کو غور کرنے کا موقع دیتی ہے جس پر سنجیدگی سے غور وخوض کے بعد کوئی مفید پہلو سامنے آسکتا ہے اور جس پر بحث ونظر سے حقیقتہً ایک ادبی غلط فہمی کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ بعض ایسے ترقی پسند ادبا وشعرا اور ان کے ہمنوا نقاد جو فرائڈازم اور جنسیات کو کسی عنوان ادب سے خارج کرنا نہیں چاہتے اور جن کا ایمان ہے کہ اس عنصر کے اخراج سے اردو ادب میں حقیقی زندگی ختم ہوجائے گی) کہتے ہیں کہ اخلاق اضافی عوامل ہیں۔ ہر دور میں، ہر ملک میں، نظامِ اخلاق بدلتا رہا ہے۔ زمانہ اپنی سنتِ جاریہ کے تحت بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاق وکردار کے مفاہیم وتعینات کو ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہے گا۔ بالفاظ دیگر مغربی تصور تہذیب سے ہمارا جو کچھ بھی اخلاقی نقطۂ نظر ہوگیا ہے وہ اپنی جگہ ناقابل اعتراض ہے۔ آیئے علمی نقطۂ نگاہ سے اخلاق کا تجزیہ کریں۔ اس کے مفاہیم وتعینات کو سمجھیں اور خالص فلسفۂ اخلاق کی کسوٹی پر اس استدلال کو پرکھیں، اس قول میں کتنی صداقت ہے؟ کتنا وزن ہے؟

اخلاق کا تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادب اور اخلاق کے روابط کو سمجھ لیا جائے۔ تاکہ اخلاق کی بحث میں کسی قسم کا خلجان محسوس نہ ہو۔ اب ہمارے سامنے خود بخود ادب کے دونوں پہلو آرہے ہیں۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی"۔ اول الذکر شق کے تحت کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ جو اس نقطۂ نظر سے میدان ادب میں اشہب قلم دوڑاتے ہیں۔ وہ اپنی باگ کی ڈھیل میں آزاد ہیں۔ انھیں کسی کسوٹی پہ نہیں پرکھا جاسکتا، ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جاسکتی۔ وہ یہی کہیں گے ہم سب کچھ محض ادب کے لئے کررہے ہیں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اخلاق تباہ ہورہے ہیں یا انسانی زندگی کرب واضطراب سے کروٹیں لے رہی ہے۔ نظام تمدن خراب ہورہا ہے۔ ملک وقوم تباہی وبربادی کے گڑھے میں گری جارہی ہے۔ ہاں "ادب برائے زندگی" کا مسئلہ غور وفکر کا محتاج ہے۔ جب ہم ادب میں زندگی کے عوامل وعواطف کو مقدم رکھیں گے تو لازمی طور پر ہمیں تعمیری ادب پیش کرنا ہوگا۔ جو تخریبی جراثیم سے قطعاً مبرا ہوگا۔ ہمیں زندگی کے حسن وقبح کے پہلو سامنے لانے

ہوں گے تمدن و معاشرت، مذہب و سیاست، اخلاق و کردار اور تعمیر و ارتقا کے تمام مقتضیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اسی نقطۂ نظر سے بیان کی طہارت، خیالات کی پاکیزگی، ہیئت کی جدت اور مواد کی بصیرت میں زندگی کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ ایسا ہی ادب زندگی کے قریب تر ہوگا۔ ایسے ہی ادب کو "ادب برائے زندگی" کہہ سکیں گے۔ ایسا ادب جس میں انسان کی کراہتی ہوئی زندگی، اس کے سڑتے ہوئے پھوڑوں پر مرہم تسکین نہ ہوگا اسے "ادب برائے زندگی" سے کیونکر تعبیر کر سکتے ہیں؟ اس میں صدق، سوز و گداز، رحم و کرم اور احساس و جذبہ کا ہونا لازمی ہے۔ انہی عناصر سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور ایسے ہی ادب کو تعمیری ادب یا "ادب برائے زندگی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ جس کی تعمیر کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں اخلاق کا تعلق سب سے قریبی ہے، اس کے فقدان سے زندگی، زندگی نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے انتشار سے زندگی عجوبہ بن جاتی ہے۔ اخلاق زندگی کا مظہر ہے۔ انسانیت کا آئینہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ اخلاق اور زندگی کے روابط مشترک حیثیت رکھتے ہیں اور اسی پہلو سے ادب اور اخلاق کے ڈانڈے ملتے نظر آتے ہیں۔ ہاں اس سے یہ مغالطہ پیدا نہ ہو جائے کہ جب ادب میں اخلاق جیسے خشک موضوع کو ٹھونسا جائے گا تو لکھنے والا محض مصلح ادب، واعظ اور شیخ بن کر رہ جائے گا۔ ادب اور اخلاق کی باہمی تطبیق کے اظہار سے یہ مقصد نہیں ہے کہ ادب کو محض درس اخلاق کے لئے مختص کر دیا جائے۔ بلکہ یہ انکشاف مقصود ہے کہ وہ مسلمہ نظریات جن کی اساس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا ان کو اضافی سمجھ کر بد اخلاقی اور فحاشی، شہوانی اور جنسی تحریک کو جزو ادب بنا کر عین اخلاق تصور نہ کر لیا جائے۔ ادب کے ساتھ جب اخلاق کا نام لیا جاتا ہے تو یہ اجتماعی اور عمرانی نظریہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ادب اگر شعرا و ادبا ہی کے لئے مختص ہوتا انہی کی ذات کے لئے محدود رہتا۔ وہ جو کچھ کہتے اپنے ہی لئے کہتے اور جو کچھ لکھتے اپنے ہی لئے لکھتے تو ایسی حالت میں نہ تو ادب و اخلاق کی مطابقت کا پہلو باقی رہتا اور نہ ادب پر کڑی نگاہ ہی ڈالنے کی ضرورت ہوتی۔ لیکن شاعر و ادیب جو کچھ کہتا ہے سماج کے لئے کہتا ہے۔ جو کچھ لکھتا ہے سماج کے پیش کرتا ہے۔ اس لئے اسے سماجی و اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔

اسی نکتہ پر پہنچ کے [illegible] رہ جاتا ہے۔ اسی کو سمجھنے اور پرکھنے کی [illegible] کو خارجی عوامل سے کیوں تعبیر کیا جا رہا ہے؟ یہ ایک [illegible] ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک تمام اخلاقی تصورات [illegible] زندگی کے معاشرتی ماحول اور خارجی واقعات سے [illegible] ہیں۔ اخلاقی افکار اور ذہنی تصورات کسی عنوان خارجی حوادث سے الگ شے نہیں۔ تاریخ کی مادی تعبیر کو اگر ہم پیش نظر رکھیں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اشتراکیت اپنے اساس سے مادہ کے ماورا دوسرے عوامل باطنہ کی قائل ہی نہیں اور اسی کلیہ کی بنا پر اخلاق کو خارجی مظاہر کا رد عمل کہہ کر اخلاق کو مادیت کے قریب لایا جاتا ہے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ جو چیز میکانکی طریقہ سے زندگی پر اثر گیر ہوتی ہے تو پھر افکار و اقدار اور اخلاقی تصورات کے لئے نیک و بد، محمود و مذموم اور حق و باطل کے پرکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس اظہار حقیقت کے بعد اب ہم نہایت اختصار سے اخلاق کا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے ائمہ فلاسفہ اس باب میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ متقدمین نے اس باب میں کافی غور و خوض کیا ہے کہ اخلاق طبعی ہیں یا خارجی و اضافی۔ کچھ مفکرین طبعی کے قائل ہیں اور کچھ اضافی کے۔ جالینوس کا خیال ہے کہ بعض آدمی طبعاً اہل خیر ہوتے ہیں اور بعض اہل شر اور بعض دونوں فطرتوں پر پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے اقوال پر وہ یوں استدلال کرتا ہے کہ اگر تمام انسانوں کو طبعی طور پر اہل خیر تصور کر لیا جائے اور شرارت عارضی تسلیم کی جائے تو وہ شرارت یا تو اپنی ذات سے حاصل کریں گے یا کسی دوسرے سے اخذ کریں گے۔ لہذا طبعی طور سے اہل خیر نہ ہوں گے۔ اور اگر طبعی طور سے اہل شر کا وجود مان لیا جائے تو خیر ان کے لئے اکتسابی ہوگا۔ طبعی نہ ہوگا۔ اور اگر قوت شر یا قوت خیر دونوں تسلیم کی جائیں اور ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ غلبہ پانے کا اہل باور کیا جائے تو لازمی طور پر یہ صفات حاصل شدہ ہوں گی۔

محقق دوانی صاحب "اخلاق جلالی" کا خیال ہے کہ [illegible] کی رو سے افراد انسانی کے لئے ہدایت ربانی مختص نہیں [illegible] ہے شرارت خیر سے عارض ہوا اور کبھی [illegible] سلسلہ اسی طرح دائمی رہے۔ محقق دوانی کے الفاظ [illegible]

[illegible] نیست دراں تقدیر [illegible] شرارت بہ فردے را از غیر باشد و ہم جہلا و اصلا منتہی نہ شود و بفردے کہ شریر بالذات بود چہ تسلسل مدخل ایں امور از قبیل تسلسل در مقیدات است و نزد ایشاں باطل نیست۔"

تمام حکمائے متقدمین و متاخرین اپنی صوابدید کے مطابق دونوں طرف گئے ہیں۔ دلایل و براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خلق یا تو طبعی ہیں یا غیر طبعی اور بعض دونوں کے قائل ہو گئے۔ محقق دوانی نے جس حسن لیاقت سے اس تنازعہ کو ختم کیا ہے قابل غور ہے۔ افراط و تفریط سے الجھنے والے دنیا کے تمام فلسفیوں سے گریز کر کے اس نے دنیا کے سب سے بڑے فلسفی اور معلم اخلاق کی جانب رجوع کیا ہے۔

" اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن خلقہ فلا تصدقوہ فانہ سیعود الی ما جبل علیہ" (جب تم کسی پہاڑ کے لئے سنو کہ اپنی جگہ سے بدل گیا ہے پس اس کو سچ جانو۔ لیکن جب کسی آدمی کے لئے سنو کہ وہ اپنی جبلت سے بدل گیا ہے تو اسے سچ نہ مانو۔ وہ عنقریب اپنی خلقت پر لوٹ آئے گا۔)

" مبالغہ مستفاد میشود کہ اصلا زوال اخلاق ممکن نیست و بحسب قواعد حکمت نیز اخلاق تابع مزاج است و مزاج قابل تبدیل نیست و اگر کسے منع امتناع تبدیل مزاج کند بنا بر اختلاف مزاج شخصے واحد در ہر سن بلکہ در ہر حال میگوئیم۔ ہر شخصے را عرض المزاج متوسط میان حدے معین از تفریط و حدے معین از افراط در ہر کیفیتے از کیفیات اربع و تواند بود کہ خلق در ہمہ مراتب عرض المزاج لازم باشد و زوال آں مستلزم زوال مزاج شخصے آں باشد کہ بقائے او بدوں آں محال است۔"

اپنے قول کے اثبات میں محقق دوانی نے ایک دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے۔

" الناس معادن کمادن الذہب والفضۃ خیارکم فی الجاہلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقہوا" (انسان سونے چاندی کی کان کے مانند ہے۔ اے لوگو جو تم میں زمانہ جاہلیت میں نیک تھے۔ وہی زمانۂ اسلام میں بھی بھلے مانس ہیں جبکہ انھوں نے عقل و دانش بھی سیکھ لی ہے)

" ازینجا معلوم میشود کہ اصل در فضیلت طہارت طینت و صفائی جوہر فطرت است و باکثافت ذاتی وفا است۔ اصلی سعی در تکمیل آں از آں قبیل باشد کہ کسے خواہد کہ تملیہ زجاجہ را بدرجہ لعل و یا قوت رساید یا بصیقل آہن را بمرتبہ فضہ و ذہب آورد و ایں محالست۔"

خلق انسان کی فطرت و طینت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ انسان اپنی سرشت میں جوہر اخلاق لے کر آیا ہے۔ اور حضور سرور کائنات تو اخلاق عظیم سے مرصع ہو کر مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن شاہد ہے

انک لعلیٰ خلق عظیم

ضرورت تو نہیں رہتی کہ ان حقائق کے بعد کچھ اور کہا جائے۔ لیکن ان حضرات کی تسکین خاطر کے لئے جو اخلاق پہ اصرار کرنے والوں کو قدامت پرست کہتے ہیں۔ یہ حضرات چونکہ اپنا ہر طرز تخیل مغرب سے مستعار رکھتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ہم مغربی فلاسفہ کی آرا بھی ظاہر کریں۔

جان۔ایس۔میکنزی کہتا ہے۔

" اخلاقیات کا تعلق بنی نوع انسان کے عمل نکوکاری و غلط کاری سے ہے۔ وہ انسان کی عادتوں سے بحث کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کردار و اصول سے وہ متعلق ہے جن کا انسان طبعاً عامل ہے۔"

— فرانس کے مشہور مستشرق ڈاکٹر لی بان کا قول فیصل ہے۔

" انسان پر آب وہوا اور جغرافیائی [illegible] کا اثر شدت کے ساتھ صرف اس بنا پر پڑتا ہے کہ

---

[1] یہاں لفظ جبل قابل غور ہے۔ اس کے معنی آفریدہ شدہ ہے۔ جو ناقابل تغیر ہے۔ اگر جبل کے معنی عادت کے لئے جائیں تو ایسی صورت میں عادت تغیر پذیر شے ہے اور یہ محض غلط ہے۔ جبھی تو کسی نے کہا ہے
جبلی گردد جبلی گردد ذالغنی

اس سے انسان کے وہ اخلاق و عادات متاثر ہوتے ہیں جن میں فطرتاً تغیر و تبدل کی صلاحیت ہوتی ہے اور جن کو صحیح طور پر اساسی اخلاق کا حریف مقابل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اصلی اخلاق میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک امن پسند اور صاحب وقار آدمی جب بھوک کی شدت سے بیتاب ہوگا تو گو وہ حالت اضطراب میں اپنے ہمجنسوں کو پھاڑ کھانے کے لئے دوڑیگا باینہمہ اس عارضی حالت میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی اصلی جبلت بدل گئی۔"

اس کے بعد رقمطراز ہے۔

"حاصل یہ کہ اگر ہم مزاج عقلی کے تمام موثرات کو پیش نظر رکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان سے صرف وہ اخلاق متاثر ہوتے ہیں جو اساسی اخلاق کے حریف مقابل ہیں خود اساسی اخلاق میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔"

اب ایسی حالت میں یہ کہنا کہ اساسی اخلاق زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ہر ملک و قوم میں اساسی اخلاق جداگانہ ہوتے ہیں۔ ایک فعل عبث ہے۔ اساسی اخلاق کیا ہیں؟ انسان کیونکر اس کا ادراک کرتا ہے اور [illegible] ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم [illegible] ڈالتے ہیں تو ہم کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اخلاقی [illegible] کیا جا رہا ہے۔ فحاشی و عریانی کی ترویج ہو رہی ہے۔ [illegible] افسانوں میں سمویا جا رہا ہے خصوصاً ترقی پسند ادب نے تو اس [illegible] عورت" کو پیش کیا ہے کہ وہ محض عیاشی کا آلہ اور ہوسناکی کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ نہ صرف نئے لکھنے والے بلکہ وہ ادبا بھی جنھیں ثقاہت پسند سمجھا جاتا ہے اس لغزش سے بری نہیں۔ اگر ہم حقیقتاً ادب کی ترقی چاہتے ہیں اور ترقی پسند بننے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں اپنے ادب پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے، زندگی کی قدروں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا ادب پیش کرنے کی ضرورت ہے جو تکنیک، ہیئت اور مواد کی جدت کے ساتھ ساتھ زندگی کا صحیح ترجمان ہو جب جا کر ہم اپنے ادب کو ترقی پسند کہہ سکتے ہیں۔

حقیقی ادب وہی ہے جس میں تعمیری پہلو ہو۔ اگر ہمارے ادب سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو حیا محسوس ہوگی ان کے اخلاق کو ٹھیس لگی تو ایسا ادب محض فحش ادب ہے۔

دو غزلیں

حریف صبر و سکوں دل میں کاوش غم ہے
ہمارا زخم نہاں بے نیاز مرہم ہے
وہ سامنے ہیں تو اب ان سے کیا کہے کوئی
کہ ہوش گم ہیں نظام حواس برہم ہے
عیاں ہے رونق بزم نشاط کا عالم
یہ شور قلقل مینا صدائے ماتم ہے
گری گی آج یہ بجلی کدھر خدا جانے
شکن جبیں پہ ہے ان کا مزاج برہم ہے
ہمارا حال محبت میں کچھ نہ پوچھ ازہر
نہ زندگی کی خوشی ہے نہ موت کا غم ہے

(نذر رسول ازہر)

طول شب فراق کو کم کر سکے تو کر
اے موت مجھ پہ اتنا کرم کر سکے تو کر
ترک تعلقات پہ بھی مطمئن ہوں میں
اب مجھ پہ کوئی اور ستم کر سکے تو کر
دیکھا ہے تو نے خندۂ گل کا مآل بھی
ہر اک خوشی رہین الم کر سکے تو کر
اس مشق تیغ ناز سے اکتا گیا ہے دل
میرا سر نیاز قلم کر سکے تو کر
اے دوست! سنگ ہر قدم نشتر پہ بعد مرگ
افسانہ حیات رقم کر سکے تو کر

(نشتر امروہوی)

آئینہ سکندری

ترکال درشی شیشہ!

کہتے ہیں سکندر بادشاہ کے پاس ایک آلہ تھا جس سے وہ دنیا کے سب آنے والے واقعات کو دیکھ لیا کرتا تھا لیکن اب نہ وہ سکندر ہے نہ وہ آلہ۔ اب اس دور جدید میں چشم مشتاق ایک ہی چیز کو دیکھ رہی ہے جس کا نام ترکال درشی شیشہ ہے جس کی بدولت ساحر لوگ بیجان ہڈیوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر لیتے تھے ہم نے اس نئے عجیب و غریب اصول اور جدت پر حیرت انگیز شکل کا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے آپ ہر قسم کے طلسمی سوالات کا جواب بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں مثلاً گمشدہ کا پتہ چلانا۔ اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات دیکھنا' تقدیر۔ روزگار اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا۔ کیا ہمارا بیمار اچھا ہو جائیگا اور میری آئندہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ مجھے کس قسم کی عورت ملے گی۔ دفینہ معلوم کرنا۔ پردیس گئے ہوئے کا پتہ لگانا۔ کیا تلاش روزگار کے لئے مجھے پردیس جانا پڑے گا۔ فلاں آدمی کیسا ہے۔ مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہئے۔ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے وغیرہ اس قسم کے سینکڑوں سوالات کے جوابات اس طلسمی شیشہ سے کئے جا سکتے ہیں نیز ماضی حال و مستقبل کے حالات کسی مشکل کے حل ہونے یا نہ ہونے کا انکشاف ارزانی و قحط کے آثار قبل از شروع سال معلوم ہو سکتے ہیں افلاس و پریشانی دفع ہونے کی تدبیریں بھی ملیں گی۔ حب و بغض مشکل کاموں میں کامیابی ہو سکتی ہے جس عورت یا مرد کو کبھی نہ دیکھا ہو وہ اس آئینہ میں جلوہ گر ہوگا۔ ہر شخص کے سربستہ راز و خفیہ اسرار پوچھ لو بزرگان سلف سے باتیں معلوم کر لو ہر قسم کے مریض کی تشخیص و نسخہ لکھنا بھی ممکن ہوگا وغیرہ جو چاہو دریافت کر لو اصلی ترکال درشی شیشہ سوائے ہمارے کارخانہ کے انڈیا بھر میں بھی کسی اور جگہ سے آپ کو نہ مل سکے گا۔ ایک بار کا خریدا ہوا عمر بھر کام دیگا۔ ترکال درشی شیشہ واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔

نوٹ :۔ اس شیشہ سے عورت مرد دونوں یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت ترکال درشی آئینہ فی عدد صرف تین روپیہ ہے۔ کاپی ترکیب استعمال چھپی ہوئی ہمراہ ارسال ہوگی۔ پسند نہ آنے یا غلط نکلنے پر واپسی کی شرط ہوگی۔

اصلی کلید سٹہ :۔ سٹہ و لاٹری کا نمبر معلوم کرنے والی کتاب قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :۔ **مینیجر موہنی بھنڈار رجسٹرڈ لاہور**



امریکن پستول

چھ فیر والا — ماڈل — زبردست

اس پستول کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے مگر پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ پہلی خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول امریکہ کے مقابلہ میں حال ہی میں تیار ہو کر آئے ہیں دوسری خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول کی مانند چرخی خود بخود گھومتی ہے اور کارتوس چلنے کی آواز اس قدر ہوتی ہے کہ چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اس میں ¼ انچ کے کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا وزن تقریباً ۱۵ اونس ہے لمبائی قریباً ۹ ۔ چور ڈاکو اس کی آواز سن کر اور شکل دیکھ کر ہی بھاگ جاتے ہیں قیمت ۱۱۱ پستول معہ شاٹ للعہ ۱۲۱۲ عدد کو اصلی فولاد کا بنا ہوا معہ شاٹ ۱۲ اسپیشل درجہ خاص نیو ماڈل معہ شاٹ ۱۸ فالتو کارتوس (شاٹ) قیمت ۔ پستول کیلئے تیل فی شیشی ۱۲ محصول وغیرہ معاف

الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ پوسٹ بکس ۴۶ لاہور

سگریٹ کی ایجنسی لینے کے خواہشمند

نمونہ دیکھ کر ہی آرڈر دیں۔ کوئی وی۔پی وصول نہ کریں جب تک پوری تسلی نہ ہو کہ لفافہ میں کیا ہے۔ جو اصحاب مال خریدنے کیلئے خود تشریف نہ لا سکیں مکمل سیٹ نمونہ کیلئے پندرہ آنے۔ ٹکٹ یا منی آرڈر برائے محصول ڈاک و پیکنگ پیشگی روانہ کریں شرائط ایجنسی مفت طلب کریں قیمتیں مقابلتہً کم چیز اعلیٰ نیا مال نہایت خوبصورت اعلیٰ پیکنگ میں تیار ہو کر آ گیا ہے۔ دیر سے آرڈر بھیجنے والوں کو دوسرے چالان کا انتظار کرنا پڑیگا۔

پتہ!

فیڈرل سگریٹ کمپنی ۱۲ اے چیمبرلین روڈ لاہور

[illegible]

تاریک رات

رات تاریک تھی — غلاموں کے دن کی طرح تاریک —!

وہ بستر پر پڑا مختلف خیالات کی کشمکش میں مبتلا تھا کتنی ہی دیر سونے کی کوشش میں وہ پہلو بدل بدل کر اب ناکام اور مایوس سا ہو چلا تھا۔ آخر اُس نے تنگ آکر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا تاریک خلا کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اُف کس قدر تاریکی تھی۔ چاند کا کہیں نشان تک نہ تھا اور چند چھوٹے چھوٹے مدھم تارے بلندیوں پر سے پستی کو حقارت کی نظروں سے گھور رہے تھے۔

وہ مقامی دفتر میں ایک کلرک تھا — بس ایک کلرک!

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کلرک ہوتے ہوئے بھی اُس کے احساسات اور جذبات زندہ تھے — ہاں انسانوں کی طرح تڑپتے چیختے ہوئے احساسات اُس کے دل اور ذہن میں موجود تھے اور اسی لئے دن بھر دفتر کی خشک کاغذات کے ڈھیروں تلے دفن رہنے کے بعد جب وہ رات کو آکر بستر پر لیٹتا تو خود کو زندہ انسان محسوس کرنے لگتا۔ یہ خیالات اُس کے ذہن میں رینگنے لگتے اور آدھی آدھی رات تک اُسے پریشان کئے رکھتے۔ وہ ان خیالات سے بھاگنے چھپنے کی کوشش کرتا اور خود کو کئی بار جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نیند کی لہروں میں بہا دینے کی سعی کرتا مگر یہ سب کوششیں رائیگاں جاتیں اور اُس کے خیالات میں اور بھی شدت پیدا ہو جاتی۔ وہ جتنا ان پریشان کن خیالات سے بھاگنا چاہتا یہ اور بھی تیزی سے اُس کا تعاقب کرتے اور آخر مجبور ہو کر اپنے آپ کو سوچ کے اس طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔

آج بھی روزانہ کی طرح شاید خیالات اُس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے اُس نے یہ سوچ کر کہ رات کو بہت دیر سے سونے کے باعث اُس کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے کئی بار اپنے آپ کو کوسا اور کروٹیں لے لے کر سونے کی کوشش کی مگر بے سود۔ پھر اُس نے خیال کیا کہ اُسے ہر روز صبح سویرے اُٹھنا پڑتا ہے۔ دفتر جانے سے پہلے نہانے دھونے کے بعد اُسے کھانا بھی خود ہی تیار کرنا پڑتا ہے اسی باعث اُس کی صحت روز بروز بگڑ رہی ہے لیکن اُس نے کبھی صبح اپنی نیند پوری ہو جانے کے بعد اُٹھنا پسند نہیں کیا کیونکہ اگر وہ

ایسا کرتا تو ہر روز بہت دیر سے دفتر پہنچا کرتا، اِس لئے مجبوراً اُسے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ اس قدر مجبور کیوں ہے؟ — غریب انسانوں کی طرح مجبور جن پر قانون۔ حکومت اور سرمایہ داروں کا جبر اور تشدد بڑھتا جا رہا ہے — بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا جبر — یہ تشدد کبھی ختم نہیں ہوگا —؟

اور اب جبکہ اُس کی نگاہیں ہر طرف چھائی ہوئی تاریکی کو بُری طرح محسوس کر رہی تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھیانک تاریکی اُس کی دنیا پر کس قدر حاوی ہے۔ اُس کا ماضی اتنا تاریک نہ سہی لیکن اُس کا حال — کتنا مایوس کن ہے یہ اور اُس کا مستقبل تو انتہائی تاریک ہے۔ اُسے آج صبح اخبارات میں پڑھے اور اپنے ساتھیوں سے سُنے ہوئے کئی جملے یاد آ رہے تھے۔ "جنگ ختم ہو چکی ہے — ہر محکمے میں چھانٹی (Reduction) ہونے والی ہے"۔ اس خیال سے وہ کانپ اُٹھا۔ یہ چھانٹی — اُف پھر وہ بیکار ہو جائیگا — اُس کا مستقبل۔ اُسے آج سے تین سال پہلے کا وہ وقت یاد آنے لگا جبکہ اُس نے بی، اے کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں پر کامیاب ہونے کے بعد مزید پڑھائی جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو اُس وقت اُس کے باپ نے اُسے سمجھایا تھا۔ "دیکھو اب ملازمت مل رہی ہے۔ جنگ کے خاتمے پر وہی بیکاری، بیروزگاری ہو جائیگی۔ اس لئے تم دفتر میں ملازم ہو جاؤ۔ بہت آرام دہ ملازمت ہے"۔ اور وہ دفتر میں کلرک ہو گیا تھا۔ اپنے دُوسرے لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح۔ اگرچہ یہ زندگی اُسے بہت بے لطف۔ بندھی بندھی گھٹی گھٹی اور بے حس سی محسوس ہوتی تھی تاہم اُس نے دُکھی ہوتے ہوئے بھی اسے ترک نہیں کیا تھا۔ کلرکی — وہ سوچ رہا تھا — بدترین ذریعۂ معاش سہی لیکن اس ذریعے سے وہ کم سے کم اپنی روٹی تو کما رہا ہے۔ وہ اپنا پیٹ تو پال رہا ہے لیکن ملازمتوں میں تخفیف کے بعد؟ کاش یہ جنگ ابھی ختم نہ ہوتی اور وہ کلرک ہی رہتا —

ہمیشہ کلرک ہی رہتا لیکن اب وہ کلرک نہیں رہیگا۔ بیکار ہو جائیگا۔ بیکاری، بیروزگاری، فاقے، بھوک۔ نوجوانوں ــــ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی حالت۔ بھیک۔ بوٹ پالش۔ خودکشیاں ــــ آہ اور اُس نے چاہا کہ پھر ایک عالمگیر جنگ چھڑ جائے۔ اُسے ایسے امن کی خواہش نہیں جس میں بھوک۔ بیزاری اور مایوسی کے خوفناک شعلے بھڑک رہے ہوں ــ پھر ایک جنگ چھڑ جائے ــ تباہ کن جنگ جو کبھی ختم نہ ہو۔ دُنیا کی ہر حکومت۔ سلطنت۔ مُلک اس میں کود پڑیں۔ تباہی کی لپیٹ میں آجائیں۔ اسی طرح وہ اور اُس جیسے کروڑوں انسان بیکاری سے بچے رہیں گے لیکن اُس نے پھر سوچا کہ اس طرح جنگوں سے انسان تباہ ہو جائیں گے جنگیں کتنی ہلاکت خیز اور خوفناک ہوتی ہیں، انسانی خون پانی کی طرح بہ جاتا ہے لیکن پھر اُس نے اس خیال کو ذہن سے دھکیل دیا انسان تو پہلے ہی تباہ و ہلاک ہو رہے ہیں۔ جنگ سے دُور رہنے کے باوجود لوگ فاقوں اور قحطوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ انسان۔ انسانوں کے استبداد کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ بھوک اور فاقوں کے دیوتاؤں نے لاکھوں انسانوں کی گلی سڑی لاشوں پر ناچ کیا ہے ــ خونیں ناچ۔ ایسی ذلیل موت سے لڑائیوں کی موتیں کہیں بہتر ہیں۔ ظلم، بیکاری، غلامی اور فاقہ کشی کی گِری ہوئی زندگی سے سنگینوں کی لائی ہوئی دلیر موت کہیں بہتر ہے۔ سڑکوں، بازاروں اور شکستہ چارپائیوں پر برسوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کی موہوم اُمید میں تڑپتے رہکر رُوح کو اذیتیں دے دے کر ہڈیوں کے پنجروں سے آزاد کرنے کی بہ نسبت ایک بم سے پیدا کی ہوئی موت بدرجہا افضل۔ آسان اور مردانہ وار موت ہے ــــ

معًا وہ چونک گیا۔ اُس کے ساتھ والے مکان کی چھت پر سے ایک بچہ چیخنے لگا ـ اُس کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔ اُسے اپنی نیند کا خیال آنے لگا جو اُس سے کوسوں دُور بھاگ رہی تھی، اور رات کی خاموشی میں شہر کے گھنٹے گھر کا گھڑیال چِلّا اُٹھا ــ ایک ــ دو اور وہ بھی گھڑیال کی آواز کا تعاقب کرنے لگا ــ تین ــ چار ــ پانچ ــــ اور بارہ۔ اوہ بارہ بج چکے ہیں ــ اُس نے خیال کیا ــــ اور وہ ابھی تک نہیں سویا۔ وہ صبح وقت پر نہیں اُٹھ سکیگا اور اُس نے پہلو بدل کر سو جانا چاہا لیکن ہمسایہ چھت پر بچہ ابھی تک چیخ رہا تھا۔ اُسے بچے پر غصہ آنے لگا "کمبخت۔ ذلیل خاموش نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس کے ماں باپ اس وقت کہاں غائب ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے بچے تک کا ہوش نہیں رہتا" بچے کے

رونے کی آواز سکوت کی چیر کر ابھی تک اُس کے کانوں [illegible] ٹکرا رہی تھی۔ "اُف" ــ اُس نے پریشان ہو کر اپنے [illegible] میں اُنگلیاں ٹھونس لیں لیکن شور پھر بھی اُس کے کانوں میں [illegible] اُس نے بڑبڑاتے ہوئے پھر کروٹ بدلی۔ اب اُسے بچے [illegible] غصہ آنے لگا۔ "یہ بیوقوف۔ احمق اپنے بچوں کو بھی سنبھالنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اور ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اس بچے کا باپ بھی اُسی کی طرح ایک کلرک ہے۔ اور اب اس خیال کے آتے ہی اُسے اُس پر رحم آنے لگا۔ یہ بچہ چیخ چیخ کر اپنے باپ۔ ایک کلرک کی بےبسی مجبوری کا ڈھنڈورہ پیٹ رہا ہے۔ اُس کی ماں اور باپ بھی شاید اس کی پیدائش پر بہت خوش ہوں گے، اس کا رونا غالباً ان کی سماعت کو مجروح نہ کرتا ہوگا اور شاید اُن کی نیند بھی اس چیخ پکار سے اُچاٹ نہ ہوتی ہوگی لیکن اُس کا باپ اپنے مستقبل سے واقف ہونے کے باوجود اپنے بچے کے مستقبل سے آگاہ نہیں ہوگا۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ [illegible] چھانٹی کی خوفناک چھری اُس کے گلے پر پھرنے والی ہے کیونکہ وہ بھی جنگ کے دوران میں کلرک بنا تھا۔ پھر بیکار ہونے کے بعد اُس کا ــ اُس کی بیوی اور اس چلاتے ہوئے بچے کا کیا ہوگا؟ وہ ان کے لئے کہاں سے روٹی۔ دُودھ۔ کپڑوں اور رہائش کا انتظام کریگا؟ جبکہ وہ خود اپنے آپ سے بیزار، اور مایوس ہو چکا ہوگا۔ اور اسی لمحہ اُسے یاد آیا کہ اُسکی ماں اور باپ نے کئی بار اُسے شادی کرنے کے لئے مجبور کیا تھا لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا تھا اُسے معلوم تھا کہ وہ اس قلیل تنخواہ میں اپنا پیٹ بھی مشکل پال رہا ہے۔ وہ شادی کر کے اپنے دُکھوں اور معاشی تکلیف میں روز بروز اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ــــ اُس نے سوچا کہ اگر وہ شادی کر لیتا تو اب تخفیف کے بعد اُس کا کیا بنتا؟ شادی کرنے سے انکار کر کے کتنا اچھا کیا تھا اُس نے۔ اِس خیال سے اُسے قدرے تسلی سی محسوس ہوئی لیکن دُوسرے ہی لمحے یہ تسلی پھر خوفناک خیال تلے دب گئی۔ چھانٹی کے بعد اُس کا کیا بنے گا۔ کیا بنے گا؟ اور ایک ٹھنڈا سانس اُس کے حلق میں سے رینگتا ہوا رات کی خاموش اور اندھیری فضا میں نکل کر جذب ہو گیا۔ کاش [illegible] اُس نے سوچا وہ مُلازمت کے دوران میں کچھ پونجی بچا کر رکھ لیتا تاکہ بیکاری کے دنوں میں اُس سے گذارہ چلا سکتا۔ لیکن وہ نقدی بچاتا کیسے؟ جبکہ اُس کی روٹی اور کپڑے کا خرچ بھی انتہائی [illegible] چل رہا تھا اور اس وقت اُس کی نظروں میں اپنے کپڑے [illegible] اُس کے پاس صرف تین قمیصیں رہ گئی تھیں [illegible]

قریب [illegible] کا چہرہ زرد ہو گیا ہے لیکن اُس کے پاس صرف ایک گرم کوٹ ہے جو کہیں آستینوں پر سے بالکل گھس چکا ہے اور اُس کے بوٹ تو بہت خراب ہو چکے تھے کئی بار مرمت کروانے کے بعد مرمت کرانے کی وجہ سے وہ بہت بھونڈے اور بوجھل سے ہو گئے تھے۔ اور اب پہننے کے قابل بھی نہ رہے تھے، اُس نے سوچا کہ وہ اس تنخواہ پر ضرور نئے بوٹ خرید لیگا اور یوں بھی اُسے ایک دوست کی شادی میں اُسے شریک ہونا ہے۔ اُسے بوٹ خریدنا ہی پڑینگے۔ مگر بوٹوں کی قیمتیں آجکل بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ جنگ ختم ہو چکی لیکن زندگی کی ضروریات کی چیزیں ابھی تک بے حد گراں ہیں۔ بوٹ کم از کم بیس روپے میں آئیں گے — اور اُس کی تنخواہ پینتالیس روپے ہے۔ پھر وہ پچیس روپوں میں سارا مہینہ کس طرح گزارہ کریگا؟ آہ ایک کلرک — اُسکی ضروریات زندگی — اُس کی تنخواہ — اُس کے ذہن کی قیمت اور اسی وقت نگاہوں میں اپنے ذہنوں کو بیچنے — نیلام کرنے والے لاکھوں کلرک گھوم گئے۔ یہ دفتر میں چپ چاپ ٹکر ٹکر اپنے میزوں پر جھکے ہوئے زرد زرد چہرے وہ نیم مُردہ سے انسان جن کے جسموں سے شاید رُوحیں نکل کر پرواز کر چکی ہیں اور یہ بیجان ہو کر کرسیوں میں بتوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں، کبھی کبھی مدھم ہلکی سی ڈرتی۔ لرزتی سرگوشیاں ان کے منجمد سکوت میں تیر جاتی ہیں۔ "آج 'صاحب' موڈ (Mood) میں نہیں ہیں"۔ "صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں اب کیا ہوگا؟"۔ "مجھے ترقی ملنے والی تھی مگر صاحب نے سفارش نہیں کی"— اور اُس کا دل چاہا کہ صبح کو دفتر جاتے ہی "صاحب" کے ان غلاموں بے حس مُردہ بتوں کو جنجھوڑ ڈالے۔ انہیں چیخ چیخ کر کہے — "تم انسان ہو کر ایک انسان سے اس قدر کیوں ڈرتے ہو؟ کیوں اپنے ذہنوں کو سستے داموں نیلام کر رہے ہو؟ کیوں اپنے احساسات کا گلا گھونٹ رہے ہو؟ اٹھو اپنی سوچوں پر سے زنگ اُتارو۔ انہیں ٹٹولو۔ اپنی خودداری کو محسوس کرو۔ اپنے احساسات کو خودکشی کرنے سے روکو۔ اپنی سوئی ہوئی ضمیروں کو بیدار کرو۔ دیکھو چھانٹی ہونے والی ہے تمہاری چھانٹی جنہوں نے اپنے خون پسینے سے اس حکومت کی بنیادوں کو مستحکم نہیں کیا بلکہ دیا۔ جنہوں نے جنگ کی مصیبتوں میں حکومت کا بدل و جان ساتھ دیا جنہوں نے تھوڑی سی تنخواہوں پر ہی اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔ اپنے ضمیروں کو زنگ آلود۔ اپنے احساسات کو غلام اور اپنی سوچوں کو مجروح کر دیا۔ ہاں تمہیں اب باہر دھکیلا جا رہا ہے۔ تم اس حکومت کے ستون ہو — کلرک — تمہیں اب ان دیواروں سے نکال دیا جائیگا جن کی اینٹوں میں تم نے اپنی خودداری — احساسات اور ذہن جذب کر کے حکومت کی مشینری کو مضبوط بنایا......

"ٹن" — گھنٹہ گھر کے گھڑیال نے ایک بجنے کا اعلان کر کے پھر اُسے پریشان کر دیا۔ اُسے ابھی تک نیند نہیں آ رہی تھی، کاش اُسے کوئی ایسی شے مل جائے جو اُسے رات بھر آرام سے سُلا دیا کرے — اُس نے سوچا۔ لیکن اُس کے خیالات۔ یہ بے اطمینانی۔ مایوسی اور مستقبل کا خوف — اس کا کیا علاج ہو — ؟؟

اُس نے نیند کو بُلانے کی کوشش میں اپنی آنکھیں بند کر کے ہولے ہولے سانس لینا شروع کر دیا لیکن ابھی اُس کا ذہن خیالات سے محفوظ ہونے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور آواز نے اُس کے کانوں میں گھسنا شروع کر دیا۔ رات کے سناٹے میں کوئی بے فکرا ایک گیت گاتا ہوا گزر رہا تھا — محبّت میں سارا جہاں جل رہا ہے۔ محبّت میں . . . . . اور باوجود کوشش کے اس کا ذہن اس آواز کو جذب کرنے سے نہ رہ سکا۔ محبّت میں سارا جہاں — کتنے فضول اور حقیقت سے دُور ہوتے ہیں ہمارے فلمی فسانے اور گیت بھی۔ آج تو سارا جہاں کیا ایک انسان بھی محبّت میں نہیں جل رہا۔ محبّت تو کب کی سرمایہ داری کے ہاتھوں تاراج ہو چکی ہے۔ زندگی کے دُوسرے پاکیزہ اور بلند مقاصد مذہب۔ قانون۔ حکومت۔ سماج کی طرح محبّت پر بھی سرمایہ داروں کا تسلط ہو چکا ہے۔ غریبوں سے محبّت چھین کر اہلِ زر نے اس کی شکل و صورت کو بے حد بگاڑ دیا اور بھونڈا بنا دیا۔ اس میں سے پاکیزہ نکال کر ہوس کا مصنوعی تنفس داخل کر دیا ہے۔ گزرنے والا ابھی تک گاتا ہوا جا رہا تھا۔ زمین جل رہی آسمان جل رہا ہے۔ اُس نے سوچا آج زمین محبّت میں نہیں ہوس میں جل رہی ہے۔ ہوس کی آگ جس کے شعلے سرمایہ داری نے بلند کئے ہیں۔ اور اس میں سے سچائی — پاکیزگی۔ خلوص۔ سچی تڑپ۔ اخلاقی بلندی سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اور آج سارا جہان بھوک۔ ننگ فاقوں۔ بیماریوں۔ ظلم و ستم کے دوزخ میں جل رہا ہے۔ اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے کب سرد ہونگے؟ یہ دوزخ کب ٹھنڈا ہوگا؟ ہوس کی جگہ کب محبّت لوٹ کر آئے گی۔ کب دُنیا میں غلامی۔ جھوٹ۔ فریب۔ ریاکاری کی بجائے آزادی، سچائی۔ محبّت۔ راحت اور مساوات کا دور آئیگا؟ کب انسان

انسانوں کو بیچا [illegible] ؟ کب دُنیا سرمایہ پرست درندوں بھوکے قانون سازوں۔ باہم لڑانے والے مذہبوں قوم فروش لیڈروں سے پاک ہوگی؟ کب دُنیا میں مزدوروں۔ فاقہ کشوں۔ بھکاریوں اور کلرکوں کی بجائے انسان نظر آئیں گے۔ زندہ چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے انسان۔ خوش دلوں اور بشاش چہروں والے انسان اور اُسے یاد آیا کہ جنگ کے دوران میں وہ کئی بار اخبارات میں پڑھتا تھا کہ "بڑوں کی کانفرنس میں نئی دُنیا کی تعمیر پر غور ہو رہا ہے۔" نئی دُنیا کی تعمیر ہوگی یہ دُنیا ــــ اُس نے سوچا۔ کب تک تعمیر ہوگی؟ یہ نئی دُنیا کیسی ہوگی؟ کیا یہ وہی نئی دنیا ہوگی جس میں کروڑوں مزدور بیکار ہو جائیں گے لاکھوں کلرک بے روزگاری سے تنگ آکر دریا کے کناروں اور ریلوے لائنوں کی طرف خودکشی کے لئے بھاگیں گے۔ کیا یہ نئی دُنیا ایسی ہی دُنیا ہوگی۔ جیسی جنگ سے چند سال پہلے تھی۔ دُکھوں۔ فاقوں اور ناامیدیوں سے بھرپور زندگی۔ ایسی دُنیا جس میں انسان بھوکوں مریں انسان بدستور غلام رہیں۔ انسان چند انسانوں کی مسرتوں اور راحتوں کے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیئے جائیں۔ انسان خونی درندے بنے رہیں۔ انسان بیکار ہو کر گلی کوچوں میں فاقوں سے نڈھال دم توڑتے رہیں نہیں چاہئے۔ ایسی نئی دُنیا سے تو یہ پرانی دُنیا جس میں وہ کم سے کم اپنا پیٹ تو پال رہا ہے بہتر ہے......

اور ٹن ٹن" ــــ وہ پھر چونک [illegible] وہ بڑبڑایا۔ وہ صبح دفتر وقت پر یقیناً نہیں پہنچ سکے گا اور اگر دفتر نہ پہنچا تو "صاحب" ناراض ہو جائیگا اور شاید اس صورت میں اس کی تنخواہ میں سے جو عنقریب اُسے ملنے والی ہے ایک دن کی تنخواہ کٹ جائے ــــ وہ سوچتا گیا ــــ لیکن اگر ایک دن کی تنخواہ کٹ گئی تو کیا ہوگا؟ اور اُسے ابھی بُوٹ بھی خریدنے ہیں اور اپنے دوست کی شادی میں بھی شریک ہونا ہے۔ اور کپڑے تو اگلی تنخواہ پر بنوائیگا۔ اگلی تنخواہ؟ لیکن شاید اُسے اگلی تنخواہ نہ مل سکے۔ اُسے اس سے پہلے ہی کلرکی سے جواب مل جائے۔ پھر ــــ اس خیال سے وہ پھر کانپ گیا۔ پھر اُس نے خود کو تسلی دینے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ کہ یہ تنخواہ تو بہرحال اُسے مل جائے گی۔ اس لئے اُسے ضرور صبح وقت پر پہنچنا چاہئے۔ اور یہ سوچ کر اُس نے اپنا سر قدرے اوپر اُٹھا کر تکیے پر پٹک دیا۔ گویا اس طرح سے اپنے ذہن سے خیالات کو جھٹک کر باہر پھینک دینا چاہتا ہو۔ یوں ہی اُس نے پھر آسمان کی طرف نظریں اُٹھا دیں۔

وہاں چاند کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ بلکہ یوں معلوم تھا جیسے رات اور بھی تاریک ہوتی جا رہی ہے ــــ تاریک ــــ کلرک کے مستقبل کی طرح تاریک ــــ!!

اور نہ جانے وہ کتنی ہی دیر اپنے خیالات سے اُلجھتے رہنے کے بعد سو گیا۔

یکتا امروہوی

افسانہ

آنکھوں میں اُدھر آنسو لب پر اِدھر افسانہ — لو کر ہی گیا آخر اپنا اثر افسانہ
بننے کو تو افسانے بن سکتے ہیں لاکھ اس سے — ہے ورنہ بجائے خود نیچی نظر افسانہ
رہتا ہوں تو رہتا ہوں خاموش میں مدت تک — کہتا ہوں تو کہتا ہوں افسانہ در افسانہ
پھر نوح کے طوفاں کا پھر نوح کے طوفاں کا — صدقے ترے دہرا دے اے چشمِ تر افسانہ
جس سے کہ بآسانی کٹ جائے رہِ منزل — ایسا کوئی کہتا چل اے ہم سفر افسانہ
اے دل وہ زمانہ بھی کیا خوب زمانہ تھا — بھولا ہوا مدت کا مت یاد کر افسانہ

ہمت تو نہیں بالکل دُہرانے کی اے یکتا
کہتے ہیں تو دُہرا دے بارِ دِگر افسانہ،

نادیہ عالم

زیادتی

خودداری اور بے پروائی تو اب بھی اُسکی طبیعت میں ویسی ہی ہے، مگر یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے، جب وہ دیہات نما شہر کے پرائمری اسکول کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا، اور ایک بے پرواہ شرارتی چھوکرے کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں — نہ کسی حسین لڑکی سے اُنگلی چھو جانے پر جسم میں بجلی دوڑتی۔ نہ کسی بڑی بڑی آنکھوں والی گوری لڑکی سے باتیں کرنے کے خیال سے گھبراتا، اور نہ رات کو خوبصورت رنگین تکیوں کے مدھ بھرے خواب ہی آتے — جب زندگی اپنی دھیمی اور دھیمی ہوتی چال سے بچپن کی شفاف اور ہموار سڑک پر چلی جا رہی تھی — ہولے ہولے نرم انداز میں — اُس مخصوص سڑک پر جو کسی چوراہے سے جا کر نہیں ملتی، اور نہ چھوٹی چھوٹی پُر پیچ پگڈنڈیاں اُس سے آکر ملتی ہیں —

وہ جب اسکول میں داخل ہوا، تو پرائمری اسکول کے پرائمری ماسٹروں کے مظالم سے چھوٹے چھوٹے پھول سے بچوں کو مُرجھاتے دیکھا، اسکول میں قبرستان کی سی خموشی مسلط رہتی بچے سہمے سہمے اور ڈرے ڈرے، الگ الگ پھرا کرتے —، اکثر ایسا ہوتا کہ ماسٹر صاحب اُن کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتے، اور غریب بچے یہ بھی نہ جان پاتے کہ یہ کس قصور کی سزا ہے؟ اُس کے لئے یہ ماحول بیحد تکلیف دہ تھا —

اگر کوئی اور بچہ ہوتا تو وہ بھی باقی بچوں کی طرح ہو جاتا، مگر وہ شرارت جو اُس کی گھٹی میں پڑ چکی تھی — اُس سے جُدا نہ کی جا سکی —، شروع شروع میں تو وہ بھی خوب پٹا، مگر آہستہ آہستہ دُوسرے بچوں کو ملا کر، اُس نے ایک فوج بنا لی، اور باقاعدہ اُن ظالموں سے مقابلے کی ٹھان لی —، ہیڈ ماسٹر سے شکایت کی گئی —، کُرسی پر کیلیں بچھائی گئیں —، اور ایکدن تو ایک لڑکے کو بہلا پھسلا کے یہاں تک راضی کر لیا کہ وہ گھر جا کر کہدے کہ اُسے آج ماسٹر صاحب نے بُری طرح مارا ہے، اور ثبوت میں اپنی بلیڈ سے کٹی ہوئی ہتھیلی کا زخم پیش کر دے۔ چنانچہ اُس نے یہی کیا — اور اگلے روز اُسکی بڑی بڑی مونچھوں والا باپ دندناتا ہوا اسکول آن پہنچا، اور طیش میں اپنی موٹی لاٹھی کو گھماتے کے ماسٹر صاحب کو بیحد سنائیں — پہلے تو وہ اکڑتے، مگر

سب بچوں نے کہدیا کہ ہمارے سامنے چھڑی سے مارا ہے تو غریب اتنے پریشان ہوئے کہ اُس کے باپ سے معافی مانگتے ہی بن پڑی —، اور باپ، اپنی بڑی بڑی خونیں آنکھوں سے اُنہیں گھورتے ہوئے یہ کہکر چلا گیا کہ اگر آیندہ اُس کے لاڈلے کو کچھ کہا تو وہ اُن پر مقدمہ چلا دے گا —،

بچے جتنے دبے تھے اُتنے ہی اُبھرے —، اسکول میں جیسے بہار آگئی —، شرارتیں —، چھیڑ چھاڑ، کھیل —، اور ننھے ننھے بچوں کے قہقہوں سے تو ہر وقت، وہ اسکول کی بوسیدہ عمارت گونجتی رہتی —، مضمحل، مُردہ سی دھوپوں میں جان آگئی تھی —، اور درختوں کی گھنیری چھاؤں حیرت انگیز طریقے پر، پُر رونق ہوتی گئی —، تفریح کے وقت وہ سب بچوں کو جمع کرکے اسکول سے کچھ فاصلے پر، نہر کے نزدیک ایک چھوٹے سے گھاس کے میدان میں لے جاتا، جہاں وہ فٹ بال کھیلا کرتے — اور جب تھک جاتے تو وہیں، نہر کے ساتھ ساتھ جو ایک دس بارہ فٹ چوڑی پٹڑی گئی تھی —، اُس پر بیٹھ جاتے، اور رنگ برنگی بلوری گولیوں سے "انٹا پلو" کھیلنے لگتے۔

نہر کے دوسرے کنارے نزدیک ہی، دُودھ والوں کا چھوٹا سا گاؤں تھا —، اور بہت سے مرد اور عورتیں، دُودھ کے مٹکے سروں پر رکھے چھوٹی سی پلیا کو عبور کرکے، اُس پٹڑی پر سے گذرا کرتے تھے، کبھی کبھی اتفاقاً کسی کا دُودھ گر جاتا، تو وہ نہایت اطمینان سے دُودھ کی کمی، نہر کے گدلے پانی سے پوری کر لیتا۔

ایک روز وہ دُوسرے بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیل رہا تھا، تو تھّو حلوائی کا گھٹے ہوئے جسم والا لڑکا، بیگو کہیں سے گھومتا گھامتا آگیا، اور کھیل دیکھنے لگا۔ اُس نے آدھی آستینوں والی قمیص اور دھوتی پہن رکھی تھی —، سر میں معلوم ہوتا تھا، گویا کمر طوں تیل اُنڈیل لیا ہو —، یہی اُنیس بیس برس کی عُمر ہوگی، کہنے لگا "لاؤ میں تمہیں ٹھیک سے کھیلنا سکھا دوں"۔ اور وہ اُنہیں سکھانے لگا۔

"یوں نہیں یوں! دیکھو جی ہاتھ مت لگاؤ، ارے — رے،

نوشتہ:- بی سیتارام شاستری
ترجمہ:- زینت جہاں (بی اے سٹوڈنٹ)

واپسی

"لنگا"

"حضور!"

"ہم راستہ بھول گئے ہیں لیکن ہمارا گاؤں یہاں سے کچھ دور نہیں ہے۔"

"ادھر دیکھئے حضور، کوئی سفید سی لکیر دکھائی دے رہی ہے۔ وہی سڑک ہوگی۔ نہیں، وہ تو پانی بہہ رہا ہے ـــــ ایک چھوٹا سا نالہ۔"

"ادھر آ، اس ٹیلہ پہ چڑھ کر دیکھیں۔ شاید کچھ پتہ چلے"۔

اندھیرا ہو چلا تھا، لنگا کیچڑ میں بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ میں گھوڑے پر اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہم پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ گرمی کی چھٹیاں ملنے پر میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بنگلور سے لاری میں روانہ ہوا اور تحصیل پہنچکر وہاں تحصیلدار صاحب سے جن سے میری جان پہچان تھی۔ گھوڑا لیا اور ان کے نوکر لنگا کو بھی ساتھ لئے گاؤں چلا ـ لنگا اچھی طرح راستہ سے واقف تھا اور گو میں اس طرف سے کئی دفعہ گذرا۔ پھر بھی جانے ہم اُس شام کیوں بھٹک گئے۔

"لنگا"

"سرکار!"

"پیٹی بہت بھاری ہے کیا"؟

"جی نہیں، بہت ہلکی ہے، دیکھنے میں تو بڑی ہے۔ کیا کیا ہے حضور اس میں؟"

"چار کتابیں، دو کپڑے، بھائی کے لئے ایک زری ٹوپی اور ایک جوڑی جوتے۔ بہن کے لئے دو گڑیاں۔ بس یہی"

"کتنے دن سے ہیں حضور آپ بنگلور میں؟"

"پچھلی گرمیوں کے بعد گیا ابھی آ رہا ہوں۔ دیکھا، یہ جگہ اتنی بدل گئی ہے۔ سڑک کی دونوں طرف کی جھاڑیاں اور پودے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لئے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں؟"

ہم تینوں۔ لنگا، میں اور گھوڑا تھک گئے تھے۔ کچھ دیر خاموش چلتے رہے، مجھے تو جلدی گھر پہنچکر سب کو دیکھنے کی بے تابی تھی۔ خاص کر اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کو۔ میرا بھائی شاما ٹوپی کی انتظار میں ہوگا۔ بہن کے لئے گڑیاں لی ہیں۔ پتا جی سے کہنا ہے کہ میں نے امتحان میں خوب لکھا ہے اس کے علاوہ کتنی ہی باتیں تھیں جو میں گھر والوں کو بتانا چاہتا تھا۔

ہم چڑھائی پر جاکر چاروں طرف دیکھنے لگے، لیکن بے سود راہ پہچاننے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش کی، لیکن ہوا کی وجہ سے دیاسلائی سلگتے ہی بجھ جاتی۔ آخر بڑی مشکل سے میں سگریٹ جلانے میں کامیاب ہوا۔ گھوڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سناٹے میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔

"لنگا"

"حضور"

"ہمیں ساری رات اسی بیابان میں پڑا رہنا ہوگا"

اس بات پر (جیسے میری بات سمجھ گیا ہو) گھوڑے کے کان کھڑے ہو گئے اور لنگا بولا۔

"ذرا سنئے، سرکار"

ہماری داہنی طرف کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی"

"چل، اس طرف چلیں" میں بولا "شاید کوئی گاؤں مل جائے۔ پیڑ، پودوں کو بھی دیکھتا آ کچھ نہ کچھ نشان مل جائے گا"

"ہم ذرا دائیں طرف مڑ کر دیکھنے لگے۔ لیکن کتے کا بھونکنا پھر نہ سنائی دیا۔ یکایک لنگا ٹھہر گیا اور بولا۔

"وہ کیا ہے؟ دیکھئے!"

میں نے ادھر دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا۔

"اوہ! وہ تو ایک پیڑ ہے۔ ڈرپوک کہیں کا! ادھر آ گھوڑے

بیکے ساتھ ساتھ چلی۔ گھبرا نہیں۔ میں ایک کہانی سناؤں گا۔ تجھے لکھنا پڑھنا آتا ہے۔"

"کچھ کچھ آتا ہے حضور، ہاں، سنائیے کہانی"

وہیں ایک مینڈھ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے لنگا کو کہانی سنائی۔ .... انگریزی فوج کاویری ندی کس طرح پار کر کے آئی۔ ٹھیک دوپہر میں انگریز کس طرح قلعہ پر چڑھ آئے اور اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ اس وقت سلطان کھانے پر بیٹھے تھے، وہ کھانے ہی کھانے والے تھے کہ چڑھائی کی خبر سنی اٹھ گئے ——— گھوڑے پر سوار ہو، قلعہ کے پاس آ گئے۔ شام تک لڑتے رہے، سات گولیاں کھائیں۔ تب گرے، پھر بھی جان باقی تھی۔ لاشوں کے بیچ چھپے رہے۔ ایک گورے نے سلطان کا کمربند نکال لینا چاہا۔ ٹیپو نے تلوار کا وار کیا اور سپاہی نے گولی چلا دی۔ اس گولی سے وہ مر گئے۔ پھر کہانی کا باقی حصہ ——— انگریزوں کا سلطان کے بیٹے کو قید کرنا ——— لالٹین کی روشنی میں ٹیپو کی لاش تلاش کرنا ——— رات کی تاریکی میں سرنگاپٹن کی لوٹ کھسوٹ ——— اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے عورتوں اور بچوں کا رات بھر کھلی سڑکوں پر گزار دینا ——— دوسری صبح ٹیپو کے جنازے کا جلوس اور تجہیز و تکفین .... اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا۔

"بڑی دردناک ہے، حضور۔ سچ کتنی دردناک ہے،"

"اچھا، اب اٹھ چلیں"

ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے لنگا نے زیر لب کہا ——— "حضور! پیڑ کہیں بیاہا ہوتا ہے"؟ اور گھوڑے کے نزدیک آ گیا۔

بات یہ تھی کہ وہ پیڑ اندھیری رات میں کچھ بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ لڑکا ڈر جائے گا، میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

"اس پیڑ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں ارے۔ ہمارا گاؤں یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اس پیڑ کو دیکھ کر میرا بھائی شاما اتنا ڈر گیا تھا ———"

"وہ اس طرف کیوں آ نکلے تھے؟ سرکار"

"پچھلی گرمیوں میں جب میں یہاں آیا تھا۔ شاما اور میں شام کو یونہی گھومنے نکلے۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ وہ مجھے ایک کہانی سنا رہا تھا۔ وہی کہانی جو میں نے ابھی تجھے سنائی۔ شاما بڑا ہوشیار ہے، بڑی اچھی کہانیاں سناتا ہے۔ سرنگاپٹن کی یہ کہانی اسے خاص طور پر پسند ہے اتنے جوش و خروش سے بیان کرتا ہے کہ کہانی سناتے وقت اپنے آپ کو بھول جاتا ہے وہ مجھے اکثر تنگ کرتا رہتا ہے "سرنگاپٹن نہیں لے چلوگے مجھے"۔ اس دن بھی کہانی سنتے سنتے رات ہو گئی اور ہم راستہ بھول گئے، اور بھٹک کر بالکل اسی پیڑ کے پاس پہنچے، شاما اس پیڑ کو دیکھ کر ڈر گیا۔ گھر جاتے ہی اسکو بخار ہو گیا اور تین دن نہیں اترا،"

"تب تو حضور، یہاں سے گاؤں تک کوئی ٹھیک سڑک نہیں۔ ہمیں اس اندھیرے میں ٹٹول کر جانا پڑے گا؟"

"دیکھ، یہی ہمارے گاؤں کا شمشان ہے ——— یہاں سے گاؤں کوئی آدھ میل ہے"

"حضور، کیا کہا آپ نے!"

بھول سے میں نے شمشان کا ذکر کیا۔ وہ چودہ سال کا لڑکا، ڈر جائے تو؟

"یہاں سے ذرا داہنی طرف جانا ہے۔ ادھر دیکھ۔ یہ پیڑ ہمارے گاؤں کے پچھم میں ہے"

برسات تھم گئی تھی۔ لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ مینڈک ٹرٹرا رہے تھے۔ لنگا پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا چل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ڈر گیا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا اس سے بات چیت کرتا رہوں تو اچھا ہے۔

"لنگا"!

"ادھر دیکھئے حضور" اس نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھوتوں سے ڈرتا ہے! ڈرپوک کہیں کا؟"

"لیکن وہاں دیکھئے، حضور"، اس نے ہمت کی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس مینڈھ کے پاس جہاں میں نے بیٹھ کر لنگا کو کہانی سنائی تھی، روشنی نظر آئی۔ دو سہمی ہوئی صورتیں آمنے سامنے بیٹھی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی ——— جھوٹ، کیوں کہوں؟ ——— ذرا ڈر بھی لگا۔

"لنگا، وہاں کیا دکھائی دیتا ہے۔ تجھے؟"

"دیکھئے، ایک مشعل اور اس کے آس پاس ———"

"اچھا، تو میں یہاں بیٹھ کر دیکھیں"
دیکھئے اس طرف، دیکھئے !"

وہاں روشنی حرکت کرتی نظر آئی۔ ایک ہاتھ سے لنگا کو تھامے اور دوسرے سے گھوڑے کی لگام لئے، میرے پیچھے چھوٹی میں مینڈھ کی طرف بڑھا۔ جو پہلے نظر آیا تھا وہ ہمارا وہم نہیں تھا۔ وہاں دو صورتیں تھیں اور ان کی آواز۔ انسانی بات چیت سنائی دی وہیں ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ہم سننے لگے۔

"ہائے میرے بچے۔ میرے بچے ۔۔۔ تم دودھ کے لئے تڑپتے تھے۔ تمہیں دودھ پینے کی آرزو تھی۔ اور یہ آرزو لئے تم چل بسے ۔۔۔ لو میں دودھ لائی ہوں۔ لو، پی لو۔ تم سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، روز بروز کمزور ہوتے گئے۔ اور آخر کار ہم سب کو چھوڑ کر چل دیئے۔ ہائے۔ آخری دفعہ تم کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن موت نے تمہیں آ دبوچا۔ اور تم نے صرف میری طرف دیکھا ۔۔۔ تمہاری آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے ہو۔ کہو میرے لال تم کیا کہنا چاہتے تھے؟ تمہاری وہ پھٹی پھٹی رحم طلب آنکھیں ۔۔۔ ہائے میرے بچے، اس جنگل میں تن تنہا، بالکل اکیلا، بالکل اکیلا ۔۔۔ ہائے ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔"

ایک عورت کٹورے سے اس مینڈھ پر دودھ انڈیل کر بے اختیار رو رہی تھی۔ ہاں، ہم اس دھیمی روشنی میں پہچان سکتے تھے کہ وہاں دو عورتیں ہیں۔ میں نے لنگا کے کانوں میں کہا "رو رہی ہے۔ دُرمت"۔ دوسری، جو ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ وہ بھی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"بھیا کو دیکھ بھی نہ سکے۔ دن دو دن کے اندر یہ کیا ہو گیا۔ ہائے"

میں دو قدم آگے بڑھا۔ اتنے میں ہمارے سامنے کی روشنی بھی مینڈھ تک پہنچ گئی۔ اور تیسری آواز آئی، بھرائی ہوئی آواز لیکن قدرے کرخت لہجہ میں وہ بولی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے کہ اس بھیانک رات میں تم یہاں آئی ہو؟ تمہاری آہ و بکا سے واپس آ جائے گا؟ چلو گھر چلیں"

میں نے آواز پہچان لی۔ وہ میرے پتا جی تھے۔

"میرے بچے، تم اندھیرے سے ڈرتے تھے، اب تم یہاں اکیلے پڑے ہو۔ تم ایک بار اسی جگہ ڈر گئے تھے ۔۔۔ اور تمہیں تمہارا بھیا گھر لایا تھا۔ اب یہاں اکیلے سنسان میں ڈر نہیں لگتا؟ میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر گھر کیسے جاؤں؟"

میری ماتا رو رہی تھیں۔

"بھیا ٹوپی اور جوتے لائیں گے۔ اب انہیں سر پر کلغی کا قصہ کوئی نہ سنائیگا۔ او بھیا، اب کسکو سر پر کلغیاں دکھائیں گے؟ میرے شیامو ۔۔۔ ہائے بھگوان۔" یہ میری بہن کی آواز تھی۔

اپنی اس وقت کی حالت میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس بے پایاں دنیا میں میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ لنگا مجھے پکڑے ہوئے تھا اور آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ لیکن میں اس کی گرفت سے علیحدہ ہو کر مینڈھ کی طرف بھاگا۔

پتا جی نے لالٹین اٹھائی اور پوچھا کون ہے؟

"پتا جی ۔۔۔"

مجھے دیکھتے ہی سب رو پڑے۔ غم کا جذبہ امڈ آیا۔ بہت دیر تک میں شامنا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ لنگا بھی رو رہا تھا اور رو رو کے ہلکان ہو کر آنسو پونچھ رہا تھا۔ اور میں نے چھوٹی سی ٹوپی اور جوتے نکالے اور اس کی قبر پر رکھ دیئے ۔۔۔ پھر سے غم کا جذبہ امڈ آیا۔ شامنا نے ایک بار پوچھا تھا "بھیا یہ پیڑ پودے رات دن جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں؟" یہ بات یاد کر کے میں نے وہ رات وہیں گزار دینی چاہی۔ ہم بہت دیر تک وہیں پڑے رہے بات چیت جاری رہی ۔۔۔ شامنا کی بیماری۔ وہ ہمارے گھر کا ہیرا تھا ۔۔۔ سب کا چہیتا ذہین، ہوشیار، عقلمند اور گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں کا نور۔ اس کے بغیر زندگی بے کیف تھی۔ پتا جی نے آہ بھری اور کہا "ایک نہ ایک دن ہم سب کو بھی یہیں آنا ہوگا ۔۔۔"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور جیسے اپنے ساتھ جواب لایا

"ہاں"۔

یہ لاکا، اسی جگہ جہاں ایک بار میرے ساتھ چھپنے پر بھی ڈر گیا تھا۔ وہ آج گہری نیند سو رہا ہے ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے، جی ہاں گھر کی طرف، لیکن گھر ہے کونسا؟

(کنڑی زبان سے)